مقامات ناصری

از

میر ناصر علی دہلوی

مرتبہ

سید انصار ناصری

انجمن ترقی اردو

اردو روڈ کراچی

مقامات ناصری

میر ناصر علی مرحوم کے مقالات کا انتخاب

جلد اوّل

مرتبہ
سیّد انصار ناصری

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ۔ کراچی

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقیٔ اردو

شمارہ: ۳۳۳

اشاعت اول	۱۹۶۹ء
طابع	انجمن پریس، کراچی
قیمت	اکیس روپے

تہدیہ

میر ناصر علی کے مخدوم زادے

عالی جناب میجر جنرل نواب زادہ محمد شیر علی خاں صاحب بالقابہ

کی خدمت میں

"گل آورد سعدی سوئے بوستاں"

انصار ناصری



میر ناصر علی دہلوی

فہرست

حصۂ دوم

حصّہ سوم

جمیل الدین عالی
معتمد اعزازی، انجمن ترقی اردو

حرفے چند

پہلی بار

خان بہادر میر ناصر علی پورے چھپن برس تک لکھتے رہے۔ بائیس برس تو 'صلائے عام' ہی جاری رہا۔ ان کی ادبی زندگی نے 'صلائے عام' سے بہت زیادہ بڑی عمر پائی تھی۔

اُن کے مضامین، انشائیے، صحافیے عوام و خواص کے علاوہ بڑے بڑے جیّد اہلِ قلم کی نظر میں کیا شان رکھتے تھے اس کا کچھ اندازہ ان اقتباسات سے ہو سکتا ہے جو لائق مرتب نے کتاب کے آخر میں پیش کیے ہیں۔ کون ادیب تھا جو سید صاحب مرحوم سے متاثر ہو کر کھلے دل سے ان کا معترف نہ ہوا ہو۔

ان کی زندگی معاشی طور پر کبھی بری نہیں گزری، بہت آسودہ رہے اور خاصی امارت کے عالم میں انتقال کیا۔ اللہ کے فضل سے کسی بات کی کمی نہیں تھی، مگر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ نہ تو ان کا کوئی انتخاب، کوئی مجموعہ ان کی زندگی میں چھپا نہ ۱۹۶۹ء تک کہ ان کے انتقال پر چھتیس برس ہوتے ہیں۔ اس کے کچھ اسباب لائق مرتب نے صفحہ ۹۲-۱۹۱ پر بتائے ہیں مگر بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مرحوم اس طرف سے بے نیاز تھے، وہ تو بس لکھتے تھے اور کیا اچھا لکھتے تھے، آج کے زمانے میں جب کاتا اور لے دوڑی کا راج ہے میر صاحب مرحوم جیسی شخصیت کا یہ روّیہ خاصا ناقابل فہم معلوم ہوگا۔

اس اشاعت سے دو بڑے کام ظہور میں آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اردو کے ایک صاحبِ طرز، محترم، مشہور اور بزرگ ادیب کا پہلا مجموعہ پہلی بار چھپا۔ 'صلائے عام' ایک تحریک کہلانے لگا تھا، مگر خان بہادر میر ناصر علی مرحوم کی تحریریں جس طرح اپنے معاصرین اور بعد میں مشہور ہونے والے نثر نگاروں پر اثر انداز ہوئی تھیں اس کا پتا تقابلی مطالعے

سے صاف ملے گا۔ اس لحاظ سے یہ کتاب اہلِ نظر اور اہلِ تحقیق کے لیے خاص دل چسپی کا باعث ہوگی اور اردو نثر کی چند نئی تدریجی کیفیتیں آشکار ہوں گی۔

اس اشاعت سے بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کی ایک دیرینہ خواہش بھی پوری ہوتی ہے۔ جیسا کہ فاضل مرتب کے بیان سے ظاہر ہوگا مولوی صاحب مرحوم، میر صاحب کے مضامین کا انتخاب چھاپنے کے بڑے آرزومند تھے۔ ہمیں خوشی ہے کہ فاضل مرتب نے ازراہ تعاون انجمن کو اس منصوبے کی پیش کش کی اور نہایت محنت سے اس جلد کو مرتب کیا۔ اس کی اشاعت میں قدرے تاخیر ہوئی ہے مگر مختصراً یوں سمجھیے کہ ایسا ہونا ناگزیر تھا۔

اب کہ یہ کتاب چھپ کر سامنے آرہی ہے ایک اور بات ثابت ہو جاتی ہے، وہ یہ کہ بڑے لکھنے والے اپنے عہد کے بعد بھی ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔ ذرا غور کیجیے۔ خان بہادر صاحب نے چھپن برس تک کتنا لکھا اور چھیاسی برس کی عمر پائی مگر ان کا مجموعہ نہ چھپا۔ پھر ان کے انتقال پر چھتیس برس گزر گئے۔ ایک طرح دو نسلیں ان کی تحریروں سے محروم گزر گئیں صرف تذکروں میں ذکر پڑھا یا کہیں ایک آدھ مضمون دیکھ لیا، مگر ایک اتنے منفرد اور خوبصورت نثر نگار کے بھرپور مطالعے سے فیض یاب نہ ہو سکیں۔

خداوند تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ سعادت بھی انجمن ترقیٔ اردو کو نصیب ہوئی اور اس معاملے میں ہم میر صاحب موصوف کے پوتے سید انصار ناصری صاحب کے نہایت ممنون ہیں جنھوں نے اس عظیم الشان کتاب کو مصنف کے شایان شان مرتب کیا۔

تقریظ

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

اپنی زبان سے سب کو محبت ہوتی ہے مگر خان بہادر ناصر علی مرحوم کی اردو کے عشق میں جو بے قراری اور استواری دیکھنے میں آئی اس کی مثالیں مشکل سے ملیں گی۔ مرحوم کچھ کم نوے سال زندہ رہے اس میں کم و بیش ساٹھ سال تو ضرور اسی محبوب کی آرائش و نمائش کی دھن میں بسر کیے، ان کی نثر نگاری کا آغاز "تیرھویں صدی" سے ہوا۔ (اس نام کا رسالہ انہوں نے ۱۸۷۶ء میں نکالا تھا جو چار پانچ سال تک جاری رہا) اور خہتتام "صلائے عام" پر جو ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۲ء تک نکلتا رہا۔ اسی کے دوسرے سال مرحوم علیل ہوئے اور چند مہینے کے بعد (جون ۱۹۳۳ء) ان کا انتقال ہوگیا۔ تالیف و تصنیف یا انشاپردازی اور صحیفہ نگاری مرحوم کا پیشہ نہ تھی، لیکن سرکاری ملازمت کی مصروفیت میں بھی یہ شوق انھیں بے چین رکھتا تھا، پھر جب حسن خدمت کا وظیفہ اور انعام و اکرام پاکر ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو فرصت کا سارا وقت اور کمائی کا بہت سا حصہ اسی شوق کی نذر ہونے لگا، اچھی اور نئی چیزیں لکھنے کی تشنگی، اچھی اور نئی چیزیں پڑھنے کے بغیر سیراب نہیں ہوسکتی، خان بہادر مرحوم نے بھی مشرقی اور انگریزی کتابوں کا ایک عمدہ ذخیرہ فراہم کیا اور آخر تک اپنے مطالعے کو تازہ رکھنے میں سرگرم

رہے۔ اور اپنے مخصوص رنگ میں مدت العمر تک ایسے دلکش مضامین کے پھول کھلاتے رہے جن کی لطافت اور شگفتگی سدا بہار رہے۔

مرحوم کی ادبی خدمت کا سب سے مشہور کارنامہ رسالہ صلائے عام تھا اس کی اشاعت محدود رہی لیکن شہرت ہماری دنیائے ادب کے ہر کونے تک پہنچ گئی۔ جو لوگ معتقد نہ تھے وہ بھی معترف تھے کہ خان بہادر ناصر علی ایک خاص طرز نگارش کے مالک ہیں، چھوٹے چھوٹے مربوط جملے جن میں شاعرانہ سخن سنجی کے ساتھ فلسفیانہ نکتہ رسی، طنز ملیح، شوخی اور لطافت بڑے دل پذیر انداز میں یک جا نظر آتے ہیں، یہ سخنورانہ اسلوب ان کا حصہ تھا اور ان کے ساتھ ختم ہو گیا، ادب کی نسبت اپنے تصورات اور نصب العین کی خود مرحوم نے جگہ جگہ صراحت کی ہے، وہ اردو نثر میں "نازک خیالی اور پاکیزہ بیانی" کے نمونے دیکھنے کے آرزومند تھے جسے ہم مجموعی طور پر شاعرانہ نثر کے نام سے یاد کر سکتے ہیں، اودھ میں یہ طرز خاصا مقبول تھا، دل گداز وغیرہ میں اسی قسم کی شاعرانہ نثر کی مثالیں نظر آتی ہیں لیکن مغربی خیالات وجدید معلومات کے سامنے جنکا سیلاب امڈا چلا آتا تھا یہ مرصع طرز نگارش نہ نبھ سکتا تھا، اور جدید اخبار نویسی کی جو آندھیاں آئیں ان میں یہ خوبصورت پھول پتیاں اڑ اڑ کر نابود ہو گئیں، بہر حال خان بہادر مرحوم کی انشا پردازی کو اسی شاعرانہ دور کی ایک نادر و اعلیٰ یادگار سمجھنا چاہیے جس کے باکمال اساتذہ میں سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت محمد حسین آزاد کو نصیب ہوئی

خان بہادر مرحوم نے کبھی جم کر کسی ایک موضوع پر قلم فرسائی نہیں کی، کہ باقاعدہ کتابوں کی صورت میں لوگ ان کے کلام و بیان سے لذت یاب ہوتے انہوں نے جو کچھ لکھا، چھوٹے چھوٹے مضامین، شذرات یا انشائیے ہیں، یعنی ایسی نازک اور لطیف پھل جھڑیاں جو رسائل اور جرائد میں اپنی چمک دمک دکھا

کر پھر اندھیرے میں چھپ گئیں۔ اسے بھی ان کے شاعرانہ مزاج کا کرشمہ سمجھنا چاہیے، لیکن ان "مضامین پریشاں" اور عباراتِ پاشاں" میں بھی حکیمانہ فکر و نظر، شستہ و رفتہ ادبیت اور اساتذہ کی پاکیزہ زبان میں لطیف و دل کش پیرایۂ بیاں کے مرصع نمونے نظر آتے ہیں، کہیں کہیں طنز و مزاح اور دانش و حکمت کے ایسے ایسے تیر و نشتر ان کے قلم سے نکلے ہیں جو صاحبان ذوق و سوز کو مدتوں تڑپاتے رہیں گے، اسی نظر سے ہم اسے اردو ادبیات کی خوش قسمتی سمجھتے ہیں کہ مرحوم کے جواہر پارے جو ہزاروں اوراق میں دبے اور بکھرے پڑے تھے بلکہ اکثر نایاب ہو چکے تھے ان کے لائق پوتے سید انصار علی صاحب ناصری نے کان کنوں جیسی محنت کر کے جمع کئے اور مرتب کتاب کی شکل میں ان کی حفاظت اور افادہ پذیری کا انتظام کیا۔

جزاہ اللہ خیر الجزا

عبدالحق

انجمن ترقی اردو۔ کراچی

۱۰ رجنوری ۱۹۵۹ء

پیش لفظ

مولینا عبدالماجد دریابادی

زمانہ یہی کوئی ۱۹۰۸ء، ۱۹۰۹ء کا ہوگا، کالج میں پڑھ رہا تھا اور لکھنے پڑھنے کا شوق نیا نیا پیدا ہوا تھا۔ یاد ہے کہ اس وقت جن چند استادوں کی تحریروں کو حیرت، دلچسپی اور شوق کی راہ سے بڑھتا تھا کہ ان سے کچھ سیکھئے، کچھ لیجئے، کچھ حاصل کیجئے۔ ان چند میں سے دہلی کے ایک میر ناصر علی مرحوم بھی تھے، زبان شستہ اور ٹکسالی، مضامین پُرمغز اور معیاری۔ "تیرھویں صدی" بند ہو چکا تھا، صلائے عام ایک جگہ تبادلے میں آتا تھا، وہیں مجھے دیکھنے کو مل جاتا تھا۔ ادبی پرچے اور بھی آتے رہتے تھے، اس کی طرز و وضع سب میں نرالی تھی، اس کی ندرت ایک یاد رہ جانے والی چیز تھی، نقش جو اس وقت دل میں بیٹھا آج تک قائم ہے؛ ادیبانہ شان کے ساتھ اس کے مضامین میں ایک خاص وضع کی حکیمانہ نکتہ رسی اور آن بان تھی۔

صلائے عام اپنے نام کے برعکس پرچہ عوام کا نہیں، خواص کا تھا، حلقہ اثر وسیع نہیں محدود در محدود تھا، پڑھنے والے قدر کرنے والے، لطف اٹھانے والے تھوڑے ہی تھے، یہ خاص اس وقت، جب اس کی ادبیت کا عین شباب تھا، اور اب تو نصف صدی اس پر بیت چکی ہے، خدا جانے کتنی بہاریں خزاں میں

تبدیل ہو چکی ہیں، کتنی جگمگاتی ہوئی شمعیں گل ہو چکی ہیں، کتنی محفلوں کی بساط الٹ چکی ہے، کتنے آفتاب اور کتنے ماہتاب غروب ہو چکے ہیں، کیا زبان اور کیا خیال سب کی دنیا ہی زیر وزیر ہو چکی ہے۔ ایسے میں میر ناصر علی غریب کو کون پوچھتا ہے کون انہیں یاد رکھتا ہے۔ اس کس مپرسی کے عالم میں مرحوم و مغفور کے پوتے انصار ناصری سلمہٗ نے بڑی ہمت دکھائی ہے کہ اپنے جد امجد کی بھولی بسری یاد کو تازہ کرنے کی ٹھان لی، اور ایک بجھی ہوئی شمع کو پھر سے روشن کرنے کو کمر باندھ لی اور زمانے کی اس نصیحت کی ذرا بھی پروا نہ کی۔

چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

اللہ ان کی ہمت میں برکت دے اور مقالاتِ ناصری کو شرفِ قبولیت سے نوازے، یہ ان کے منتخب مضامین کا مجموعہ ہے اور نام انہی مرحوم کا تجویز کیا ہوا ہے عربی کے مقاماتِ حریری اور مقاماتِ بدیعی کی طرز پر، اردو میں اسی قسم کے مضامین شرر مرحوم بھی لکھا کرتے تھے، دونوں میں فرق شاید وہی ہے جو دہلی اور لکھنؤ میں ہے۔ محمد حسین آزاد مرحوم دونوں سے متقدم اور دونوں کے پیش رو ہوئے ہیں، مرحوم اچھے خاصے پختہ مسلمان تھے، کہیں کہیں رَوا رَوی اور بے خیالی میں ایک آدھ فقرہ ذرا دوسرے رنگ کا قلم سے نکل گیا ہے۔ یقین ہے کہ نظر ثانی کا موقع اگر مل جاتا تو ضرور خود ہی اس میں ترمیم فرما دیتے، تاریخ اسلام پر مرحوم کی نظر غائر تھی اور بند تو وہ معقول اور منقول کی شاید کسی صنف بھی میں نہ تھے۔

ہماری زبان کے کتنے اچھے اچھے شاعر اور ادیب گم نامی کے پردے میں چھپ گئے۔ فہرست خاصی لمبی ہے اور اس فہرست میں میر ناصر علی بھی داخل ہیں۔ شہرتِ عام کے اسباب بھی کچھ اور ہوتے ہیں، ان پر اگر بحث شروع کر دی جائے تو یہ مختصر سا "پیش لفظ" خود ایک مستقل اور طویل مقالہ بن جائے۔ عطار کب تک اپنے مشک

کے فضائل، زبانی بیان کئے جائے۔ ذیل کی مختصر عبارتیں خود پڑھ کر مصنف کی علمی معلومات، فلسفیانہ فکر و نظر، پاکیزہ ادائے بیان اور سخن ورانہ زبان کے متعلق رائے قائم کیجئے:

"ابن رشد کا تمام یورپ پر احسان ہے کہ مسلمان اور عیسائیوں میں یہی ایک شخص تھا جس نے ارسطو کی تصانیف کا مطلب ہمیں سمجھایا۔ اور ارسطو کی تصانیف سے مسلمانوں کو جس قدر فائدہ ہوا اسی قدر عیسائیوں کو ہوا — اسلام سے پہلے کے علما اس بات پر زور دیتے رہے کہ دنیا کی خوبیوں میں کمال پیدا کیا جائے۔ مسلمانوں نے ثابت کیا کہ اس عالم اور عالم آیندہ دونوں میں آرام کی فکر کی جائے۔ افلاطون کی تعلیم ہے کہ انسان اپنی ضعیف البنیانی کے ساتھ اس قدر کسب کمال پیدا کرے کہ خدا سے قریب تر ہوتا جائے۔ ارسطو کا قول ہے کہ جس طرح ہر پھول شروع سے آخر تک بیج میں تھا، پھر اُگا، پھر شاخ میں آیا، پھر کھِلا اور کمال کو پہنچ گیا۔ انسان بھی اسی طرح کمال انسانی حاصل کرے، بعد اس کے سوکھے یا مرجھائے، مسلمانوں نے ثابت کیا کہ مرنے کے بعد بھی کام آئے۔ پھولوں کا کیوڑا، گلاب کھینچے جو قیامت تک اور قیامت کے بعد بھی زمانے کے دل و دماغ کو خوش رکھے۔"

"نظم میں کوئی بات باقی نہیں رہی جو آپ دکھا سکیں، جتنے اگلے کہہ گئے اس سے زیادہ کیا، اس کے برابر بھی کہنا مشکل ہے اور اگر کہا جائے اور قواعد کی پابندیاں ترک کی جائیں، تو عوام کی تو نہیں کہہ سکتا مگر اس فن کے جاننے والے ہنستے ہیں، نظم کی جگہ آپ نثر میں

محنت کریں، اس میں پابندیوں کی شرط نہیں، ردیف وقافیہ بحر و وزن کا جھگڑا نہیں، زلفِ جاناں سے بڑا مضمون نہ ہو، اور دہن یار سے چھوٹا ہو تو عیب نہیں، ــــ ابوالفضل کی عبارت دیکھئے کہ کتنی دور جاکر مطلب نکلتا ہے اور شیخ سعدی کتنی جلدی اپنا مطلب ادا کردیتے ہیں، ظاہر وحید کے رقعات اور رقعاتِ عالمگیری ملایئے تو کتنا فرق نکلے گا، لیکن دونوں معتبر طرز کی تحریریں ہیں، انہیں اپنی اپنی وضع میں لاجواب سمجھیے، اردو میں جہاں تک ہوسکے ہندی کے محاورے جو ہر ایک کی زبان پر ہیں، زیادہ زیب دیتے ہیں ــــ"

"فارسی میں عشق ومحبت کی داستانیں اس دھوم سے لکھی گئیں کہ یہ مضمون زیادہ تر اسی زبان کا حصہ ہوگیا، اردو میں بھی یہاں کے شاعروں نے اسے خوب نبھایا لیکن ہندی میں اس مضمون کو جس خوبصورتی سے ادا کیا یہ اہلِ ہند کا حق تھا، یہاں تک اور اب تک جو کچھ ہوا سو ہوا، جب سے نیچرانہ شاعری کا نام نکلا ہے، عشق ومحبت کا نام مٹتا جارہا ہے، زلف وسنبل کے ذکر سے پریشانی ہوتی ہے، خدوخال سے جی گھبراتا ہے، نئی تہذیب والے نہیں جانتے کہ نظم میں عشق ومحبت کے بغیر چارہ نہیں اور نثر میں بھی اس کا ذکر برا نہیں ؎

اَحوالِ ما اگرچہ مکرر شنیدہ
سوگند می خوریم کہ کمتر شنیدہ"

"دنیا میں نیا سال ہو یا پرانا، دراصل گردشِ لیل ونہار

کے سوا کچھ نہیں ، نگاہِ یار کی طرح دوست دشمن ، بُرے بھلے سب اسی کے مارے ہوئے ہیں ، اس کی ہر گردش میں خدا جانے کتنوں کے کام بنتے کتنوں کے بگڑتے دیکھے ؎

میری طرح جو غیر سے وہ آنکھ پھیرلے
دوں میں دعائیں گردشِ لیل و نہار کو"

" میزانِ عدل کی طرح گردشِ لیل و نہار کے دو پلڑے ہیں ، ماضی و مستقبل ، حال کا میں قائل نہیں کہ زمانہ ایک پل بھر بھی ایک حالت میں نہیں رہ سکتا ، یہ جاتا نظر آتا ہے یا آتا ؎

رہتے تو ہم مقابلہ کرتے حُباب سے
کیا کہیے اپنی زیست کا وقفہ قلیل تھا

مجھ سے کوئی پوچھے کہ میری عمر جو گزر گئی وہ اچھی تھی یا اب جو سامنے آرہی ہے ۔ اگر سوچ سمجھ کر جواب دینے کی اجازت ہو تو میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جو وقت گزر گیا غنیمت تھا ، مجھے جب یاد آیا پچھلا زمانہ ہی یاد آیا ، جوانی میں لڑکپن کو روتا رہا اور اب بڑھاپے میں دونوں کا رونا ہے ، اس کے بعد موت دکھائی دیتی ہے ؎

پلا کے شیرِ طفل کو سُلاتی ہے دایہ ذکزا
دلیلِ خوابِ اجل ہے سفید بال ہونے "

" انسان گردشِ لیل و نہار سے اگر کچھ نہ سیکھ سکا تو اپنی زندگی رائیگاں جانے دی ۔ دنیا کو میں بہت اچھا جانتا ہوں کہ مجھے اس میں

نیکی ہی نیکی نظر آتی ہے ، بدی ہے بھی تو چھپی چھپائی ، یہی وجہ ہے کہ انسان عیب چھپا کر کرتا ہے ۔ خدا کو دنیا سے محبت ہے، جس طرح ماں باپ کو اولاد سے ہوتی ہے اور اہل سخن کو اپنے طبع زاد سے ، اس میں عیب ہوں تو ہونے دیجئے ، حسینوں سے محبت کے لئے یہ شرط نہیں کہ وہ وفا بھی کریں ۔ ان کی بے وفائی پر بھی چاہنے کا لطف ہے ، کہتے ہیں کہ عورت کو خدا نے ناقص العقل بنایا ہے مگر نقص ہی رعایت چاہتا ہے ۔ خم شکستہ کو پیر مغاں کو احتیاط سے اٹھاتے دیکھا ؎

بادہ خواروں کے لئے یہ گردش افلاک ہے
مہر و مہ ساغر ہیں اور یہ چرخ گرداں خاک ہے"

"جس طرح دنیا کا مدار گردش لیل و نہار پر ہے ، اہل سخن کی زندگی ان کی گردش پر سمجھئے کہ جب تک زبان کو گردش نہ ہوگی ، گویائی معلوم ۔ خواجہ وزیر فرماتے ہیں ؎

گردش نہ زباں کو ہو تو پھر بات نہ نکلے
گویائی ہے گردش سے وزیر اہل سخن کو"

ہندوستان میں نئی اور پرانی تعلیم کی نسبت اولڈ اسکول کے لوگوں کو شکایت ہے کہ مسجد و مکتب کے پڑھے ہوئے اپنے بڑوں کا جتنا خیال رکھتے تھے ، اتنا آج کل کے تعلیم پائے ہوئے لڑکے نہیں کرتے ۔ اتفاق سے میں دونوں کے بیچ میں حرف مشدّد کی طرح آپڑا ہوں کہ مکتب میں فارسی اور کالج میں انگریزی پڑھی ، انگریزی تعلیم

میں بھی اب فرق بتاتے ہیں کہ پہلے کے پڑھے ہوئے لوگ اور وضع کے تھے اور اب اور وضع ہے۔ میری رائے میں انگریزی تعلیم میں تو کچھ فرق نہیں نظر آتا، فارسی کی تعلیم میں البتہ فرق ہوا ہے اور فرق کی وجہ یہ ہے کہ اول تو فارسی سررشتۂ تعلیم کے نصاب میں بیکار سمجھی جاتی ہے، دوسرے فارسی کی تعلیم مکتبوں کی وضع پر جو پہلے دی جاتی تھی اس سے بچوں کو حفظ مراتب کا سبق ایسا دلوں پر نقش ہو جاتا تھا کہ نسلاً بعد نسلٍ خاندانوں میں چلا جاتا تھا۔ اس کے معمولی آثار بھی نئی وضع میں نظر نہیں آتے ؎

بزرگش نخواہند اہل خرد
کہ نام بزرگاں بزشتی برد"

" دنیا میں اگر مانگنے سے مراد ملتی تو میں زبانِ اردو کے لئے آپ کی قدردانی کی دعا مانگتا" خدا زلفِ خوباں سی رسا طبیعت دے تو کمر یار کا مضمون باندھنے کو جی چاہتا ہے لیکن آپ کی قدردانی کمر یار کا جواب ہے۔

آپ کی زبان اگر نہیں تو آپ کا ہونا نہ ہونا یکساں ہے، دیوانہ نہ ہو تو فصلِ گل اور موسم خزاں میں کیا فرق ہے؟ جنوں نہ ہو تو زنجیر و زنداں بےکار ہے۔ جس طرح شمع کے دم سے محفل کی روشنی ہے۔ زبان سے بزم ہستی کی رونق سمجھئے، خاص کر اپنی زبان جس کے سامنے بلبل کی نغمہ سرائیاں شور بیگانگاں سمجھ کر سننے کو جی نہیں چاہتا ؎

گلشن اک مدرسہ ہے اپنا
بلبل کو سبق پڑھا رہے ہیں

ہر بچے کے کان میں پہلی صدائے محبت جو آئی وہ ماں کی آواز تھی اس لئے پہلے حق زبان مادری کا ہے، دنیا میں جتنی قومیں ہوئیں اور ہیں انسانوں سے مرکب ہیں اور انسان کی جان زبان ہے، زبان میں فرق آیا تو جان میں کیا دھرا ہے۔ جس قوم کی زبان گئی اس کی جان بھی گئی ہی سمجھ لیجئے، اگر زندہ بھی ہے تو جسم بے جان ہے۔ ہندوستان میں سنسکرت کا رواج کم ہوا ہی تھا کہ مسلمانوں کا دور شروع ہو گیا، یہودیوں میں عبرانی برائے نام رہ گئی تھی کہ غیر قوموں نے آگھیرا، جو قوم فنا ہونے والی ہوتی ہے اس کی زبان پہلے مٹتی ہے۔ جس طرح کسی مظلوم کو کوئی ظالم سفاک جان سے مارا جاتا ہے تو پہلے اس کا منہ بند کرنا مصلحت سمجھتا ہے، کہ نہ چیخے گا نہ کسی کو خبر ہوگی، اسی طرح جلاد فلک جس قوم کو مٹانا چاہتا ہے پہلے اس کی زبان مٹاتا ہے۔ یونانیوں کی وہ زبان نہیں رہی جو ارسطو و افلاطون کی تھی، نہ رومیوں کی اب وہ زبان ہے جو لاطینی کہلائی جاتی تھی۔ مجھے اس کا رونا ہے کہ آپ کی قدر دانی کا یہی حال رہا جو میں دیکھ رہا ہوں تو یہ زبان چلتی نظر نہیں آتی، کیسی ہی نازک خیالیاں اور پاکیزہ بیانیاں پیدا کی جائیں، کسی کی قدر نہیں، "صلائے عام" میں جو اس طرف توجہ کی جاتی ہے بیکار جاتی ہے ؎

گل گراں گوش و چمن صورت حیرانی ہے
کس گلستاں میں ہمیں حکم غزلخوانی ہے"

یہ ہیں مختصر نمونے اس دل آویز انشا کے جو میر ناصر علی نے ایجاد کی اور جس میں انہوں نے برسوں تک زرنگار مضامین اس استادانہ شان سے تحریر کئے کہ یہ طرز انہی کا حصہ ہوگئی۔ یوں کہنے کو "ادبِ لطیف" کی گھڑی ہوئی اصطلاح کے نام پر بعد کو چند غاصبوں نے اس طرز پر قبضہ جمانا چاہا مگر یہ نازک خیالی اور پاکیزہ بیانی کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ انہی کی ملکیت تھی، انہی کے ساتھ ختم ہوگئی — وہ ہمارے برگزیدہ استادوں میں سے تھے، اب استادوں کو بھلا کون یاد رکھے یا انہیں کسی شمار و قطار میں لائے، اپنی جگہ ہر ایک خود استادِ فن بنا بیٹھا ہے، دنیا ان کے احسانات تو کیا ان کے نام کو بھی بھلا بیٹھی۔

ان کے نام پر مٹنے والے مہدی حسن جن کی "کھلی چٹھی بنام میر ناصر علی" داد کا حق ادا کرگئی، اور اردو ادب میں ایک نقشِ دوام ثبت کرگئی، انہی مضامین کی اشاعت کے بارے میں میر ناصر علی کو اس طرح آمادہ کرتے رہے:

"....... نئی نسل کو آپ کی اردو سے دور کا بھی واسطہ نہیں، نہ بہئیتِ موجودہ کسی میں صلاحیت ہے ..... کون ہے جو آپ کے رنگ میں دو سطریں بھی لکھ سکے۔ مرحوم ریاض (خدا اسے مدتوں زندہ رکھے) اور برہم و اشہری کے دل سے پوچھیے، ناصر علی پھر کہاں؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے قدردان کہاں سے آئیں گے موجودہ نسل آپ کو نہیں جانتی۔ اور یہ آپ ہی کا قصور ہے .... آپ کا عنصر غیر فانی ہے لیکن افسوس ہے آپ کو یہ خیال نہ آیا کہ جس سے اتنے دماغی شاہکار ہے وہ بہئیتِ مجموعی کتابی صورت میں جلوہ گری کا حق رکھتی ہے۔ اس پاکیزہ مجموعے کی ترتیب و اشاعت سے اردو ادب العالیہ (کلاسیکس) میں آپ کی طرف سے مستقلاً ایک

قیمتی اضافہ ہوتا، جو یادگار زمانہ رہتا۔ آپ معاف فرمائیں گے کہ یہ بدترین حق تلفی تھی جو آپ اپنی کر سکتے تھے، جس طرح ہو اپنی مستقل یادگار چھوڑیے، اس کی چلتی ہوئی ترکیب یہ ہے کہ متفرق پرچوں میں خاص آپ کے جو مضامین ہیں یکجا کر کے اہتمام کے ساتھ ایکدم شائع کر دیجئے، ...... اگر ایسا نہ ہوا تو میں سمجھوں گا، میرے منہ میں خاک! آپ جیتے جی مر لیے، اور لٹریچر کے خون ناحق کا بارگراں جو آپ کی گردن پر رہا، وہ علیحدہ .... یہ اصرار آپ کے خاص مرتبۂ انشا پردازی کے لحاظ سے ہے ..... آپ کی زبان اپنے مختص النوع صفات کے ساتھ کسی اور کے بس کی نہیں، سچ یہ ہے کہ آپ اس فن کے اختصاصی (اسپیشلسٹ) ہیں ..... میں آپ میں یونانیوں کی سی لطافت خیال پاتا ہوں ..... "

ایک طرف شوخ نگار مہدی حسن کی یہ ادائے داد اور ایسا نازو اصرار، دوسری طرف جادو نگار میر ناصر علی کی طرف سے "حسن تحسین مضمون" کے عنوان سے اس داد کی داد، مگر اصرار پر وہی انکار، ایک اگر استادی میں فرد تو دوسرا ارادت مندی میں جواں مرد، یہ اس پر فریفتہ، وہ اس پر والہ و شیدا، وہ اس کی لطافتوں کی بلائیں لینے والا، یہ اس کی نفاستوں پر مرمٹنے والا۔ اب آج جس طرح کوئی میر ناصر علی ممکن نہیں، اسی طرح دوسرا مہدی حسن کوئی کہاں سے لائے۔

" ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے "

آج مہدی حسن اور ریاض خیرآبادی، برہم دا شہرتی، اکبر الہ آبادی، دلگیر اکبرآبادی، مولوی سبحان اللہ، اور مرزا عرفان علی بیگ، گرامی اور طباطبائی

محشر لکھنوی اور عزیز لکھنوی، طالب دہلوی اور سائل دہلوی، سر کشن پرشاد اور نواب شمشیر بہادر سے قدرداں زندہ ہوتے تو میر ناصر علی کے ان مقامات کی شایان شان قدر و منزلت ہوتی اور عزیزی انصار ناصری بھی اپنی تلاش اور محنت کی داد پاتے۔ دیکھنا ہے کہ موجودہ اور آنے والی نسلیں اپنی زبان کے اس بلند مرتبت استاد کے ان جواہر پاروں کی کیسی قدر کرتی ہیں، کس حد تک اس انمول خزینے سے متمتع ہوتی ہیں، ہمارے آپ کے لئے یہی بہت ہے کہ سپاس گزاری کے ساتھ 'ساٹھ ستر برس پہلے کے کھلے ان پھولوں سے جن کی رنگت اور مہک آج تک شاداب، تر و تازہ اور عطر بیز ہے' اپنے قلب و ذہن اور روح کو پھر سے بسا لیں۔

عبدالماجد دریا آبادی

لکھنؤ مارچ ۱۹۶۴ء

اردو کا پہلا اور آخری انشائیہ نگار

میر ناصر علی دہلوی

علامہ نیاز فتحپوری

میرا خیال ہے کہ یہ نام سن کر نئی نسل کے بہت سے ادیب چونک پڑیں گے کیونکہ یہ بات غالباً ان کے علم میں نہ ہوگی کہ دلی میں اس نام کا ایک جیدادیب گزر چکا ہے، اور ادیب بھی وہ جس نے اردو ادب کو بالکل "نئی چیز" دی اور اس کو اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ نام اب سے ۲۰-۲۵ برس پہلے کے ادیبوں نے سنا ہو اور شاید اس "نئی چیز" کو بھی دیکھا ہو جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے لیکن نئی نسل کے لکھنے والوں میں تو شاید ہی کوئی اس وقت ایسا ہو جو ان کے ادبی کمالات سے واقفیت رکھتا ہو۔ اس لئے پہلے مختصراً یہ سن لیجئے کہ میر ناصر علی کون تھے۔ اور کیا تھے۔

میر ناصر علی ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ انقلاب سے دس سال قبل پیدا ہوئے اور اور ۱۹۳۳ء میں وفات پائی۔ آپ ایک ایسے خاندان سادات سے تعلق رکھتے تھے جو اپنی روایات فضل وکمال کی وجہ سے خاص امتیاز کا مالک تھا۔ میر صاحب کے والد ماجد مولوی سید ناصر الدین محمد ابوالمنصور اس وقت کے جید مولوی اور جلیل عالم تھے اور فن مناظرہ کے زبردست ماہر۔ آپ نے فارسی میں تفسیر قرآن کے علاوہ اردو میں تاریخ اسلام، رد تبلیغ عیسائیت اور دیگر دینی مباحث پر بے شمار کتابیں

اور رسالے تصنیف کئے، اسی ماحول میں میر ناصر علی کی تعلیم و تربیت ہوئی، علوم دینی اپنے والد ماجد سے اور عربی فارسی اس وقت کے مشاہیر علما سے پڑھی اور انگریزی تعلیم دہلی کالج میں حاصل کی، وہی مرحوم دہلی کالج جس نے بڑے بڑے علما اور فضلا پیدا کئے اور جو مرکز تھا اہل کمال کا، آپ کے چھوٹے بھائی میر نصرت علی بھی نامور ادیب اور مورخ تھے اور ناصر الاخبار، نصرت الاسلام رسالوں کے جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ایڈیٹر تھے اور نصرت المطابع (پریس)، کے مالک۔

میر ناصر علی کی زندگی کے حالات بیان کرنا اس وقت مقصود نہیں، اس لئے مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ میر صاحب نے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اپنی معاشی زندگی بڑی آسائش اور عزت و احترام سے بسر کی، چند ماہ صوبجات متحدہ کے محکمۂ تعلیم سے وابستہ رہنے کے بعد ۱۸۶۸ء سے ۱۹۰۵ء تک گورنمنٹ ہند کے محکمۂ نمک (آبکاری) سے ایک نہایت اونچے افسر کی حیثیت سے متوسل رہے۔ یہاں تک کہ خان بہادر کا خطاب بھی پایا، اور ۱۹۱۱ء میں شہنشاہ جارج پنجم کا دلی میں دربار منعقد ہوا تو آپ کو ان کی خدمت میں پیش کئے جانے کی عزت بھی حاصل ہوئی، گویا اس وقت سے درباری امرا کی صف میں شامل ہو گئے، سرکاری ملازمت سے پنشن پانے کے بعد آپ دلی میں مجسٹریٹ مقرر ہوئے اور اس کے بعد ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۳ء تک ریاست پاٹودی کے (چیف منسٹر) دیوان رہے۔ ۱۹۳۳ء مطابق ۱۳۵۲ھ میں وفات پائی اور کس قدر عجیب بات ہے کہ یہی سنہ "میر ناصر علی خاں" کے اعداد سے بھی نکلتا ہے۔ مولانا حامد حسن قادری مرحوم کا بیان تھا کہ کچھ دن زندگی کے انہوں نے لکھنؤ میں بھی گزارے لیکن کب۔ اس کا تعین انہوں نے نہیں کیا، خیر یہ تو وہ باتیں ہوئیں جن کا تعلق میر صاحب کی حیات مستعار سے تھا لیکن وہ حقیقی زندگی جو اپنے بعد ایک نقش دوام چھوڑ گئی ان کی ادبی اور صحافتی زندگی تھی۔

میر ناصر علی کو ابتدا ہی سے علم و ادب کا کتنا ذوق تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دوران ملازمت ہی آپ نے ۱۸۷۶ء میں آگرہ اخبار آگرہ کے مالک مولوی محمد یوسف صاحب کے اشتراک سے ایک جریدہ "تیرھویں صدی" کے نام سے جاری کیا جس کا اصل مقصود تو غالباً سرسید احمد خاں کے رسالہ تہذیب الاخلاق کے مذہبی خیالات اور نیچری خیالات کا جواب دینا تھا لیکن میر صاحب نے اردو ادب میں ایک نئی صنف سخن کی بنیاد ڈالی جسے انگریزی میں ESSAY WRITTING کہتے ہیں اور اب اردو میں وہ انشائیہ نگاری کہلاتی ہے،

تیرھویں صدی میں میر صاحب نے جس روش خاص سے اس دور میں خالص ادبی مذاق کی ترویج کی اور حکیمانہ اور شاعرانہ کوائف کے امتزاج سے نثر نگاری کا جو دلپذیر اسلوب وضع کیا فی الواقع وہ مہدی افادی مرحوم کے الفاظ میں "خاصے کی چیز" تھی جس پر اردو انشا پردازی ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔ اس کے بارے میں اپنی اس "کھلی چٹھی" میں جو میر ناصر علی سے زیادہ خود ان کی شہرت کا باعث ہوئی، مہدی آفادی نے یوں داد سخن دی۔

" تہذیب الاخلاق کے ساتھ ساتھ آپ نے جس ٹھاٹھ سے دھواں دھار حقائق لکھے اور سرسید کے لٹریچر پر جس سلیقے اور سخن گسترانہ شوخیوں سے آپ نے انتقادات کی ٹھرائی سچ یہ ہے کہ وہ اردو لٹریچر کی جان ہیں، آج سنجیدگی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ میں نہیں جانتا کہ نامور اہل قلم آپ کے گزشتہ کمالات کی داد دے سکیں گے ـــــ لیکن میں کھل کر کہتا ہوں کہ آپ نے اس وقت انشاپردازی کو چمکایا جب بہتوں نے قلم بھی ہاتھ میں نہ لئے تھے موجودہ نسل تمام تر " تہذیب الاخلاق" کے ادبی دور کی پیدا کردہ

ہے۔ جب آپ کے لٹریچر کا شباب تھا اور یہیں سے اپنا مرتبہ دیکھ لیجئے۔"

"تیرھویں صدی" پانچ سال تک جاری رہا۔ اس کے بند ہونے پر میر صاحب نے پھر دوسرا پرچہ " زمانہ " کے نام سے جاری کیا اور یہ بھی آگرہ اخبار آگرہ کے مطبع سے ـــــ یہ بھی کوئی چار پانچ سال تک چلتا رہا۔ پھر میر ناصر علی اپنے وطن چلے آئے اور یہاں سے اپنے برادر عزیز مولوی نصرت علی صاحب کے پریس نصرت المطابع سے پہلے" افسانۂ ایام" اور اس کے بعد" ناصری" پرچے جاری کئے، چند دن بعد میر ناصر علی کے ذہن اور صحافتی ذوق نے ایک اور کروٹ لی، خود اپنا پریس" مطبع ناصری" قائم کر کے" صلائے عام" جاری کیا جو ۱۹۰۸ء کی بات ہے، "صلائے عام" ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۲ء تک نکلتا رہا البتہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۳ء تک اس پرچے کی اشاعت ملتوی رہی، اغلباً اس کی وجہ یہ ہو کہ ریاست کے انتظام و انصرام نے میر صاحب کو مہلت نہ دی کہ پاٹودی سے صلائے عام کی اشاعت کی نگرانی کر سکیں جو بدستور مطبع ناصری دلی سے نکلتا تھا۔ پھر ۲۳ء سے جب آپ ریاست کی چیف منسٹری سے بھی سبکدوش ہو گئے تو صلائے عام کی اشاعت پھر جاری ہو گئی اور اپنے اس دوسرے دور میں یہ پرچہ ۱۹۲۳ء سے ۳۲ء تک برابر جاری رہا۔ ۱۹۳۲ء میں آپ کی صحت نے بالکل جواب دے دیا تو صلائے عام بھی بند ہو گیا، اور اسی کے دوسرے سال جون ۳۳ء میں آپ بھی رخصت ہو گئے۔ یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ میر ناصر علی نے جتنے رسائل جاری کئے ان سے کوئی کاروباری غرض وابستہ نہ تھی، تیرھویں صدی اور زمانہ تو آگرہ اخبار آگرہ سے نکلتے تھے، ان کے انتظامی امور سے میر ناصر علی قطعاً لاتعلق تھے، دیگر رسالے بھی محض ان کے شوق کا نتیجہ تھے۔ بالخصوص

ان کا آخری رسالہ صلائے عام تو خالصتاً زبان اردو کی خدمت کے لئے نکلتا تھا محدود تعداد میں بہ پاس خاطر احباب شائع کیا جاتا تھا اور فی الجملہ مفت ہی تقسیم ہو جاتا تھا

۱۸۷۶ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک پورے ۵۶ سال جو آجکل کی عمر طبعی سے بھی کچھ زیادہ مدت ہے، میر ناصر علی نے اردو ادب کی جتنی اہم خدمات انجام دی ہیں اور اپنے مخصوص فن انشائیہ نگاری کے جتنے بیش بہا اور لازوال نقوش چھوڑے ان سب کا تفصیلی محاکمہ بہت دشوار ہے، اس کے لئے ایک عمر کی فرصت چاہیے، تاہم اجمالی طور پر چند باتیں ان کی خصوصیات انشا کے بارے میں عرض کرتا ہوں۔

کہا جاتا ہے کہ انشائیہ نگاری کا آغاز بعض دوسرے ادیبوں نے بھی اختیار کیا تھا اور اس ضمن میں سرسید، آزاد۔ حالی اور شرر کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، میر ناصر علی ان کے ہم عصر بلکہ کسی حد تک پیش رو تھے اور ان سب کے رخصت ہونے کے بعد بھی عرصہ تک اپنے زریں قلم سے موتی بکھیرتے رہے حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کے خصوصی امتیازات کچھ اور تھے اور ان میں سے کوئی بھی صحیح معنوں میں انشائیہ نگار نہ تھا۔ اس فن لطیف کا تعلق صرف سلاست زبان سے نہیں بلکہ تخیل شاعرانہ اور شعور ناقدانہ سے بھی ہے اور حکیمانہ نکتہ رسی سے بھی۔ اس کے لئے نہ صرف اعلیٰ درجہ کی ژرف نگاہی درکار ہے جو صرف وسیع مطالعے اور دقیق مشاہدے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے، بلکہ فلسفیانہ انداز تفکر، جدت و اختراع، یعنی ORIGINAL THINKING بھی ضروری ہے، جو ایک فطین و ذہین دماغ، متوازن و سلیم طبیعت اور ایک کشادہ و پاکیزہ قلب ہی کو میسر آتی ہے، ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ سادہ زبان اور شگفتہ و دل نشین انداز بیان، ان ہی تمام خصائص کو میر ناصر علی خود ذو

سادہ سی ترکیبوں میں مرکوز و مجتمع کر کے " نازک خیالی " اور " پاکیزہ بیانی " کا نام دیتے تھے۔

اگلے وقتوں میں یہ طرز عاشقانہ کہلائی جاتی تھی ۔ کوئی اسّی برس ہوئے اس وقت کے بعض نامی پرچوں میں یہ بحث چلی تھی کہ اردو میں اس طرز کا موجد کون تھا، میر ناصر علی کی طرف سے رسالہ " دبدبۂ آصفی" میں ۱۲۹۲ھ میں اس سلسلے میں ایک مضمون شائع ہوا تھا، اس کا اقتباس یہاں بے محل نہ ہوگا ؎

" نہیں گمنام میں اہل سخن میں
مرا نالہ ہے نامی انجمن میں

رسالہ " دلگداز" کے کسی جھگڑے میں ایک دفعہ یہ بحث ہوئی کہ نثر میں عاشقانہ مضامین لکھنے کا موجد کون تھا۔؟۔ اس بحث کی وجہ یہ ہوئی کہ صاحب " دل گداز" کی طرف سے اس رنگ کے موجد ہونے کا دعویٰ ہوا تھا جس پر رسالہ " ناول" لکھنؤ نے ۱۸۹۳ء میں ایک مضمون لکھا جو اس وقت تو میری نظر سے نہیں گزرا لیکن اتفاق سے اس وقت کا ایک رسالہ مضامین ان دنوں میرے پاس آگیا جس میں کسی نے لکھا ہے :۔

" ہمیں خوب یاد ہے کہ اس رنگ کے مضامین سب سے پہلے ہم نے " تیرھویں صدی" کے صفحوں پر تخمیناً ۲۰-۲۵ برس اُدھر دیکھے تھے، جو اس زمانے کے لائق نوجوان ناصر علی صاحب دہلوی کے زور قلم کا نتیجہ تھے جنھیں دیکھ کر ہمارے معزز دوست حضرت ریاض خیرآبادی نے جو ایک چلبلی طبیعت کے آدمی ہیں، اس رنگ کو اڑایا اور اس کے برتنے میں اپنی فطری شوخیوں کے سبب خوب سے خوب

ہی پھلے پھولے "

اس کے بعد اور ایسی ہی پتے دار باتیں بیان کر کے لکھا کہ :

" ان کے (صاحب دلگداز) اس رنگ کے موجد ہونے کا دعوی اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک کہ مذکورہ بالا واقعات کو غلط نہ ثابت کر دیں (منقولہ از دلپذیر سیریز نمبر ۶ مطبوعہ مارچ ۱۸۹۴ء صفحہ ۳۵)

میں وہی ناصر علی ہوں جس نے رسالہ "تیرھویں صدی" نکالا تھا مگر جوان نہیں رہا، اس وقت کا کوئی آدمی جوان رہا ہو تو میرا قصور ــــ جوانی کے ساتھ وہ طبیعت بھی نہ رہی جس کی وجہ سے لکھنے پڑھنے کا شغل تھا لکھنے کی تو میں نے مدت سے قسم کھا رکھی ہے مگر پڑھنے کی عادت نہیں گئی ۔ میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوں کہ جس غرض سے میں نے اردو میں لکھنا شروع کیا تھا، وہ غرض میری آرزو سے زیادہ پوری ہو گئی ، اب مجھ سے بہت زیادہ اچھے لکھنے والے نظر آتے ہیں جن کی نظم و نثر سے اردو میں جان پڑ گئی ؎

در مستاں زدم تا حال ہشیاراں شود پیدا
نہفتم قدر خود تا قیمت یاراں شود پیدا

(از دبدبۂ آصفی جمادی الثانی ۱۲۹۲ھ)

اسی انداز خاص میں "تیرھویں صدی" اور "صلائے عام" کا تقابل کرتے ہوئے ایک بار میر ناصر علی نے جو لطیف تبصرہ فرمایا وہ بھی سننے کے لائق ہے :

" جنھیں کوئی اعتراض نہیں ملتا وہ یہ کہتے ہیں کہ صلائے عام میں "تیرھویں صدی" کی سی شوخ بیانی نہیں، سچ پوچھیے "تو تیرھویں صدی" کو میں خود بھول چلا تھا ۔ سمجھے ہوئے تھا کہ ایک خیالی بات کا

قصہ چار پانچ برس تک چلا، بہت چلا، اگر کوئی خوبی اس میں تھی تو وہ اس کے ساتھ ختم ہو لی۔" صلائے عام" کے سامنے" تیرھویں صدی" طبیعت کی محض امنگ کا نتیجہ تھا، اب پختہ مغزانِ معانی سے سابقہ ہے۔ آگے میں دوسروں کا حال اپنی زبان میں ادا کرتا تھا، جس طرح ڈرامے میں ایکٹر دوسروں کے رنج و سرور کی نقل کرتے ہیں جنگل دیکھا نہیں اور قیس کا پارٹ لے رہے ہیں، پہاڑ دیکھا نہیں اور فرہاد بنے بیٹھے ہیں۔ اب میں اپنا حال اپنی زبان سے ادا کر رہا ہوں جس میں تصنع کا نام نہیں ـــــ جو مجھ پہ گزرتی ہے، میں جانتا ہوں کہ وہی اوروں پہ گزرتی ہوگی ـ آگے جو جی میں آتا تھا کہہ ڈالتا تھا، اور کوئی ناپسند نہیں کرتا تھا، اور اب بہت سوچ کر لکھتا ہوں اور شکایت ہوتی ہے۔ آگے جو نہیں سمجھتے تھے وہ بھی خوش ہوتے تھے اب جو سمجھتے ہیں وہ بھی داد میں کمی کرتے ہیں، آگے شوخ بیانی پر چپ ہو جاتے تھے، اب متانت میں بھی عیب نکالتے ہیں، آگے جن باتوں کو میں بے سمجھے لکھ دیتا تھا، لوگ سمجھ جاتے تھے، اب سمجھا کر لکھتا ہوں اور سمجھنے والوں کے لالے ہیں ـ آگے واہ واہ تھی ـــ اب آہ آہ ہے۔"

انشائیہ نگاری درحِصل ایک صنف ہے مغربی ادب کی، اور انگریزی ادب کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا آغاز ان کے ہاں بہت پہلے چارلس لیمب ہی کے زمانے سے ہو گیا تھا جس کو ولیم ہیزلٹ، چسٹرٹن وغیرہ نے زیادہ شاعرانہ اور حکیمانہ لب و لہجہ عطا کیا، پھر ادیبوں کی ایک خاص جماعت نے اس کا تتبع

شروع کر دیا، اور ہر ادیب نے ایک مخصوص موضوع کو سامنے رکھ کر اس پر ESSAY لکھنا شروع کیا، کسی نے مذہب کو لیا، کسی نے شاعری کو لیا، کسی نے تاریخ لی، کسی کو فلسفہ پسند آیا اور کسی کو محض مطالعۂ فطرت۔

یہ صنف دراصل تنقید ہی کی ایک صورت ہے لیکن نہایت لطیف و خوشگوار اس کا انداز بالکل ویسا ہی ہوتا ہے جیسے ہم بے تکلف بزم احباب میں باہم تبادلۂ خیالات کریں اور لطف و تفریح کا عنصر ہاتھ سے نہ جانے دیں، ظاہر ہے کہ اس نوع کی صحبتوں میں جو گفتگو کی جاتی ہے وہ کسی علمی تقریر کی حیثیت نہیں رکھتی اور محض خشک و دقیق مسائل ہی سے کام لیا جاتا ہے لیکن ہوتی ہے وہ بہر حال تنقید ہی اس لئے کسی مقصود سے خالی نہیں ہوتی اور اس کے اظہار کے لئے جو زبان استعمال کی جاتی ہے وہ بڑی شیریں، بے ساختہ اور بے تکلف ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ظرافت اور مزاح سے بھی خالی نہیں ہوتی، چناں چہ آپ دیکھیں گے کہ ایک اچھا انشائیہ نگار دراصل ماہر نفسیات بھی ہوتا ہے اور حقائق کا بیان وہ شاعرانہ فکر و تخیل اور ادیبانہ لب و لہجہ میں کرتا ہے اس لئے سننے والا اس سے جلد متاثر ہو جاتا ہے اور اس کی علمی مسائل سے متعلق اکثر الجھنیں بھی دور ہو جاتی ہیں۔

ان خصوصیات کے پیش نظر جب آپ اردو انشا پردازی کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہو گا کہ ان باتوں کا نباہنے والا سوا میر ناصر علی کے دوسرا پیدا نہیں ہوا، ہر چند ان کے بعد بھی بعض حضرات نے اس کی تقلید کرنا چاہی، لیکن خاطر خواہ کامیابی انہیں حاصل نہیں ہو سکی اور اس رنگ کو فن کی حیثیت سے اختیار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے، اس لحاظ سے ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انہی پر یہ رنگ ختم بھی ہو گیا۔

میر ناصر علی کا سہل ممتنع اور بے ساختہ انداز تحریر، رنگیں بیانی

کے ساتھ فلسفیانہ نکتہ رسی، پاکیزگیِ خیال کے ساتھ شستگیِ بیان، وارفتہ نگاری اور شوخ بیانی، لطیف جملوں میں مابعد الطبیعات کے خشک و بے آب نظریوں کو ہمارے لئے نہ صرف گوارا بلکہ دلنشیں بنا دینا اور ان سب پر مستزاد ان کا اعلےٰ ذوقِ شعری، یہ ان کے اسلوب نگارش کی وہ خصوصیاتِ خاصہ ہیں جو انہیں متقدمین اور متاخرین میں جن کے درمیان وہ "عقدۃ الوسطیٰ" کی حیثیت رکھتے تھے علانیہ ممتاز کرتی ہیں۔ شاعرانہ نثر نگاری کا ایسا انوکھا رنگ ان کی زندگی میں بھی کسی دوسرے کو حاصل نہ ہو سکا، اور اب تو بھلا کیا ہو گا۔

صلائے عام وقف تھا اردو نثر کی ترقی، خالص ادبیت، صحیح مذاقِ سخن اور حکیمانہ طرزِ تفکر کی ترویج کے لئے — نہ کسی وقتی تحریک کی حمایت تھی، نہ کسی خاص مکتبِ خیال کی تائید۔ صلائے عام کے سارے فائل دیکھ جایئے، نہ کہیں کوئی جوش و خروش ہے، نہ کسی قسم کی بحث و تکرار، نہ شکوہ ہے نہ شکایت، نہ غصہ ہے نہ نفرت، البتہ — محبت ہے — اور کیسی والہانہ محبت! اپنی اردو زبان سے، اور ہر پاکیزہ شاعرانہ خیال سے، چاہے وہ کسی خیال اور کسی ملک کا ہو — لگن اور تڑپ ہے تو بس یہی کہ کسی طرح اردو نثر، جس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا، ترقی پا کر اس لائق ہو جائے کہ ہر قسم کے تحقیقی مضامین اور فلسفیانہ افکار اس میں ادا ہو سکیں اور اس خوبی کے ساتھ اس میں سما جائیں کہ اسی کے بن جائیں۔ اس کے لئے قید یہ لگا دی کہ زبان اور طرزِ ادا اساتذہ کی سی ہے کہ یہی زبان کی عمدگی اور فصاحت کا معیار رہے۔

ذرا دیکھئے، میر ناصر علی اپنی زبان اور اپنے بیان (اسٹائل) کے بارے میں کیسی کیسی گل افشانیاں کرتے ہیں:۔

۱۔ "۔۔۔۔۔۔۔ میرے احباب میں سے بعض کی یہ رائے ہے کہ پرانے ڈھنگ اب پسند نہیں، آجکل کے ڈھنگ پر لکھنا چاہیئے۔ ان سے کون کہے کہ آجکل کی طرز تو انگریزی زبان کا محض ترجمہ ہے، جس سے اچھی انگریزی بری اردو بن جاتی ہے، علاوہ ازیں انسان جب کسی اچھی چیز کے اچھے نمونے جمع کرے تو جہاں تک ممکن ہو مستند تلاش کرے۔ اگر زبان کے نمونے ہوں تو ٹکسالی جس سے میری مراد کلاسیکی یعنی اساتذہ کی زبان ہے۔ مجھے اس بات کا فکر رہتا ہے کہ خیال نیا ہو اور لباس اپنا۔ جس کے لئے میں نے ملی جلی انشا پسند کی اور اتفاق سے ایک خاص طرز نکل آئی ؎

آں زرے از کانِ کہن ریختہ
ویں دُرے از بحر نو انگیختہ

اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ زبان اساتذہ جو مٹی جاتی تھی پھر نگاہ میں پھر گئی ؎

تا زِ تو آراستہ گردد سخن
معنیٔ نو باید و لفظِ کہن

۲۔ ۔۔۔۔۔۔۔ انگریزی خوانوں کو شکایت ہے کہ میری زبان پرانی ہے، یعنی میں جس زبان میں لکھتا ہوں اس کے سمجھنے والے نہیں رہے، سمجھنے والوں کا میں ذمہ نہیں لیتا، مگر لکھنا میرا کام ہے کہ آج کل کے خیال اساتذہ کی زبان میں ادا کر دوں کہ ع

خیال نو کو ہوئی احتیاج مشق کہن

نثر میں اس طرز کا لکھنے والا اگلوں میں اس لئے نہیں کہ ان کو آجکل کا زمانہ نصیب نہیں ہوا، اور آجکل کے لکھنے والے زبانِ اساتذہ پر قادر نہیں رہے، یہ بات نئی پیدا ہوگئی کہ جو سامان اگلوں کو میسر نہ ہوا اور جس میں آجکل کے لکھنے والے عاری ہیں، دونوں کی خوبیاں یہاں دیکھ لیجئے ؎

قائل نہیں ہیں دیدۂ پرنم کے سامنے
طوفان نوح اگلے زمانے کی بات ہے

اگلی اور پچھلی، پرانی اور نئی لٹریچر، اپنی اور بیگانی زبانوں کی خوبیاں میں اس لئے اکٹھا کر کے دکھا رہا ہوں جس سے معلوم ہو کہ ہماری زبان کسی سے گری ہوئی نہیں ؎

ناقہ پر اس کی جا دل لیلےٰ ہیں اس کا گھر
کچھ قیس سے زیادہ نہیں سار بان بلند

اگر اور اہل کمال اس طرف متوجہ ہو جائیں تو اردو بہت جلد اچھی زبانوں میں ہو جائے ؎

ہو جائے گی میری شبِ فرقت کے برابر
ہے کاکل پیچاں کی درازی اگر ایسی

۳۔ .... صلائے عام کی زبان آپ پرانی بتلاتے ہیں۔ بتایئے ــــ مگر ہماری یادگار یہی رہے گی ـــ یادگار جس قدر پرانی ہو جائے اچھی ہے ؎

یہ طعنہ ہے کہ اب اس سے چلا نہیں جاتا
قدم جو تیری محبت میں استوار ہوا

یہ پرانی زبان آپ نہ مٹائیں۔ اس کے مٹ جانے سے ہم مٹ جائینگے

مجھے اٹھاتے ہو کہہ کر کہ ہے یہ خلوت خاص
وہ لوگ کون چلے آتے ہیں ادھر دیکھو

ہم نکلے تو خدا جانے کون کون اس گھر میں آجائے گا کہ گھر کا پہچاننا مشکل ہوجائے گا۔ ہماری زبان واجب القتل نہیں، گو ہم نے اسے زلیست سے بیزار کر رکھا ہے۔ صلائے عام چاہتا ہے کہ تڑپتے تڑپتے بھی وہی آواز، گلوئے مرغ بسمل سے نکل جائے، ہماری زبان بہت محتاج اور لاچار ہی، مگر کبھی بے چارگی بھی ناموری کا سبب ہوجاتی ہے، فرہاد کی جاں کنی خسرو و شیریں کی بھی شہرت کا باعث ہوگئی۔ بونے پارٹ کا وہ حصہ لوگ بھول گئے جو آسٹرلٹیز کی فتح سے متعلق تھا، واٹرلو میں شکست کا حال اب تک تازہ ہے، اسلام کی تاریخ میں فتوح الشام کا وہ اثر نہیں مگر معرکۂ کربلا سے تمام دنیا کے دل ہل جاتے ہیں، اپنی زبان کی حمایت میں صلائے عام کو ہر زبان سے بازی لینی ہے، یہ کیا کم نمود کی بات ہے ؎

پرویز سے رقیب پہ کس کو نہ ناز ہو
مرتا ہوں کوہ کن پہ کہ عاشق کہاں ہوا

اردو زبان ہمارے اقبال کی یادگار ہے جس پر ہمارے ولولوں کا مدار ہے سلطنتیں، قومیں اور زبانیں اور بھی ہوئیں اور رہیں لیکن مسلمانوں کی سلطنت و قوم و زبان کو از روئے ترقی کسی سے کم سمجھنے کو جی نہیں چاہتا ؎

دوش خوش شکوہ رانی کردم　　خویش را ترجمانی کردم

" ..... میں نے تازہ اور نئے خیال اساتذہ کی زبان میں ادا کرنے کی طرز پیدا کی اور نظم کی خوبیاں جو ہماری زبان پر ختم تھیں، نثر میں دکھانے کی کوشش کی۔ اس تدبیر سے نثر عامیانہ وضع سے بچ گئی اور شاعری کی نازک خیالیاں پیدا ہو گئیں، میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ انداز بیان کمال کو پہنچ گیا ہے، یا اس میں اصلاح کی گنجائش نہیں، مگر یہ کہنا ضرور ہے کہ صلائے عام نے بہت سے میرے ہم زبان اور ہم خیال پیدا کر دیئے، اب آپ صلائے عام میں اچھے سے اچھے مضامین دیکھ لیجئے۔ صلائے عام کی آواز تو آپ اچھی طرح پہچانتے ہیں، اس کا ساتھ دینے والے جو کچھ کہا چاہتے ہیں، وہ کان لگا کر سننے کے لائق ہے ؎

میں تو آنکھوں سے بجا لاتا ہوں ارشاد حضور
آپ سنتے نہیں کانوں سے بھی کہنا میرا "

یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ صلائے عام میر صاحب کی ذاتی دلچسپی اور شوق کا نتیجہ تھا، اس سے کوئی کاروباری غرض وابستہ نہ تھی، نہ کسی قسم کی جلب منفعت یا شہرت مقصود تھی۔ میر صاحب دلی کے بڑے روسا میں تھے اور معاش کی فکر سے بے نیاز، اپنی خدمات کی وجہ سے درباری امرا میں ان کا شمار تھا اس لئے مزید وجاہت و شہرت ان کو درکار نہ تھی۔ یہ رسالہ خالصتہً اردو ادب کی خدمت کے لئے جاری کیا گیا تھا۔ بعض معترضین سے ناراض ہو کر ایک بار میر صاحب نے اس انداز میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

—" اس رسالے کے نکالنے والے کی نسبت بعض کا گمان ہے کہ شاید کوئی نیا اخبار نویس ہے جس کو معاش کی ضرورت ہے یا جس کو زباں داں یا اہل زبان سمجھے جانے کا خبط ہے۔ اردو ابھی اس مرتبے کی زبانوں کو نہیں پہنچی جس میں کمال پیدا کرنا ناز کا باعث ہوسکے، خاص کر مجھ جیسے آدمی کے لئے جس کے خاندان میں اردو میں معمولی خط لکھنا بھی عار سمجھا جاتا تھا، جس کا تکیۂ کلام تمام عمر عربی فارسی رہا — لیکن جب دیکھا کہ اہل کمال میں سے وہ لوگ جنھیں زبان دانی کے بڑے دعوے ہیں اس کی نثر کی طرف توجہ نہیں دیتے تو ناچار باوجود ہیچمدانی مجھے قلم ہاتھ میں لینا پڑا — یہ بھی نصف صدی پہلے کی طبیعت کی اُمنگ تھی کہ مجھے اس زبان کی خدمت کا شوق لاحق ہوا، جو اب گلے کا ہار ہو رہا ہے ؎

یہ طوق اس واسطے چھوٹا بڑا قمری کی گردن میں
کہ تھا بلبل کی قسمت کا بڑا قمری کی گردن میں

"........ روزگار کی ضرورت سے میں نے انگریزی پڑھی، میں نے دیکھا کہ اس زبان کی نثر نگاری اس بلا کی ہے کہ شاید ہی کسی زبان کی ہو۔ جس طرح عربی فارسی اور خیر میں اردو شاعری کمال کو پہنچ گئی، انگریزی نثر لاجواب ہے، مجھے خیال ہوا کہ جس طرح اردو میں شاعری کو عروج ہوا، اسی طرح نثر کی طرف بھی اہل کمال کو توجہ دلائی جائے تو ملک و قوم کی ترقی کا سبب ہوسکتا ہے۔ اسی خبط میں عمر رائیگاں کردی ؎

خضر کو دے کے یارب عمر کیوں رائیگاں تو نے
کسی عاشق کو دی ہوتی یہ عمر جاوداں تو نے

"...... دنیا میں اگر کوئی کام بغیر کسی ذاتی غرض کے ممکن ہے تو یہ اردو کے ساتھ میری محبت اور محنت ہے جسے آپ صلائے عام میں دیکھ رہے ہیں، جو لوگ مجھے جانتے ہیں اور جو مجھے نہیں جانتے لیکن اخبار نویسی سے واقف ہیں ان کے قیاس میں یہ بات کبھی نہیں آئیگی کہ صلائے عام سے کسی قسم کے ذاتی فائدے کی صورت ممکن ہے، اپنی معاش کی طرف سے مجھے اطمینان ہے .... حسن اتفاق سے صلائے عام کا خرچ بھی اس کی آمدنی پر منحصر نہیں... ہندوستان میں لکھنے پڑھنے کا مدار آمدنی پر مشکل ہے .... جو لوگ ادبی رسالے نکال رہے ہیں، آپ بالکل یقین کرلیں کہ اپنے ملک اور زبان پر احسان کر رہے ہیں۔"

"...... یہ رسالہ اردو نثر کی ترقی کے لئے جاری کیا گیا ہے مگر نثر سے میری غرض محض عوام کی زبان نہیں — زبانِ عوام کی ترقی تو جب تک جس زبان کے بولنے والے عوام زیادہ ہیں خود بخود ہوتی رہے گی، ہاں مگر خاص کی زبان تکلف اور امتیاز کے بغیر ذرا مشکل ہے، خاص کی زبان عوام سے ہمیشہ علیحدہ ہوتی ہے جس کے لئے TASTE یعنی مذاق صحیح کی ضرورت ہے۔
اہل ہند اپنے ملک سے باہر نکلنے کے ہمیشہ دشمن رہے، اس

کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان جیسا دوسرا ملک نہیں ، باہر کی قومیں
خود یہاں آتی رہیں ..... تعجب ہے کہ ایسے اچھے ملک کی زبان
ایسی ذلیل ہو جیسی کہ اردو ہے کہ تمام دنیا کی زبانیں اس سے بازی
لے گئیں - جی چاہتا ہے کہ اردو عالمانہ زبانوں کے مرتبے کو پہنچ جائے
فلاطون و ارسطو کے خیال اس زبان میں ادا ہو سکیں - ابن رشد
اور فارابی کی تحقیق ہماری زبان میں بیان کی جائے ۔"

اردو زبان کی خوبیاں بیان کرنا ، اس کا صحیح ذوق پیدا کرنا اور نثر کی ترقی کے لئے ہر قسم کے فلسفیانہ و محققانہ مضامین کی ضرورت پر شد و مد سے زور دینا میر ناصر علی کے محبوب ترین عنوانات تھے جن پر انھوں نے برسہا برس تک خامہ فرسائی کی ہے اور خود ہزاروں کی تعداد میں علمی اور حکیمانہ ، ادبی اور ناقدانہ ، تمثیلی (الیگریکل) اور شاعرانہ مضامین لکھے اور اس احتیاط سے کہ خیال و فکر میں جدت و ندرت کے ساتھ زبان اور طرز بیان اساتذہ کی یعنی کلاسیکی رہے ، یہ معمولی کارنامہ نہیں - یہ معجزات میر ناصر علی ہی نے تخلیق کئے اور انہی کے ساتھ ختم ہو گئے - لاتعداد ایسے وقیع اور ارفع خیالات جن سے اردو ادب پہلے آشنا نہ تھا ، پاکیزہ و دلکش تعبیرات و تشبیہات ، گنے چنے الفاظ ، چھوٹے چھوٹے سادہ مگر رنگین جملے سلیس و شگفتہ عبارت ، پاکیزہ و شستہ لب و لہجہ ، متانت کے ساتھ کہیں کہیں ہلکی سی شوخی ، فلسفیانہ موشگافیوں کے درمیان کبھی کبھی زیر لب تبسم ، اور جا بجا دل میں کھب جانے والے فارسی اور اردو کے برجستہ اشعار ، ـــــ یہ کیفیت ، یہ اثر آفرینی ، یہ لذت ، یہ شیرینی ، یہ کشش یہ معجزہ سامانی کسی اور کی تحریر میں دیکھنے میں نہیں آئی ، نہ ان سے

پہلے، نہ ان کے بعد ـــــ سچ کہا تھا ان کے عظیم فدائی ریاض خیرآبادی نے کہ:

"قلم سے لکھنے والے تو بہت ہیں لیکن دل سے لکھنے والا ایک ناصر علی ہی تھا"

دل سے لکھنے سے کیا مراد ہے، اس راز کو وہی اہل قلم جان سکتے ہیں جو اہل دل بھی ہیں۔ ان کے کمالات کی اتنی جامع اور بلیغ تحسین کسی اور طرز پر ممکن نہیں۔ خود میر ناصر علی نے اس "دل والی بات" کی طرف اپنے مخصوص انداز میں اشارہ کیا ہے۔

" ہر زبان کی لٹریچر میں ادائے بیان کے سینکڑوں طرز ہوتے ہیں اور ہر طرز اپنی اپنی جگہ اچھی لگتی ہے، سرو قبرستان میں، شمشاد لب جو، اور ساگون جنگل میں۔ ساری لٹریچر ایک ہی طرز کی ہو تو زبان کا عیب ہے، اور لوگ اور طرز پر لکھتے ہیں اور بہت اچھا لکھتے ہیں۔ میں نے جو طرز اختیار کی ہے، اس میں زبان کے ساتھ دل کو جس قدر سامنے آسکے لاتا ہوں، ــ اور اگرچہ اردو میں لکھنے والے بہت ہیں مگر اس طرز کے لکھنے والے ہر گلی کوچے میں نہیں ملتے، یہ طرز پرانی نہیں، اگر پرانی ہوتی تو شاید آپ خفا نہ ہوتے اس طرز کے لکھنے والے اور زندہ ہوتے تو مجھے اپنے بچاؤ کے لئے سہارا ہوتا کہ انہیں کی آڑ پکڑتا ؎

میں کیا کہوں قلق کی زباں کو کہ سحر ہے

جیتا ہے بارے شکر وہ جادو بیاں ہنوز

یہ طرز گو تعلّی کی سہی کہ لن ترانی میں داخل ہے۔ مگر لن ترانی طوطا مینا کی کہانی سے اچھی ــ اس سے مجھے اپنی شہرت مقصود نہیں جتنا یہ ثابت

کرنا منظور ہے کہ آپ کی زبان میں کتنی گنجائش ہے، اگر تعلی ہے بھی تو آپ ہی کی زبان کی خوبی ہے ؎

اللہ میری لاغری کو ٹوکنے لگے
اپنی کمر تو دیکھیں ذرا سر جھکا کے آپ

ریاضؔ خیر آبادی سے عظیم سخنداں نے میر ناصر علی کی وفات پر جو چند جملے اپنے خاص رنگ میں لکھے تھے جو رسالہ "ساقی" نے "ناصر نمبر" کے یادگار شمارے ستمبر ۱۹۳۳ء میں شائع کئے تھے اسے بے اختیار نقل کرنے کو جی چاہتا ہے کہ ریاضؔ کی یہ غالباً آخری تحریر تھی اور بجائے خود ایک غیر فانی یادگار ہے:۔

" خان بہادر میر ناصر علی کی طبیعت مرتے دم تک اسی طرح جوان رہی جس طرح آغاز شباب میں تھی، ہر کلیے کے لئے استثنا ہے مگر موت کے لئے نہیں ——— ان کی موت حیات تازہ ہے جس طرف جایئے، جس سے سنیئے، انہیں کا ذکر، جب تک اردو لٹریچر کو بقا ہے، ان کے نام کو بھی۔ جس کا نام کبھی نہ مٹے وہ زندۂ جاوید ہے، غالبؔ سے زیادہ انشا پردازی میں انہوں نے نام پایا، غالبؔ اپنی طرز کے موجد تھے، یہ اپنی طرز کے۔ سر سید مرحوم نے انھیں ہمیشہ " ناصح مشفق " لکھا۔ ان کے متبعین و حوارین اور معاصرین اور تہذیب الاخلاق کے سب ہی لکھنے والوں نے ان کا لوہا مانا۔

ساٹھ پینسٹھ برس میں انشا کے مختلف دور گزرے، ان سے کسی نے مخالفت نہ کی، انتہا یہ کہ شعرا نے بھی ان کو مانا۔ مثال میں ان کا مثل نہ تھا، اس کے وہ بادشاہ تھے۔ نہ کسی نظم میں ان کا جواب

نکلے گا، نہ نثر میں، اس کے بعد ان کی نازک خیالی وشوخ نگاری، اسلوب بیان، شستگیٔ زبان گو خاص خاص کے حصّے میں آئی مگر ان سے کم۔ ان کے معاصرین میں اچھے اچھے انشا پرداز ان کی تقلید سے عاجز تھے۔ مہدی حسن افادی جو ان کے نام اپنے مکتوب سے زندہ بن چکے ہیں ان کے نقطے نقطے کو ہمیشہ اپنے لئے مشعلِ راہ سمجھے رہے۔ انہوں نے تقلیداً گو بہت امتیاز پیدا کیا اور ایک خاص طور پر وہ اپنے طرز کے موجد بھی تسلیم کئے گئے مگر بلندیٔ خیال کے ساتھ خان بہادر کے لئے زبان کی پاکیزگی اور بیان کی شستگی و بے ساختگی اول سے آخر تک ان تمام خصوصیات کی مالک رہی جو ان کی طبعی ذہانت اور ان کی بلند نظری نے قدرت سے حاصل کی تھی، مولوی سبحان اللہ، رئیس گورکھپور، جن کی ذہانت و علمی قابلیت اچھے اچھوں کو نظر انداز کر دیتی تھی خان بہادر کے والہ وشیدا تھے۔ مجھے تو اس کا رونا ہے کہ کوئی میرا مرتبہ داں اور قدر شناس اس پائے کا باقی نہ رہا — مجھ سے محبت کرنے والوں میں ان کے والد ماجد مولوی سید ابو المنصور صاحب امام فن مناظرہ بھی تھے۔ میں پہلے دربار قیصری میں مرحوم کا مہمان رہا، مگر وہ عالمانہ شان تہذیب اور تھی اور خان بہادر ناصر علی کی ادائے وحشت زا اور چیز تھی۔ مذاق صحیح اور ذوق سلیم خان بہادر کا حصہ تھا، ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

میں اس موقع پر وہ چند شعر لکھنا چاہتا ہوں جو میں نے دہلی میں کہے

تھے۔ میرے لئے یہی بہتر ہے ؎

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مرا
بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل بود بس است

میرے اشعار سے معلوم ہو سکے گا، ناصر علی کیا تھے اور ان کا صلائے عام کیا تھا ؎

صلائے عام سے وسعت بڑھی تو بات کہی گئی — صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے
یہ کس کے نام نے لی زباں میں چٹکی — کہ بے قرار ہوئیں شوخیاں بیاں کے لیے
ابھی تو بات بھی کوئی نہ آئی تھی لب تک — اثر نے دوڑ کے بوسے زباں کے لیے
ہوئی تھی کاہے کو تاثیر اس طرح بے چین — کسی کی نیم شبی نالہ و فغاں کے لیے
زبان خشک کو دعویٰ ہے گلفشانی کا — زباں کے کانٹے بنیں پھول اب زباں کے لیے

شکست آبلۂ پا کی بے سکت آواز — فغاں بنے گی جرس ہائے کارواں کے لیے
یہ باغ وہ ہے کہ سینچا ہے خون دل سے اسے — بہار بھی ہوئی ایسے بوستاں کے لیے
یہی ہوا جو رہے گی زمین گلشن کی، — نئے شگوفے کھلیں گے اب آسماں کے لیے
ستارے چلنے ہیں اب ور رنگ بدلیں گے — بنیں گے پھول وہ داماں کہکشاں کے لیے
اڑیں گے اور بھی اب اونچے نغمہ خوان بلبل — بلند جائیں گے طوبیٰ سے آشیاں کے لیے

عجب ادائے بیاں ہے عجیب طرز بیاں — کہاں یہ حسن بیاں غیر کی زباں کے لیے
شعاع مہر نمایاں خطوط مسطر سے — ضیا فزا ہے ہر اک سطر کہکشاں کے لیے
ہر ایک دل کا سویدا ہے نقطۂ روشن — یہ نور آنکھ کی پتلی کا ہے جہاں کے لیے
حروف کی نگہہ نکتہ رس بلائیں لے — نظر فریب ہے ہر نکتہ نکتہ داں کے لیے

رہے گی جان پڑی اس میں ہر سخنور کی | ہر ایک دائرہ ہے دام مرغ جاں کے لیے
ہر ایک صفحہ ہے تختہ زمین دہلی کا | ہوئی زمین سبب فخر آسماں کے لیے
اٹھا کے دست نظر سے سب آنکھ میں رکھ لیں | عجیب چیز ہے یہ اپنے قدرداں کے لیے
خدا کرے یونہی پھولے پھلے یہ باغ سخن | خزاں نہ اس کے لیے ہو نہ یہ خزاں کے لیے

ریاض کوئی غزل اور اس زمیں میں کہو
مگر جو خاص ہو یاران نکتہ داں کے لیے

(ان کے طویل دو غزلے سے صرف چند شعر پیش کئے گئے)

میر ناصر علی سے میرا تعارف (مرئی نہیں بلکہ قرطاسی) اب سے پچپن سال پہلے ۱۹۱۰ء میں ہوا تھا۔ صلائے عام کا شباب تھا اور میرا بھی، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ میں اس کا پرستار تھا اور وہ میرا معبود خیال، یہاں تک کہ اس کا انتظار بھی ایک مستقل لذت پیدا کرتا تھا، چہ جائیکہ اس کا مل جانا کہ پھر تو فرط شوق میں وہی "ہاتھ لگائے نہ بنے" کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ میں ان دنوں مسوری میں تھا یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جنگ بلقان نے مسلمانوں کے دل ہلا رکھے تھے۔ میرے مضامین نثر و نظم مولانا آزاد کے الہلال اور مولانا ظفر علی خاں کے زمیندار میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے تھے لیکن ان کا تعلق زیادہ تر سیاست سے تھا ، ادبی مضامین بھی گاہ گاہ مختلف رسائل میں نکلتے رہتے تھے جو ہفوات اور مزخرفات سے زیادہ کچھ نہ تھے۔

جب پہلے پہل صلائے عام میری نظر سے گزرا تو میں چونک پڑا اور غالب کی وہی — "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"۔ والی بات سامنے آگئی — اس سے قبل شرر و سرشار۔ سرسید و آزاد، حالی و شبلی سب ہی کا مطالعہ

کر چکا تھا اور کسی نہ کسی حد تک ان سب سے متاثر بھی تھا لیکن جب میر ناصر علی کا صلائے عام دیکھا تو بے اختیار بیدل کا یہ مصرع زبان پر آگیا۔ ع

توبہار عالم دیگری زکجا بہ این چمن آمدی

اور جب ان کی نازک خیالیاں اور پاکیزہ بیانیاں دیکھیں تو معلوم ہوا کہ "جا ایں جاست" اور میں ان میں کھو گیا۔ شعر منثور یا نثری شعر کا یہ رنگ ترکی زبان کی انشا میں تو بے شک میری نظر سے گزرا تھا لیکن مجھے اس وقت معلوم نہ تھا کہ اردو میں میر ناصر علی اسے اوج کمال تک پہنچا چکے ہیں۔

اس طرز انشا کو دیکھ کر شوق نے گدگدایا، امنگ نے اکسایا، ہمت تو نہ تھی اور معاملہ بھی ایاز قدر خود بشناس والا تھا، تاہم میں نے سوچا کہ قسمت آزمائی میں کیا ہرج ہے، ایک مختصر سا مضمون اسی انداز میں لکھ کر میر صاحب کی خدمت میں ڈرتے ڈرتے بھیج دیا، میں جانتا ہوں کہ وہ ہرگز اس قابل نہ تھا کہ صلائے عام جیسے بلند و پاکیزہ ادبی رسالے میں شائع ہو سکتا لیکن میر صاحب نے نہ صرف ازراہِ ہمت افزائی اسے شائع کر دیا بلکہ اپنے خط میں اس کی داد بھی دی۔ کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا۔ اس کے بعد باندازۂ کرم میں گستاخ ہوتا گیا اور وہ ہمیشہ میری گستاخیوں کو سراہتے رہے۔

جب ۱۹۱۴ء میں میرا دلی جانا ہوا تو میں والہانہ جذب و شوق کے ساتھ سیدھا در دولت پر حاضر ہوا، ان کے خلوت کدۂ علم و ادب میں باریابی نصیب ہوئی اور ان کے اس عظیم کتب خانے کو بھی دیکھنے کا موقع ملا جو فی الواقع نوادرات اور عجائبات کا فقید المثال مجموعہ تھا، انگریزی، فرنچ وغیرہ کی قریب قریب تمام کلاسیکی کتابوں کے عمدہ و نفیس لائبریری ایڈیشن کے علاوہ نادر و بیش بہا قلمی کتابیں عربی و فارسی کی ہزاروں کی تعداد میں، اور ان گنت محلّٰی و مطلّا قلمی نسخے گلستاں،

بوستاں کے، — حافظ، فردوسی، رومی، نیظری و خاقانی کے شنگرف میں لکھے ہوئے قلمی دیوان اور بے شمار قلمی بیاضیں، مثنویاں، مخطوطات، غرض اس نادر ذخیرے کو دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ، اس کے بعد تو میرے لئے بمنزلۂ قرض کے ہو گیا کہ جب بھی دلی جاتا ان کی خدمت میں ضرور حاضری دیتا، مجھ پر خاص شفقت فرماتے تھے اور جس لطف وکرم سے میرے ساتھ گھنٹوں اپنے دلکش انداز میں گفتگو فرماتے رہتے تھے اس کے نقوش میرے دل پر آج تک مرتسم ہیں۔

ان کی معلومات بے حد وسیع تھیں اور ان سے کسی موضوع پر گفتگو کرنا کارے دارد تھا، بالخصوص فلسفہ و تاریخ، الٰہیات و اسلامیات۔ اور ادب و شعر کے تو وہ بادشاہ تھے۔ نازک مزاج بھی بے حد تھے، اگر انہیں احساس ہو جائے کہ آپ ان کی بات پوری توجہ سے نہیں سن رہے تو بولتے بولتے وہ یکدم خاموش ہو جاتے تھے اور خفا ہو کر خود اٹھ جاتے تھے لیکن اگر آپ سے خوش ہوں تو پھر گھنٹوں بٹھائے رکھتے تھے اور مسلسل گفتگو فرماتے رہتے تھے ، وہ ان کے ہلکے ہلکے لطیف اور دلنشیں جملے جن میں فلسفہ و ادب، مزاح و تفاول اعتدال کے ساتھ سموئے ہوتے حقیقتہً تیر ونشتر کا کام کرتے تھے، جیسی تحریر تھی ویسی تقریر، معلوم ہوتا تھا، صلائے عام سن رہے ہیں، مضمون چھوڑیے باتیں سنیے ، باتیں چھوڑیے خطوط دیکھئے، کوئی فرق نہ تھا جیسے مضامین تھے، ویسے ہی مکتوبات۔ اس کا ثبوت ان کے خطوں سے مل سکتا ہے کہ اگر آج انہیں شائع کر دیا جائے تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ صلائے عام کا اقتباس نہیں ہے۔ میں تو مہینے میں دو چار خط ان کے نام زبردستی صرف اس لئے بھیج دیا کرتا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ جواب ضرور دیں گے اور میں ان سے لطف اٹھاتا رہونگا۔

مطالعۂ کتب ان کی زندگی کا واحد مشغلہ تھا۔ پنشن لینے کے بعد، زیادہ تر اپنی حویلی کے بالائی حصے ہی میں رہتے تھے۔ تمام کمرے کتابوں سے بھرے رہتے تھے

جب دیکھیے ، وہ ہیں اور خاک آلود کتابوں کا ڈھیر ہے اور ان کی جھکی ہوئی گردن، پڑھ نہیں رہے ہیں تو لکھ رہے ہیں۔ اور لکھتے لکھتے تھک گئے ہیں تو پھر پڑھنے میں مصروف ، مغربی و مشرقی لٹریچر ، فلسفہ و تاریخ میں ان کا گہرا اور وسیع مطالعہ تھا ، اور سب سے بڑا انعام جو فطرت نے انہیں دیا تھا ، یہ تھا کہ ان کا حافظہ غضب کا تھا ، جو کچھ ان کی نظر سے ایک بار گزر جاتا نقش فی الحجر ہو جاتا ، اردو فارسی کے ہزاروں لاکھوں اشعار ان کے نوک بر زبان تھے جنھیں وہ کثرت سے اپنی تحریروں میں استعمال کرتے تھے ، اشعار کا اتنا برمحل استعمال جس سے تحریر کا تاثر سہ چند ہو جائے فن کی حیثیت سے ان پر ختم تھا۔

ان کے انشائیوں کا میرے قلب و ذہن پر جو اثر ہوتا تھا، اس وقت تو میں اس سکر و مخموری کا کوئی سبب متعین نہ کر سکتا تھا، لیکن بہت غور کرنے اور ان کی تحریروں کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کا انداز تحریر محض شاعرانہ نہیں ، بلکہ اس کے ماسوا "شے دیگر" کے ایسے گہرے جمالیاتی رنگ میں رچا ہوا ہے جس کا تعلق محض احساس حسن سے نہیں بلکہ ان کے معنوی کیفیات و جذبات سے ہے جن کے اظہار کے لئے نفسیات کا ماہر ہونا ضروری ہے جو وہ بلاشبہ تھے لیکن تعجب ہوتا تھا کہ انہوں نے زندگی سے کبھی شکست نہیں کھائی ، وہ ہمیشہ جوان رہے اور کبھی بوڑھے نہیں ہوئے۔ زندگی سے انہیں بے پناہ محبت تھی اور اس کی ہر ادا سے پیار اور حسن کے تو وہ ازلی شیدائی تھے "تلاش حسن" ہی ان کی شاعرانہ طبیعت اور ان کے کلام کی رنگینی اور شوخ بیانی کا اصل سبب تھی۔

میرناصرعلی کی انشا صرف ان کی سلیس زبان اور ان کے دل میں گھر کرنے والے شگفتہ انداز بیان کا نام نہیں بلکہ ان کی دلکش و بلیغ تعبیرات و تشبیہات کا نام ہے جنھیں صرف ایک بڑا شاعر ہی پیدا کر سکتا ہے۔ ان کے چند شعار منثور نقل کیے بغیر

یہ تحریر تشنہ رہے گی ۔ جنس لطیف کو یوں داد حسن دیتے ہیں :

" ــــــ عورت جب منہ پھیر کر چلنے کے لئے اٹھ کھڑی ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ چاہتی ہے کہ کوئی دوڑ کر دامن پکڑ لے ۔"

" ــــــ خدا نے عورت کو بالطبع عیش پسند پیدا کیا ہے ۔ عورت کے لئے عیش سلطنت کا جلوس ہے ۔"

" ــــــ عورت جس کی عملداری میں رہتی ہے اسی پر حکومت کرتی ہے ۔"

" ــــــ مصائب میں عورت کا حال شاخ گل سا ہے جو آندھی میں جھک جاتی ہے اور جہاں ہوا تھمی پھر سیدھی ہو گئی ۔"

" ــــــ وہ حسین عورت جو کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتی دل میں خوب سمجھے ہوئے ہے کہ سب کی نگاہیں میری ہی طرف ہیں ۔"

" ــــــ عورت کے دماغ کو دل سے ہو کر رستہ ہے ، جب تک دل پر قابو نہ ہو ، اچھی سمجھ اختیار سے باہر ہے ۔"

" ــــــ کم سن حسین چہرہ اس آئینے کی طرح ہے جس میں اب تک کسی کا عکس نہیں پڑا ۔"

" ــــــ عورت کے لئے اس قدر بس نہیں کہ مرد کا دل ہاتھ میں رکھے بلکہ جب ہاتھ آجائے تو تنگ رکھے کہ یہی مجرب نسخۂ تسخیر ہے ۔"

" ــــــ مرد اگر کسی عورت کو دغا دے تو بھی عورت ہی کا مارا سمجھیے ۔"

میر صاحب نے جس زندگی کو حقیقی زندگی جانا وہ صرف محبت کی زندگی تھی ، چند تعبیرات سنیے :۔

" ــــــ محبت سامان و اسباب کی محتاج نہیں ، اسے اکیلا دل چاہیے ۔"

" ــــــ محبت میں اگر مرنے کو جی چاہے تو یہ بات مرنے سے بدتر ہے ۔"

"— محبت کا واسطہ دل سے ہے اور ہوس کا نفس سے، پھر جس کو ہوس سے کام لینا ہو وہ دل سے واسطہ نہ رکھے"۔

"— محبت کے آگے عورت، دولت کو بیکار جانتی ہے، بلکہ عورت کے لئے دولت کو لات مارنے سے تو خوشی ہوتی ہے"۔

"— نری محبت سے محبت نہیں بڑھتی، اس کے لئے تغافل بھی ضروری ہے"۔

"— جس محبت میں ناچاقیاں نہ ہوں، وہ محبت نہیں زمانہ سازی ہے۔ شکایتیں تو تجدید محبت کے اسباب ہیں"۔

"— محبت میں عورت کے لئے جو عیب ہے وہی مرد کے لئے ہنر ہے — یعنی چھوڑ دینا"۔

"— یار کا دوپٹا جب تک اوڑھنے کے سوا کچھ اور کام نہ دے محض دوپٹا ہے۔ ایک کپڑے کا نام، لیکن جب منہ چھپانے اور آپ کی طرف سے آنچل کا سرا کھینچ کر آڑ کرنے کے کام آئے تو نرا دوپٹا نہیں رہا، کتاب محبت کا ایسا ورق ہے جس کے آگے ہزار یوسف زلیخا کے افسانے اور لاکھ لیلیٰ مجنوں کے قصے بیکار ہیں"۔

اب زیادہ گہرے مسائل کو لیجئے، یہاں بھی میر صاحب منفرد نظر آتے ہیں۔

"— دنیا ایسا تماشا ہے کہ جس قدر زیادہ دیکھیے اسی قدر جی لگتا ہے"۔

"— گردش روزگار کے یہی معنی ہیں کہ ایک اوپر چڑھے اور دوسرا نیچے اترے، سب ایک ہی جگہ رکے کھڑے رہیں تو راستہ بند ہو جائے، کوئی کسی کو اوپر چڑھنے سے نہیں روکتا۔ لیکن جب

اترنا پڑے تو شکایت کی ممانعت ہے۔"

"_____ انسان کے لئے صبر غایت درجہ کی لاچاری کا نام ہے جسے کوئی اپنی چلتے پسند نہیں کرتا۔"

"_____ زندان ہستی کی دیواریں گو ایسی اونچی نہیں کہ انسان پھاند نہ سکے، اول تو پہلے ہی سے بہت مضبوط نہیں، اس پر غم زدگاں کے سیلاب اشک نے انہیں جابجا سے بودا کر دیا ہے، مگر ہم اس قید خانے کی مرمت کی دھن میں ایسے لگے ہوئے ہیں کہ آج تک کوئی جیتا یہاں سے نکلتا نہ سنا۔"

"_____ جہاں پر کام کے لئے فرصت کی ضرورت ہے، جینے کے لئے سب سے زیادہ فرصت درکار ہے۔"

"_____ خدا نے عیش کو وہ دلکش آواز بخشی ہے کہ بہرے اس کی آواز پر کان لگائے ہوئے ہیں اور گونگے مرحبا کہنے کو تیار ہیں اسی دھوکے میں ہم جوانی میں اپنے نصیب اور آرزو کے تکیے بنا کر خیال زلف معنبر میں غافل پڑے سوتے رہے، جب صبح پیری کے جگانے سے آنکھ کھلی تو گورکنارے نظر آئے۔"

فلسفۂ لذت والم (*Pain and pleasure*) پر تقریباً تمام فلاسفروں نے اظہار خیال کیا ہے لیکن میرزا محمد علی کی تعبیرات کا جواب آپ کو کہیں نہیں ملے گا:

"_____ اس سرائے فانی کے دو دروازے ہیں، جو اندر آنے کا ہے اس پر لکھا ہے" خوش کبھی نہ رہنا۔" جو جانے کا ہے اس پر کندہ ہے" غم نہ کرنا۔"

"_____ دنیا میں زندگی کا لطف ہے تو خوشی کی امید پر، لیکن محض خوشی

کو زندگی کا حاصل سمجھ لینا اسی قدر غلط ہے جس قدر یہ سمجھ لینا کہ دنیا میں مصیبت کے سوا کچھ نہیں۔"

"—— دنیا میں نری بزم رقص و سرود نہیں لیکن کبھی کبھی اس خرابے سے پرانے بوریے اٹھا کر فرش مخملیں اگر میسر ہو تو بچھا لیجئے، گھڑی دو گھڑی ناچ کود لیجئے، پھر ویسے ہی بوریے بچھا دیجئے۔"

"—— انسان کے دل کو بہت نرم بتاتے ہیں لیکن مصیبت برداشت کرنے کی طاقت اس میں سب سے زیادہ ہے۔"

—— دنیا میں خوشی ضرور ہے، اگر نہیں ہے تو بھی اس کی تلاش دل خوش کن ہے، پہلے آپ خوش رہنے کا ارادہ کرلیں، اور جھگڑوں کو پاس نہ پھٹکنے دیں تو خوشی کہیں نہیں گئی۔"

"—— خوشی انسان کے دل میں ہے۔ اس کے لئے سامان کی ضرورت نہیں، گو سامان سے خوشی کے اظہار میں رونق آجاتی ہے۔"

—— جہاں خدا نے انسان کے ساتھ روٹی کا جھگڑا لگا رکھا ہے، دل و دماغ بھی دیا ہے کہ اپنی جان کو خوش رکھ سکے —— پھر بھی اگر جی خوش نہ ہو تو رونے ہی کی کیا ضرورت ہے۔"

—— تعلقات دنیوی میں ہزاروں جھگڑے ہیں، مگر ان کو چھوڑ دینے میں بھی آپ چاہیں کہ خوش رہ سکیں، یہ بھی غلط ہے۔"

"—— کسی نے خوشی سے پوچھا تو کہاں ملتی ہے، جواب ملا، جہاں تیرا جی چاہے۔"

"—— رنج و راحت کی کشمکش یونہی چلی جائے گی۔ مرتے دم تک دل میں یاس اور نگاہوں میں انتظار رہے گا۔"

غرض ایسے ہی جواہر پاروں سے میر ناصر علی کے سارے انشائیے معمور ہیں، کہاں تک نقل کئے جائیں۔ اگر میر ناصر علی اردو کے بجائے کسی اور زبان میں موتی لٹاتے اور برصغیر کے بجائے کہیں یورپ میں پیدا ہوئے ہوتے تو اس نوع کے مقولوں، تاملات، نشتروں یا مقامات کی سینکڑوں کتابیں (APHORISMS SAYINGS AND MEDITATIONS) کے نام سے شائع ہوتیں اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتیں۔ ہمارے ہاں ان کے ان معجزات کے سمجھنے اور قدر کرنے والے بھی اب مشکل سے ملیں گے۔

میر ناصر علی کے انشائیوں کا مجموعہ کتابی شکل میں اب سے نصف صدی پہلے شائع ہونا چاہیے تھا۔ "تیرھویں صدی" میں ان کے مضامین کے انتخاب کی اشاعت سے متعلق ان کے احباب اور قدردانوں کے تقاضے اس رسالے کے بند ہوتے ہی شروع ہو گئے تھے۔ پھر جب ۱۹۰۸ء میں صلائے عام جاری ہوا تو ان تقاضوں کی تجدید ہوئی جس کی ایک یادگار مہدی حسن کی وہ "کھلی چٹھی" ہے جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ یہ برہم کے پرچے مشرق میں اکتوبر ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی اور جس نے اس وقت کے ادبی حلقوں میں تہلکا مچا دیا تھا۔ اسے میر ناصر علی نے پھر صلائے عام بابت نومبر ۱۹۰۹ء میں چھاپا۔ اور گو "حسنِ تحسینِ مضمون" کے عنوان سے اپنے مخصوص انداز میں مہدی حسن کو داد و تحسین سے نوازا، لیکن مدعائے اصل سے اغماض ہی برتتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس تجویز کے حق میں نہ تھے اور شاید اسے پسند بھی نہیں کرتے تھے، ورنہ اگر چاہتے تو ایک مجموعہ کیا، بیسیوں مجموعے اپنے ہی پریس "مطبع ناصری" سے شائع کر سکتے تھے۔ صلائے عام کے

مضامین کے انتخاب کے سلسلے میں بھی ان کے قدر دانوں اور صلائے عام کے مضمون نگاروں نے جن میں ۱۹۱۱ء کے بعد سے میرا شمار بھی ہونے لگا تھا، بار بار میر صاحب سے درخواست کی اور قرائن سے پتا چلتا ہے کہ وہ اس پہ آمادہ بھی ہو گئے تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ صلائے عام کے پرانے پرچے دستیاب نہ ہوتے تھے۔ پرچے کی اشاعت محدود سی تھی اور چھپتے ہی ساری کاپیاں تقسیم ہو جاتی تھیں۔ باقاعدہ فائل کی ترتیب یا مضامین کی نقلیں وغیرہ رکھنے کی میر صاحب کو نہ فرصت تھی نہ وہ طبعاً اس قسم کے اہتمام و انتظام کے بکھیڑے پسند کرتے تھے، چنانچہ صلائے عام کے پرانے پرچوں کے بارے میں بار بار صلائے عام ہی کے ذریعے اشتہار دیے گئے لیکن بے سود۔

۱۹۳۰ء میں جب شاہد احمد صاحب نے دلّی سے رسالہ ساقی جاری کیا، جس کی ادارت میں انصار ناصری صاحب بھی ان کے ساتھ شامل تھے، تو ان جوانوں کے پے بہ پے اصرار سے بالآخر میر صاحب آمادہ ہو گئے اور اپنے مجموعۂ مضامین کے لئے یک کیفت آگیں نام "مقاماتِ ناصری" بھی خود ہی تجویز کیا۔ پرانے پرچوں کے فراہم کرنے اور مضامین کی نقلیں تیار کر کے نظر ثانی کے لئے ان کی خدمت میں پیش کرنے کا کام ان جوانوں کے سپرد ہوا تھا۔ لیکن افسوس یہ کام میر صاحب کی زندگی میں پورا نہ ہو سکا۔

ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند ارجمند سید انتصار علی صاحب (ریٹائرڈ ڈپٹی) نے بڑی تلاش، کوشش اور صرفِ کثیر سے صلائے عام کے پرانے پرچے جابجا سے فراہم کر کے جلدیں مکمل کیں، اور مضامین کی نقلوں کا بھی انتظام کیا، لیکن اپنی ملازمت کی مصروفیتوں کے باعث ان کی اشاعت کا بندوبست نہ کر سکے، ادھر انصار ناصری صاحب بھی ریڈیو میں ملازم ہو کر لکھنؤ آ گئے تھے، ان کے قیام لکھنؤ کے زمانے میں ان سے اکثر دلچسپ صحبتیں رہتیں، مقاماتِ ناصری کی اشاعت کا بھی بارہا تذکرہ ہوا، لیکن وہی معذوری درپیش تھی کہ پرانے فائل دستیاب نہ ہوتے

تھے۔ اس کے بعد کافی عرصے تک ابتلا کا سا دور رہا، جنگ عظیم اور اس کے بعد فرقہ وارانہ فسادات اور پھر تقسیم ملک کے ہنگامے، ان مفسدات اور لوٹ مار میں نہ صرف صلائے عام کی جلدیں ہی بلکہ میر صاحب کا وہ عظیم کتب خانہ جو مجموعۂ نوادرات تھا اور ان کی شاندار حویلی کا جملہ اثاث البیت، غرض سبھی کچھ تباہ برباد ہو گیا، میرا انتصار علی صاحب اپنی جان جوکھم میں ڈال کر بمشکل کچھ پرچے اس یلغار سے بچا سکے، جنھیں وہ اپنے ہمراہ پاکستان لانے میں کامیاب ہو گئے، بعد ازاں انصار ناصری صاحب ایک دو بار اس سلسلے میں ہندوستان گئے اور بعض قدیم گھرانوں، پرانے کتب خانوں، عزیزوں، دوستوں سے چند اور جلدیں اور کچھ متفرق پرچے حاصل کر سکے۔ پاکستان میں بھی انہوں نے قریب قریب سبھی لائبریریاں اور پرائیوٹ کتب خانے دیکھ ڈالے، جہاں سے جو کچھ دستیاب ہو سکتا تھا، حاصل کیا۔ غرض بہزار دقت اس گم شدہ خزینے کا معتدبہ حصہ فراہم کیا گیا اور گو یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ میر ناصر علی نے ۵۶ برس تک جو اہم خدمات اردو کی انجام دیں وہی سب کی سب ہمارے سامنے موجود ہیں، تاہم جتنا ریکارڈ دستیاب ہو سکا بجائے خود ایک گنج گرانمایہ ہے، اس کی اشاعت از بس ضروری ہے کہ نہ صرف اس دور کی اہم یادگار ہے بلکہ ہمارے عظیم ترین انشائیہ نگار کے قلب و قلم کے تخلیق کردہ ایسے دُرہائے نایاب ہیں جو اردو انشا پردازی کے لئے ہمیشہ سرمایۂ افتخار بنے رہیں گے۔

انصار ناصری صاحب نے میر ناصر علی سے میرے نیاز قدیم کی بنا پر اور خود مجھ سے اپنی دیرینہ شیفتگی اور محبت کی وجہ سے مضامین کے انتخاب کے اس اہم کام میں مجھے بھی شریک کر لیا، اس بار عظیم کو اٹھانے کے لئے میں شاید آمادہ نہ ہوتا، اگر ان کے اصرار سے زیادہ خود میری یہ غرض شامل نہ ہوتی کہ اس طرح ایک بار پھر صلائے عام کے پرچے دیکھنے

کو ملیں گے۔ اور ایک ساتھ اتنے بہت سے ــــــــــ گویا پچاس سال بعد ایک بار پھر معنوی طور پر میر ناصر علی کی صحبت و قربت نصیب ہوگی، اور اتنی طویل و ہزار گونہ دلکش ـ!

صلائے عام کی تمام جلدیں ۱۹۰۰ء لغایت ۱۹۳۲ء میں نے بالاستیعاب دیکھیں، بعض مضامین کو ایک سے زیادہ مرتبہ پڑھا کہ لذت سخن کا اقتضا یہی تھا یہ سعادت بذاتہ میرے لئے کتنی عظیم ذہنی و روحانی مسرتوں، سرشاریوں اور سرخوشیوں کا باعث ہوئی، احاطۂ تحریر سے ماورا ہے، عرض کر سکتا ہوں تو بس اتنا ہی کہ بوڑھے میر ناصر علی (جو ہمیشہ جوان ہی رہے) کی زندگی کی مسرتوں اور کیف سامانیوں کی حرارت سے بھرپور ان تحریروں نے ان کی نرم و گرم شوخیوں، متین سخن رانیوں اور دل ربا مسکراہٹوں نے مجھے آج بھی کہ لب گور ہوں، ایک بار پھر جوان بنا دیا۔

انتخاب سے متعلق انصار ناصری صاحب نے جو تجاویز مرتب کیں میں ان پر صاد ہے، مشورے اس حالت میں انہیں کیا دے سکتا ہوں، خود اعلیٰ لیاقت کے مالک ہیں اور ادب کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں، ساقی کے اجرا سے لے کر اب تک ان کی دلچسپ تحریریں اور ادبی مشاغل سب میرے پیش نظر رہے ہیں، افسوس ہے کہ ان کی اعلیٰ صلاحیتیں، ریڈیو کی کان نمک میں ضائع ہو رہی ہیں ورنہ یہ جوہر قابل بھی اپنے دودمان عالی کی طرح اردو ادب میں کیسے کارہائے نمایاں انجام دیتا۔ اپنے جد امجد کے ان نادر مضامین کی ایسی عظیم دشواریوں کے باوجود "بازیافت" اور تدوین و ترتیب ان کے شوق علمی کی ایک مثال ہے۔ انتخاب کے بارے میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ چونکہ صلائے عام کی اشاعت نہایت ہی محدود تھی اور اس پر اب نصف صدی کی طویل مدت بھی گزر چکی ہے اس لئے ان مضامین کو غیر مطبوعہ ہی سمجھنا چاہیے، موجودہ

نسل ان سے قطعی آشنا نہیں، اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کے تمام کے تمام مضامین منصۂ شہود پر آجائیں، بعد ازاں ان "کلیات" سے مختلف انتخابات علیحدہ علیحدہ مرتب کئے جاسکتے ہیں، مثلاً زبان و ادب کے مضامین علیحدہ، حکیمانہ و مورخانہ علیحدہ، وقس علیٰ ہذا۔ اور "مضمون پریشان" جو ان کی خاص الخاص شے تھی قطعی ایک دو جلدوں میں علیحدہ شائع ہونے چاہئیں، لیکن ملک میں علمی و ادبی کتابوں کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں جو دشواریاں حائل ہیں ان سے میں بے خبر نہیں ہوں، کراچی کے اردو بورڈ میں، جس کی مجلس مشاورت میں مجھے بھی شریک کیا جاتا ہے دو ایک بار شان الحق حقی صاحب کی تحریک پر مقالات ناصری کی اشاعت کا مسئلہ سامنے آیا لیکن محض فنڈ کی کمی کی وجہ سے التوا میں ڈال دیا گیا۔ تجارتی اشاعت خانوں سے تو اس قسم کی خالص علمی و ادبی خدمات کی توقع رکھنی ہی بے سود ہے، اندریں حالات انصار ناصری صاحب مقالات ناصری کی اشاعت کا انتظام خود کر رہے ہیں لیکن یہ دیر طلب بات معلوم ہوتی ہے اور چونکہ میں ذرا عجلت پسند انسان ہوں اس لئے بغیر کسی مزید انتظار کے ان کی اجازت سے نگار میں میر ناصر علی کے ایک ایک دو دو مضامین شائع کرتا رہوں گا کہ آج کے لکھنے اور پڑھنے والے ان معجزات سے یکسر بے خبر نہ رہیں۔

ایک صلاح میں نے انصار ناصری صاحب کو یہ دی ہے کہ مقالات ناصری شائع ہوئیں جو ظاہر ہے کئی جلدوں میں آئیں گے تو صلائے عام کے دیگر لکھنے والوں کے مضامین کے انتخاب بھی ضرور شائع کریں، میرے مضامین جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے شاید اس لائق نہ ہوں کیونکہ میرے اس مجنونانہ دور کی یادگار ہیں جسے میں خود بھلا چکا ہوں لیکن دیگر مشاہیر کی نہایت اعلیٰ اور یادگار تحریریں، نظمیں، مضامین اور مکاتیب صلائے عام کی جلدوں میں دفن ہیں جنکا کتابوں کی شکل میں شائع ہو جانا قطعی ضروری ہے۔ ساقی کے ناصر نمبر میں بھی میر ناصر علی کی یاد میں جو مضامین اور نظمیں شائع ہوئیں

تھیں، مثلاً ریاض خیرآبادی، مولوی سبحان اللہ شاہ دلگیر، راشد الخیری اور خواجہ حسن نظامی اور خود شاہد احمد کے مضامین اور پنڈت امرناتھ ساحر احسن مارہروی، نہال سیوہاروی اور شاہد صدیقی کی نظمیں یہ سب بجائے خود یادگار رہیں اور محفوظ کرنے کے لائق۔

نیاز فتحپوری

ناظم آباد۔ کراچی


۱۵ر فروری ۱۹۶۵ء

معروضاتِ ضعیف

سیّد انتصار علی

اللہ جل شانہٗ کا احسانِ عظیم ہے کہ حضرت والد ماجد مرحوم و مغفور کے گراں مایہ مضامینِ پریشاں کی تدوین کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچا اور بالآخر مقاماتِ ناصری کی اشاعت کی نوبت آئی۔ بندۂ حقیر کس منہ سے شکر بجالائے اُس قادر و کریم کا جس کی تائید شاملِ حال نہ ہوتی تو ہماری کیا مجال تھی کہ اب بھی اس نیک فرض سے عہدہ برآ ہو سکتے۔

آرزو تھی کہ حضرت والد ماجد کی حیات ہی میں ان کے غیر فانی مضامین جو مختلف رسائل کی جلدوں میں دبے پڑے تھے کتابی صورت میں شائع ہو جاتے لیکن افسوس یہ آرزو ان کے جیتے جی پوری نہ ہو سکی۔ ان کے وصال کے بعد اس حقیر نے اس اہم فرض کو بجالانے کی بار بار کوشش کی لیکن اپنی ملازمت کی مجبوریوں کے سبب پے بہ پے ایسی اندوہناک ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا اور آخری بار تو اس بری طرح لپنے منصوبوں کو ملیامیٹ ہوتے دیکھا کہ کمرِ ہمت ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گئی۔ پاکستان آجانے کے بعد تو اس کے تمام ذرائع و اسباب بالکل ہی ختم ہو چکے تھے، لاچار و مایوس ہو کر ہمیشہ کے لئے صبر کر کے بیٹھ گیا۔ برخوردار میاں انتصار سے کبھی کبھی اپنی اس دیرینہ حسرت کا ذکر کر لینے کے سوا اور کر ہی کیا سکتا تھا۔ وہ ازراہِ سعادتمندی مجھے تسلّی و تشفی دیتے رہتے



میر ناصر علی مرحوم کے صاحبزادے سید انتصار علی مرحوم ۱
اور پوتے سید انصار ناصری

اور میری جانب سے اس نیک فرض کی انجام دہی کا وعدہ بھی کر لیتے۔ لیکن ریڈیو کے نت نئے ہنگاموں میں ان کی اندھا دھند مصروفیت دیکھ دیکھ کر میں دل ہی دل میں کڑھتا رہتا کہ جس طرح مجھے عمر بھر ملازمت کے بکھیڑوں نے اس خدمت سے معذور رکھا انہیں بھی شاید ہی کامیابی نصیب ہو۔ کیوں کہ ان کی ملازمت کی کیفیت میری ملازمت سے بدرجہا بدتر ہے۔ تقسیم ملک اور مہاجرت کے سبب حالات بھی یکسر بدل چکے تھے اوّل تو صلائے عام کے پُرانے فائل ہی سرے سے ندارد تھے۔ پاکستان بھر میں دو چار متفرق پرچوں کے علاوہ جو شاید کہیں کسی پُرانی لائبریری میں مدفون ہوں تو ہوں مکمل فائل قطعاً مفقود تھے۔ کسی قیمت پر بھی کہیں دستیاب نہ ہو سکتے تھے۔ پھر اگلے وقتوں کے چند بزرگ ادیبوں کے سوا کوئی صلائے عام اور اس کے اڈیٹر کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔ دوسرے مستقل بے وطنی اور مسافرت کی وجہ سے معمولی سکون بھی میسر نہ ہو سکا۔ میاں انصار کے آئے دن کے تبادلوں نے کہیں جم کر بیٹھنے ہی نہ دیا جو فراغت یکسوئی کے ساتھ اس خدمت کو انجام دے سکتے۔ کبھی پشاور، کبھی کراچی، کبھی لندن، کبھی راولپنڈی، کبھی ڈھاکہ، پھر راولپنڈی، پھر کراچی اور پھر راولپنڈی اور ان کے ساتھ صلائے عام کے متفرق پرچوں کے پشتارے بھی جگہ جگہ مارے پھرا کئے۔ اور برسوں پر برس گزرتے چلے گئے۔ اس کارواں سامانی کے پیش نظر سچ پوچھئے تو مجھے قطعی امید نہ تھی کہ اپنی بقیہ چند روزہ زندگی میں اس کام کو پورا ہوتے دیکھ سکوں گا۔

بارے کئی برس کے بعد آج، بالکل غیر متوقع میاں انصار نے کتاب کا مسودہ ہر طرح تیار اور مکمل صورت میں مع حضرات ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مولانا عبدالماجد دریابادی، اور علامہ نیاز فتحپوری کی بیش بہا تقاریظ کے میرے سامنے لا رکھا اور دعا کے طالب ہوئے — اسے دیکھ کر بے اختیار میرے آنسو نکل پڑے۔

اسیؔ برس کے ضعیف کو جس کی ساری قوتیں سلب ہو چکی ہوں آنسوؤں پر اختیار نہیں رہتا۔۔۔ حضرت والد ماجد مرحوم و مغفور کی جانب سے جو قرض میں اپنے پر عائد سمجھتا تھا اور جسے بجالانے کی حسرت میرے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی، اور شاید میرے ساتھ ہی قبر میں جاتی اور اس سعادت سے محرومی کے باعث حشر میں حضرت والد ماجد مرحوم کے سامنے منہ دکھانے کے لائق نہ رہتا۔۔۔ آج میاں انصار کی برسوں کی مسلسل محنت سے مکمل کتاب کے مسودے کی شکل میں میرے سامنے ہے۔ الحمد للہ والمنۃ!!

اب میاں انصار کا اصرار ہے کہ میں بھی چند کلمے لکھ دوں، جنہیں وہ اپنی دانست میں تبرکاً اس کتاب میں شامل کیا چاہتے ہیں، بھلا میں اس لائق کہاں! اس انتہائی ضعیفی میں دل و دماغ کا جیسا کچھ حال ہونا چاہیے، میری حالت اس سے سوا ابتر ہے۔۔۔ جو صدمات، جسمانی مصائب اور روحانی اذیتیں اس پُر آشوب دور میں اٹھانی پڑیں انہوں نے رہے سہے حواس بھی مختل کر کے رکھ دیے۔۔۔ پھر حضرت والد ماجد مرحوم کے ایسے برگزیدہ دوستوں اور مرتبہ شناسوں نے اُن کے محاسن سخن پر ایسی فاضلانہ، اعلیٰ و پاکیزہ تقاریظ لکھ کر داد کا حق ادا کر دیا بھلا ان ذی مرتبت بزرگوں کے سامنے مجھ جیسے بے ہُنر، ہیچمداں، ضعیف و ناتواں کو لب کشائی کی کیسے جرأت ہو سکتی ہے ؂

رسم است کہ مالکانِ تحریر
آزاد کنند بندۂ پیر

حضرت والد ماجد مرحوم کی فضیلت، علمی مرتبے اور ان کی بیش بہا ادبی خدمات کے بارے میں رائے زنی کا یہ حقیر کسی طور مجاز بھی نہیں۔ نہ ادیب ہے نہ سخنور، ان کے

علمی کمالات کا جائزہ و محاکمہ اہل کمال ہی کا منصب ہے۔ ہاں اُن کے مضامین کے مجموعے ان کی وفات کے بعد سے اب تک کیوں نہ شائع ہو سکے؟ اس سوال کی جواب دہی البتہ میاں انصار سے پہلے مجھ پر عاید ہوتی ہے، لیکن یہ ایسی دلخراش داستان ہے کہ اب اسے دُہرانے کی بھی مجھ میں سکت نہیں۔ پھر ان تمام اسباب و علل کی توجیہہ کی جائے جو اس کام میں متواتر مانع و مزاحم ہوتے رہے تو دفتر کے دفتر سیاہ کرنے پڑیں گے اور تب بھی یہ عذر تراشی قابلِ اعتبار نہ ہوگی ؎

لیکن نہیں مناسب بالکل ہی چپکے رہنا
اب رازِ دل چھپاؤں اور تجھ سے رازداں سے

اس لئے مختصراً عرض کرتا ہوں ؎

نہ کچھ عقل نے اور نہ تدبیر نے
رکھا مجھ کو معذور تقدیر نے

واقعہ یہ ہے کہ اس حقیر کی ہر تدبیر کے ساتھ ستم ظریف تقدیر کی مسلسل و پیہم بازی گری جاری نہ رہتی تو اب سے برسوں پہلے مقاماتِ ناصری کی ایک دو نہیں بلکہ متعدد جلدیں نذرِ ناظرین ہو چکی ہوتیں۔

صلائے عام کے پڑھنے والے ذی قدر اصحاب سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ صلائے عام جب تک جاری رہا محدود تعداد میں چھپتا تھا اور ہر پرچے کی ساری کاپیاں شائع ہوتے ہی تقسیم ہو جاتی تھیں۔ دفتر کے لئے ایک بھی کاپی نہ بچتی تھی۔ حضرت والد ماجد نے پرانے پرچے خود قیمتاً حاصل کرنے کے لئے بار بار صلائے عام میں اشتہار دیے جو صلائے عام کی جلدوں میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ لیکن آں مغفور کی یہ کوششیں بار آور نہ ہوئیں اور جب ان کا انتقال ہوا تو صلائے عام کا ایک بھی پرچہ حویلی میں نہ تھا۔

بعد ازاں اس حقیر نے جس طرح ممکن ہو سکا کئی برس میں صلائے عام کے پُرانے پرچے فراہم کئے اور تمام جلدیں مکمل کیں۔ پھر اپنے دورانِ ملازمت میں جب بھی ممکن ہو سکا وقتاً فوقتاً کئی کئی منشی اور نقل نویس مقرر کر کے مضامین کی نقول بنوائیں اکثر ایسے ویران و سنگلاخ مقامات پر تعینات رہا کہ وہاں کتابت و طباعت کا امکان ہی نہ تھا۔ جب بھی رخصت پر دلّی آتا، مضامین کی کتابت کراتا رہا۔ کئی کئی بار کتابت ہوئی کاپیاں تک بن گئیں لیکن ہر بار کسی نہ کسی جانکاہ حادثے کی بھینٹ چڑھتی گئیں اور آخری بار تو یہ ساری متاعِ عزیز، تقسیم کے بعد کے فسادات میں میری آنکھوں کے سامنے تباہ و برباد ہو گئی۔ اور یہ حقیر و لاچار و مجبور کچھ نہ کر سکا۔ دل تھام کر رہ گیا یہ واردات یوں ہوئی کہ سب عزیز و اقارب پاکستان آچکے تھے میں یکہ و تنہا بے یار و مددگار اپنے آبائی مکان (حویلی میر ناصر علی، فراش خانہ دہلی) کے بالائی حصے میں صلائے عام کی جلدیں حضرت والد ماجد مرحوم کے دست و قلم کے مسوّدات نجی خطوط کے انبار، اور دیگر خاندانی تبرکات سنبھالے، جو میری زندگی کا آخری سرمایہ اور سہارا تھے، اپنی پنشن کے تصفیے کی خاطر کسی امید موہوم پر تکیہ کئے پاکستان آنے کا منتظر تھا۔ مکان کے باقی حصوں میں ہندو سکھ شرنارتھی در آئے تھے، ایک دن مُفسدوں نے سرِشام حویلی کے بالائی حصے پر بھی دھاوا بول دیا —— میری آنکھوں کے سامنے سارا اثاث البیت اور یہ گراں مایہ خزانہ لٹتا رہا اور میں دم بخود دیکھتا رہا —— نہ معلوم انہوں نے اس گناہگار کو کیوں یہ سب کچھ دیکھنے اور سہنے کے لئے زندہ رکھا، قتل نہیں کیا، گو سر پر تلواریں اور کرپانیں چمکتی رہیں، لاٹھیاں اور لونگے بھی اُٹھتے رہے۔ اسی پر اکتفا کی کہ دھکے دے کر زینے سے اُتار دیا۔ اس کے بعد دوبارہ اس زینے پر قدم رکھنا نصیب نہ ہوا۔

بعد ازاں کس طرح بعض اکابر شہر کے اثر و رسوخ سے کسٹوڈین اور پولیس کی

امداد حاصل کی گئی۔ کسی طرح منتوں، خوشامدوں اور منہ مانگے داموں پر جتنی جلدیں صلائے عام کی مل سکیں، حاصل کی گئیں۔ کس طرح پاکستان ہائی کمیشن کے وسیلے سے کچھ جلدیں اور باقی ماندہ کتابیں وغیرہ پاکستان بھجوائیں، جن میں سے کچھ پہنچیں، کچھ راستے میں غت ربود ہوئیں ـــــ کس طرح پاکستان ہائی کمیشن سے "ساز باز" کرنے اور اپنی "دولت" پاکستان بھجوانے کے الزام میں یہ ضعیف عین فراری کے وقت بارڈر سے گرفتار کیا گیا، حراست میں رہا، پھر دلّی لایا گیا، مقدمہ ہوا، قید و بند جھیلی، بالآخر کسی طرح چند بچے کھچے متفرق پرچے جو اپنے ساتھ لا سکتا تھا لے کر گرتا پڑتا پاکستان پہنچا۔ یہ سب جانگداز واقعات ہیں جنہیں یاد کرنے سے بھی اب دل لرزتا ہے ـــــ ہاں غنیمت ہے کہ والد مرحوم کے بے نظیر کتب خانے سے چند الماریاں اچھی اچھی کتابوں کی، اینگلو عربیک کالج اور فتحپوری مسلم ہائی اسکول کی لائبریری میں والد ماجد مرحوم کی یادگار کے طور پر پہلے ہی پہنچا چکا تھا ورنہ باقی کتب خانے کی طرح یہ سب بھی تباہ و برباد ہو جاتیں ـــــ اس سعادت پر خداوند کریم کا شکر بجا لاتا ہوں۔

پاکستان پہنچنے کے بعد اس حقیر میں ذرا بھی سکت باقی نہ رہی۔ میاں انصار نے باوجود اپنی بے پناہ مصروفیت کے اس کام کو اپنے ذمّے لیا اور برسوں تک جس جانفشانی اور مستقل مزاجی سے وہ اس گم شدہ خزینے کی بازیافت کے لئے تگ و دو کرتے رہے انہی کی ہمت ہے ـــــ بے شمار دشواریوں کے باوجود کس طرح وہ از سر نو صلائے عام کی جلدیں مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئے تعجب انگیز ہے ـــــ ظاہراً یہ قطعی ناممکن تھا۔ اس لئے میں نے بڑے اشتیاق کے ساتھ ان سے اس کی تفصیل بار بار پوچھی، اور جتنی مجھے معلوم ہو سکی، ان کے شوق اور لگن کا واضح ثبوت ہے۔ اس سے مجھے دلی خوشی حاصل ہوئی، اس لئے اپنی طرف سے ادائے حق کے طور پر اس کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ انہوں نے خود دلّی جا کر وہاں کی

لائبریریوں، نجی کتب خانوں، قدیم گھرانوں، کتب فروشوں اور کباڑیوں وغیرہ سے بہت سے پرچے بہ صرفِ کثیر حاصل کئے۔ پاکستان میں بھی تمام لائبریریاں چھان ماریں جو جو پرچے جہاں جہاں سے دستیاب ہو سکے اُن کی نقلیں خود دستی بنائیں یا حاصل کیں سو کیں، کچھ نقول مضامین انڈیا آفس لائبریری سے اپنے قیام لندن میں حاصل کیں۔ کچھ پُرانے پرچے حضرت والد ماجد مرحوم کے انگریز دوستوں (جے۔ پی ٹامسن صاحب سابق چیف کمشنر دلی اور آر۔ پی۔ ڈیوہرسٹ صاحب ہوم سکریٹری گورنمنٹ صوبجات متحدہ) کے مکانوں پر آکسفورڈ، کیمبرج اور لیڈز جا جا کر اُن کے اعزّا سے حاصل کئے۔ غرض، کہیں سے مانگ کر، کہیں سے خرید کر، خود نقلیں بنا بنا کر جس طرح بھی ہو سکا انہوں نے برسوں کی تلاش اور محنت سے یہ بیش بہا ذخیرہ ازسرِ نو فراہم کیا ــــ "تیرھویں صدی" "افسانۂ ایّام" اور "ناصری" کے پرچے جواب قطعی نایاب ہیں انہوں نے کہاں سے اور کس طرح حاصل کر لئے یہ میرے لئے اب تک معمّا بنا ہوا ہے۔

انتخاب کا کام بھی اسی عالم میں جب بھی وقت ملتا تھوڑا تھوڑا کرتے رہے، کسی ایک جگہ برائے چندے قیام میسر آتا تو بکس اور پشتارے کھولے جاتے، منتشر پرچوں کی شیرازہ بندی ہوتی۔ مضامین کی ترتیب شروع نہ ہونے پاتی کہ پھر کالے کوسوں کا تبادلہ ہو جاتا۔ پھر مسوّدات کی گٹھڑیاں باندھ دی جاتیں اور جلدیں وغیرہ پھر بکسوں وغیرہ میں بند کر کے کیلیں جڑ دی جاتیں اور بنجارے کے ٹانڈے کی طرح پھر یہ سارا اسباب دوسرے پڑاؤ کی طرف لد جاتا۔ اسی کارواں سامانی اور رواروی میں انہوں نے کبھی اپنے کراچی کے قیام کے دوران حضرت ڈاکٹر مولوی عبدالحق سے مشورے کئے، اُن سے تقریظ لکھوائی، کبھی راولپنڈی سے متعدد مضامین کی نقول لکھنؤ بھیج کر حضرت مولانا عبدالماجد دریاآبادی سے پیش لفظ لکھوایا اور بھی نہ معلوم کس کس کو لکھا ــــ طباعت کا کام شروع ہوا ہی چاہتا تھا کہ پھر کراچی تبادلہ ہو گیا۔ اس عرصے میں حضرت والد ماجد کے

دیرینہ قدر شناس اور صلائے عام کے قدیم مضمون نگار جناب نیاز فتحپوری صاحب بھی لکھنؤ کو خیرباد کہہ کر پاکستان تشریف لا چکے تھے۔ اُن سے اور عزیزی میاں شاہد احمد سے مہینوں تک مشوروں کے بعد انتخاب کا کام مکمل کیا۔ اور جناب نیاز فتحپوری سے اتنا فاضلانہ مقدمہ لکھوایا۔ یوں مسلسل رواروی کے عالم میں "مقاماتِ ناصری" مرتب ہوئی۔ تاخیر جتنی ہوئی، میں سمجھتا ہوں، ان حالات میں ناگزیر تھی۔ اگر میاں انصار اس طرح مستقل مزاجی سے اس دھن میں نہ لگے رہتے تو یہ قطعاً ممکن نہ تھا۔

مدعا، میاں انصار کا غالباً یہ تھا کہ میں چند رسمی سے دُعائیہ کلمات لکھ دوں، وہ بھی اختصار کے ساتھ کیوں کہ انہیں گنجائش کا بھی بہت فکر ہے ——! اور میں دیکھتا ہوں کہ یہاں تک جتنا مجھ سے لکھا جا سکا، اس سے شاید ان کا مدعا پورا نہیں ہوتا۔ لیکن میری دانست میں، کتاب کی اشاعت میں، میری اور ان کی جانب سے جو غیر معمولی تاخیر ہوئی اور جو حادثات گزرے ان کا مختصر احوال بیان کرنا نامناسب نہیں تھا، پھر سب کچھ تباہ ہو جانے اور لُٹ جانے کے بعد انہوں نے جس طرح ازسرِ نو یہ نادر و نایاب مضامین حاصل کئے اور جس محنت سے کتاب کو مرتب کیا اس کا ذکر بھی ضروری تھا، جو وہ خود شاید تکلفاً نہ کرتے، اس لئے دُعا سے پہلے اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے گزارش احوال واقعی کے طور پر اتنا لکھنا میرے لئے ضرور ہوا۔

میاں انصار نے حضرت والد ماجد کی زندگی کے مختصر حالات لکھ کر بغرض اصلاح مجھے دکھائے، زندگی کے حالات کو کمال محنت سے مختصر کر کے پیش کیا گیا ہے واقعات کے لحاظ سے جتنی باتیں درج کی گئیں، سب درست ہیں۔ خاندانی حالات بھی جس قدر انہیں معلوم ہو سکے مختصراً لکھ دیے اور جو مختلف ضروری شواہد درج کئے گئے وہ بھی بڑی تلاش سے حاصل کئے گئے ہیں۔ اہل علم کو شاید ان سے زیادہ جاننے کی ضرورت بھی

نہ ہو۔ لیکن حضرت والد ماجد قبلہ کے حالاتِ زندگی سے جو یوں بھی بہت مختصر ہیں، ذاتی طور پر میری تسکین نہ ہوئی کہ ضرورت سے زیادہ غیر جانبدارانہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان سے آں مغفور کی تعلیم، ملازمت اور علمی کارناموں وغیرہ کا حال تو ایک حد تک معلوم ہو جاتا ہے لیکن آں مغفور کی شخصیت اور اُن کے بے مثال خصائلِ باطنی کے بارے میں کچھ بھی آگاہی نہیں ہوتی۔ میں سمجھ نہ سکا کہ میاں انصار نے ان حالات کے لکھنے میں اپنی غیر جانبداری ثابت کرنے میں اتنی احتیاط برتنی کیوں ضروری سمجھی کہ آں مغفور سے اپنی نسبتِ خاص کا بھی انہوں نے کہیں ذکر نہ کیا۔ حضرت والد ماجد ان پر خاص شفقت فرماتے تھے اور انہیں "اپنا بیٹا" بنا رکھا تھا۔ مدتوں تک اُن کے فیضانِ صحبت اور خدمت کی سعادت سے بہرہ یاب ہوئے آں مغفور کی زندگی کے آخری زمانے میں جب عربک کالج میں پڑھتے تھے برسوں تک شب و روز انہی کے ساتھ رہے۔ آں مغفور بھی ان سے بہت خوش تھے اور خود سعدی، رومی، حافظ و نظیری اور فارسی کی دیگر کتابیں پڑھاتے تھے۔ اور ان سے اخبار وغیرہ پڑھوا کر سنا کرتے تھے۔ اپنے طالب علمی کے زمانے سے ادب کا ذوق اور مضمون کا شوق انہی کے قدموں کی برکت سے انہیں حاصل ہوا ہے۔ اپنے نام کے ساتھ "ناصری" لکھنا بھی انہوں نے آں مغفور کی اجازت سے اسی تعلق خصوصی اور نسبت شاگردی کی بنا پر اختیار کیا۔ میرے نزدیک یہ بڑی مبارک اور فخر کے لائق بات تھی اور اس کا ذکر ضروری تھا۔ آں مغفور کی آخری علالت میں جس طرح انہوں نے اُن کی خدمت کی، وہ یہ بھول گئے ہوں تو بھول جائیں، میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ جب میں نے میاں انصار سے کہا کہ ان مختصر حالاتِ زندگی میں حضرت والد ماجد کی سیرت اور خصائل کے بارے میں چند باتیں بڑھا دو تو انہوں نے پہلے تو وہی گنجائش کی کمی کا عذر پیش کیا پھر دبی زبان سے کہا تو اتنا کہ یہ باتیں نجی قسم کی ہیں ہمارے لئے اہم ہوں تو ہوں عام دلچسپی کی نہیں۔ آج کل کے پڑھنے والے اب ایسی باتیں پسند نہیں کرتے۔ جب میں نے اصرار کیا اور

اپنے مقصد کی وضاحت کی تو یہ اُلٹے میرے گرد ہو گئے کہ "آپ کے ہوتے میرا یہ منصب نہیں، اَلوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیۡہٖ کے مصداق آپ سے بہتر ان کی سیرت کون بیان کر سکتا ہے۔ آپ ضرور لکھ دیجئے، لیکن مختصر طور پر" اختصار کی تاکید گنجائش کے پیش نظر مکرر کی، غرض اس طرح بہ لطائف الحیل انہوں نے مجھ پر لازم کر دیا کہ چند باتیں، جیسے بھی مجھ سے بن پڑے میں خود لکھ دوں۔ اب رہا گنجائش کا سوال وہ ئیں ان پر لازم کرتا ہوں کہ جیسے بھی ہو پیدا کریں۔

میرا خیال ہے کہ اہل علم و دانش، آں مغفور کے علمی فضائل اور تخلیقی کارناموں کے جائزے اور محاکمے کے بعد اُن کے خصائل کے بارے میں بھی ضرور کچھ نہ کچھ جاننا پسند کریں گے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ باتیں اب اُس زمرے میں داخل سمجھی جاتی ہیں جنہیں پُرانی قدریں کہا جاتا ہے اور جس کا مٹ جانا اور مٹا ڈالنا ہی "ترقی" کا عنوان سمجھ لیا گیا ہے۔ تاہم اس خیال سے کہ ع

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

اور خاص کر بایں وجہ کہ ان کے کمالاتِ ادبی کو پرکھنے والے اہل کمال تو ماشاءاللہ بہت ہیں اور جب تک اُردو ادب کو بقا ہے، اور بہت سے پیدا ہوتے رہیں گے آں مغفور کے خصائل اور باطنی شمائل جاننے والا، بلکہ اُن سے نصف صدی تک فیضیاب و سیراب ہونے والا اس حقیر کے سوا اب کوئی دوسرا شاید کم نہیں اور یہ حقیر خود قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا ہے۔ اس لئے امید کرتا ہوں کہ اس چراغِ سحری سے اس ضمن میں دو چار باتیں سُن لینا بارِ خاطر نہ ہوگا۔ یہ حقیر اگر کچھ عرض بھی کر سکتا ہے تو بس یہی۔ اس سے سوا اس کی کوئی حیثیت بھی نہیں۔ نہ کسی اور اعتبار و نسبت سے غرض ؎

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مرا
بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس است

حضرت والد ماجد قبلہ نے ۸۶ سال کی عمر میں ۱۲؍رجون ۱۹۳۳ء کو وفات پائی۔ اس وقت اس حقیر کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ گو اس سانحے کو گزرے اب تینتیس ۳۳ برس ہو گئے ہیں لیکن آں مغفور کی ایک ایک بات مجھے اس طرح یاد ہے جیسے کل کی بات ہو۔ انسان پچاس برس تک کسی درخت کے سائے میں بھی لگاتار بیٹھتا رہے تو اس بے جان سے بھی گونہ اُنسیت ہو جاتی ہے وہ تو میرے قبلہ وکعبہ تھے۔ پچاس سال تک اُن کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ اُن کے فیضانِ باطنی سے سیراب ہوا، ان کی شفقت اور توجہِ خصوصی سے سرفراز ہوا۔ جزئیات کو چھوڑ کر اگر خاص خاص باتوں کو بھی بیان کرنے بیٹھوں تو ایک عمر کی داستان ہے۔ شاید یہ سب باتیں سب کی دلچسپی کا باعث بھی نہ ہوں اس لئے صرف دو چار یاد رکھنے کے لائق باتیں ہی عرض کرتا ہوں جن سے معلوم ہوگا کہ انسان کی حیثیت سے بھی وہ کتنے عظیم اور بے مثال تھے۔

اُن باطنی صفات کے اعتبار سے جو انسان کے تمام اعمال و اخلاق کی محرک ہوتی ہیں اور جن سے انسانیت کا شرف قائم ہے، اگر میں عرض کروں کہ حضرت والد ماجد قبلہ ایک ولی کی طرح برگزیدہ انسان تھے تو اسے ہرگز مبالغے پر محمول نہ کیجئے۔ نہ اس میں میرے ذاتی خوشِ عقیدت کا کچھ شائبہ ہے۔ یہ میں پوری احتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ عرض کر رہا ہوں اور کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس ضعیف کی بات کا یقین نہ کریں۔ اس بات میں اس قدر اصرار کرنے پر یوں مجبور ہوا کہ آں مغفور کی آخر عمر میں اُن کے معتقدات کے بارے میں بعض نام نہاد علمبر دارانِ دین نے اُن کے فلسفیانہ مضامین کی بنا پر کچھ شکوک کا اظہار کیا ——— استغفر اللہ ——— اپنے عمر بھر کے ذاتی علم اور کثیر مشاہدات کی بنا پر عرض کرتا ہوں کہ جس قدر خوفِ خدا ان کے تمام اعمال و افعال میں اُن پر مدت العمر تک غالب رہا اس کا عشرِ عشیر بھی ایسے نام نہاد خدائی فوجداروں کو نصیب ہو جائے تو اپنی نجات کی طرف سے مطمئن رہیں۔ اپنے خالق و معبود پروردگار کی ذات سے ان کا تعلق

[redacted]ر رسمی عبادات کے بل بوتے پر نہیں بلکہ ہمیشہ راست بالقلب رہا اور پاکیزگیٔ اعمال کے ذریعے سے ہی آں مغفور نے قربِ خداوندی اور محبتِ الٰہی کے وہ اعلیٰ درجات حاصل کئے، جو نمائشی مسلمانوں میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوتے۔ یہ درست ہے کہ شیخوخیت کے سن کو پہنچ کر وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند نہ رہے تھے لیکن اس عالم میں بھی وہ کبھی یادِ خدا سے غافل نہ رہے۔ میں نے ان آنکھوں سے انہیں اکثر بارگاہِ خداوندی میں سجدہ ریز روتے اور گڑگڑاتے دیکھا ہے۔ نہایت حساس اور رقیق القلب واقع ہوئے تھے۔ جہاں کوئی ایسی بات ہوتی یا کوئی لطیف واقعہ پیش آتا جس سے ان کے قلب پر اثر ہوتا۔ فوراً سجدے میں گر جاتے۔ اس میں وقت اور جگہ، لباس اور طہارت، کی کوئی قید نہ تھی۔ جس عالم میں ہوں اور جہاں ہوں۔ میز کرسی پر، قالین پر، پلنگ پر، دسترخوان پر، فرشِ خاک پر، شرط تھی تو صرف تنہائی کی۔ اگر کچھ غیر لوگ ہوتے تو خاموشی سے اٹھ کر تنہائی میں چلے جاتے۔ اور کمرے کے دروازے بند کر کے سجدے میں گر پڑتے۔ پھر سجدے سے اُٹھنے کے بعد بھی دیر تک گریاں و لرزاں رہتے۔ کسی سے بات نہ کرتے، کبھی کبھی یہ کیفیت دو دو تین تین دن تک متواتر طاری رہتی اور بار بار سجدے کرتے رہتے۔

نماز بھی جب کبھی پڑھتے پوشیدہ طور پر سب کی نظروں سے چھپ کر تازہ غسل کے بعد ہمیشہ نماز پڑھتے تھے۔ ادھر غسل سے فارغ ہوئے اور کمرے کے دروازے بند کر دیے گئے۔ پھر آدھ گھنٹے پون گھنٹے کے بعد برآمد ہوتے۔ عیدین کی نماز کے لئے عیدگاہ جانا فرض سمجھتے اور جب تک چلنے پھرنے کی طاقت رہی یہ وضع کبھی ترک نہ کی۔ گھر کے سب مردوں، لڑکوں بالوں کو اپنے ہمراہ عیدگاہ لے جانے پر اصرار فرماتے، کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ خود تیار ہو کر نچلی منزل میں تشریف لا چکے ہیں اور سب بڑے بھی تیار کھڑے ہیں، سواریاں آچکی ہیں لیکن کوئی لڑکا ابھی تک تیار نہیں ہے تو ایک ایک کو آوازیں دیتے اور اس کے آنے تک انتظار فرماتے۔ دلی کی جامع مسجد سے انہیں بے انتہا محبت تھی۔ صلائے عام

کی لوح پر اُس کی تصویر چھپا کرتی تھی۔ سفر پر جانے سے پہلے یا باہر سے واپس آنے پر، پہلے سیدھے جامع مسجد تشریف لے جاتے۔ دو رکعت ادا کرتے، پھر حویلی تشریف لاتے۔ پنشن لینے کے بعد جب مستقل طور پر دلی میں رہنے لگے تو روزانہ شام کو جامع مسجد تشریف لے جاتے۔ جب تک صحت رہی جامع مسجد کے چوک کا پھیرا ناغہ نہیں ہوا۔ جب تک سیڑھیاں چڑھ سکتے تھے جنوبی دروازے کی طرف سے جو مٹیا محل کے رخ ہے اوپر تشریف لے جاتے، حوض پر جا کر کلی کرتے، دو ایک بار چہرے اور آنکھوں پر پانی ڈالتے، پھر مکبّر کے بائیں جانب اندرونی دالان کے چبوترے کے پاس پہنچ کر دوگانہ ادا کرتے، کبھی صرف سجدہ کرتے اور نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ آنکھیں بند کر کے دُعا کرتے ــــ اکثر رقّت طاری ہو جاتی ــ رُومال سے آنکھیں پونچھتے واپس آتے اور مشرقی دروازے سے جو قلعے کی طرف ہے سیڑھیاں اُترتے۔ وہیں ان کے محبوب کتب فروش، کباڑیے، اور نوادر فروخت کرنے والے بیٹھتے تھے۔ گھنٹے پون گھنٹے تک ان میں گم ہو جاتے۔ سبھی کباڑیے ان کے شیدائی تھے کہ منہ مانگے دام پاتے تھے، چاروں طرف سے "میر صاحب" "ڈپٹی صاحب" "نواب صاحب" کی آوازیں لگاتے گھیر لیتے، کوئی پرانی قلمی کتاب دکھاتا، کوئی قلمی تصویر، یا کوئی پرانا سکّہ، کوئی نادر چیز پسند آجاتی تو خرید لیتے، پھر سامنے کے رُخ حضرت سرمد شہیدؒ اور ہرے بھرے صاحبؒ کے مزارات پر فاتحہ پڑھتے۔ دو ایک فقیروں کو کھانا کھلواتے اور خود بھی اکثر وہیں جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر، شربت، فالودہ، قلفی وغیرہ نوش فرماتے اور بعد مغرب حویلی واپس آجاتے۔

یہ اُن کا روزانہ کا معمول تھا جس میں آخری علالت تک کبھی فرق نہیں آیا، دلّی والوں کی وضع داری اب ایک بے معنی سا لفظ اور بسری کہانی بن گئی ہے اس لئے کہ اس کو معنی بخشنے والی ہستیاں ایک ایک کر کے سب خاک میں جا سوئیں۔ حضرت والد ماجد مرحوم اس وضع داری کے پیکر تھے۔ لباس و اطوار، آداب و طرز گفتار میں جو روش اختیار

کی عمر بھر اُسی پر قائم رہے۔ عزیز و اقارب ملنے جلنے والوں سے بھی جو طرز تپاک قائم کیا آخر تک اُسے نبھایا۔ چاہے اُس میں ذاتی تکلیف اور پریشانی بھی اٹھانی پڑے یوں کم آمیز تھے لیکن جس سے ایک بار رسم ہوگئی کبھی ترک نہ کی۔ اس کی ان گنت مثالوں میں سے صرف ایک سن لیجئے۔ صلائے عام آغاز سے لے کر آخری پرچے تک یعنی ۱۹۰۸ء سے لیکر ۱۹۳۲ء تک ایک ہی کاتب نے لکھا، میر احمد ان کا نام تھا۔ عزیزوں میں ہی سے تھے، اس طویل مدت میں بارہا ایسا بھی ہوا کہ کسی فروگذاشت کی بنا پر اُن سے ناراض ہوگئے، یا وہ خود کسی وجہ سے کام چھوڑ کر گھر چلے جاتے، آں مغفور پھر اُنہیں بُلا لیتے، خود معافی چاہتے، اور تنخواہ میں مزید اضافہ کر کے پھر اُنہیں رکھ لیتے۔ میر احمد صاحب اور ان کے فرزند سید احمد صاحب جو مطبع ناصری کے پریس مین تھے مدت العمر تک آں مغفور سے منسلک رہے۔ اسی طرح اور بہت سے خورد و کلاں اُن سے متوسل رہے۔ کنبہ پروری اور اقربا میں میل جول قائم رکھنا ایسی خاص روش لطف و کرم تھی جسے آخر دم تک نبھاتے رہے۔ حد درجے کے صلح خُو اور صُلح جُو تھے ـــــ کوئی عزیز کسی دوسرے عزیز سے کسی بات پر ناراض ہو جاتا تو خود منانے جاتے۔ اُس کی جانب سے معافی تلافی کرتے، خود بُرا بھلا سُنتے، لیکن آپس میں صلح صفائی کرا دیتے، اور سب کو جمع کرتے اپنے ساتھ چاء پلاتے جو ان کی محبوب ترین ادا تھی۔ یہ مروتیں، یہ سلوک، ایسی نوازشیں اور لطف و کرم کی ادائیں اب کہیں دیکھنے کو تو کیا، سننے میں بھی نہیں آتیں۔

رحم دلی بھی اُن پر ختم تھی۔ کبھی کسی انسان کو اُن کی ذات سے کسی قسم کی تکلیف یا رنج نہیں پہنچا۔ کبھی کسی کو دکھ نہیں دیا۔ سب ہمیشہ اُن سے خوش اور وہ سدا سب سے راضی رہے۔ کہنے کو یہ بات بڑی آسانی سے کہہ دی گئی، لیکن غور کرنے کے لائق ہے کہ محض یہی ایک بات جو بظاہر معمولی سی سمجھی جاتی ہے کیا کسی انسان کی عظمت کا کافی ثبوت نہیں ہے۔ انسان تو انسان انہوں نے دانستہ کبھی کسی حیوان کو بھی اذیت نہیں پہنچائی شکار

سے انہیں ہمیشہ دلی نفرت رہی، گو ملازمت کے زمانے میں بندوقیں، رائفلیں وغیرہ بہت سی رکھیں، جن پر (اب ندامت کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں) اکثر میرا تصرف ہی رہا۔ اُن سے چھپ چھپ کر شکار کو جاتا تھا۔ خود تو آں مغفور نے کبھی مچھر تک نہیں مارا۔ حشرات الارض بھی اُن سے محفوظ رہے، حویلی میں جا بجا چڑیوں کے لئے پانی کی کنڈالیاں دھری رہتیں۔ جن میں دونوں وقت تازہ پانی بھروانے کا بڑا اہتمام رہتا تھا۔ ملازموں کی سب سے بڑی خدمت یہی تھی، اپنی چا، وغیرہ میں دیر ہو جاتی تو پروا نہ کرتے، لیکن اگر ان کنڈالیوں میں پانی نہ بھرا جاتا تو رنجیدہ ہوتے۔ گو پرندوں سے بڑی محبت کرتے تھے لیکن کبھی کسی چڑیا کو مقید کر کے انہوں نے نہیں رکھا۔ اُن کے حینِ حیات حویلی میں کسی کی مجال نہ تھی کہ پنجرے میں بند کر کے طوطا، مینا یا لال وغیرہ پال سکے۔ بچوں سے بھی بہت محبت کرتے تھے اور ان سے خود بچوں کی طرح باتیں کرتے تھے۔

صداقت و راستبازی بھی آں مغفور کے کردار کی نمایاں خصوصیت تھی۔ زندگی کے ہر شعبے اور ہر فعل میں ہمیشہ راست بازی سے کام لیتے۔ اس میں کئی بار انہیں نقصانات بھی اٹھانے پڑے لیکن کبھی کسی قیمت پر بھی غلط بیانی یا اخفائے حق انہیں گوارا نہ ہوا، مکر اور تصنع کو بھی سخت ناپسند کرتے تھے، اگر کسی سے کسی بات پر ناراض ہو جاتے تو اس سے گفتگو ترک کر دیتے تھے۔ اگر وہ حیلہ تراشی کی بجائے سچائی کے ساتھ معافی کا خود خواستگار ہوتا تو فوراً معاف بھی کر دیتے اور اپنی ناراضگی کو بالکل بھول جاتے۔ دوسروں کی غلطی پر اس قدر ناراض نہ ہوتے جتنا غلطی کو جھوٹ یا چالبازی سے چھپانے پر۔ خود جو کچھ دل میں ہوتا وہی زبان پر بھی ہوتا۔ اُن کی زبان اور قلم ہمیشہ اُن کے قلب کی سچی ترجمانی کرتے رہے۔

فقر و استغنا اور درویشانہ طور طریق بھی آپ کی سیرت کی نمایاں خصوصیت تھی۔ ملازمت کے زمانے میں جب فوجداری کے اختیارات رکھتے تھے، شرفا کے ساتھ خاص

رعایت کرتے تھے۔ سزا دینے سے زیادہ معاف کر دینے کے خود جویا رہتے تھے، نجابت و شرافت کی معمولی اداؤں کی بڑی قدر و تکریم کرتے تھے، لیکن ناحق رعب داب کسی کا نہیں مانتے تھے نہ ایسوں کو گردانتے تھے۔ حاجت مند کی حاجت روائی سے مقدور بھر دریغ نہ کرتے تھے۔ خود نہایت غیور اور خوددار تھے۔ اگر کوئی غیور دستِ سوال دراز کرنے سے گریز کرتا تو پوشیدہ طریقے سے اُس کی امداد کرتے تھے۔ غربا و مساکین کو نقد خیرات کی بجائے کھانا کھلا دینا بہتر سمجھتے تھے، جامع مسجد کی سیڑھیوں پر اکثر غربا کو قطار در قطار بٹھا کر خود کھانا کھلاتے تھے۔

ان اعلیٰ صفات کے ساتھ مزاج میں لطافت، بذلہ سنجی اور تفنن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ لطائف و ظرائف سے بڑا شغف تھا۔ ہمیشہ ہنستے مسکراتے رہتے اور بات بات پر کوئی لطیفہ یا نقل سُنا سُنا کر خود ہنستے اور سب کو ہنساتے رہتے۔ کوئی رنج یا فکر ہوتا تو کسی کے سامنے اس کا تذکرہ نہ کرتے، نہ عزیزوں کے سامنے پریشان کن یا رنجیدہ باتیں کرتے۔ اُن کی صحبت میں بیٹھنا، اُن کے ساتھ چاء یا کھانے میں شریک ہونا بذاتِ خود ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھا، یہ پُر لطف صحبتیں، یہ گرمئ مجلس، یہ دلچسپیاں، یہ شفقتیں، محبتیں اب خواب و خیال ہو گئیں۔ کہنے کو یہ سب باتیں معمولی نظر آتی ہیں لیکن یہی معمولی باتیں اگر اس دور میں کسی ایک انسان میں یکجا پائی جائیں تو یہ حقیر اس ضعیفی کے باوجود ایسے عظیم انسان کی زیارت کے لئے سر کے بل حاضر ہونا سعادت سمجھے۔

باپ کی حیثیت سے وہ کیسے تھے؟ مٹی کے کوزے کی کیا مجال ہے کہ کوزہ گر کے فضائل بیان کر سکے ـــــ حضرت والد ماجد قبلہ کو اپنے والد ماجد (یعنی خلد آشیانی حضرت دادا جان مغفور) سے بے پناہ عقیدت تھی۔ ان کی خوشی کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اب ایسے باپ کی شان میں اُن کا یہ نالائق بیٹا بھلا کیسے لب کشائی کی جرات کرے۔ اور ان بے پایاں نوازشوں کا کس مُنہ سے ذکر کرے جو آں مغفور اس حقیر پر صرف

فرمایا کرتے تھے۔ محبت، شفقت، لاڈ پیار، عام چیزیں ہیں اور کم وبیش سب ہی والدین کی طرف سے ان کی اولاد کو یہ نعمتیں حاصل ہوتی ہیں۔ تعلیم و تربیت بھی والدین کا حق ہے اور عام طور پر سبھی والدین اپنی بضاعت سے بڑھ چڑھ کر اس حق کو ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے مقدور سے زیادہ دنیا جہان کی نعمتیں اُن پر نثار کرتے رہتے ہیں بحمداللہ یہ سب نعمتیں مجھے بھی بدرجہ وافر حاصل ہوئیں لیکن اس سے ماسوا، وہ نادر و بے بہا نعمتیں بھی حاصل ہوئیں۔ جنہیں لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا، یہ لاچاری اُن کم معلوم و مُبہم اثرات سے مماثل کہا جا سکتا ہے جنہیں صوفیا کی اصطلاح میں "فیضان باطنی" سے موسوم کیا جاتا ہے، جو نئی قدروں والوں کی سمجھ میں کچھ آتی ہیں کچھ نہیں آتیں۔ کس مُنہ سے شکر بجا لاؤں ان تمام عظیم نعمتوں کا جو آں مغفور کی نظرِ کرم سے اس حقیر و ہیچ، کندۂ ناتراش کو عمر بھر نصیب ہوتی رہیں۔ اُن کی مسلسل توجہ نے اس حیوانِ مطلق کو آدمی، آدمی سے انسان، اور انسان سے مسلمان بنایا۔ ان اقدار کو سمجھنے کی صلاحیتیں بخشیں جن کے لئے زندہ رہنا اور جن کی خاطر مرجانا مقتضائے انسانیت ہے۔ علم و آگہی کے ساتھ بصیرت و احساس کی دولت عطا کی۔ عزت نفس، اور سیر چشمی کے ساتھ استغنا اور توکل علی اللہ کی ادائیں سکھائیں۔ چارہ جوئی سے زیادہ چارہ گری کے اطوار سکھائے۔ شکایت سے زیادہ شکر کے طریقے سمجھائے۔ شرافت اور شائستگی کی نزاکتیں سمجھائیں۔ خودداری کے ساتھ حفظِ مراتب کے آداب بتائے، غرض فی الجملہ قبلہ رو کر کے ایک کامیاب و بامقصد راست و پُرمسرت زندگی بسر کرنے کے رموز سکھائے۔ اگر ان کے سکھائے ہوئے سبق یاد نہ رکھ سکا اور ان کی توقع کے مطابق اپنی حیات کو نہ ڈھال سکا تو دوش سر تا سر خود میرے اعمالِ سیہ اور تیرہ بختی کا ہے۔ اگر ایک ایک کر کے ان تمام احسانات کی تفصیل بیان کروں تو میری بقیہ عمر تک یہ روئیداد ختم نہ ہو۔ شکر ادا کیا چاہوں تو بھی ممکن نہیں۔ اس سعی میں اپنی جان بھی نذر کر دوں تب بھی ان کے عظیم احسانات کا

حق ادا نہ ہو۔ اس لئے خود آں مغفور کی پیروی کرتے ہوئے اتنا لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ

"جس طرح اللہ کریم نے میرے والد ماجد کی دعاؤں کی برکت سے
مجھے زندگی بھر بیش از بیش انعامات سے نوازا، بھروسا ہے کہ آخرت
میں بھی وہ غفور الرحیم انہی کے طفیل اس سیہ کار کو بخش دے گا۔"

شاید یہ میری بات کچھ عجیب و بے ہنگم سی معلوم ہو، اس طور اعلانیہ کہنے کی بھی نہ تھی لیکن اس خیال سے کہ شاید میری یہ آخری تحریر ہو، میں نے جان بوجھ کر اس موقع کو غنیمت سمجھا، کیا عجب ہے کہ میری یہی آخری تحریر میری نجات کا باعث بن جائے۔ اس رحیم وکریم کو تو رحم فرمانے کے لئے معمولی سا ایک بہانا ہی چاہیے! اگر نئی قدروں' والوں میں سے کسی کو میرا اتنا لکھا ناگوار گزرے اور کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو میری قسمت، اگر ناگوار نہ ہو اور کچھ سمجھ میں بھی آجائے تو اُن کی قسمت۔

معلوم نہیں میری اس تحریر سے میاں انصار کا جو مدعا تھا وہ پورا ہو سکا یا نہیں لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ ان معروضات کو لکھتے لکھتے میری اپنی جو غرض بن گئی تھی وہ ضرور پوری ہو گئی۔

حضرت والد ماجد مرحوم ومغفور کی آخری اور مستقل یادگار ہونے کی حیثیت سے اس کتاب کی جو قدر ومنزلت میرے دل میں ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ میاں انصار نے اس کی تیاری میں جو تکلیفیں اٹھائیں اور برسوں تک مسلسل محنت کی اُس کی دل سے قدر کرتا ہوں، ان کی اس خدمت گزاری سے ذاتی طور پر مجھے جو قلبی اور روحانی خوشی حاصل ہوئی اس کا صلہ میرے ذمے ہے ــــ یہ معاملہ اُن کے 'میرے اور اللہ کریم کے مابین ہے!ــــ ہاں، ان نادر ونایاب مضامین کی تلاش اور ایسے ناممکن حالات میں ان کی بازیافت، ترتیب اور تدوین، ایک لائق قدر علمی خدمت بھی ہے، جس کی داد وقدر شناسی ارباب علم وفضل کے ذمّے ہے یقین ہے کہ وہ جائز قدردانی اور

مناسب حوصلہ افزائی میں بخل نہ کریں گے۔

بھلا یہ ناقص و بے ربط معروضات اس لائق ہیں کہ حضرت والد ماجد مرحوم و مغفور کے گراں مایہ مضامین کے ساتھ اس کتاب میں شامل کئے جائیں۔ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند مناسب نہیں البتہ "مقامات ناصری" میں شامل ہونے کے لائق ایک اور چیز پیش کرتا ہوں، اس سے میاں انصار کی "تبرک" والی غرض بھی انسب طور پر پوری ہو جاتی ہے۔ کتاب میں حضرت والد ماجد مرحوم کے وہ مضامین درج کئے گئے ہیں جن کا روئے سخن ارباب علم ہی کی طرف ہوا کرتا تھا، انہی کے لئے یہ مضامین صلائے عام میں شائع کئے جاتے تھے اور انہی میں یہ رسالہ تقسیم کیا جاتا تھا، جو ان کے ادائے بیان اور حکیمانہ نکات کے قدردان تھے، میں آں مغفور کی چند ایسی تحریریں پیش کرتا ہوں جو شائع ہونے کے لئے ہرگز نہیں لکھی جاتی تھیں، اور جن کا مخاطب صرف یہ حقیر ہوا کرتا تھا۔ یعنی میرے نام نجی خطوط جو آں مغفور ضرورتاً نہیں بلکہ محض اپنی بزرگانہ شفقت ارزانی کے لئے مجھے پابندی سے تحریر فرمایا کرتے تھے۔ آں مغفور کے احباب کے علاوہ عزیزوں میں صرف یہ حقیر ہی وہ خوش نصیب تھا جسے آں مغفور زندگی بھر اس طرح نوازتے رہے۔ ان سینکڑوں خطوط میں سے جو آں مغفور کے دست و قلم کے لکھے میرے پاس اب تک حرز جاں کی طرح محفوظ ہیں، دو چار خطوط ارباب علم و فضل کی نذر کرتا ہوں کہ وہ ان کی قدر و منزلت جان سکتے ہیں اور مجھ سے زیادہ ان کے محاسن سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہ نجی خطوط بھی ان کی مخصوص ادائے بیان کے حامل ہیں اور شاید اس لحاظ سے اور بھی قدر کے لائق ہیں کہ ان سے حضرت والد ماجد مرحوم کے شمائل باطنی کے بعض پہلو جن کا میں نے مختصراً ذکر کیا اُجاگر ہوتے ہیں۔ میرے لئے یہی اعزاز، باعث صد افتخار ہے کہ ان بے مثال مکاتیب کا مکتوب الیہ رہا۔ میری جانب سے "مقامات

ناصری" کے لائق و فاضل پڑھنے والوں کی خدمت میں یہ حقیر نذر قبول ہو — سوائے آخری خط کے جو آخر ہی میں درج ہے باقی خطوں کی کوئی خاص ترتیب نہیں۔ ان کے لازوال مضامین کی طرح ہر خط اپنی جگہ مکمل ہر وقت تازہ اور غیر فانی ہے۔ اپنی جانب سے کسی خط کے بارے میں کچھ عرض نہیں کروں گا۔ یہ اگر کر سکتا تو ہر خط میرے لئے ایک مستقل کتاب کا درجہ رکھتا ہے۔ بلاحاشیہ چڑھائے ... نقل کرتا ہوں۔

بیٹا —

"تمہارا خط کل تیسرے پہر کو مجھے ملا۔ ارادہ کیا کہ اسی وقت جواب لکھوں کیوں کہ جواب سے غرض تم سے باتیں کرنی ہوتی ہے۔ لیکن باتیں اسی وقت اچھی طرح ہو سکتی ہیں جبکہ دل خوش ہو اور طبیعت کو کسی طرح کی الجھن نہ ہو۔ اس لئے آج صبح چائے پی کر آتش دان کے پاس بجلی کی روشنی میں تمہیں خط لکھنے بیٹھا ہوں۔ پہلے اس وقت کی چار کا حال سن لو۔ ۵ بجے صبح سے انگیٹھی گرم ہوئی اس کے بعد چائے پینے والے اور والیاں جمع ہونے لگیں۔ سترہ آدمیوں، لڑکیوں اور لڑکوں نے چائے ساتھ پی۔ سب سے مقدم چائے کے اہتمام میں فنّی[1] بیگم ہیں جن کا نام پھلپی دیوالی سے لچھمی ہو گیا ہے۔ ان کے ذمہ دونوں وقت بلکہ ہر وقت میری چائے کا انتظام ہے۔ کھانا کھلانے کی نوکری دونوں وقت کی ان کی بڑی بہن حمّی کے ذمّے ہے۔ یہ دونوں لڑکیاں چائے اور کھانے میں بہت آرام دیتی ہیں چائے میں اکثر یہ چیزیں ہوتی ہیں۔ انڈے، مکھن، توس، پنیر، جیلی اور سب سے زیادہ عمدہ چیز کچوریاں گرم گرم۔ گرم گرم اس لئے کہ کڑھائی یہیں چڑھتی ہے اور کڑھائی سے گرم گرم اترتی جاتی ہیں اور میں کھاتا جاتا ہوں۔ کچوریاں کباب

---

[1] فنّی اور حمّی بندہ زادیوں کے پیارے نام ہیں۔ (انصار علی)

کے ساتھ کھائی جاتی ہیں۔ چار بہت نفیس ہوتی ہے جو پانچ روپے پونڈ سے کم نہیں ہوتی۔ اس سے زیادہ تکلف کی چائے ممکن نہیں، یہ سب چائے پی پلا کر رخصت ہو جاتے ہیں اور میں اپنے لکھنے پڑھنے کے دھندے میں لگ جاتا ہوں۔ تم بتاؤ کہ تم کو یہ لطف حاصل ہے۔؟ مگر تم ابھی نوکری کے دھیان میں لگے رہو۔ اور میری طرف سے اطمینان رکھو۔ . . ."

بیٹا۔

میری ایک آرزو یہ ہے کہ کتب خانے والامکان تکلف سے آراستہ ہو جائے۔ اور میں دن رات وہیں پڑا رہوں۔۔ اگر تم ساتھ چائے پینے آجاؤ تو کیا کہنا۔ مگر کوئی معمولی ذکر کسی کا نہ ہو۔۔ کھانا جب بھوک لگے مل جائے اور کوئی لڑکی آکر کھلا جائے کوئی نایاب کتاب یا چیز نظر آئے تو مجھے اتنا مقدور ہو کہ فوراً خرید لوں۔ رات کو بے فکر سوؤں اور صبح خوش اٹھوں۔ کوئی مسئلہ فلاسفی کا جو سمجھ میں نہ آتا ہو اسے سمجھ لوں اور دوسروں کو سمجھا سکوں۔ دنیا کی جتنی کتابیں دل و دماغ کو خوش کر سکیں سب میرے پاس ہوں۔ جاڑے میں انگیٹھی ہو اور گرمی میں برف۔ برسات میں کمرے کے اندر بیٹھا ہوں اور وہ ٹپکتا نہ ہو۔ رات کو خوبصورت کینڈل سٹک CANDLE STICK کی روشنی ہو اور جو کتاب مجھے پسند ہو وہ میرے سامنے ہو، تم اتنا سامان میرے لئے کر دو تو I SHALL DIE HAPPY

بیٹا۔

". . . . اب مجھے اپنی جوبلی کا فکر ہو رہا ہے کہ تم سب کو میری اس لمبی

عمر کی خوشی منانی چاہیئے۔ کہ اس خاندان میں مجھ سے بڑا کوئی نہیں ——— وحدہٗ لاشریک لہٗ تمہاری والدہ کے انتقال کے بعد سے ہو گیا تھا کہ کوئی گلے کا ہار نہیں اور اب اس طویل عمر سے جلّ جلالہٗ کا رُتبہ حاصل ہو گیا کہ کُنبے بھر میں کوئی مجھ سے بڑا نہیں۔ اس لئے میں جوبلی کا مستحق ہوں۔۔۔۔۔"

بیٹا۔

"یہ مہینہ دسمبر کا ہے جس میں تم آؤ گے۔ اب اس میں تھوڑے دن باقی ہیں پھر بھی میں بہانے ڈھونڈا کرتا ہوں کہ جب تک تم آؤ تم سے باتیں کرنے کا کوئی نہ کوئی حیلہ نکل آئے۔ کل لالہ سری رام کا خط ولایت سے آیا جس میں انہوں نے لندن کا حال مفصل لکھا ہے۔ میں نے ولایت تو کیا سمندر، جہاز کلکتہ، مدراس وغیرہ بھی نہیں دیکھے۔ مجھے تمام دنیا میں ہندوستان، ہندوستان میں دلی، دلّی میں فراش خانہ، فراش خانے میں اپنا گھر، اس گھر میں یہ کوٹھری پسند ہے جس میں انگیٹھی جل رہی ہے اور بجلی روشن ہے۔ میں انگیٹھی سے چمٹا بیٹھا ہوں۔ اخبار، رسالوں، اور کتابوں کا ڈھیر ہے، ایک کتاب سے جی ہٹا تو دوسری اٹھالی، اور سب سے گھبرا گیا تو گدّے پر پڑا رہا۔ بیٹی حمیؔ کھانا کھلانے اور چھوٹی ٹمیؔ چائے پلانے کو آگئیں۔"

بیٹا۔

اب کی دفعہ میری بیماری سے تمہیں بہت فکر ہوا۔ اور میں بھی کچھ کچھ آثار سفر آخرت کے دیکھ رہا تھا۔ بارے تمہاری پریشانی خدا نے دیکھ لی اور میں نے بھی ابھی چند روز اور جینے کا ارادہ کر لیا ہے۔ خدا نے اپنا فضل کیا۔ جب

تمہیں میری وجہ سے اس قدر پریشانی ہوئی تو مجھے چاہیے کہ خدا کے فضل کا بھی تم سے ذکر کروں تاکہ تم خوش ہو۔

بڑھاپے کی وجہ سے اب کی بیماری میں زیادہ اندیشہ رہا۔ خاص کر اس وجہ سے کہ بیماری زیادہ ٹھہری۔ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری شکایت ہوگئی، آخر میں تیز بخار ہوگیا جس سے معمول سے زیادہ تکلیف ہوئی۔ اس تکلیف میں دو دفعہ رات کو تمہاری بی بی کو جگایا اور ایک دفعہ اتنا گھبرایا کہ نیچے کے گھر میں چلا گیا۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ مر رہا ہوں۔ اور والد ماجد مرحوم نے مجھے زمین پر سے اٹھا کر گود میں لے لیا۔ اور زبان مبارک سے فرمایا — "افسوس کیسا اچھا لڑکا مر رہا ہے۔"

یہ آواز میرے کان میں صاف صاف آئی۔ اور ابھی وہ مجھے سنبھالے ہوئے تھے کہ میری آنکھ کھل گئی۔ میں گھبرا کر نیچے گیا، اور یہ خواب سب لڑکیوں سے بیان کیا۔ میں نے کبھی والد ماجد کو اپنی طرف سے اس قدر خوش نہیں دیکھا — باپ کا خوش ہونا میری نگاہ میں ہزار بہشت اور لاکھ نعمت سے بہتر ہے۔ جس محبت اور پرورش اور الطاف سے میں نے اُن کی زبان سے یہ لفظ سُنے میں قیامت تک نہیں بھولنے کا۔ قیامت میں یہی لفظ میری نجات کا ذریعہ ہوں گے۔ اب مجھے کامل یقین ہے کہ دین و دنیا میں میرا بیڑا پار ہوگیا۔ دین کا ثبوت دیکھ لو کہ جس کا باپ بیٹے سے خوش ہو اس کی خوش نصیبی میں کیا شک ہے۔ رہا دُنیا کا معاملہ یہ بھی میرے باپ کے صدقے میں ایسا گزرا کہ خدا سب کو نصیب کرے۔ آج میں بہت خوش ہوں تم بھی میرے ساتھ خوش ہو۔

تم اس خط کو رکھ چھوڑنا کہ میرے اعتقاد کا گواہ ہے اور میری وصیت[1] یاد رکھنا کہ والد ماجد کی پائنتی مجھے گاڑ دینا ۔ اور ان کے کٹہرے سے ملا دینا۔ اس کے بعد مجھے کوئی تمنا نہیں لوح پر اگر تم کرسکو تو یہ شعر کندہ کرا دینا ؎

جایم بروزِ واقعہ پہلوئے او کنید
او قبلۂ من است رُخم سوئے او کنید

بیٹا۔

"گھر والوں کو میری وجہ سے کسی قسم کی تکلیف نہیں اور اس احساس سے میں بہت خوش ہوں۔ تمہیں جو میری وجہ سے فکر اور تردّد رہتا ہے یہ تمہاری سعادتمندی کا تقاضا ہے...... مگر میں چراغ سحری ہوں اور چراغِ سحری کو رات کی فکر کرنی غلطی ہے...... رات جتنی تھی جس طرح ہوا گزر گئی، اب صبح کے چراغ کے لئے بجھنے کے سوا کیا باقی رہ گیا ہے دنیا میں آرام کی تمنا نہیں اور نہ امید ہے، صرف مجھے اپنے طور پر جی لینے دو — چند روز میری زندگی کے باقی ہیں میں نہیں چاہتا کسی وجہ سے رنجیدہ ہوں۔ میں اپنا رونا رو چکا، اب تم جانو اور تمہارا کام، مگر دیکھو خدا کو نہ بھولنا اس نے بڑی بڑی مصیبتوں میں تم کو بچایا ہے۔"

---

[1] پروردگارِ عالم کا شکر بجالاتا ہوں کہ اس وصیت کی تعمیل کی توفیق حاصل ہوئی۔ (انتصار علی)

بیٹا۔

تمہارے خط سے جو ابھی پہنچا میں بہت خوش ہوا۔ تم ناحق ذیابطیس کا وہم کرتے ہو۔ مجھے ذیابطیس کی شکایت (یا جسے میں ذیابطیس سمجھا) برسوں سے ہے، ڈاکٹروں اور حکیموں نے جب بھی معائنہ کیا اپنی اپنی سمجھ کے موافق اسے ذیابطیس ہی قرار دیا۔ میں نے تمام بیماریوں میں ذیابطیس سے مرنا زیادہ رومانٹک سمجھا کہ نمونیہ، ہیضہ، طاعون وغیرہ عامیانہ بیماریاں ہیں۔ ذیابطیس ان سب میں دلچسپ اور کم تکلیف دہ ہے خان صاحب محمد علی نے جب یہ سُنا تو بہت ہنسے کہ مرنے میں بھی دلچسپی کا خبط۔ غرض میں اس بیماری سے خوش ہوں۔ جن لوگوں نے مجھے اس بیماری سے مرنے کا خوف دلایا اُن کے جواب میں میرا یہ عقیدہ ہے کہ جبتک مجھے ڈرانے والے نہ مرلیں میں نہیں مرنے کا۔ اکثر ان میں سے بہشت نصیب ہو چکے۔ مجھے جوانی میں بھی اس طرح کی کچھ شکایت تھی، ان دنوں میں بیکانیر کے دورے پر تعینات تھا۔ اس علاقے میں پیلو بہت ہوتا ہے میں نے پکے پیلو بہت کھائے، اس سے یہ شکایت جاتی رہی یا کم ہو گئی۔ احباب کو تعجب ہوا کہ یہ عجیب علاج ہے۔

میرے مزاج میں غذا کی طرف سے احتیاط کم ہے۔ کبھی کسی قسم کا پرہیز نہیں کیا حالانکہ اس میں شُدرہ چیزوں کا بہت پرہیز بتاتے ہیں اور یہاں عمر بھر چلتے اور کافی کا زور رہا۔ سوائے پیشاب زیادہ اور بار بار آنے کے اور کوئی خاص شکایت نہیں۔ زیادہ پیشاب آنے سے یہ فائدہ ہے کہ دماغ بہت صاف رہتا ہے۔ ذرا بھی پیشاب میں کمی ہو تو سر کا بُرا حال ہو جاتا ہے اور پیشاب کا رُک جانا تو موت ہے۔

میں نے دیکھا کہ ذیابطیس میں دماغ کو بہت دخل ہے۔ دماغی محنت ذیابطیس کی جڑ ہے لیکن اب اس کی وجہ سے تو دماغ کو معطّل نہیں کیا جا سکتا۔ میری رائے میں یہ ذیابطیس ہی پر موقوف نہیں، جس بیماری کا خیال زیادہ کرو وہی لاحق ہوتی ہے اور اگر اس بیماری سے مرنے کا خوف کرو تو اکثر یہ اندیشہ صحیح نکل آتا ہے۔ انسان یہ خیال نہ کرے کہ مجھے ذیابطیس ہے، یہ خیال بیماری کا معین ہو جاتا ہے۔ میں نے ڈاکٹروں سے از روئے دعویٰ کہہ دیا کہ اور کسی بیماری سے مر جاؤں تو خیر، مگر ذیابطیس سے نہیں مر سکتا یہ دعویٰ اب تک تو پورا کیا۔ ۸۰ سے متجاوز ہوں اور کوئی خاص شکایت نہیں۔ دماغ تو لاجواب ہو گیا معمولی احتیاطیں جو لازمی ہیں وہ از خود پوری ہو رہی ہیں۔ چلنا پھرنا، اس قدر کہ تکان نہ ہو، اتنا ہی میں چلتا ہوں۔ نیند جس قدر آئے مفید ہے، مجھے کم آتی ہے اس مرض میں عورتوں سے علیحدگی بھی بتاتے ہیں، سو میرے لئے تو اس کا سوال ہی نہیں ہو سکتا کہ احتیاط شرط ہو، فکر سے بچے، ہوس کو چھوڑے یہ خود بخود ہو رہا ہے۔ خاص کر یہ سمجھ لینا ضرور کہ ذیابطیس ہو، ہوا کرے مجھے کچھ فکر نہیں۔ یہ میں ڈاکٹروں کی ضد میں خود کر رہا ہوں"۔

برخوردار من ۔

جانے دے چارہ گر شبِ ہجراں میں مت بُلا
وہ کیوں شریک ہوں مرے حالِ تباہ میں

طبیعت کل سے گھبرا رہی تھی۔ اُٹھا بیٹھا نہیں جاتا۔ تمہارا بہت انتظار رہا لیکن تم نہ آسکے۔ میرا قیاس ہے کہ زیر باری کے خیال سے تم نے یہاں

آنے میں تامّل کیا۔ اس میں شک نہیں کہ تمہارے ذمے یہ خرچ میرے سبب سے پڑے گا، لیکن مجھے یقین ہے کہ خدا تم سے ضرور خوش ہوگا۔ چند روز بعد پھر ہزار خرچ کرنے سے بھی میں نظر نہ آؤں گا۔ اب وقت بہت نہیں رہا کہ میں جب تمہارا جی چاہے مل سکوں۔

اس قدر لکھا تھا کہ تمہارا خط اسی وقت آیا۔ خیریت معلوم ہونے سے خوشی ہوئی، اور اس سے زیادہ اس بات کی کہ تم جلد آنے والے ہو۔ اب اس خط کو شکایت کا خط نہیں بلکہ 'ویلکم' کا خط سمجھو۔ تمہارے آنے کی مجھے بہت خوشی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میرے سوا اور کس کس نے تمہیں ویلکم لکھا ہے۔ میں کل دُلھن کو سمجھا رہا تھا کہ انصار کی قدر میری نگاہ میں اس سبب سے نہیں ہے کہ انصار میرا لڑکا ہے، اگر وہ غیر بھی ہوتا تو میری نگاہ میں اس کی قدر ایسی ہی ہوتی۔ قدر شرافت اور شائستگی کی ہے نہ کہ محض رشتے کی۔ شرافت جس میں ہو اپنا یا پرایا، عزیز ہو جاتا ہے۔ اگر شائستگی اپنے میں نہ ہو تو اُس سے غیر اچھا جس میں شرافت اور وضع کی پابندی ہو۔

تم آجاؤ گے تو میرے بہت سے کام جو رُکے ہوئے ہیں میری مرضی کے موافق ہو جائیں گے۔ اسباب کی بلٹی انصار کو دے دی۔ سامنے والے کمرے تمہارے لئے درست کر دیے گئے ہیں۔ جلدی آنا۔"

بیٹا۔

ابھی نئی جگہ تعینات ہوئے ہو۔ تمہیں خط لکھنے کی فرصت کم ہوگی! لیکن مجھے اپنا حال لکھنا ضرور۔ پہلی خبر تو یہ ہے کہ میری علالت کا حال سن کر

پرسوں خاں صاحب عطاء اللہ سر دفتر کمشنر دہلی مزاج پرسی کے لئے مکان پر آئے۔ اُن کی کوئی تواضع نہ ہو سکی۔ خیر وہ پرانے شناسا ہیں اور زیادہ دیر ٹھہرے بھی نہیں، رسمی طور پر کھڑے کھڑے آئے اور چلے گئے۔ لیکن آج سہ پہر کو ڈپٹی کمشنر ریڈ صاحب بہادر اور اسسٹنٹ کمشنر ولسن صاحب بہادر، مکان کا پتا پوچھتے پوچھتے اچانک آگئے۔ میں گھبرا کر اٹھا، خس کی ٹٹیاں ہٹا کر انہیں کمرے کے اندر بلایا، کمرہ تمام خراب ہو رہا تھا۔ پانی کاٹب رکھا تھا اور جگہ جگہ کتابیں رسالے وغیرہ پھیلے پڑے تھے۔ کہیں شائستگی سے بٹھانے کو جگہ نہ تھی۔ اتفاق سے بڑے میاں (ملازم) بھی نہ تھے۔ ڈاک خانے گئے ہوئے تھے۔ دونوں لڑکے کہیں سیر تماشے کو نکل گئے تھے۔ یہ صاحبان اچانک آگئے، ان کی چائے وغیرہ یا کسی طرح کی تواضع نہ ہو سکی، انہیں تو کیا، مجھے شرم آئی۔ دیر تک بیٹھے رہے، ریڈ صاحب اپنی جوانی کی، جب وہ میرے ماتحت تھے دلچسپ باتیں پتہ وار مجھے یاد دلا دلا کر سناتے رہے اور خوش ہوتے رہے اور ولسن صاحب کو میرے بارے میں بہت کچھ بتاتے رہے — یہ تازہ ولایت سے آئے ہیں، ولسن صاحب تمہارے ہی علاقے کے افسر ہیں۔ ان کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ دونوں صاحب تم سے خوش ہیں۔ مجھے اس بات سے خوشی ہوئی کہ تم نے اپنی ملازمت میں حاکموں کو راضی رکھا۔ دونوں صاحبان بڑے تپاک اور ادب سے پیش آئے۔ خاندانی انگریز پاس وضع کا بہت خیال رکھتے ہیں، یہ اقبال کے آثار ہیں، جو ہماری سوسائٹی سے اب مفقود ہو گئے۔

میں کئی دن سے جامع مسجد اور چوک کی سیر کو نہیں جا سکا۔ گو طبیعت اب بالکل ٹھیک ہے مگر گرمی اور نقاہت کے سبب جی نہ

چاہا۔ تمہارے بغیر اس سیر کا لطف بھی نہیں، کس کے ساتھ جاتا، وہاں کے کباڑیوں نے جب مجھے اتنے دن سے نہ دیکھا تو سب کا خیال ہوا کہ میں شاید ملکِ عدم کی سیر کو نکل گیا۔ ایک پرانا کباڑیا جو اکثر مجھے چیزیں وغیرہ دیا کرتا تھا، اپنی ضرورت سے یا شاید تحقیق کرنے کہ میں زندہ ہوں یا نہیں کل شام آیا۔ بڑے میاں اُس سے الجھ رہے تھے کہ میں نے آواز پہچان کر بُلا لیا، مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ مجھے بھی اپنی تنہائی کی وجہ سے اس کا آنا غنیمت معلوم ہوا۔ شاہ عالم کی قلمی تصویر جو کسی انگریز یا اطالوی مصور کے ہاتھ کی بنائی ہوئی ہے لایا تھا۔ تصویر جگہ جگہ سے بے رنگ ہو چکی تھی اور دھبے پڑے ہوئے تھے لیکن اس خیال سے کہ یہ ضرورت مند ہے اور آس لگا کر میری تلاش میں آیا ہے میں نے رکھ لی اور جو کچھ اس نے مانگا اُسے دے دیا۔ وہ بہت خوش ہوا اور میں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ اُس کے چلے جانے کے بعد میں نے بے اختیار اُسی فرش پر، اپنی اسی حالت میں خدا کے حضور سجدہ کیا کہ اُس نے ایک حاجت مند کی حاجت پوری کرنے کا مجھے وسیلہ بنایا۔ یہ توفیق اس کی طرف سے بڑا انعام ہے۔ اس ایک سجدے سے جو اضطراراً میں نے کیا، مجھے سچی خوشی حاصل ہوئی، جو علامت ہے قبولیت کی۔ اس کا ذکر تم سے اس لئے کیا کہ تم کو اس خوشی میں شریک کرنا منظور تھا۔ ورنہ یہ باتیں کسی سے کہنے کی نہیں۔

تمہارے بھیجے ہوئے فجری آم اب پک کر تیار ہو گئے۔ میں نے سب کو بانٹ دیے، میرے حصّے کے پانچ آم اب تک باقی ہیں۔ میں روزانہ ایک برف میں لگا کر کھاتا ہوں۔

تم سے جہاں تک ہو سکے جلدی آنے کی کوشش کرنا۔ انصار کو اب یہاں آجانا چاہیے اس کا کالج گرمیوں کی تعطیل کے بعد کھلنے والا ہے پڑھائی کی طرف سے اس عمر میں غفلت مناسب نہیں۔ مجھے بھی وہ اکثر چائے پر یاد آتا ہے۔ اخبار رسالوں کے مضامین پڑھ کر سنانے والا اب کوئی نہیں اُس نے ایسی اس کی عادت ڈال دی کہ اب خود پڑھنا دوبھر معلوم ہوتا ہے...."

برخوردار من۔

آج عید ہے، مگر ہماری عید تمہارے نہ ہونے سے پھیکی رہی۔ کسی کو عیدی نہیں دی گئی میں نے تو کپڑے بھی نہیں بدلے، کھانا بھی مختصر سا کھایا گیا، تیسرے پہر کو معمولاً چائے پر سب شریک ہوئے، مگر میں نے جلدی سب کو ٹالا۔ اکیلا اپنے کمرے میں آبیٹھا۔ جی چاہا کہ تم سے کسی طرح باتیں کروں۔ اسی لئے یہ خط لکھ رہا ہوں

میاں رفیع کی طبیعت اچھی نہیں۔ اس لئے وہ عیدگاہ نہیں گئے۔ وہ اور ان کا لڑکا تہذیب جامع مسجد نماز پڑھنے گئے۔ تمہارے بڑے بھائی نصیر علی، ذکی اور انصار میرے ساتھ عیدگاہ گئے۔ تمہارے چچا مولوی نصرت علی صاحب ان کے لڑکے مستنصر اور نواسے شجاع کو نماز کے لئے لینے میں ان کے مکان پر گیا۔ عیدگاہ سے واپس آتے وقت خاندان کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے قدم شریف گیا۔ تم نے قبروں پر سنگِ مرمر کے کتبے لگوائے، میں نے دیکھے، یہ بڑا ثواب کا کام ہوا۔ انہیں پڑھ کر مرنے والوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ مجھے اپنی فکر ہے کہ والد مرحوم کی پائنتی زیادہ جگہ نظر نہیں آتی۔ بہرحال تم میری وصیّت یاد رکھنا کہ مجھے ان کے قدموں میں گاڑ

دینا — آگے جو خدا کی مرضی۔

آج مجھے اپنے ماں باپ بہت یاد آئے۔ اُن کی آخری نشانیوں کی اس طرح مرمّت اور درست کرلنے پر میں تم کو دعا دیتا ہوں۔

بیٹا۔

تمہارا پہلا جنوری کا خط ابھی پہنچا۔ تمہاری NEW YEAR GREETINGS سے جی خوش ہوا۔ لیکن مجھ جیسے قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے بڈھے کے لئے LONG LIFE کی آرزو بیکار ہے۔ اور اس عمر میں PROSPERITY کو لے کر کیا کروں گا۔ یہی غنیمت ہے کہ چند روز بغیر تکلیف اور الجھن کے گزر جائیں۔ بہرحال تمہاری سعادتمندی سے میں بہت خوش ہوں۔

اخبار پانیر کئی روز سے نہیں آیا۔ اگر تم نے اخبار والوں کو بند کرنے کے لئے لکھ دیا ہو تو اچھا کیا کہ مجھے چنداں اس کی ضرورت بھی نہیں۔ میرے مشغلے کے لئے صلائے عام ہی کافی ہے، اس کا خرچ دوسو سوا دوسو روپے ماہوار سے کم نہیں۔ آمدنی کی تو کبھی کسی طرح امید ہی نہیں تھی۔ اس کا خرچ بھی صریح زیر باری ہی ہے۔ کبھی کبھی گھبرا کر خیال کرتا ہوں کہ بند ہی کردوں لیکن اس خیال کے ساتھ ہی دل بیٹھ سا جاتا ہے۔ اور خود اپنی زندگی بے مصرف نظر آنے لگتی ہے۔ اسے بند کرنا اب میرے اختیار سے باہر ہے۔ میرا اس کا عمر بھر کا ساتھ ہے، یہ ساتھ آخر تک نبھ جائے تو مجھے بڑی خوشی ہو۔ آخر کو بند ہی ہوجائے گا۔ یہ کہانی اب ختم ہی سمجھو ؎

ختم ہی سمجھو زندگی کے دن   کچھ ورق اور ہیں فسانے کے

میں تمہیں خط لکھنے میں کسر نہیں کرتا۔ کیونکہ تم سے باتیں کرنے کو خود جی چاہتا ہے لیکن تم اس معاملے میں زیادہ قصوروار ہو۔

انصار کی والدہ اور بچوں کو دعائیں۔ فنی بیگم کے خط سے مجھے بڑی خوشی ہوئی خاص کر ان کے اتنا لکھنے سے "ناچیز آپ کی بیٹی فہمیدہ ناصری" تم فنی کو یہاں بھیجدو تو عنایت ہوگی۔ آج کل میری چائے کا انتظام بانو بیگم کے سپرد ہے، ان کا لڑکا ولایت اور انصار بھی شام کی چائے پر میرے ساتھ ہوتے ہیں۔

تم کب تک مکان پر آسکو گے۔ جلدی لکھنا اور جلدی آنا۔

اور یہ ہے حضرت والد ماجد مرحوم کا میرے نام آخری خط جو انہوں نے رحلت سے پانچ روز قبل (یعنی ۷ر جون ۱۹۳۳ء) میاں انصار کے ہاتھ ارسال فرمایا تھا۔ میں اُس وقت بسلسلہ ملازمت فرخ نگر (ضلع گوڑگاؤں) میں تعینات تھا۔ والد ماجد عرصے سے علیل تھے میں نے میاں انصار کو آں مغفور کی خیریت طلبی اور پرسشِ مزاج کے لئے اُن کی خدمت میں بھیجا تھا۔

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

بیٹا۔

شاید یہ لکھنے کا آخری موقع ہو۔ اس چار مہینے میں جو کچھ گزرنی تھی گزری۔ اس کے بعد اللہ ہی اللہ ہے۔ گمان یہ ہے کہ میں جانبر نہ ہوسکونگا

ہاتھ پیروں کی طاقت سلب ہوگئی، خدمت گو اچھی ہوئی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا ؎

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم
ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کرے

تم سے جہاں تک ہو سکے جلدی آنا۔ بصارت تو خدا نے دوبارہ مجھے دی لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں، ہے تو صرف اتنا ہے کہ تم آؤ تو تمہیں دیکھ لوں۔ گھر کا کام اور خود ابتر پڑا ہوا ہو گی اس کا حق جتنا مجھ پر ہے اتنا ہی اولاد پر ہے۔ انصار کو تم نے بھیجا میں خوش ہوا، خدا تم کو خوش رکھے ــ اور کیا لکھوں ؎

کہیں حقیقتِ جانکاہیٔ مرض لکھئے
کہیں مصیبتِ ناسازیٔ دوا کہیے

حضرت والد ماجد قبلہ کے ان گرانمایہ خطوط کو جو میری زندگی کا آخری سرمایہ ہے میاں انصار کے سپرد کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں مقاماتِ ناصری کی اشاعت کے بعد مکاتیبِ ناصری کی اشاعت کی توفیق بھی اپنی رحمت سے عطا فرمائے،

نجات کا طالب
انتصار علی

راولپنڈی
۶ر جنوری ۱۹۶۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پردہ کشائے رُخِ حسنِ قدیم

افتتاح کلام

حمد باری تعالےٰ

مبارک است بنامِ تو افتتاحِ کلام تبارک اسمک یا ذوالجلال والاکرام

بنامِ آنکہ اُو نامے نہ دارد
بہر نامے کہ خواہی سر بر آرد

ہم نے نہیں دیکھا کہ ماں نے کبھی اپنے بچّے سے، جس نے ابھی اچھی طرح سر زبان نہیں کھولی، اس پر ضد کی ہو کہ بچّہ مجھے اس نام سے پکارے اور اس نام سے نہ پکارے۔ بچّہ پہلے پہل جس نام سے اپنی ماں کو پکارے ماں خوش ہو جائے گی۔ بچّے کا کسی طرح اپنی ماں کو پکار لینا ماں کو اُن لمبے چوڑے، اچھی ترکیب والے، ادب کے گھڑے ہوئے ناموں سے کہیں زیادہ پیارا معلوم ہوتا ہے۔ جس سے غیر اس کو مخاطب کریں۔ اگر کسی بچّے نے ایک طرح سے اپنی ماں کا نام لیا اور دوسرے نے دوسری طرح سے، تو ماں کو کبھی بُرا نہیں معلوم ہوگا کہ دونوں ایک ہی طرح سے کیوں نہیں پکارتے۔ اُسے تو اسی خوشی کی بیتابی ہے

کہ میرے بچے کسی طرح مجھے پکار لیں۔ اس بے تابی میں کسے خیال ہے کہ سب بچے ایک ہی قاعدۂ خاص سے کیوں نہیں پکارتے —؟ ماں کو کبھی اس بات کا انتظار نہیں ہوتا کہ جب تک بچہ ضابطے اور قواعدِ مقرّرہ سے نہ پکارے بچے کے پکارنے کا خیال نہ کرے، بچّے کا بے معنی اور بے قاعدہ جس طرح بن پڑے رُک رُک کے، تُتلا کے، کسی طرح پکار لینا ماں کو ایسا پیارا معلوم ہوتا ہے کہ کبھی بچّے کو جھڑکتی نہیں۔ بچے اپنے اپنے آہنگ میں جس طرح چاہیں پکاریں انہیں اختیار ہے۔

ہم بھی اس پرچے کے آغاز میں اپنے خالق کو جس طرح پکارتے ہیں گو معمولی ڈھنگ کے خلاف ہے لیکن چونکہ جی سے ہے، یقین ہے کہ وہ ضرور سُنے گا۔

موجِ اجابت از دلِ ما جوش میزند
سرچشمۂ قبولِ دُعا دیدۂ تراست

اسی پُکارنے کا نام اسلام کی اصطلاح میں حمد ہے۔ ہم نے چونکہ بچے کی مثال چھیڑی ہے اور بچے کی اس وجہ سے کہ یہ پرچا ابھی نکلا ہے۔ اس لئے اُسی رعایت سے کہتے ہیں کہ ننھے مُنّے بچوں کو جب اُن کی ماں کچھ دیتی ہے تو اکثر دیکھا ہے کہ جب خوشی میں ہوتے ہیں تو اُسی میں سے ماں کی طرف بھی بڑھا دیتے ہیں۔ گو یہ دینا دیکھنے والوں کو کیسا ہی کریہہ معلوم ہو کہ اگر مٹھائی ہے تو تھوڑی سی اپنے مُنہ میں رکھ لی اور باقی، اُن انگلیوں سے جو ابھی دھوئی نہیں گئیں ماں کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ تو بھی کھا۔ ماں ہی نے چیز دی اور ماں ہی کو دی جا رہی ہے۔ بچّے کی طرف سے اس سے زیادہ ماں کو خوش کرنے کی کوئی تدبیر ممکن نہیں۔ ماں بھی بچّے کا دل رکھنے کو کبھی بچّے کو نہیں گھُرکے گی کہ کیسی بیہودہ حرکت بچّہ کر رہا ہے۔ بلکہ اُسے اگر اپنے بچّے کا خیال ہے تو ایسی صورت بنالے گی جس سے بچّے کو معلوم ہو کہ ماں نے اُسکی دی ہوئی مٹھائی کھائی اور خوش ہوئی۔ ماں

جانتی ہے کہ اگر ایسا نہیں کرتی ہوں تو بچے کا دل دُکھے گا اور وہ رو دے گا۔ وہ خوب جانتی ہے کہ دینے کو یہ کہاں سے لائے گا۔ اُسی میں سے دے گا جو میں نے ہی دی ہے۔ اسی لئے ہم بھی جو کچھ اُس خالق نے ہمیں دیا ہے اُسی میں سے اُس کے حضور پیش کرتے ہیں۔ یعنی اس کج مج زبان سے اُس کا نام لیتے ہیں جو اُسی نے دی ہے۔

اے نام تو قبلۂ زبان ہا   چشمِ دل ہا چراغِ جاں ہا
آئینۂ راز تست عالم   پیدا است زنام ہا نشاں ہا
میر منزل تست ، بے نشانے   گردِ رہ کیست کارواں ہا

پروردگار کی یہی حمد ہے کہ جو کچھ اُس نے ہمیں دیا ہے اُس میں سے اُس کے رُوبرو پیش کریں۔ یعنی اس زبان سے جو اُس نے دی ہے اُس کا نام لیں اور اِس دل سے جو اُسی کا بنایا ہوا ہے اُسے مانیں ؎

میرم جائیکہ دل نا محرم است
چشمکے از دور بر جاں میزنم

پروردگار کی حمد میں عقل و دلیل کو بے کار سمجھ کر اکثر محض خیال و گمان سے کام لیا جاتا ہے۔ کیوں کہ سمجھ لیا گیا ہے کہ خدا کا حال عقل سے نہیں معلوم ہو سکتا۔ اس لئے اس میں دلیل و فکر کی ضرورت نہیں۔ ؎

اے از تو دلیل در قدم خار   وے از تو حدیث سر بہ دیوار
جولاں گہت از حدِ خرد بیش   اندیشہ در و خجالت اندیش

لیکن میرا ارادہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے اس ذکر میں عقل کو دل کے ساتھ رکھوں۔ سبب یہ ہے کہ خدا شناسی کے لئے عقل و حواس کا ہونا ضروری ہے دیوانہ و مجنوں جہاں ہوں، قیدِ مذہب سے آزاد کئے جاتے ہیں

فتورِ عقل و حواس میں خداشناسی سے واسطہ نہیں رہتا۔ خداشناسی اور مذہب کی پابندی اُن ہی پر فرض ہے جو عقلِ سلیم رکھتے ہیں۔ اسلام میں دیوانہ و مسلوب الحواس پر حدِّ شرعی قائم نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ثابت ہے کہ خداشناسی کے لئے عقل کی ضرورت پہلے ہے ؎

عقل آنکہ بگویدت چناں کن | ترکِ رہ و رسمِ این و آں کن
گو بخت زخواب سرگراں باش | اے عقل بہ من تو ہم عناں باش

آپ نے دیکھا ہوگا کہ باغ کا دروازہ گو بند ہو، بوئے چمن غمازی سے نہیں رُکتی۔ مکان کے اندر گو کوئی نظر نہ آئے لیکن اگر ذرا سی روشنی بھی ہے تو کچھ نہ کچھ حال کھل جاتا ہے۔ قندیلِ خرد اُس نے اسی لئے ہمارے دلوں میں لٹکا رکھی ہے کہ دُور سے دیکھا کیجئے۔ فیضیؔ نے اس کی نسبت خوب لکھا ہے۔ ؎

قندیلِ خرد بہ رشتۂ نُور | آویخت در آں مقرنس از دور
خاکی بہ سپہر کرد بازی | از قوتِ او بہ سرفرازی
خود رفت درونِ باغ و در بست | باغے ز وجود نقش بر بست
ہر گل بہ ہزار پردہ سر زد | ہر غنچہ بصد نقاب ور زد

جس طرح روشنی سے مکان کا نشان اور نکہت سے باغ کا پتا لگتا ہے، ہماری عقل پروردگار کو ڈھونڈ ہی لیتی ہے ؎

کویت چمنے بہار ہا را | داغت محکے عیار ہا را

جس وقت انسان اپنی ہستی سے واقف ہوا اُسی وقت سے یہ خیال بھی ضرور ہوا ہوگا کہ جس طرح ہر چیز جو ذہن میں آتی ہے کسی نہ کسی سبب سے ہے میرا بھی اس حالت میں ہونا کسی وجہ سے ہے۔ اگر ہمیشہ یہ خیال نہیں رہتا تو لاچاری اور تکلیف میں تو قطعی سوجھتا ہے کہ مجھ سے بڑا دوسرا ضرور ہے جس

کی قدرت کے سبب میرے سارے کام میری مرضی کے موافق ہمیشہ نہیں چلتے

ما از تغافل تو پریشاں نہ گشتہ ایم — دل جائے دیگر است ونگہ جائے دیگر است

اسی لئے اپنے سوا دوسرے پر اپنے کاموں کے انحصار کا اقرار کرنا پڑا۔ اب اس "اپنے سے سوا" کی تلاش میں انسان نے کوشش شروع کی۔ اپنے ذہن اور تلاش کے موافق جو چیز جس کی سمجھ میں آئی اُس کی عظمت کا یقین کر لیا۔ پہلے زمین کہ سب سے زیادہ قریب تھی "پرتھوی ماتا" بنی۔ پھر ہر روز ان ہی پر چلنے پھرنے سے ان کی طرف سے شک ہوا۔ درختوں کو دیکھا، مگر ان کا حال بھی جلدی کھل گیا۔ پھر پہاڑ دریا وغیرہ جو چیز سامنے دیکھی اُس کے موافق پہلے اس کی عظمت ہوئی پھر نظر سے گر گئی۔ عالمِ اسباب میں جب ان چیزوں کو دیکھ لیا جن تک ہمیں خود رسائی نہیں — مگر جنھیں ہم جانتے اور دیکھتے ہیں مثلاً آسمان، آفتاب، چاند تارے، وغیرہ کی عظمت نگاہ میں جمی ؎

نقش و نگار صورت و معنی اشارہ ایست
آئینہ دیگر ست و دلِ چاک دیگر است

یہاں تک تو مشغلہ بُت پرستی میں رہا، لیکن جب ان کا حال بھی وہی ہوا جو اور چیزوں کا ہوا تھا تو اب محض خیال پر مدار رہا کہ یہ سب عالمِ اسباب جو کچھ نظر آتا ہے کسی اور کے وجود کے ثبوت میں ہے اور وہ خود ان سب کے "سِوا" ہے۔ جو کسی کے ذہن میں نہیں آتا ؎

تو ئی کہ شوخیِ حسنت نمی دہد آرام
بدل قرار نہ گیری بدیدہ جا نگنی

اس سے معلوم ہو گیا کہ عقل نے کہاں سے کہاں تک پہنچایا، اور اب تک ٹھکانے سے پہنچاتی رہی ؎

یک حرف بیش نیست ز تعبیرِ رازہا
معنی یکیست گرچہ عبارت مکرّر است

اس کے بعد دہریوں کی کتابوں کو دیکھا جن میں خدا کے وجود سے انکار کرنے میں بہت محنت کی گئی ہے۔ ان کی نسبت کسی نے کیا اچھی بات کہی کہ یہ بچارے خدا سے انکار کرنے میں اپنی طرف سے کوشش تو بہت کرتے ہیں لیکن بن نہیں پڑتی ـــ ہم سے کہتے ہیں کہ خدا کو ثابت کرو اور آپ اب تک ثابت نہ کر سکے کہ خدا نہیں ہے۔ یعنی اگر ثابت کر دکھائیں کہ خدا نہیں ہے تو جھگڑا مٹے جب یہ خدا کا نہ ہونا ثابت نہیں کر سکتے تو میری دانست میں علمائے یونان کا یہ قول سننے کے لائق ہے کہ کسی بات کا یقین کر لینا انکار کرنے سے بہتر ہے۔ خاص کر جب کہ اس کے ہونے کے ثبوت میں نہ ہونے سے زیادہ دلیلیں ہوں۔ خدا کے نہ ہونے کا آسان مسئلہ دہریوں کو دیا جاتا ہے، پھر بھی اُن سے ثابت نہیں ہوتا تو ضرور اُس کے ہونے کا یقین بدیہی سمجھا گیا جس کی تعریف میں ہے کہ ؎

عدم احرام طاعت بست، ہستی قامت آرا شُد
نیازِ ہر دو عالم سجدۂ واجب تعالےٰ شُد
رشکوہ وحدتش روزے کہ زد طبلِ سلیمانی
دلِ مورے طپید و اضطراب بحر پیدا شُد
غبارے از رہے برخاست اشکے از دلے جوشید
یکے معمارِ صحرا ہا، یکے سرکارِ دریا شد

جس نے پہاڑوں کو لحافِ ابر سے چھپایا اور طفلِ گیاہ کو دایۂ ابر سے دُودھ پلوایا۔ جس نے دریا کو تسبیح حباب اس لئے دی کہ اس کا ذکر کئے

جائے، جس نے ہر درخت کو باغ میں کھڑا کر دیا کہ اس کا ذکر سُنا کرے۔ چہرۂ گل پر اسی کی قدرت کی غازہ کشی ہے، زلفِ سنبل میں اسی کی شانہ کشی ہے ؎

آندھی کو دواں کیا، دواں ہے . پانی کو رواں کیا رواں ہے
پھول اس نے کھلائے، کھلتے ہیں روز دو وقت ملائے، ملتے ہیں روز

زیں ساں کہ نمودِ باغبانی؟
زیں گو نہ کہ کردگل فشانی؟

میری دانست میں ابد و ازل کے جھگڑوں میں بحث کرنے سے خدائے لایزال کی حمد جس طرح ہو سکے زیادہ مناسب ہے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ کتاب کی جلد باندھنے میں جلد ساز کتاب کے دونوں طرف سادہ ورق لگا دیتے ہیں۔ صحافِ ازل نے بھی کونین کا شیرازہ باندھنے میں دونوں طرف کے ورق سادہ رکھے کہ آغاز و انجام کا حال بتانا منظور نہ تھا۔ اگلے لوگ یادداشت کے طور پر کتاب کے ان سادہ ورقوں پر کچھ لکھ لیا کرتے تھے۔ گو کتاب کے مضمون سے متعلق یا اس سے ملتا جلتا ہو یا نہ ہو —— نہ ملنے کا تو یہ حال ہے کہ میں نے گلستاں کے ایک بیش قیمت قلمی نسخے کے سرورق پر کسی نے دو روپے کسی کو قرض دیے وہ یادداشت کے طور پر لکھے ہوئے دیکھے۔ مجرب نسخے تو اکثر وہیں لکھے ملے اور دھوبی کو جو کپڑے دیے گئے وہیں لکھے گئے —— بہرحال دونوں طرف کے سادہ ورقوں پر عجیب عجیب تحریریں دیکھنے میں آئیں یہی حال کتاب روزگار کا سمجھئے کہ بیچ میں کچھ سہی شروع اور آخر کے سادہ ورقوں پر مختلف طبیعتوں نے اپنی اپنی سمجھ اور ذوق کے مطابق جو چاہا یادداشت کے طور پر لکھ لیا

اسی لئے شیرازہ بستن حقیقی نے یہ ورق انسان کے لئے سادہ چھوڑ رکھے ہیں۔

خوشی کی بات ہے کہ ہماری زبان کی لٹریچر میں جو باتیں حمد باری تعالیٰ میں پیدا کی گئیں وہ کسی زبان میں میسر نہیں۔ بلکہ دقت یہ ہے کہ جو کچھ اس طرز پر لکھا گیا اُس سے زیادہ تو کیا اُس کے برابر بھی لکھنا مشکل ہے۔ میری کیا مجال کہ حمد باری تعالیٰ میں ایک حرف بھی نیا لکھ سکوں۔ اس مضمون سے یہ غرض بھی نہیں کہ مجھے ایسے مشکل کام کا دعوا ہے جو آج تک کسی سے نہ ہو سکا۔ مگر بچوں اور بوڑھوں کی ضد اُن کی سمجھ کے موافق پوری ہو جائے تو خوش ہوتے ہیں اور شاعروں کو وصف دہن یار میں، گو نظر آئے یا نہ آئے لطف آتا ہے۔ مجھ سے بھی اگر حمد نہ بن پڑی تو میں حمد کی تعریف میں اس قدر لکھ کر اپنا دل خوش کئے لیتا ہوں ؎

ہم سمجھے ہم نے مدح کے دریا بہا دیے
کیا ہو گیا جو بحر میں قطرے ملا دیے

یہ وہ ذکر ہے جو شب و روز و ماہ و سال، ماضی و مستقبل و حال کی زبان پر ازل سے جاری ہے۔ اور ابد تک ختم نہیں ہو سکتا۔ رات شام سے تاروں کو جمع کر کے یہی ذکر سنانا شروع کرتی ہے۔ اور صبح کو مرغان خوش الحان کی زبان سے یہی ذکر سن لیجئے۔ اس ذکر میں بے تاب دلوں کو وہ تسلی ہوتی ہے جو ہوائے گرم میں جب لوئیں چل رہی ہوں آبشار کے پاس گنجان درختوں کے سائے میں بیٹھنے والوں کو بھی نصیب نہیں۔ اس کا لطف ان سے پوچھئے جن کو شور و غوغا سے گھبرا کر کسی گوشۂ عافیت میں بے غل و غش خیال یار میں بیٹھنا نصیب ہو۔ جس طرح جوشش بہار سے ہر برگ گیاہ پر اثر ہوتا ہے۔ حمد باری تعالےٰ کے ذکر سے ہر نیک دل کی جان میں جان آجاتی ہے۔ اس کا ذکر اس کی دی ہوئی

زبان سے عجیب نعمت ہے اُس کی دی ہوئی ہر چیز کی تعریف عین دینے والے کی تعریف ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اپنی زبان کی ترقی کا بہترین طریقہ حمدِ الٰہی ہے — حمد کے لئے زبان اپنی ہی چاہیے غیر کی نہیں۔

میں خوش ہوں کہ مجھے اس پرچے کا پہلا مضمون حمدِ باری تعالےٰ کی تعریف میں لکھنا نصیب ہوا۔ ؎

یہاں تک تھی حریصِ نالہ بلبل
نکالی بیضہ سے منقار پہلے

'ناصری' شمارہ اولیٰ ۱۳۰۷ھ

حصّہ اوّل

(انتخاب از "تیرھویں صدی")

بزمِ خیال

مے کدۂ بے خروش ہے

خون نابہ راز فاش کند ورنہ عاشقاں
تار جگر کشند و گریباں رفو کنند

دنیا میں اگر نمود سب کو عزیز ہے تو گمنامی بھی عجیب چیز ہے۔ بلکہ چھپے رہنے میں جو مزہ ہے وہ کھُل جانے میں نہیں۔ جو کیفیت اپنے تئیں چھپا رکھنے میں ہے وہ دکھانے میں نہیں۔ سارے اہل اللہ دنیا سے چھپتے ہی رہے۔ اور اچھے نقال پردے کے پیچھے ہی دیکھے گئے۔ ہنگامے سے مجھے بھی ہمیشہ طبعی الجھن ہی رہی۔ تشہیر کے ڈر سے شہرت بھی چھوڑ دی۔ شروع سے ارادہ یہی رہا کہ جہاں تک ہو سکے چھُپنا۔ دہنِ یار کی طرح ہونا اور دکھائی نہ دینا۔ رازِ نیچر کی طرح پس پردہ رہنا اور اسرار قدرت کی طرح سب کچھ ہونا اور کسی پر نہ کھلنا؎

نامیست بے نشاں کہ باں فخر می کنند
ایں ہستیٔ کہ شہرت عنقا گرفتہ است

اس میں بڑا فائدہ یہ ہے کہ لوگ جو کچھ میری نسبت کہیں گے سب معلوم ہو جائے گا اور انہیں خبر نہو گی کہ کسے کہا۔ اگلے بادشاہوں میں بھی بعضوں کا یہی ڈھنگ رہا ہے کہ اکثر چھپ کر راتوں کو نکلا کرتے تھے کہ بے چھپے حال نہیں کھُلتا

اسی لحاظ سے میں نے بھی پہلے پرچے کے اجرا کے بعد چاہا کہ نکل کر دیکھوں تو لوگ میری اور اس کی نسبت کیا کہتے ہیں؟ ہنگامہ و معرکہ سے اگر نفرت ہے تو بزم خیال میں کیا قباحت ہے۔ اِس سے معلوم ہو جائے گا کہ وہ علی گڑھ سے شملہ کو تار گیا کہ "غضب ہوا تہذیب کا جواب نکلا" دلّی سے لکھنو کو خبر گئی کہ "اردو میں جان آگئی"۔ ادھر بندگان نیچر پکارے کہ "بلا کی داد دی"۔ ادھر پابندگانِ مذہب نے مبارک باد دی۔ ایک نے ایک سے کہا کہ "بھئی! ایسا خوش بیان نہیں دیکھا"۔ کسی نے کسی سے کہا کہ "یہ روزمرہ نہیں سنا"۔ کوئی پوچھ رہا تھا کہ "جانے اس کا لکھنے والا کون ہے؟ مولوی تو نہیں معلوم ہوتا مگر تحقیق غضب کی ہے"۔ پُرانے خیالات کے لوگ بولے کہ "لکھتا تو خاصا ہے مگر فسانۂ عجائب و چار درویش کو نہیں پہنچتا"۔ مولویوں نے گردن ہلا کر کہا کہ "ہاں ایسا بُرا بھی نہیں مگر بہت سنجیدہ نہیں"۔ ایک عقل کے پتلے کیا کہتے ہیں کہ "واہ! اچھا اخبار ہے جس میں بارش کا تو حال ہی نہیں"۔ دوسرے بزرگ ورق ادھر ادھر الٹ کر فرماتے ہیں کہ "کابل کی خبر ہی ندارد"۔ میاں کے ہاتھ میں یہ پرچا دیکھ کر بی بی کہہ رہی ہیں کہ "کتابوں کے نام 'تیرھویں صدی' نہ سُنے تھے؟"

مطبع آگرہ اخبار کی طرف سے جو نکلا تو مہتمم اور دفتر کے منشی میں گفتگو سنی کہ بے اختیار نقل کرنے کو جی چاہتا ہے۔

مہتمم صاحب: تیرھویں صدی کے پرچے کہاں کہاں بھیجے۔؟

منشی جی۔ پانچ تو سید احمد خاں صاحب بہادر کو شملہ بھیج دیے۔

مہتمم۔ خوب کیا۔ انھی کے لئے تو یہ ساری محنت ہے۔ مگر وہ اتنے کیا کریں گے؟"

منشی ۔ ایک تو مدرسے بھیجیں گے ۔ ایک کمیٹی کی نذر کریں گے ۔ ایک پرچہ تہذیب الاخلاق کے ساتھ مجلد ہو گا ۔ ایک، ہماری طرف سے نذر ہے ۔ بہ قیمت تو ایک ہی رہا ۔

مہتمم ۔ رامپور کتنے پرچے بھیجے ؟

منشی ۔ ستر۔ کیوں کہ وہاں کے لئے تو یہ صرف گوارا کیا گیا ہے ۔ حضور پُر نور عالی جناب نواب صاحب بہادر دام اقبالہٗ کی قدر دانی سے وہ ریاست آج کل اہلِ کمال کے باعث بہشتِ سخن ہو رہی ہے ۔ اسی جگہ سے مدرسۃ العلوم کو بھی سب ملا کر اتنا ملا کہ سید احمد خاں صاحب سے چندے کے حریص خوش ہو گئے ۔

مہتمم ۔ تو اب کی یہاں اور بھی پرچہ بھیج دینا ۔ اور لکھ دینا کہ ع

خوش نعمتیست دولتِ دنیا بشرطِ بذل

خوش دولتیست نعمت خوش لذّتِ سخا

منشی ۔ مگر وہاں ایسی باتوں کے سمجھانے کی ضرورت نہیں ۔ اس ریاست سے بہت سے ایسے کارخانوں کی زندگی ہو رہی ہے ۔

مہتمم ۔ بھوپال بھی بھیجے ؟

منشی ۔ جی ہاں ۔ کچھ پرچے وہاں بھی گئے ہیں ۔ اجازت کا انتظار ہے کہ تعداد بھی درج رجسٹر کی جائے ۔

مہتمم ۔ حیدر آباد بھی تو بھیجو ۔ وہاں ہمارے قدیم عنایت فرما مولوی حافظ نواب صدر السلام خاں صاحب ہیں جن کے سبب سے ریاست میں بڑی قدر دانی کی اُمید ہے ۔ سر آسمان جاہ خود بڑے قدر شناس ہیں ۔

منشی ۔ بہت خوب ۔

مہتمم ۔ کیا کہیے ہماری زبان سے بیگانگی کے سبب ہمارے حکام اس کی قرار واقعی قدر دانی سے لاچار ہیں ۔ ورنہ ایسے کمالوں کی داد جو یہ دیتے آج دنیا میں کہیں نہیں ملتی ۔

منشی ۔ مگر گورنمنٹ رپورٹر صاحب یہ شکایت اپنے بلیغ ترجموں سے رفع کردینگے ۔

مہتمم ۔ مگر ابھی تو اور بہت ٹھکانے ہیں لوہارو ۔ باسودہ ، مالیر کوٹلہ وغیرہ ۔ ان میں سے ایک ایک ایسی ریاست ہے کہ اکیلے ایسے ایسے بہتیرے پرچوں کا بیڑا پار کر دے ۔

منشی ۔ پھر نامور امرا میں ہمارے قدیم مربی الگ رہے ۔ بخشی فیض علی خاں صاحب سی ایس آئی ۔ مولوی حاجی سید امداد العلی صاحب ، سی ایس آئی ۔ سید قربان علی صاحب کہ ان میں سے ایک ایک اس پرچے کو اوروں کی محتاجی سے مستغنی کرسکتا ہے ۔

مہتمم ۔ اس میں ابھی تک ہم نے اپنے پرانے مہربانوں کو نہیں گنا جو خاص و عام میں سے ہزاروں ہیں ۔ نیچری بھی اس لئے خوش ہیں کہ ان کے معاملے میں ہم انصاف کو ہاتھ سے نہیں دیتے اور مذہب والے تو اپنے ہی ہیں ۔

منشی ۔ یہ سب تو آپ نے خریداروں میں گنائے ۔ تمام انگریزی و ہندوستانی اخباروں کو بھی ایک ایک پرچا معاوضے میں اس نظر سے بھیجا ہے کہ جو برائی بھلائی ہم میں دیکھیں ہمیں اطلاع کردیں ؎

بر اں گروہ حرام است خامشی صائبؔ
کہ کار خلق توانند از زباں سازند

مہتمم۔ سامان تو بہت اچھے دکھائی دیتے ہیں۔ آگے نصیب! یا بخت! خدایا اس کے بے مثل لکھنے والے کی محنت رائیگاں نہ جائے!"

مگر آہستہ جی میں کہا کہ "ابھی تو سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ؎

ہر سو بہ کردہ ایم رواں کشتیٔ امید

طوفاں بہ بادر شور بہ دریا نوشتہ ایم

مہتمم کا یہ مایوسانہ کلام سن کر بے اختیار جی میں آئی کہ ایک دفعہ تم جلوۂ حسن طبیعت تو دکھا دو کہ یہ سب جھگڑے دھرے رہ جائیں۔ جس کے دیکھتے ہی سارے قصے بھول جائیں پچھلے پرچے میں تو رمضان المبارک کے سبب قدر دانوں سے جی کھول کے گفتگو نہ ہوسکی ؎

قُرب یکماہ بمیخانہ اقامت کردم

اتفاقاً رمضاں بود نمی دانستم

علاوہ اس کے پہلی ملاقات میں بہت جرات بھی نہیں ہوتی ہے۔ آج عید کی تقریب میں کچھ کہہ سُن لیں۔ یہ معاملے کی خشک باتیں کب تک؟ عید ہے۔ ذرا عروس سخن کی بہار دیکھیں ؎

یوں شاہدِ مضموں دم فکرِ سخن آئے

جس طرح کہ ڈالے ہوئے گھونگٹ دُلھن آئے

فرانس کے مہوشوں میں ایک بلائے روزگار کو دعویٰ تھا کہ عورت کے دل کا حال میں اس کے کپڑوں کی گوٹ سے بتا دوں۔ عورت کا لباس اس کے دل کا آئینہ ہے۔ لباس کی ذرا ذرا سی چھوٹی باتیں پہننے والے کے

رنج وشادمانی کی غمازی کرتی ہیں۔ گوٹ بُری ہے تو معلوم ہوا کہ اس کے چاہنے والے کا قصور ہے۔ دوپٹہ میلا ہے تو سمجھ لو کہ اسی سے رنج ہے۔ چاہنے والا اگر بے پروا ہے تو یہاں لباس بھی ویسا ہی ہے۔ وہ خوش ہے تو کپڑے کپڑے سے بانکپن ٹپک رہا ہے۔ عورت کا قول ہی یہی ہے کہ اُنھی کو پروا نہیں تو ہمیں کیا غرض کہ کنگھی چوٹی کا جھگڑا کریں۔ وہ خفا ہیں تو پھر کس کے دکھانے کو کپڑے بدلیں۔ کپڑے کیوں میلے ہیں؟ اتاریں کس کے لئے؟ وہ خوش ہیں تو بلا کا جوڑا نکلا ہے۔ غرض جیسی اُدھر سے دل دہی ویسی ہی یہاں دل آرائی دیکھی، وہاں طبیعت بدلی اور یہاں صورت بگڑی ؎

بیگانہ رو شود بہ درِ آشنا رود
آنکس کہ آشنا بتو باشد کجا رود

صاحبو! بعینہٖ یہی حال عروسِ سخن کا ہے۔ اس کی دلبری وخوبی ہمیشہ تمہاری قدر ومحبت پر موقوف رہی۔ مدت سے جو اس نے شوخی وطراری چھوڑ رکھی ہے سارا سبب تمہاری بے پروائی کا ہو۔ اب یہاں تک تو نوبت آئی ہے کہ دلبری ورعنائی تو ایک طرف اپنی جان سے تنگ ہے۔ جانے کس طرح اب تک اپنے دن کاٹ رہی ہے۔ تم جو منہ نہیں لگاتے تو اب پردۂ دل سے بھی باہر نہیں آتی۔ اس کا سہاگ تمہیں تک تھا تمہیں کو پروا نہیں تو پھر کس کے دکھانے کو نکالے۔ بجھنے تو اسے غیروں کے لئے چھوڑ بیٹھے۔ بہت سے نالائق نکل گئے۔ بہتیرے اس سے اس طرح پیش آئے کہ اسے اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔

اس کی بےکسی کا حال وہی جانے جس کا کوئی چاہنے والا نہ ہو۔ مگر چونکہ آج عید ہے۔ برس کے برس دن تو رنج نہ چاہیے۔ جیوں تیوں اسے سمجھاتے

ہیں کہ بزم خیال ہے۔ اس میں نکلنے کا مضائقہ نہیں ؎

اے حجلہ نشیں پردۂ دل سے نکل اب تو

اے تازہ عروس اپنی ادائیں بدل اب تو

اے دل یہ بے تابی کس لئے؟ اے نطق یہ بے قراری کس لئے؟

کون نکلا مرے پہلو کے برابر ہو کر

دیکھو تو معانیٔ رنگیں کا لباس پہننے خانۂ دل سے یہ کون نکلا!

از ہیچ نقش غیر نکوئی ندیدہ‌ٔ　　　اے دیدہ محو چہرۂ زیبائے کیستی؟

سارے خوبانِ جہاں میں مجھے اس سے زیادہ کوئی پیارا نہیں۔ تمام عالم میں ایسا کوئی نہیں۔ اس کا انداز ہی سارے حسینوں سے جدا ہے، جس میں کیا نمونۂ قدرتِ خدا ہے۔ وہ پردہ نشین دل ہے جو ہزار پردوں میں بھی نہیں چھپتی ہے۔ دل میں ہے اور پھر مشتاق رکھتی ہے۔ کسی کے بس کی نہیں مگر جب خیال کرد آجائے۔ چھپ کر ادائے عروسانہ اور نکل کر گرمیٔ بازار دکھاجائے۔ وہ سرمایۂ ناز ہے کہ حیائے آرزو کی طرح، اگر دل میں نہاں بھی رہے تو طرزِ بیاں میں شوخ بیانی نہ چھوڑے۔ بے نیاز ایسی کہ دل سے زبان تک آنے میں ہزار ناز دکھائے ۔ بے باک ایسی کہ جب کہو دل وجگر تو چل آئے۔ اس پر عشوہ گری یہ کہ پھر اچھوتی بنی رہے، اور پارسائی یہ کہ بیگانہ خیال بھی پاس نہ پھٹکے دنیا میں سب سے بہتر مشغلہ اسی کی محبت کا ہے۔ جادو رقمی، اعجاز بیانی جس کا صدقہ ہے۔ وہ آدمی ہی نہیں جو اس کا شیفتہ نہ ہو۔ وہ زندہ نہیں جو اس پر فدا نہ ہو۔

ذرا آنکھیں بند کرکے اسے غرفۂ دل میں جھانکیے۔ خود مسکراتی، چھبیں دکھاتی جھروکے میں آن کھڑی ہے۔ وہ دیکھئے بے نقاب آپ کے سامنے کھڑی ہے آپ نہ دیکھ سکیں تو نگاہ کا قصور اور اس سے زیادہ آپ کے دل کا قصور ؎

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقاب حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

طبیعت کو اب چین کہاں؟ جوشِ سخن تو یہیں سے بہکا۔ شاہد مضموں کی نزاکت نے شیشۂ دل کو رشک پری خانہ بنا دیا۔ زبانیں دہن میں بے قرار ہوگئیں۔ فرشتوں نے حوروں سے اور جنوں نے پریوں سے باتیں کرنی چھوڑ دیں۔ جس کا قد ہماری طبیعت کی راستی اور وسعت خیال جس کی زلف کی درازی ہے۔ جس کا دہن گرداب صہبائے معانی اور ادنیٰ شوخی لن ترانی ہو۔ جس کی چال، دلوں کو ہلائے اور نگاہ جگر کو گدگدائے۔ جس کی ادا دلوں کو صدائے خانہ آباد اور جس کی آواز کانوں کے لئے مبارک باد ہے۔ جس کی بوئے پیرہن میں موجِ مے کا مزہ ہے اور شوخیٔ طبع جس کا تقاضا ہے۔ اس کی رگوں میں خون کی جگہ روشنائی ہے اور بدن میں سادہ کاغذ کی صورت صفائی ہے۔ گرمی گفتار جس کی گرمجوشی، اور رنگیں بیانی، جس کی رعنائی ہے۔ گو عادت یار کے خلاف اپنے عاشقوں سے بہت نہیں بگڑتی۔ مگر نزاکت کے سبب خاطر مضطر کی طرح بگڑی تو پھر نہیں سنبھلتی۔ بہتوں کی بے پروائی و ناقدری اور بعضوں کی بدسلوکی سے یہ مدت سے بگڑ رہی تھیں۔ اور ایسی کہ کسی طرح ان کی راہ پر آنے کی امید نہیں رہی تھی۔ مگر اب ہمارے اور ہمارے قدر دانوں کے سمجھانے سے پھر "تیرھویں صدی" کے بھیس میں تشریف لائی ہیں۔ یہ ان کا جلوہ آخیر ہے۔ یہ بیکار جانے دیا تو پھر پتا نہیں۔

از دودۂ ارباب کرم فیض رسا نے
جز تاک دریں کہنہ سرا سلسلہ نیست

(تیرھویں صدی۔ شوال ۱۲۹۶ھ)

تیرھویں صدی اور تہذیب الاخلاق

کچھ تجھے خبر بھی ہے کہ تہذیب کے دو پرچے نکل چکے اب تو تو بھی ذرا قدم بڑھا ۔

بالا ہے ترا حسن حسینانِ چگل سے
سب بزم ہے مشتاق، نکل پردہ دل سے

اور اس انداز سے کہ نیچر کے مارے ہوئے بھی چونک پڑیں۔ اس کے بگڑے ہوئے بھی قدرت باری کا تماشا دیکھ لیں ۔

مکش اے طور با افسردہ حالاں گردنِ دعویٰ
کہ در خاکستر ماہم شرارے می شود پیدا

ولایت میں ایک شخص کو گردن مارنے لئے جاتے تھے۔ راہ میں لوگوں کو مقتل کی طرف بے تحاشا بھاگتے دیکھ کر یہ حضرت کیا کہتے ہیں کہ کیسے بے وقوف ہیں جو خواہ مخواہ گھبرائے دوڑے چلے جاتے ہیں۔ تماشا تو تب ہی ہو گا جب کہ میں پہنچوں گا۔ جب تک میں نہ پہنچ لوں تب تک دل لگی نہیں ہونے کی۔ پھر جلدی کس لئے ۔؟ بے دولھا برات کیسی ؟"

ہم نے بھی سمجھ رکھا ہے کہ بے تہذیب مزہ نہیں پہلے یہ کچھ لکھ لیں تب لکھئے ۔ ۔

قضائے ہر خزاں آخر بہارے می شود پیدا
بہارِ رفتہ بعد از انتظارے می شود پیدا

میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے سید احمد خاں صاحب بہادر اب بہت ہی بیباک ہوتے جاتے ہیں۔ نیچری ہونے کا دعویٰ علانیہ کرتے ہیں۔ یہ تو یہ کہتے ہیں کہ جتنے نبی ہوئے سب نیچری ہوئے ہیں۔ ان کی وضع پر تو یہ بہت ہی جی سے لگتی بات ہے مگر غلطی دراصل حق کا استعمال بیجا ہے۔ نیچریوں کے عقائد سے میں ثابت کیا چاہتا ہوں کہ نیچر اور مذہب میں کس قدر ضد ہے۔ ایک کا قائل دوسرے کا اقرار نہیں کرسکتا۔

اس لئے ضرور ہوا کہ ہم اطمینان سے دونوں کی حقیقت دریافت کریں۔ کہ نیچری ہونا کیا ہے؟ اور مذہب کی پابندی کیا ہے؟ پہلے پرچے میں نیچر کی نسبت اسی قدر معلوم ہوا ہوگا کہ یہ کتنا پرانا مسئلہ ہے جو خوئے بد کی طرح پھر اس زمانے میں رنگ لایا۔ یورپ میں اس کا شور ایک بارگی ایسا مچا کہ گویا باسی کڑھی میں اُبال آیا۔ جن کی طبیعتوں میں شورشیں تھیں خوش ہوگئے کہ پابندئ مذہب سے بچے۔ ایمان، عاقبت، سزا و جزا وغیرہ کے جھگڑوں سے چھوٹے۔ اور چونکہ منحرف طبائع کے لوگوں کو عقاید کی پابندی ہمیشہ شاق ہوتی ہے تحقیقاتِ نیچر کو ترکِ مذہب کا معقول بہانہ سمجھ لیا۔ جس کے شکر میں تمام دنیا کے مذہب والوں کے پیچھے پڑ گئے۔

ان میں جو ذرا تیز طبیعت تھے وہ نمود کے لئے اور بہت طریقے اختراع کر بیٹھے مگر اصولِ خدا پرستی کے دشمن رہے۔ کیوں کہ دراصل نیچر ہی ان کی پروردگار ہے۔ خُدا کا محض اقرار ہے بھی تو مثل خدائے اپیکورس بیکار

ہے جس کو ہم سے نہ ہم کو اس سے کچھ سروکار ہے۔ جو کچھ ہے نیچر ہے۔ اس میں خدا کا ہونا نہ ہونے سے بدتر ہے۔ ہم اس سے اور وہ ہم سے بے خبر ہے۔ بہت ہوا تو ایک 'سببِ اول' یا 'علت العلل' مانا۔ مگر اس کو بھی (استغفر اللہ) شحنۂ معزول کی طرح محض معطل جانا۔

نیچریوں کے اصول کی یہ ایسی بدیہی باتیں ہیں۔ جو زیادہ شرح و تفصیل کی محتاج نہیں۔ جس کی نگاہ ذرا بھی تحقیق پر ہوگی وہ کہدے گا کہ میں نے اس بیان میں واقعی سے بھی بہت کم کہا ؎

کیا کہا گر یہ کہا کچھ نہ کہا
نہ رہا مرتبہ اس کا نہ رہا

ورنہ وہ تو سرے سے حضرت موسیٰؑ کا ہونا غلطی اور حضرت عیسیٰؑ کا وجود فرضی بتاتے ہیں۔ توریت کی ساری باتیں خیالی کہتے ہیں۔ ان کے قیاس سے باغِ عدن کا حال تو بابل کی اسیری میں مجوسیوں کی وضع پر لکھا گیا۔ اور جبر و اختیار کے مسئلے کے سبب کہ برائی کا بانی کون ہے، آتش پرستوں کی تقلید میں سانپ کا قصہ گڑھا گیا۔ جو ہرمز و اہرمن کا جواب ہے۔ اسی حساب سے انھیں تعجب ہے کہ بنی اسرائیلیوں کا سا خدا ترسی کا مذہب جس کی الہامی کتابوں میں عاقبت کا ذکر نہ ہو۔ اسی طرح انجیل کی نسبت کہتے ہیں کہ کلام تو خدا کا جو نطق و فصاحت کی اصل ہے۔ مگر بے تکا اتنا کہ اس سے بدتر نمونہ عیوب زبان کا ممکن نہیں۔ یہ میں ایسے نامور نیچریوں کے مسلمات کا ذکر کر رہا ہوں جو کہنے کو عیسائی بھی تھے۔ اب آپ ہی عیسائی سے پوچھئے کہ یہ عیسائی کیونکر رہے؟ عیسائیت پر کیا منحصر ہے؟ تحقیقات نیچریہ اور پابندئ مذہب اکٹھا نہیں ہوسکتیں۔ جیسا کہ آگے اچھی طرح ثابت ہوگا۔ مگر اس طرح ہر موقع کو

تیز طبع لوگ بیکار نہیں جانے دیتے۔ بعضے زمانے سے کام لینے والوں نے مثل ہابس، سوفٹ، چسٹر فیلڈ وغیرہ کی اس تحقیقات نیچریہ سے ایک ایسا دہریہ پن نکالا جس میں ایک قسم کا خدا بھی رکھا۔ کہا کہ جانے خدا کی کیا فطرت ہے مگر اس کی ضرورت ہے۔ ٹولنڈ کو سیّد کی طرح ٹھیٹ عیسائی ہونے کا دعویٰ تھا۔ اس نے عیسائی و اسلام کے نام سے ایک نیا مذہب نکالا جس میں دونوں کی باتیں شامل کیں۔ مگر قول یہی تھا کہ ایسے خدا کو ماننے سے فائدہ کیا؟ جس میں باوجود قدرت کاملہ ہم سے دو بدو ہونے کی جرأت نہ ہو اور ہو تو یہ کیسی شرارت ہے کہ اس کا ہی جی نہ چاہے۔ اسی طرح فرانس وغیرہ میں بھی ہوا۔ والٹیر نے اُلوہیت کا اقرار کیا مگر خدا اسے انکار رکھا۔ غرض ایسی ہی اور مثالیں ہیں جن سے معلوم ہو جائے گا کہ بعضے نیچریوں نے ایک قسم کا دہریہ پن مع ایک خُدا کے نکالا۔ مگر اہل مذہب نے کبھی اعتبار نہیں کیا۔ نہ خود ان سے بن پڑا کہ تحقیقات نیچریہ کو کسی مذہب میں ملا سکتے۔ ہمارے سیّد جو ولایت گئے ذہین تو تھے ہی اس کا چرچا دیکھ کر سوچا کہ اسلام میں لا ڈالئے۔ یورپ کے محققان نیچر تو ہر مذہب کو نیچر کے خلاف بتاتے ہیں۔ ہو سکے تو اسلام سے ملا دیجئے۔ بن پڑے تو یہ وہ بات ہو گی۔ جو یورپ کے حکمائے نیچریہ سے بھی نہیں ہو سکی۔ یہ تو تمام دنیا کے مذہبوں کو اصول نیچریہ کے خلاف ہی بتاتے رہے۔ سیّد کی ذہانت میں تو شک نہیں کہ وہاں والے اسلام کی حقیقت سے واقف تھے ہی نہیں۔ اُن کی اختراع کے قائل ہو گئے۔ اور یہاں والے نئی بات سمجھ کر مرید ہو گئے۔ مگر چونکہ ہمارے سیّد کو اس تحقیقات میں بھی جو انگریزی میں ہے۔ معمولی آگہی سے زیادہ دستگاہ نہ تھی اور نہ مثل ٹینڈال و اسپنسر وغیرہ جو علوم حکمیہ کے پروفیسر ہیں، نیچر کی داد بھی اچھی طرح

نہ دے سکے۔ یہ ہوتا تو کبھی مذہب کو فلسفہ و نیچر کا پابند نہ کرتے۔ مذہب و نیچر تو کبھی نہیں مل سکتے۔ جس نے محنت کی اس میں کی کہ عقائد مذہبی اور تحقیقات نیچری علیحدہ رکھے۔ یہ ایجاد "سیدی" ہے۔ کہ دونوں کو ملاتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ مذہب کو نیچر کا پابند کیا تو جس طرح آج کل ہر چیز کلوں سے بنتی ہے۔ روئی کی کل ہے۔ کپڑے کی کل ہے۔ روشنی کی کل ہے۔ اسلام بھی عوام کو راہ پر لگا رکھنے کی محض ایک "کل" رہ جائے گا۔ گونگے بہرے کی طرح الہام سے شک پر جس کی ابتدا اور انکار پر انتہا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اسلام کو نیچر کا پابند کرنے سے غرض کیا ہے؟ نیچر تو خالق کے اس انتظام کا نام ہے جو اس نے بقائے ہستی کے لئے مقرر کیا۔ نیچر دراصل کچھ نہیں۔ ہے تو صرف مرضئ پروردگار عالم ہے، جس کے حکم سے سارا جہاں چل رہا ہے۔ وقت و وسعت و حالت، نیچر کے اسباب ہیں۔ دنیا اس کی علت غائی اور ہستی و حرکت اس کی کارگزاری ہے۔ یہ محض ایک گورکھ دھندا ہے۔ مگر ہاتھ میں ایسے ہی کے ہے جو ایسے بے گنتی کھلونوں کو جب چاہے بگاڑ دے اور ایسے بھان متی کا کارخانہ ہے جس کے سامنے مجال کس کی کہ دم مار سکے ؂

یک تبسّم کردی و شورِ جہاں شد آشکار
یک اشارت کردی و صد داستاں آمد پدید

نیچر اس کی عظمت کا محض ایک سامان ہے جس کے دیکھنے کو پہاڑ سر اٹھا رہے ہیں۔ زمین و آسمان چکر کھا رہے ہیں۔

یہاں تک کہ ایک دن وہ ہوگا جب کہ نیچر بھی ایسے معشوق کی طرح جو اپنے عاشقوں کے سبب بدنام ہو اپنے قاتلوں سے کہتی الگ ہو جائے گی۔ ؂

پاس رسوائی کا گر اپنی نہ ہو
دیکھو تم مجھ کو تو رسوا نہ کرو

یہاں تک تو تحقیقاتِ نیچریہ از روئے مذہب ہوئی کہ ؎

شعارِ تقویٰ و آئین اسلام
بنا قوس و چلیپا میر سانم

اب میں مذہب کو از روئے نیچر دیکھا چاہتا ہوں ؎

جبیں را سجدہ فرسائے درِ پیرِ مغاں کردم
بیام کعبۂ دل میزنم ناقوس ترسا را

یعنی وہ عالمانہ ڈھنگ تھا تو آگے محققانہ ہے۔

(تیرھویں صدی۔ شوال ۱۲۹۶ھ)

مذہب کی حقیقت

زیادہ ضرورت تو اس تحقیق کی ہمیں سید احمد خاں صاحب کی تحریر سے ہوئی۔ جن کا دعویٰ ہے کہ" جو ہمارے خدا کا مذہب ہے وہی ہمارا مذہب ہے۔" پیشتر اس سے کہ ہم خدا کا مذہب دریافت کریں۔ خود مذہب ہی کو دیکھیں کہ دراصل چیز کیا ہے۔ خدا کا مذہب ثابت کرنے سے پہلے ہم مذہب انسانی کی تحقیقات کریں کیوں کہ خدا کی نسبت مذہب کا ثبوت اتنا ضروری نہیں جتنا کہ ہماری نسبت ہے دوسرے "صحیفۂ فطرت" کے لکھنے والے نے "تہذیب الاخلاق" میں تحقیقات مذہب کا دعویٰ کیا ہے۔ اور چلے اس طرح ہیں کہ یہ دعویٰ نبھتا نظر نہیں آتا۔ سبب یہ کہ اس تحقیقات میں ایسی باتیں فرض کر کے چلے ہیں اور اس ڈھنگ سے جو ایسی تحقیقات کے شایاں نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ دعویٰ ان کا رہے اور مطلب اپنا سے

خواہ از لبِ مسیحا خواہ از زبان ناقوس
صاحبدلاں شناسند آواز آشنا را

مذہب کے لغوی معنوں سے یہاں کام نہیں چلتا۔ جس کے مرادف 'دین' 'ملت'، 'طریق'، وغیرہ ہیں۔ نہ یہاں کسی خاص فرقے کے مسلمات کو واقعی یا

غیر واقعی ثابت کرنے سے غرض ہے بلکہ مذہب کی تحقیق کرنی ہے کہ دراصل کیا ہے؟
سو بھی اس طرح جس میں عقائد وغیر عقائد کا جھگڑا نہ ہو۔ اُس مذہب کی تحقیق
کی جائے جس کا اطلاق سب پر آئے یعنی مذہب بطور ابسٹرکٹ دیکھا جائے کہ

بہر نکہت نہ پردارد دماغ پیر کنعانی
نسیم پیرہن در آستیں دار دنشانیہا

مذہب کی نسبت ایک نامور محقق میکس مولر صاحب کا قول ہے۔ جس سے
بہتر میں نے آج تک نہیں سنا کہ :۔

"جس وقت انسان اپنی ہستی سے آگاہ ہوا اور جانا کہ اپنے
ماسوا سے میں علیحدہ ہوں۔ یعنی اپنی خودی کے ذہن میں آتے ہی سوجھتا
ہے کہ ضرور مجھ سے بھی بڑا کوئی ہے جس کے بغیر کچھ نہیں۔ اس میں ہماری
تعریف یا ہجو نہیں۔ مگر ہماری طبیعت ہی اس طرح پر واقع ہوئی ہو
کہ ہر طرح ہم اپنے تئیں کسی کا محتاج دیکھتے ہیں۔ تمام قومیں کسی باب میں
کتنی ہی مختلف ہوں مگر اس میں متفق ہیں کہ ہم نے اپنے تئیں نہیں بنایا
پس خدا شناسی کا پہلا مسئلہ یہی ہے جو حواس خمسہ کی طرح بغیر حجت و
دلیل ہمارے وجود کے ساتھ ہے۔ یہی روزمرہ میں ایمان ہے۔
جس کے بغیر کوئی مذہب قائم نہیں رہ سکتا۔"

یہ مسئلہ تحقیقات نیچریہ کے بالکل خلاف ہے جو اجزا لاانتہا اور بے حس سے
ترکیب عالم بتاتے ہیں، اور اس آگہی کا سبب اب تک نہیں بتا سکے کہ کیا ہے۔
جب مفردات جن سے ہم بنے بے حس تھے تو ہم میں حس اور آگہی کہاں سے آگئی
وہ گونگے بہرے تھے تو ہم میں ہوش کہاں سے آگیا؟ حلوہ اس لئے میٹھا ہوتا ہے کہ
شکر جس سے بنا میٹھی ہے۔ اگر نمک سے بنائیں تو میٹھا کس طرح رہے۔ لیکن گو اس آگہی

کا سبب نہیں بتا سکتے۔ مگر کہتے ہیں کہ ایک قانونِ اخلاق (جسے کوڈ آف موریلیٹی کہئے) یعنی بُرائی بھلائی کی تمیز خلقی اور طبعی ہم میں ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ یہ قوت ہم میں آئی کس طرح؟ اسپنسر صاحب کہتے ہیں کہ مذہب تو دراصل وہ خلش یا الجھن ہے جو انسان کو معمائے ہستی حل کرنے میں ہوتی ہے اور یہ نتیجہ فکر کا ہے اس کے بعد اس قانون مورلیٹی کا وجود ہے۔ ان کے حساب سے وہ تمیز نیک و بد یا قانونِ اخلاق جسے کوڈ آف مورلیٹی سمجھتے ہیں طبعی نہیں بلکہ اس خلش کا عرض ہے جو مذہب کی تعریف میں بیان ہوئے۔ مگر آرنلڈ صاحب ایک جدید محقق کی رائے میں مذہب صرف اس قانون خلقی کا (جسے کوڈ آف مارلیٹی مان رکھا ہے) قوت سے فعل میں لانا ہے۔ یعنی وہ نیک و بد کا ملکہ جسے اسپنسر صاحب نے مذہب کا عرض رکھا تھا۔ انھوں نے اس کا جوہر رکھا۔ غرض انسان میں اس ملکہ کا ہونا ہر طرح ثابت ہے۔ اور زیادہ اعتبار کے لائق پہلا قول ہے کہ یہ قوت، پروردگار کا عطیہ ہے۔ نہ اسباب نیچر میں سے کسی چیز کا نتیجہ۔ کیونکہ جب عالم اسباب میں سے اس کا ثبوت نہ ہو سکا۔ نہ نیچریوں نے اب تک اس کا پتا لگایا تو ضرور یہ الہام یا روحانی سامان میں رہا۔ ڈاروِن صاحب نے اس میں بہت محنت کی ہے کہ انسان کی اس آگہی اور قوت کو بھی اسباب عالم یعنی پیدائشی سامان میں قائم کریں۔ اور اسبابِ موالید کی بہت خاک چھانی ہے کہ انسان اپنے اس کمال و شرافت کو محض نیچر کے ذریعے سے پہنچا ہے۔ اسے اشرف المخلوقات کرنے میں خدا کی خاص عنایت نہیں بلکہ ترکیب و تفریق کا صدقہ ہے جو اسباب عالم کی ہستی کا سبب ہے۔ یوں کہ پہلے مادۂ عالم کچھ بنا پھر کچھ بنا۔ پھر کیا ہوا نہ جانے کیا بنا، کیا نہ بنا۔ یہاں تک کہ وہی جمادات نباتات و حیوانات کے موالید ثلاثہ طے کرتا ہوا بندر بنا جو انسان اور حیوان میں درمیانی رتبہ

ہے۔ اس سے نکل کر حضرت انسان بن بیٹھے۔ ٹنڈال صاحب نے بھی اسے مانا ہے کہ انسان کو کمالِ عقلی وغیرہ محض ورثے میں آئے ہیں۔ ورنہ روح دراصل کچھ نہیں۔ روح کوئی چیز خاص نہیں جو جسم سے علیحدہ ہو۔ اگر ہے تو جسم ہی کا ایک عرض ہوگی مگر ہیں کہاں چلا گیا۔ دکھانا یہ منظور تھا کہ ایسے رات دن کے منجھے ہوئے مسئلے میں کس قدر اختلاف ہے کہ کانشس نس مذہب کا عرض ہے یا مذہب کانشس نس (یا کانشس نس سے میری غرض وہ آگہی جو انسان کو اپنے وجود اور بُرائی بھلائی سے ہو)۔ جن نیچریوں کا بڑا دعویٰ ہے وہ بھی اس قوت کا ثبوت ایسا نہیں دے سکتے جو اطمینان کے لائق ہو۔ نیچر کی رو سے ہم کوئی ثبوت اس بات کا نہیں دیکھتے کہ ہم انہیں معمولی اجزار نیچر سے بن کر اپنے وجود سے آگاہ ہوں اور اپنا بُرا بھلا جانیں۔ جب ہمارے اجزائے خلقت جن سے ہم بنے، گم صُم ہیں تو ہم میں ہوش کہاں سے آیا۔ الہام، فضلِ خدا یا روحانی عطیہ نہیں تو کیا ہے؟ لیکن یہ سب باتیں بیکار کرنے کے لئے نیچریے سمجھاتے ہیں کہ ہماری فطرت ہی میں یہ بات ہے کہ اپنی ہستی سے واقف ہوں اور اپنا بُرا بھلا جانیں۔

اندھیر ہے کہ ہم سے تو ہر بات کا ثبوت چاہیں کہ جب تک عقل کو نہ سنبھالو چھوڑنے کے نہیں اور آپ زبردستی منواتے ہیں کہ یوں ہی مان لو۔ خیر مان لیا اب اس میں اتفاق نہیں کہ یہ کوڈ آف مورلیٹی عرض ہے یا جوہر، مذہب سے پہلے پیدا ہوا یا پیچھے۔ کیونکہ بقول بالزیک "نری یہ قوت تھی کس مصرف کی؟ محض اس علم سے کہ بُرائی بھلائی کچھ ہے سوسائٹی کا کیا کام چل سکتا تھا۔ اس لئے عمل ضرور ہوا کہ یہ تمیز کام میں لائی جائے۔ یہی مذہب ہے جس سے سوسائٹی قائم ہے۔ دنیا کو اس بات کی ضمانت ضرور تھی کہ وہ قوت عمل میں لائی جائے جس کے لئے مذہب لابد ہوا۔ مگر یہ بات کہ انسان کو مذہب کی ضرورت ہی

کیوں ہوئی رہ گئی۔ آنکھوں کے سبب دیکھنا۔ کانوں کے سبب سننا۔ ناک کے سبب سونگھنا ہے۔ علیٰ ہٰذالقیاس ہر بات کے لئے ایک سبب ہے۔ مذہب بھی اگر طبعی ہے جیسا کہ سید احمد خاں صاحب کا دعویٰ ہے تو ہماری طبیعت ہی میں کوئی بات ایسی دکھائی چاہیے جس سے مذہب کا سامان نظر آئے۔ الہام نہیں تو ہمیں مذہب کا خیال ہی کیوں آیا؟ مگر الہام مانے کون؟ یہی ہوتا تو ہمیں دقت ہی کیا تھی؟ نیچری تو ہم سے زبردستی ساری چیزیں طبعی قبول کرواتے ہیں۔ مگر ہمارا ارادہ ہے کہ گو آگہی و نیکی بدی کی تمیز وغیرہ ہم اُن کے ڈر سے جس طرح وہ کہتے رہے مان گئے مگر مذہب کو ہم روحانی ثابت کیا چاہتے ہیں۔

پروفیسر ٹنڈال کا قول ہے کہ اگر ہمیں وہ سبب معلوم ہو جائے جس سے آدمی، حیوانیت محض سے انسانیت میں آیا۔ تو پھر مسئلہ ایوولیوشن یعنی ہر چیز کا خود بخود از روئے اسباب نیچر پیدا ہو جانا لاجواب ہے۔ افسوس ہے کہ لاچاری تک قبول کرتے ہیں مگر فضل خدا نہیں مانتے۔ ہمارے سیّد احمد خاں صاحب کو بھی ایسی ہی ضد آپڑی ہے کہ یہ بھی مذہب تک کو نیچر ہی میں سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ نیچر میں کہیں مذہب سی چیز ممکن نہیں۔ یہ محض روحانی اور الہامی بات ہے۔ اس کی بنیاد ہی خلاف نیچر پر ہے۔ نیچر کا الٹ پھیر ہی تو اس کا ثبوت ہے۔ آگ لگنا اور آگ میں نہ جلنا حضرت ابراہیمؑ کا پہلا معرکہ ہے جس سے نیچری جل جل مرتے ہیں۔ جا شویع نبیؑ کا چاند سورج کو کھڑا رکھنا نیچر کو ڈانٹنا نہیں تو کیا تھا؟ حضرت عیسیٰؑ کا مردوں کو جلاتا فلسفیوں کا رُلانا نہیں تو کیا تھا؟ ہمارے پیغمبر صلعم کا نطق بیان معجزہ نہیں تو کیا تھا جس کا جواب کوئی نیچری نہیں دے سکتا۔

مگر یہ تو وہ مانے جو الہام کا قائل ہو۔ نیچر سے مذہب کو روحانی ثابت کرو تو

جائیں۔ نیچری تو اسے طبعی بتاتے ہیں۔

ذرا ٹھہریے۔ آہستہ آہستہ چلنے دیجیے۔

ابھی ہم یہ بھی نہ مانیں کہ خدا ہے یا نہیں ہے کیوں کہ سید احمد خاں صاحب کا یہ مسئلہ کہ انسان کو ایک معبود کی ہمیشہ ضرورت ہوئی ہے۔ محض عنایت ہے۔ ورنہ میں نہیں کہہ سکتا کہ بے الہام انسان کے ذہن میں خدا کا خیال آ بھی سکتا تھا۔ خدا کا خیال ایسا ابسٹرکٹ یعنی ذہنی مسئلہ ہے کہ کبھی کسی طرح طبیعت اصل میں جن سے میری مراد غایت وحشی قومیں ہیں سما نہیں سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ سب سے وحشی قومیں بھی اسباب نیچر میں سے کچھ نہ کچھ پوجتی تھیں۔ مگر جتنا یہ خیال درست ہے اسی قدر یہ خیال غلط ہے کہ اُن کے ذہن میں کسی معبود کا بھی دھیان ہو۔ معبود کا خیال تو نہایت ہی باریک و نازک مسئلہ ہے جو محض ابسٹرکٹ یعنی ذہنی ہونے کے سبب کبھی اس وقت کی وحشی قوموں کے خیال میں نہیں آسکتا۔

دنیا نہایت ہی موٹی موٹی باتوں سے شروع ہوئی ہے۔ الوہیت و وحدانیت کے باریک تصورات کا زمانہ، ان کے پیچھے کا ہے۔ بلکہ بقول محققان نیچر گو پہنچتے پہنچتے یہاں تک پہنچا ہے۔ پھر بھی ذہن میں نہیں آتا۔ ممکن نہیں کہ وہ قومیں جو نہایت وحشی تھیں، درخت و پہاڑ وغیرہ کو (جو از روئے محققین یورپ آغاز پرستش کے سامان سمجھے جاتے ہیں) خدا یا اس کی جگہ اس کے تصور جانے کے اسباب میں مانتے ہوں۔ اور یہ تو اور بھی قرین قیاس نہیں کہ اس کا گھر ان چیزوں میں سمجھتے ہوں۔ کیوں کہ جب مکین ہی ذہن میں نہیں تو مکان کہاں کا؟ پھر یہ خیال اور بھی مہمل ہے کہ انہیں اپنا ہمسر یا اپنا جواب و نظیر سمجھ کر مانا ہو۔ کیوں کہ نہایت ہی وحشی ہوں تو بھی درخت پہاڑ اور

دریا کو اپنے سے تو ضرور جُدا ہی جانا ہوگا۔ بلکہ مانا ہو تو اپنے سے اختلاف کے سبب بھلے ہی مانا ہو۔ مگر یہ بھی ثابت نہیں ہے۔ پھر اگر کہیے کہ خوف کے سبب تو محض خوف بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ پہاڑ سے خوف کا خیال جلدی ہی حماقت میں سمجھ لیا گیا ہوگا۔ پہاڑ سے مضرّت کے اندیشے بہت نہیں ٹھہر سکتے۔ پھر بات کیا ہے؟

میں بتاؤں؟ محققینِ السنہ نے اس کی تحقیق میں ہمیں بہت مدد دی۔ جو لوگ اس فن سے لگاؤ رکھتے ہیں وہی میرا مطلب اچھی طرح سمجھیں گے۔ ہر زبان میں دو قسم کے الفاظ ہیں۔ ایک تو کاغذ، قلم، دوات وغیرہ۔ دوسرے خوف، رنج برائی بھلائی، رفعت، بزرگی وغیرہ یعنی ایک تو وہ اسم جو محسوس ہوتے ہیں۔ دوسرے جو صرف ذہن میں آتے ہیں۔ پچھلوں کا اندازہ پہلوں کے ساتھ ہر زبان کی شائستگی کا پیمانہ ہے۔ اس میں مرکب کا ذکر نہیں کہ یہ بعد کو ایجاد ہوئے۔ یہاں ہم صرف مفردات سے غرض رکھتے ہیں، جو ہر زبان میں اصل کہلاتے ہیں۔

(ا) کو الف سمجھ لیا ہے اور بے کو اس طرح (ب) لکھتے ہیں اور یہ بھی فرض کر لیا ہے کہ اس شکل کی یہ آواز ہوگی اور یہ اس کی۔ اگر کوئی نہ مانے تو ثبوت میں ہم کہیں گے کہ تحریر تصویر سے لی گئی ہے۔ قدیم مصریوں میں عبارت تصویروں سے بنتی تھی۔ چنانچہ اب بھی جو عرب و شام و مصر کے صحراؤں میں کتبے ملتے ہیں ایسی ہی تحریروں میں ہوتے ہیں۔ یعنی مثلاً بہادری لکھنی ہوتی تو شیر بنادیا۔ ہوشیاری کے لئے کوّا۔ غرض اسی طرح ان علامتوں سے کام لیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ بعضے ان میں سے محض ان تصویروں کے اشارے رہ گئے۔ مثلاً عربی اور عبرانی کا حرف (س) کہ چڑیا کے پنجے کی علامت ہے۔ غرض یہ کہ جس طرح تحریر میں یہ حال ہوا تقریر میں ہم سمجھ لیں کہ پہلے ایک قوم کے دو وحشیوں نے ایک چیز دیکھی تو ضرور دونوں کے ذہن میں جس طرح آنکھ پر علم نظر کے موافق پہلے عکس پڑتا ہے تب دکھائی دیتی ہے اسی

اُسی طرح اس چیز کا اثر ان دونوں کے ذہن میں بھی ہوا اور اس اثر کے اظہار میں ایک نے یا دونوں نے جو کچھ کہا وہ اُس چیز کا نام ہو گیا۔ یعنی جو خیال کہ اُن کو ایک چیز کے دیکھنے سے ہوا اس خیال کا اظہار جس طرح پر انہوں نے کیا وہی اس معنی میں سمجھا گیا۔ یہ تو ان چیزوں کا حال ہوا جو محسوس ہو سکتی تھیں۔ غیر محسوس مثل خوف، رنج وغیرہ کے لئے بھی انھی سے کام لیا گیا کہ خوف کو کسی ایسے جانور سے نسبت دی جس سے ڈرتے تھے (مثلاً سانپ) اسی طرح کسی اونچے پہاڑ یا بڑے درخت سے بزرگی کا کام لیا۔ یعنی جو کچھ ذہن میں آیا اسباب ظاہری سے مشابہ کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ پہاڑ درخت وغیرہ کا ماننا اپنے روحانی جوش و جذبات کا اظہار تھا۔ یعنی زبان و سامان کی تنگی سے روحانی خیالات کو جو پروردگار نے انسان کے ذہن میں دیے تھے جسمانی طور سے ادا کیا۔ کیوں کہ قوائے روحانی تو موجود ہی تھے جن کے اظہار بغیر مفر بھی نہیں ہے۔ مگر شائستگی اور اسباب کی قلت سے یوں موٹے طور پر انھی جسمانی چیزوں سے جو روزمرہ پیش نظر تھیں ان کا اظہار کیا گیا۔ یہی سبب ہے جو پہلے بہت ہی آس پاس کی چیزوں کو مانا۔ مثلاً درخت، پہاڑ، دریا، جو آغاز مذہب کے اسباب پرستش سمجھے جاتے ہیں۔ ان سے نکل کر ہوا۔ طوفان، آسمان، وغیرہ کی باری آئی۔ محققین مذہب اسے بہت غور طلب مرحلہ اس تحقیق کا سمجھتے ہیں کہ اس وقت تمام مذاہب ایک ہی دھیان پر آ گئے۔ یونانیوں کا خدا ذیوس، رومیوں کا جوڈ، ٹیوٹن قوم کا ذیو اور ہندوؤں کا دیا دئس ٹھہرا۔ ان سب کی اصل ایک ہے اور معنی ایک ہی ہیں۔ یعنی بلند، آسمان، فضا، عالم بالا، وغیرہ یہی سبب ہے جو یونانیوں نے انسان کی تعریف میں کہا کہ انسان ایسا حیوان ہے جو اوپر دیکھتا ہے اور بقول صاحب "صحیفہ فطرت" جو پہلا سبب بیان کرنے میں غلطی کر گئے مگر یہ بہت درست کہا کہ حقیقت

میں انسان ہی اسمان سے علم حاصل کر سکتا ہے۔ جو حواس اور عقل سے نہیں حاصل ہو سکتا۔ یہاں تک کہ ایک نامور محقق نے توریت میں بھی اسی کا اثر دیکھا۔ جہاں یہوواہ کو لشکروں یعنی تاروں کا خدا اور آسمانوں کا خدا وغیرہ لکھا ہے۔ اسی خیال رفعت کے ثبوت ہیں۔ مگر ان باتوں میں میرا مطلب رہا جاتا ہے کہ جب درخت پہاڑ وغیرہ روزمرہ کے استعمال سے عام اور سرسری ہو گئے تو ان روحانی اسباب کے اظہار کے لئے نئی چیزوں کی تلاش ہوئی۔ اور آسمان، ہوا وغیرہ کو درخت پہاڑ وغیرہ سے زیادہ سمجھ کر ان سے کام لیا۔ جب ان کی قلعی بھی کھلی تو جانور، پھر انسان اور آخر کو تمام محسوسات میں سے کسی کو نہ چھوڑا۔ پھر جس طرح کتاب مصنف کی جگہ اور اثر سبب کی جگہ، کام دے جاتا ہے۔ وہ روحانی بلندی یا رفعت یا قوت جو ان محسوس چیزوں سے بیان کرنے کی غرض تھی کثرت اظہار کے سبب خود ان چیزوں کی طرف ڈھل گئی۔ ورنہ دراصل ان چیزوں مثل درخت و پہاڑ وغیرہ سے انسان تک کا ماننا صرف ان روحانی حرکتوں اور ولولوں کا اظہار تھا جو پرستش پر محمول ہوتا رہا یہی سبب ہر شے پرستی کا ہے کہ اپنے روحانی ولولوں کے اظہار میں انسان نے جو چیزیں کہ نظر آئیں اپنے ذہن اور حالت کے موافق سب ہی اس طرح برت ڈالیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ موسیقی کی طرح روحانی ولولوں کا ذخیرہ انسانوں میں کم وبیش ہمیشہ موجود رہا ہے۔ اور سب کو اپنی اپنی وضع پر اس کے اظہار کا فکر رہا۔ مگر تکمیل اس کی جب اسباب نیچر سے نہ ہو سکی تو غیر اسباب نیچر یعنی الہام سے ہوئی۔ انسان کے روحانی ولولوں اور جوشوں کے اظہار میں جو کچھ ہوا وہ غلطی سے اصول پرستش میں سمجھا گیا۔ حالاں کہ پرستش اور خدا پرستی بے الہام ممکن نہیں کیوں کہ ؎

اگر کلام نہ از آسماں فرود آید
چرا بہر سخنے خامہ در سجود آید

یہاں تک تو میں نے صاحب "صحیفہ فطرت" کے خلاف (جو مسلمات سے مسئلے نکالتے ہیں) آثار سے اسباب اور نتیجوں سے اصول نکالے۔ مگر بحث یہ اتنی بڑی ہے کہ میری مرضی کے موافق ابھی یہ طے نہیں ہو سکتی۔ لیکن چونکہ اس پرچے کی گنجائش سے زیادہ یہ بحث بڑھی جاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پہلے ہم اور حضرات نیچر سمجھ لیں کہ اس طرح کی تحریر سے مقصود کیا ہے؟ یعنی ناظرین کو اس سمع خراشی کے اسباب سمجھا لیں تب سنائیں۔ اس لئے یہ اگلا مضمون اسی غرض سے صاحب تہذیب الاخلاق کی خدمت میں نذر ہے ؎

آمد دِگر بصلح درِ جنگ باز کرد
صلحے بمصلحت پئے جنگِ دراز کرد

(تیرھویں صدی۔ شوال ۱۲۹۶ھ)

نیچر سے بے خبر

بلا سے ہو پامال سارا زمانہ
نہ آیا انھیں پاؤں رکھنا سنبھل کر

ہمارے سیّد احمد خاں صاحب بہادر نیچری ہونے کا تو دعویٰ کرتے ہیں مگر خیر سے جانتے نہیں کہ نیچر اور نیچری ہوتا کیا ہے؟ اور چونکہ جرات اکثر لاعلمی سے زیادہ ہوتی ہے۔ گھوڑے پر دوڑ دوڑ کر وہی چڑھتے ہیں جو ابھی گرے نہیں۔ سواری کا شوق تب تک بہت رہتا ہے جب تک کہ آدمی نئی نئی سواری سیکھتا ہے۔ جہاں دو چار دفعہ منہ کے بل آیا اور آفاتِ سواری کا تجربہ ہوا۔ پھر اتنا جی نہیں چاہتا۔ سیّد احمد خاں صاحب کا شوقِ نیچر بھی اسی ناواقفی کے سبب دور پہنچا ہوا ہے۔ ؎

فرش سے عرش تک پتا ہی نہیں
دور پہنچے ہوائے یار میں ہم

اے بندگانِ نیچر! ہم سے زیادہ خیر خواہ بھی تمہیں نہیں ملیں گے کہ صرف تمہارے لئے تم سے زیادہ اس کی تحقیق کر رہے ہیں اور اس کی وہ داد دیا چاہتے ہیں جو تم سے نہ کبھی بن پڑی نہ کبھی بن پڑے، کیوں کہ جس طرح دنیا میں کسی کو اپنے

ہم جنس پر رحم نہیں آتا یہ غیر ہی ہیں جو رحم کرتے ہیں۔ عورتیں اگر عورتوں کے مقدمے کرنے بیٹھیں تو کبھی کوئی عورت نہ چھوٹے۔ یہ مرد ہی ہیں جو رحم کر جاتے ہیں، اسی طرح ہم نیچر کی تحقیق کا وہ ارادہ رکھتے ہیں جو کبھی اہلِ نیچر سے نہ ہو سکے، اس کی حق رسائی کا وہ سامان کیا ہے جو نیچریوں کو نہ سوجھا ؎

بادۂ خونِ جگر ماست زمینا مطلب

گہر از چشمِ ترماست ز دریا مطلب

مگر پابندانِ مذہب اس سے یہ نہ سمجھیں کہ لو یہ بھی نیچر کا ہو لیا۔ نہیں۔ لڑائی میں بعضے جرنیل تو اپنے لشکر سے حریف کی کمزوری و ذلت کا ذکر کرتے ہیں مگر بعضوں نے اس سے بہتر سمجھا ہے کہ دشمن کی بہادری و دلیری کا ذکر پہلے کیا جائے کہ اول تو سپاہی اُسی نسبت سے سنبھل کر آمادۂ جنگ ہوں اور جب فتح ہو تو گویا اسی قدر اپنی نمود ہو گئی جس قدر کہ ان کی تعریف میں پہلے مبالغہ کیا گیا تھا یہی سبب ہے کہ مذہب والے نیچریوں کے مسئلے کو پہلے ہی مبتذل سمجھ کر اس کی تحقیق کی طرف اس طرح متوجہ نہ ہوئے کہ نیچر کی جتنی قلعی کھلتی اتنی ہی مذہب کی جلا ہوتی۔ یہ نہ سہی کہ حسن رخ نکویاں آئینے میں دوگنا چمکتا ہے اور نگینہ ڈانک سے ڈیوڑھا معلوم ہوتا ہے تو بھی اتنا ضرور دیکھا ہے کہ جس قدر اندھیرا ہو اسی قدر سیرِ چراغاں کا مزہ ہے جتنا انتظار ہو اتنی ہی قدر آمد یاد ہو۔ مصوروں سے پوچھئے کہ تصویر کے لئے سائے کی کتنی ضرورت ہے۔ جتنا سایہ اچھا ہوگا اتنا ہی عمدہ مرقع کھنچے گا۔ صوفیائے کرام کے حال میں دیکھا کہ ظاہرا کیسے کیسے گناہِ کبیرہ، نہایت حسنِ عمل کا سبب بن گئے۔ ظاہر کے بہت ہی برے، باطن کے اتنے ہی اچھے نکلے۔ بیماری سے آگہی اس کے علاج کا سبب ہوتی ہے۔ اور برائی سے واقف کاری اس سے بچنے کی خواہش پیدا کرتی ہے۔ بلکہ جس برائی کا بہت رواج ہوا۔ آخر اس کا اخراج

ہوا۔ ولایت میں شراب خوری کی کثرت، پارسائی کا سبب ہو رہی ہے کہ جا بجا اس کے انسداد کی کمیٹیاں اور ٹمپرنس سوسائٹیاں قائم ہوئیں۔ میری غرض یہ کہ برائی کا وجود بھی بھلائی کا سبب ہو سکتا ہے کہ عیب کو دیکھ کر انسان کو جبلی جتنی رغبت ہو اتنی ہی نفرت ضرور ہو گی۔ مگر اس کا ثبوت میں جبر و اختیار کے مسئلہ میں اچھی طرح دوں گا۔ جو نیچریوں کی روگردانی کا بہت بڑا سبب ہو رہا ہے ابھی تو پھر وہیں سے چلئے کہ مخالف ہی ہمارا قوتِ بازو ہے کہ ہم سے لڑ کر ہماری طاقت بڑھاتا ہے۔ اکھاڑے میں کشتیاں اس لئے ورزش کے اصول میں ہیں کہ یہ لڑائی دراصل طاقت افزائی ہے۔ اس سے ضرور ہوا کہ ہم تحقیق نیچریہ کی بھی وہ داد دیں جس سے پابندیٔ مذہب کی قدر ہو ؎

اکبار در جولاں بہ بیں آں قامتِ ناز آفریں
ناز خرامش بر زمیں اے کبکِ کہساری مکن

پہلے مضمون میں میں نے تحقیقاتِ نیچریہ کو شروع سے لیا تھا۔ لیکن پیشتر اس سے کہ میں پھر وہی مضمون چھیڑوں چاہتا ہوں کہ پہلے سیّد صاحب سے دو چار باتوں کا ذکر کر لوں جو ایسی بحث کے تصفیہ میں ضرور ہیں ؎

دارم از عشق و جنوں سلسلہ جنبانے چند
درمیاں تا دلِ آوارہ بیا بانے چند

اوّل تو نیچری و محقق نیچر دو جُدا مرتبے ہیں۔ محققِ نیچر تو وہ جو کارخانۂ عالم میں سے کسی جزو کی تحقیق کرے۔ جزو کی اس لئے شرط لگائی کہ کل کی تحقیقات کا ارادہ جُنون میں داخل ہے۔ جو کچھ بن پڑے غنیمت ہے۔ تمام اہل کمال اپنی اپنی وضع پر سب اسی میں آگئے۔

ان سے نہ ہمیں بحث، نہ ہمارے سیّد احمد خاں صاحب بہادر ان میں ہم

سے لڑتے ہیں۔ جیالاجی، باٹنی، حکمت، ہیئت وغیرہ ہزاروں علوم وفنون میں سے کسی میں کچھ اہل یورپ کی طرح کر کے دکھانے کا دعویٰ کیا ہوتا تو سب سے پہلے ہم سے اپنی تعریف سنتے۔ دعویٰ بھی کیا تو نیچری ہونے کا۔ بہت ہی نرمی کر کے اس کے معنی کہیے تو خدا سے زیادہ عالم اسباب کا مُعتقِد۔ بحث طے کرنے کے لئے (ایمان سے نہیں) ایک کسی قسم کے علّت العلل کا ماننے والا مگر اس کو بھی اسباب نیچر ہی میں جاننے والا۔ غرض اوّل تو خدا و مذہب سے از روئے پابندی انکار ایمان ہے تو اصول نیچر پر جن کے سامنے مذہب والہام بیکار، دائی پر عشق اور ماں سے بیگانگی۔ تماشے میں محو اور مداری سے غرض نہیں۔ یونان کی فلاسفی نے دو قسم کے اصول رکھے۔ ایک تو وہ جو دنیا کو غایت ہستی سمجھتے تھے کہ اس کے بعد کچھ نہیں۔ اس لئے جس قدر عیش کیا جائے طبعی اور لاچاری میں ہے۔ کیوں کہ مرنے کے بعد کچھ ہوتا ہی نہیں ہے۔ جو کچھ عیش کرنا ہو زندگی میں اس کی داد دے لینی چاہیے اور چونکہ زندگی مختصر اور بے اعتبار ہے جتنا ہو سکے اور جتنی جلدی ہو سکے دادِ عیش میں توغل کیا جائے۔ یہ مسئلہ کمبخت اپیکورس حکیم کا تھا۔ اس تعلیم کے معتقد اپیکورین کہلاتے ہیں۔ یہ ایک قسم نیچریوں کی ہوئی۔ دوسری اسٹوئیک جن کا عقیدہ یہ تھا کہ زندگی چونکہ مختصر ہے جس طرح بنے کاٹ دینی چاہیے اور حتی الامکان تکلیف و مصیبت کو ترجیح دینی چاہیے۔ دونوں نے اختلاف و اتفاق اجزاء عالم کو کارگاہ وجود کا بڑا سبب جانا۔ مرنے کا خوف اصول نیچر کے خلاف بتایا۔ خدا کا ماننا محض عنایت میں داخل کیا۔ اور جزا و سزا کا اندیشہ حماقت میں سمجھا۔ الہام کو فضول اور نیچر کو اصل اصول بتایا۔ معجزہ مان نہیں سکے کہ بزرگوں کے شعبدے ہیں اور نبیوں اور ولیوں میں کیا دھرا ہے کہ وہ بھی بندے ہی تھے۔

غرض جب اتنا اور اس سے زیادہ بہت کچھ خلاف مذہب والہام مانا تو نیچری بنے اور جب مذہب و نیچر دونوں کو کچھ نہ سمجھے تو سیّد احمد خاں رہے۔ کیوں کہ جب مذہب مانا تو نیچریوں کی خرافات کہاں؟ اور تحقیقات نیچریہ میں اسلام پر ایمان کہاں؟ یہ سیّد احمد خانی ایجاد ہے کہ دونوں سے لڑے۔ نہ نیچر کو مانے اور نہ عقائد اسلام کو سچّا جانے، وہ نیچری مسلمان بنے ؎

نتواں بگیتی متّصل برکین عالم بستن دل
اے غمزہ خونریزی بہل اے عشوہ خونخواری مکن

بڑی رعایت کر کے اگر یہ کہا جائے کہ تحقیقات نیچر کو اسلام میں لانے سے سیّد احمد خاں صاحب کی شاید یہ غرض ہے کہ یورپ کے نیچری اسلام کی خوبیوں کے قائل ہوں۔ بات تو ظاہر میں بہت چبھتی ہے۔ مگر ایک انگریز سے جو ذکر آیا تو بہت ہنسا اور کیا معقول جواب دیا کہ وہ تو کیا مانیں گے؟ مگر اس انتظار اور اس سامان میں مسلمان تو ضرور نیچری ہو جائیں گے۔ اور یہی ہو رہا ہے کہ نیچری تو کوئی مسلمان نہیں ہوتا۔ مگر مسلمان بگڑے جاتے ہیں۔ رونا ہے تو اسی کا کہ ہماری قوم کے اچھے اچھے نکلے جاتے ہیں ؎

آہ ایں چہ دلکشی است کہ سرہائے یکدگر
خویشاں بریدہ در رہِ قاتل نہادہ اند

اسی لحاظ سے ایک اچھے معتقدِ اصول نیچریہ نے جس میں ابھی مذہب کی بُو باقی ہے، تمام نیچریوں سے صلاحاً کہا کہ اپنے عقائد اور مسئلوں کو بہت زبان دبا کر سمجھانا چاہیے ورنہ اس سے بڑے بڑے فسادوں کا اندیشہ ہے ؎

نیم زافسردگی عاشق ولے دل یاد او دارد
شرابے نیست اما ایں سفالِ کہنہ بو دارد

یورپ سے آزاد ملک کے نیچری تو یہ کہیں اور ہمارے سید احمد خاں صاحب سوشیل رفریشن یعنی اخلاق روزمرہ وسوسایٹی کی اصلاح کرتے کرتے اسلامی مفسرین اور مذہبی محققین کے پیچھے پڑ جائیں اور مسلمانوں کو سمجھاتے سمجھاتے نیچری ہونے پر ناز کریں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ اگر تمام اسلام کو بھی اپنی وضع پر نیچر میں لاڈالا اور ثابت بھی کردیا کہ ہم ایسے نیچری نہیں جو تم سمجھے ہوئے تھے بلکہ ایک قسم خاص کے ہیں تو بھی محض نیچری ہونے کا دھبا ہی ایسا ہے۔ جو کتنا ہی دھویے پھر بھی انگریزی سیاہی کے داغ کی طرح کچھ نہ کچھ رہ جائے گا۔ نقش اور گدنے کے نشانوں کی طرح جو چماریاں اپنے بدن پر کراتی ہیں جلد میں پیوست رہے گا ؎

اکنوں اگر فرشتہ نکو گویدت چہ سود

در شہر صد حکایتِ بدنامیٔ تو رفت

میرے اس وقت کی سمع خراشی سے غرض یہ ہے کہ ایک دن فرصت میں سید احمد خاں صاحب بہادر اپنے مسلماتِ نیچریہ سے اطلاع دیں کہ ان کے عقاید ولایتی پروفیسروں میں سے کس کے پیرو ہیں۔ اور خود اس فن میں ہمارے حضرت نے کیا تحقیقات کی ہے۔ پہلے اپنے مسلمات قائم کرلیں کہ نیچر میں کہاں تک ہمارے ساتھ چلیں گے اور راہ میں چھوڑیں گے تو نہیں؟ دوسری یہ بات کیا ہے کہ کچھ مسلمات تو نیچر کے لیتے ہیں اور کچھ مذہب کے۔ اور اس اختیار کے لینے کی کوئی سند نہیں دکھاتے۔ فریڈی اور ڈیوی اور ورچو وغیرہ باوجود عمدہ نیچرل فلاسفر ہونے کے مذہب کو اپنے منصب سے علیحدہ ہی سمجھتے ہیں۔ مذہب کو اس پہلو سے چھیڑا ہی نہیں، نہ کسی اور کو ایسی صلاح اور اختیار دیا۔ تحقیقات نیچر کو اسلام میں لانے سے سیّد احمد خاں صاحب بہادر کی غرض ہے کیا؟ اور پھر مع اختراع کہ مذہب کا ثبوت نیچر سے چاہتے ہیں۔ حالاں کہ مذہب

کے خون کرنے کے لئے تو یہ مسودہ ہی گھڑا گیا۔ جب نیچر کی حقیقت دریافت کرنے میں انسان کو لاچاری ہوئی تو مذہب و الہام نے ہمیں اس کی ماہیت بتائی۔ اب اُلٹے اسلام و مذہب کا ثبوت نیچر سے لیا جاتا ہے۔ اس میں سب ہی آگئے۔ جیسا کہ اگلے مضمون سے معلوم ہوگا کہ ع

یک جامہ بر اندازۂ اندام ندارد

(تیرھویں صدی۔ سنہ ۱۲۹۶ھ)

اسرارِ ازل

ان کی نسبت اگلے نیچریوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ میں جلدی جلدی اس مضمون کے پہلے حصّے میں بیان کر چکا۔ اسی طرح آج کل کی تحقیقاتِ نیچریہ کا ذکر کرتا ہوں کہ اس زمانے کے نیچریوں کے خیالات مجملاً معلوم ہو جائیں تو آگے کو ان کے دعووں کے جواب میں پڑھنے والوں کو آسانی ہو۔

اگلے نیچریوں کی طرح یہ بھی مذہب کے تمام بڑے مسئلوں سے انکار پر اپنی تحقیقات کا مدار جانتے ہیں۔ پہلے خدا، الہام، تقدیر، قیامت وغیرہ ہر مذہب کے اصلی عقائد سے انکار کر لیں تب آگے چلیں۔ اور تحقیقات کر کے یہی نتیجہ نکالیں۔ غرض قسم ہی اسی بات کی کھائے بیٹھے ہیں۔ چھوٹتے ہی یہی کہتے ہیں کہ نیچر اپنے سوا کہیں اس بات کا پتا نہیں دیتی کہ اس سے خارج کوئی قدرت ہے جس کی مرضی پر یہ چل رہی ہے۔ اس سے تو خدا بیکار ہو گیا۔ (نعوذ باﷲ) اور جہاں یہ ثابت کر دیا کہ کارگاہِ وجود محض نیچرل ایوولیوشن EVOLUTION یعنی ایک سے ایک چیز کا پیدا ہونا ہے۔ ہیزدہ ہزار عالم غلط، ساری خلقت ایک ہی مادے اور ترکیب کا نتیجہ ہے۔ پھر الہام کہاں؟ حضرت موسیٰ کی پہلی کتابیں گئی گزریں جن پر تمام اہلِ کتاب کا ایمان ہے کہ دنیا چھ دن میں بنی۔ طوفان میں

غارت ہوئی۔ اور پھر مخلوقات کے ان جوڑوں سے بسی جو حضرت نوحؑ کی کشتی میں بچ رہے تھے۔ اول تو خدا نہ کرے جو روح کے قائل ہوں اور ہوئے بھی تو جسم کا ایک عرض بتایا کہ جب تک ہم ہیں تب ہی تک ہے۔ جسم ہی میں داخل ہے اور محض ہمارے کھانے پینے اور جسمانی ضرورتوں کا صدقہ ہے۔ جہاں یہ ضرورتیں بند ہوئیں اور یہ فنا ہوئی۔ قیامت کی نسبت آج کل کے نیچریوں کے گرو گھنٹال پروفیسر ٹنڈال فرماتے ہیں کہ مجھے ہمیشہ اس طرف سے شک ہی رہا۔ تسلی ہوئی تو فلابیرت شاعر کے اس کلام سے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس نے ایک دفعہ بنایا وہی پھر بنا سکتا ہے (یہ لفظی ترجمہ اس خدشے کا ہے جس کا جواب قرآن شریف میں پہلے ہی آچکا ہے کہ (قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُ ۝ (پارہ ۲۳ سورۂ یٰسین) لیکن ایک دن گایوں کو قبرستان میں مردوں کی خاک سے سبزہ اگا ہوا دیکھ کر دھیان آیا کہ ان کا گوشت تو جزو انسانی ہو گیا۔ ان کے کھانے والے اور بھی انہیں کے جزو ہو گئے۔ جب اس طرح ایک شے کے ذرے یعنی اجزا دوسرے کے وجود کے سبب ہوئے تو ایسے اجسام کا دعویٰ قیامت میں کس طرح سلجھے گا؟ وہی اجزا ایک ہی وقت میں دو دو جگہ کیسے جائیں گے؟ جب تک ایک فنا نہ ہو لیا دوسرے کا وجود کس طرح ہوگا:؟ چلو قیامت کا تو یوں فیصلہ ہو گیا۔ جزا و سزا کے بارے میں بڑے مل صاحب کی سنئے کہ ذرا کوئی ایسے معبود کا خیال تو کرے جو باوجود نیک و رحیم ہونے کے دوزخ بنائے اور عالم الغیب و قادر مطلق ہو اور اس لئے قصداً انسان کو پیدا کرے کہ پھر ان کو اس دوزخ میں ڈالوں گا۔ جسے ہمارے ستانے میں مزہ آئے وہ ضرور ہمارا خدا ہو؟" اس سے دوزخ ندارد ہوئی۔ بہشت کی نسبت ہربین صاحب کہتے

ہیں کہ ہیں اس کا قائل نہیں کیوں کہ ذہن میں نہیں آتی۔ جبر و اختیار میں پھر مل صاحب کو شبہ ہے کہ ہم کتنی ہی محنت کیوں نہ کریں، اس مرضی کے خلاف کبھی نہیں کر سکتے جو غیر محدود ہے۔ اور ہماری سب کی مرضیوں پر حاوی ہے۔ ہماری سعی، اگر ہم اچھے ہوا چاہیں چونکہ محدود اور جزوی ہے کبھی اس مرضی کے خلاف صحیح نہیں نکل سکتی جو غیر محدود اور کلّی ہے۔ جس طرح پہیہ کی دُھری کی لکڑیوں کو پہیہ کے ساتھ پھرنے میں لاچاری ہے اسی طرح ہماری سعی و آرزو کو خدا کی مرضی کے سامنے پیش چلنے میں مجبوری ہے۔ اس نے حسن عمل کی ضرورت نہ رکھی۔ خدا کی قدرت کو کس طرح ٹالا ہے کہ "بتاؤ درخت میں قوتِ نمو یا جان کس طرح آئی؟ درخت اگنے سے پہلے وہ کہاں تھے؟ درخت سے خارج کونسی بات تھی جو اس کی ہستی کا سبب ہوئی؟ مادۂ قوت نیچری کے سوا جس سے نباتات کی روئیدگی ہے اس میں اور کیا تھا؟ اور جب یہی درخت سُوکھ کر آگ میں گیا تو وہ قدرت کہاں گئی"؟ اسی طرح روح انسان میں کب آئی۔ اکٹھا آئی یا رفتہ رفتہ آئی؟ اکبارگی ماں کے پیٹ کے ساتھ آئی تو پھر کیوں نابالغ پر حد شرع قائم نہیں کرتے؟ دوزخ و بہشت سے بچّے کیوں نہیں ڈرتے؟ اور اگر رفتہ رفتہ آئی تو جو چیز تقسیم ہو وہ فنا سے کیسے بچے گی؟۔ اور اگر سنِ بلوغ میں آئی تو اب تک بچہ کس طرح جیا؟

مذہبوں کی ایجادیوں بتائی کہ تمام خدا پرستوں کی اصل آتش پرستوں سے ہے سب سے بڑھ کر ایک خدا کے ماننے والے زردُشتی ہیں۔ انھی سے وحدانیت کا مسئلہ یہودیوں عیسائیوں اور مسلمانوں میں پہنچا۔ خراب کیا تو اس جبر و اختیار یعنی نیکی و بدی کی اصل نے۔ زردشتیوں نے اس سے تنگ آکر ہرمز کے سوا جو ان کا خالق اصلی ہے لاچار اہرمن کو بنایا۔ ورنہ ہرمز تک تو یہ بڑے مُوحّد

تھے۔ یہودیوں نے اسی مارے عاقبت اور مرنے کے بعد جزا و سزا کے مسئلے کو نہ چھیڑا۔ خالق کے رحم و قہر ملانے کے لئے عیسائیوں نے کفارہ اور حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا ہونا مانا۔ مسلمان تقدیر میں پھنسے۔ غرض سب کو اس ایک مسئلے یعنی نیکی و بدی کی اصل نے بگاڑا۔

پادری فانڈر نے تو اسلام کو پارسیوں کی رسوم سے ملایا ہے۔ مگر آج کل کی تحقیقات سے بنی اسرائیلیوں کا مذہب بالکل زردشتیوں سے نکلا معلوم ہوتا ہے۔ ثابت کرتے ہیں کہ باغ عدن کا قصہ سرے سے آخر تک یہودیوں نے مجوسیوں سے بابل کی اسیری میں لیا۔ اسی طرح اور پیدائش کی باتیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کے خیالات محض ان کی مصری تعلیم و مصری صحبت کے اثر کا نتیجہ تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کا زندہ آسمان پر جانا نیچر کے خلاف ہے۔ جس کے سبب بقول ڈاکٹر ریچال ان کی پیدائش نعوذ باللہ یہودیوں کے قیاس کے موافق حرام اور انتقال مکر! رہے معجزے اوّل تو خلاف قیاس ہیں۔ اگر کسی نے کئے بھی تو خدا کی طرف سے ممکن نہیں۔ سب انسان ہی سے متعلق ہیں۔ معجزے کی تعریف یہ کہ جو اوروں سے نہ ہو سکے۔ مثلاً حضرت عیسیٰؑ نے مردے جلائے، جو اور کسی انسان سے ممکن نہیں۔ اس پر نیچری کہتے ہیں کہ کیا ضرور ہے جو اب تک انسان سے نہیں ہو سکا۔ پھر کبھی آیندہ بھی کسی سے نہ ہو سکے۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی؟

شاید ایک زمانہ وہ آئے کہ گاجر مولی کی طرح ہم صرف تدبیر سے آدمی پیدا کرنے لگیں۔ اس لئے معجزہ کو خدا کی خاص قدرت سے کچھ

علاقہ نہیں۔

دعا مانگنا اس لئے حماقت ہے کہ خدا ایں تلوّن نہیں جو محض گریہ و زاری اور منت و سماجت سے اپنے مقرر کئے ہوئے انتظام میں فرق ڈالے۔ ان میں بعضے نیچری ایسے بھی ہیں جو دل لگی کے لئے مذہب کو بھی لگائے رکھتے ہیں جن کا عقیدہ یہ ہے کہ الہام کی دس بیس باتوں سے انکار کرنے میں ہرج کیا ہے۔؟ جو باتیں ذہن میں نہ آئیں وہ نکال ڈالیں۔ مضائقہ کیا ہے جو مذہب کو اپنے مطلب کے موافق کرلیا۔

میں جانتا ہوں کہ سردست نیچریوں کا حال معلوم ہونے کے لئے اس قدر بس ہے۔ یہ میں نے آج کل کے نیچریوں کے کلام سے لکھا ہے اور اُن کے مضبوط مسلّمات کا خلاصہ کیا ہے۔ زیادہ تحقیقات ان کی اور مضمونوں میں دیکھئے گا۔ تب تک عمر خیّام کی رائے سن رکھئے۔

رباعی

اسرار ازل را نہ تو دانی و نہ من — ویں حرفِ معمّا نہ تو دانی و نہ من

ہست از پسِ پردہ گفتگوئے من و تو — چوں پردہ برافتد نہ تو آنی و نہ من

(تیرھویں صدی۔ شوال ۱۲۹۶ھ)

شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے گزرگاہِ خیال

دنیا کو جتنی مشابہت میکدے سے ہے اتنی کسی سے نہیں جس طرح مستوں کی کوئی حرکت سمجھ میں نہیں آتی اِس کی بھی ساری باتیں نرالی دیکھیں۔ اس کا کارخانہ ہی مثلِ وضعِ مستاں عجیب ہے ؎

مرنج اے شیخ ازمن گرسخن بے پردہ میگویم
کہ ایں بے پردہ گفتنہا ز تاثیر خرابات است

ذرا سر اٹھایئے تو ایسا خمخانۂ بے ستون دیکھئے جس میں ایک ساغرِ واژگوں رات دن چل رہا ہے۔ گردن جھکایئے تو زیرِ قدم ایک اور ہی عالمِ سکوت دیکھئے کہ اُس طرف تو نعرۂ مستانہ تھا اِدھر چُپ لگ رہی ہے۔ یہ اپنے حال میں مست ہیں تو وہ مدہوش پڑے ہیں۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں۔ یہ اُن کی تو وہ ان کی نہیں سُنتے ساقی روزگار نے دونوں کو ایسی داروئے بیہُشی پلادی ہے کہ وہ تو چُپ ہو کر پڑ گئے اور یہ اپنی دُھن میں بکنے لگے۔ یعنی جب وہ تہِ خُم پہنچے تو دُرد کی طرح بیٹھ گئے اور یہ بسر جوشِ مے کی طرح اُبل گئے جب تک کہ یہ بھی اُنھیں میں نہ جا ملے ؎

جہاں نیست مستانہ در گفتگو
زمیخانۂ اوست ایں ہائے دھو

غرض یہ عالم ایسا خمکدہ ہے جس کا سر جوش سخن میں ہے جس کی بدولت ہر شخص اپنی اپنی دھن میں ہے۔ اس میں زبان کا ہلانا نعرۂ مستانہ کے برابر ہے رنگینیٔ کلام بادۂ گلگوں سے بڑھ کر ہے۔ گلوئے خُم خوش بیانوں کی آوازیں ہیں جوشِ فصاحت میں مے پرتگال کی کیفیتیں ہیں۔ اس کی مستی سخن پرستی ہے۔ جس کے مرتبہ کو دنیا میں کوئی دولت نہیں پہنچتی۔ یہی ایک دولت ہے جس کے سوا انسان کچھ نہ لے۔ یعنی اگر اپنا بس چلے تو سب کو چھوڑ اسی کا ہو رہے۔ یا یوں کہیے کہ اگر آرزو اور حصول آرزو میں فرق نہو۔ حوصلہ و زمانہ کا ساتھ ہو تو اپنی چلتے انسان اسے نہ چھوڑے یہ وہ دولت ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ تک رہیگی اس کا سرا ازل میں تو کنارا ابد میں ہے۔

تمام دنیا کی قومیں کسی نہ کسی طرح اس کی قایل ہیں۔ ابتدائے عالم کی نسبت توریت میں ہے کہ پہلے کچھ نہ تھا خدا نے جو کچھ کہا سو ہوتا گیا۔ انجیل میں ہے کہ "شروع میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا" از روئے اہل اسلام تمام عالم "کُن" سے ہوا۔ یہ سب سخن نہ ہوا تو کیا ہوا؟

یہ تو آغاز کا حال ہوا اب انجام دیکھئے کہ لازوال کتنا ہے۔ دُنیا میں کمال والوں کے ہمیشہ سے دو گروہ رہے ہیں۔ اہل سیف و اہل قلم، ان میں ظاہرا زیادہ اثر تلوار کا سمجھا جاتا ہے۔ سکندر نے اس کے زور سے ایک عالم کو ہلا دیا۔ ہلاکو، چنگیز خاں، تیمور، نادر وغیرہ ہزاروں نے اسی کی بدولت بہت کچھ سر اٹھایا مگر آخر کیا ہوا؟ یوں تو دیکھنے میں تلوار کا اختیار بڑی چیزوں میں ہے۔ مگر جن کو اس میں بڑی بڑی قدرتیں رہیں اُن کے حال پر غور کیجئے تو اُن کے سارے اختیار کیسے ناپائدار اور در اصل کس قدر بے کار پایئے گا۔ سرِ دست تو اُن کی تلوار اور وفور اختیار بڑی نمود کا سبب ہوئے مگر نہ اُن کے لئے نہ دنیا کے لئے

کسی کا کچھ مآل ہوا۔ برخلاف اس کے اہلِ قلم اُن سے کہیں اچھے رہے فرعون اپنے ہزاروں شعلہ فشان اسباب کارزار و لاکھوں مبارزان آزمودہ کار کے ساتھ فنا ہوگیا۔ اور اب یہ بھی نہیں معلوم کہ مصر کے اتنے فرعونوں میں سے یہ کونسا تھا؟ مگر حضرت موسیٰؑ اپنی شریعت کتاب کے سبب اب تک زندہ ہیں اور کلیم اللہ کہلاتے ہیں۔ فرعونی مصریوں کا کہیں پتا نہیں مگر دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں اُمّت موسوی نہو۔

مذہب عیسوی کے بڑے بڑے ستانے والے اب کہاں؟ کوئی ان کے ناموں سے بھی اچھی طرح واقف نہیں۔ مگر حواریوں کا نام اُن کی انجیلوں کے سبب کیسے کیسے زبردست دشمنوں اور بڑے بڑے مخالفوں میں سربرآوردہ رہا۔ اور یہی کیا؟ کسی کی عظمت وجاہ (جرنیل ہو یا پادشاہ) کا پتا تھوڑے ہی دنوں بعد کاغذ و قلم کے سوا کہیں نہیں لگتا۔ تحریر کے سوا کوئی ساتھ نہیں دیتا۔

زیرِ قلم است حزیں کشورِ معنی
ایں نقش ندارند خدیواں بہ نگیں ہا

اس سے تلوار کی حکومت واختیار والے دیکھ لیں کہ ان کے سامان کا اثر کتنا ناپائدار ہے؟ اس وقت تو ذرا شور مچا جس سے صاحب حکومت واختیار خوش ہو لئے۔ مظلوم وبیکس رو لئے۔ پھر کیا تھا؟ مادرگیتی وہ وسیع دامن ذی حوصلہ اور ظرف والی ہے کہ جہاں سب کو ایک دفعہ ڈھانک لیا پھر کچھ نہیں۔ تلوار سے کوئی ملک فتح ہوا جس کا غل اس وقت تو نوبت ونشان کی بدولت آسمان تک پہنچا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد کسی کو یاد بھی نہیں رہا۔ برخلاف اس کے صریر قلم کی آواز قیامت تک رہتی ہے۔ خیال کی رسائی کہاں نہیں جاتی؟ تلوار کی ظاہر ہیں، تو یہ دل تک پہنچتی نہے۔ یعنی وہ پرائی تو یہ اپنی تابعدار ہے۔ اور ایسی کہ جس سے سب کو

لاچاری ہے۔ یا یوں کہیے کہ وہ باہر کی تو یہ گھر کی حکومت ہے۔ وہ شحنۂ شہر تو یہ یار پری وش کی اطاعت ہے ؎

حیف است قتل گہ زگلستاں شناختن
شاخ از خدنگ و غنچہ زپیکاں شناختن

یہ گفتگو مجھے خواہ مخواہ پھر عروسِ سخن کی طرف لے چلی کہ مے پرستی اسباب حُسن پرستی میں ہے۔ مستی میں ہوشیار رہنا جس سے ہو سکے رہے۔ مجھ سے تو رہا نہیں جاتا ؎

صیت قلمم جو بانگ غلغال
در ہر ورقم چو چہرہ و خال
تا تازہ و تر کنم رقم را
در بادہ کشیدام قلم را

دیکھو تو یہ گوشۂ دل سے کون نکلا؟ جس نے خمخانۂ عالم پری خانہ بنا دیا۔ جس کے دیکھنے کو الفاظ و معانی بیتاب ہو کر دوڑے۔ سحر بیانی نے قدم لئے خُم مے کی طرح مستیاں دہن سے اُبلنے لگیں، جادو بیانیاں بات بات پر لوٹنے لگیں۔ خوبان جہاں چھُپ گئے۔ کسے مجال کہ اب کوئی دم مار سکے رند و پارسا یہ کہتے سنبھل گئے۔

با حسن نہ کُن دراز دستی
ہشیار نشیں بوقت مستی

مستوں کے پیام تہِ دل لب تک آئے کہ فدائے رُخِ زیبا! حُسن کی خیر! ذرا ادھر بھی! ادھر دیکھنا تھا کہ دخترِ رز کو بھول گئے۔ سب اس کا کلمہ پڑھنے لگے۔ غرض جہاں دیکھا اسی کا بول بالا دیکھا اور چونکہ فیض سخن سے دنیا میں کوئی محروم نہیں رہا جس کو بھولے سے بھی حلاوتِ کلام کا مزہ پڑ گیا وہ پھر ہونٹ ہی چاٹتا رہ گیا غرض

سب کو گھر بیٹھے نعمت ہائے دنیا کا مزہ آگیا ــــ بے چلے پھرے سب کچھ دیکھ لیا۔ یہ کیا ملی سارے حوصلوں کی داد مل گئی۔ تمام آرزوؤں کی محنت ٹھکانے لگی جسرت مندوں کو یہ سہارا ملا کہ اپنا دُکھ درد کہہ سکیں گے۔ حوصلہ مندوں کو ٹھکانا ہوا کہ اپنا چارہ کریں گے۔ جب سارے جہاں سے تنگ آئے تو یہاں آبیٹھے۔ کہیں دل نہ لگا تو یہاں جی بہلا گئے۔

فرانس کے ایک لاجواب خوش بیان بالزیک نامی کو یہی تمنّا رہی کہ "ہائے کوئی پری وش میری محنت کی داد دے تو ساری جانفشانی ٹھکانے لگے۔ کوئی غنچہ دہن اتنا کہدے کہ بالزیک! تو نے غضب کا خونِ جگر پیا!"

عروسِ سُخن کی بدولت ہمیں یہ بات بالزیک سے کہیں زیادہ حاصل ہے۔ کیونکہ برخلاف مہ وشانِ بازاری اِس پردہ نشینِ گوشۂ دل نے ہمارے ساتھ وہ سلوک کئے جو بالزیک کی تمنّا سے کہیں زیادہ تھے؟ وہ تو اسی قدر چاہتا تھا کہ اُسے روتے دیکھ کر کوئی رونے لگے۔ یہاں یہ روتوں کو ہنساتی ہے۔ اس کی تو غایت تمنا یہ تھی کہ کبھی کبھی چاکِ گریباں سی دیا کرے اور یہاں سینہ چاکی کا رفو کرنے کو موجود ہے وہاں اسی قدر تمنّا تھی کہ چشمِ خوں ریز سے آنسو پونچھ دے، یہاں کہو تو ساتھ رونے لگے۔ غرض جو کیفیت ہمیں اس کے طفیل میں نصیب ہے کسی کو کہاں ملی؟ ہم تڑپتے ہیں تو کسی کے نازک ہاتھ ہمارا دل تھام رہے ہیں سر پٹکتے ہیں تو کسی کے زانو پر سر ہے۔ پہلو دُکھتا ہے تو بغل میں کچھ نرم سا رکھا ہوا ہے۔ ہمیں اضطراب تو وہاں بے چینی ہمیں تکلیف تو وہاں بے کلی ہے۔

مگر بیداد دیکھئے کہ اس کی قدر ہمیں نہ ہوئی۔ اس میکدے کے مہمان سب جاں بلب ہو گئے۔ سارے مستان قدیم سو گئے۔ عروسِ سُخن کا کوئی پوچھنے والا نہ رہا۔ اس کی وہ مٹی خراب ہوئی کہ خانۂ دل کے عوض یہ بے خانماں اب تمہیں کہاں اور

کس حال میں نظر آتی ہے۔

شبِ اخیر ہیں تم میرے ساتھ اس گلی تک ذرا چلو جسے اگلے کوچۂ فصاحت کہتے تھے۔ میں تمہیں اس ٹوٹے مکان میں لئے چلتا ہوں جہاں سے شمع کی وہ دھندلی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں کبھی آوازوں کے شور سے کان پڑی بات سنائی نہیں دیتی تھی۔ اب تم اپنے ہی دل کے دھڑکنے کی آواز سن لو۔ اس وقت کی حالت جی میں سمجھ لینے کی ہے کہ سارا جہاں تو بے ہوش پڑا سو رہا ہے سنسان کا عالم ہے۔ اس میں ایک نازک اندام کرب میں کراہ رہی ہے۔ ایسی حالت میں جسے ذرا بھی آدمیت کا پاس ہے اُس کا قدم بے اختیار اس مکان کی طرف اٹھتا ہے کہ دیکھئے تو سہی معاملہ کیا ہے؟ اس وقت تمکین وضبط کسے؟ گرتے پڑتے ہم دروازے تک پہنچے۔ دیکھا کہ ایک کریہہ منظر بُری شکل کا آدمی اندر سے نکلتا ہے جس کے بدن پر تمام جھُریاں پڑ رہی ہیں چہرے پر نہایت سختی برستی اور آنکھوں سے خون ٹپکتا ہے۔ ہم کو دیکھ کر کچھ بڑبڑاتا سا چلا گیا۔ کھٹکا تو ہمیں اسی وقت ہوا مگر وہ بچکر ایسا گیا کہ ہمیں زیادہ دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ نہ اُن دردناک آہوں کے خیال میں جو اندر سے آ رہی تھیں، ہمیں کچھ سوجھا۔ اندر جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ یہ غضب کی مہ پارہ جس کی عمر تیرہ چودہ سے زیادہ نہیں غش میں ادھر اُدھر کروٹیں بدل رہی ہے۔ مگر ہاتھ گلے پر ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ زیادہ تکلیف نہیں ہے۔

ہاتھ رکھے ہیں اٹھا زخم گلو پر دم حشر
مجھ سے ہوتا کہ میں جلاد کو رسوا کرتا

اُسی وقت ذہن میں آیا کہ اُس کم بخت موذی پیر فرتوت کی جو ابھی ہمیں جاتے ملا (جسے سب زمانہ کہتے ہیں) یہ ساری کرتوت ہے۔ بے ایمان گلا اس طرح گھوٹ گیا تھا کہ سانس مشکل سے لیتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دم کی مہمان ہے۔ ہم نے اٹھایا اور حال پوچھا تو بہت ہی آہستہ کچھ کہا جو کچھ سمجھ میں آیا اور کچھ نہیں کہ!۔

"لوگو! میں نے اپنا کیا پایا۔ زمانے کے منہ بہت لگ گئی تھی۔ کسی کا قصور؟ جو کچھ ہوا میری قسمت کا لکھا ہوا۔ نہ اہل روزگار مجھے زمانے کے حوالے کرتے نہ یہ ہوتا۔ مرنے اور بھرنے کے سوا اب مجھ سے کیا بن پڑتا ہے؟"

یہ کہہ کر وہ پھر غش میں آگئی۔ لوگوں نے چادر اُڑھا دی معلوم نہیں کہ چادر کے تلے اب لاش ہے یا جان بھی ہے۔

"تیرھویں صدی" کی ہوا لگے تو کچھ حال کھُلے کہ کچھ کلبلاتی بھی ہے یا نہیں۔ مگر پہلے سن لو کہ ؎

در بزم مزن بلند دستاں
آہستہ کہ خفتہ اند مستاں

تم کیا اور تمہاری تیرھویں صدی کیا؟ جہاں زمانہ ایسی مہ وش سے اس طرح پیش آئے تمہیں اور تمہارے خرافات کو کون پوچھتا ہے؟

صاحبو! یہی سبب ہے جو ذیقعدہ خالی گیا۔ ذالحجہ کی رعایت مگر اس مضمون میں ہوگئی عروسِ سخن کی حالتِ آخری سے سال اخیر کا رونا ہوگیا۔ آغاز سال کی نسبت ہمیں بہت لکھنے کا منصب نہیں۔ کہنے کو ہوگا "تیرھویں صدی" نہول کے آمدی وکے پیر شدی ٹھہری۔ مگر ؎

پُر زور تر از بادۂ تلخ است محبت
عشقے کہ بر و سال گزر کرد کہن شد

ہم بھی اور نہیں تو حسب ضابطہ آغاز سال کی نسبت کچھ لکھتے ہیں جس سے معلوم ہو کہ ہمارا پرچا اس بچّے کی طرح جو گہوارے سے بولا کیسا ہونہار ہے ؎

رازیکہ پیر صومعہ در خلوتے نگفت
می ترسمش بہ میکدہ ہا برملا کنند

تنے کہ رفت زپا بر عذار می غلطد
سرے کہ رفت ز دوش از کنار میخزد

دنیا عجیب مقام ہے! اس ہنگامۂ جاوبیجا اور اس کارگاہ ہستی وفنا کا نام ہے جہاں رات دن عدم و وجود میں لڑائی ہے۔ موت سے زیادہ ہستی کا کام جاری ہر وہ جگہ ہے جہاں موت کو بھی زندگی سے لاچاری ہے۔ مرنے پر بھی زندگی سے مفر نہیں۔ پیدائش کی وہ دھوم ہے کہ کسی کو موت کی خبر نہیں۔ ایک جاتا ہے تو دو آتے ہیں۔ دو گئے تو چار آئے۔ دیکھنے میں تو ایک دانہ زمین میں چھپا اور سڑا مگر اس سے پیدا ہزار ہو گئے۔ ایک جسم بگڑا اور ہزار کیڑے دیکھ لئے۔

اس سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ میں تناسخ کا قائل ہو گیا۔ میری غرض صرف اسی قدر ہے کہ یہاں موت میں بھی خلقت کا بازار گرم ہے۔ مرنے میں بھی پیدائشیں ہیں۔ ابھی ہم ایک دمِ اخیر دیکھ چکے اب دوسرے کا آغاز دکھاتے ہیں۔ سننے کی بات ہے کہ مادر گیتی کے ایک نواسہ اور ہوا۔ یعنی تیرہویں صدی کے بچّہ ہوا۔

بڑھیا ہے خوش نصیب! اولاد کی طرف سے تو ایسی پھلی پھولی کہ نظر لگنے کا اندیشہ ہے۔ یہی سبب ہے جو بہتیرے جلن کے مارے تیرہویں صدی سے آگے کوئی اولاد نہیں بتاتے۔ کہتے ہیں کہ مادر گیتی کی یہی اخیر بیٹی ہے۔ اس کے بعد خیریت ہے! کہاں تک جنے گی؟ مگر اچھے لوگ جو کسی کا برا نہیں چاہتے وہ اس طرح نہیں کہہ اٹھتے، ہماری طرف سے ہزار برس یہ اور جیئے، پھلے پھولے۔ بیچاری نے ہمارا کیا بگاڑا؟ جو ہم اس کا برا چاہیں بلکہ جاننے والے تو اب بھی آہستہ زبان دبا کر مادر گیتی کو امید بتاتے ہیں جو عنقریب نتیجے کی تقریب پیدائش میں زائچہ نویس روزگار نے تیرہویں صدی کا ہاتھ دیکھ کر بھی تین بچے ایسے ہی اور بتائے ہیں۔ اور اسی سبب سے اس کا نام ۱۲۹۷ھ رکھا گیا۔ مسلمان اٹھ کر اس بچے کے کان میں جو ابھی تک محض نیچر کا پُتلا ہے اسلام کی اذان کہیں کہ ابھی سے "بندگان نیچر" کے کان کھڑے ہو جائیں

تب تک دایۂ روزگار اس کی گھٹی کی فکر کرے اور ابنائے زماں کُرتہ ٹوپی لائیں۔ ہم اپنی طبعزاد کی گھٹی کے لئے روشنائی سے بہتر کوئی چیز نہیں دیکھتے جس میں ہمارے خون جگر کی بھی چاشنی ہے۔

کُرتہ ٹوپی کاغذی سہی کہ صفائی کے خلاف نہو، جو نازک خیالی کو نہ روکے اس میں رنگین کی شرط ہے کہ رنگِ سخن جما رہے نزاکت کے سوا کاغذی پیرہن ہم اس لئے اور کد کر کے اس کے گلے میں ڈالتے ہیں کہ غالبؔ کی طرح۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

ہماری طبع زاد کی شکل ابھی سے فریادیوں کی سی بن جائے جس کے دیکھتے ہی ہمارے ناظرین سمجھ لیں کہ یہ معصوم بھی زمانے کے ہاتھ سے داد بیداد پکار رہا ہے۔ کوئی سنے نہ سنے یہ چیخ رہا ہے کہ ؎

خیاط روزگار بہ بالائے ہیچکس
پیراہنے ندوخت کہ آنرا قبا نہ کرد

مگر اس پیراہن سے ہم وہ کام لیا چاہتے ہیں جو دماغ یعقوبؑ نے بوئے پیرہنِ یوسفؑ سے لیا۔ جس طرح یوسفؑ کے کُرتے نے حضرت یعقوبؑ کا مشامِ زندگی تازہ کر دیا یہ پرچا اس پیرہن سے دماغ روزگار تازہ کر دے۔ ع

رخت بے پردہ نتواں دید و شوقِ یک نظر دارم
کُجا بُردی سرت گردم نقاب روئے زیبا را

(تیرھویں صدی)

زندگی سے غرض

ایں کعبہ را بنا نہ بباطل نہادہ اند
بس معنیٔ جمیل دریں گل نہادہ اند

زندگی وہ معمّا ہے جو اب تک کسی سے حل نہ ہوا۔ نباتات سے حیوانات تک دیکھئے کہیں سمجھ میں نہیں آتا۔ اور تو اور ہمیں اپنی زندگی سے بھی صرف سنِ شعور سے آگہی ہوئی ورنہ بہت سی تو اس میں سے محض نادانی میں گزر گئی۔ مدت تک تو ہم جانوروں سے بدتر اور نباتات سے زیادہ بے خبر رہے اس حساب سے ہماری غرض زندگی سے اسی قدر رہے جس قدر کہ ہوش میں گزرے۔ اس وقت ہمیں یہ ثابت کرنا منظور نہیں کہ زندگی کیا چیز ہے؟ نہ اس سے مطلب ہے کہ درختوں سے لے کر جانوروں تک کیسی زندگی ہے؟ مگر جس قدر کہ ہمیں اپنی زندگی سے سروکار ہے اس کی غرض یا علّت غائی دیکھنا چاہتے ہیں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ زندگی سے پُرانے مسئلے پر جو وجودِ ہستی کے برابر قدیم ہے کوئی کچھ نئی بات کہہ سکتا ہے۔ خاص کر جب کہ تمام قوموں کے عالم، شروع سے اب تک اسی پر زور لگاتے رہے اور اپنی اپنی وضع پر کسی نے اپنی چلتے کوئی دقیقہ اس کی تحقیق کا نہیں چھوڑا۔ دوسرے، بات بھی ایسی ہے جس سے انسان کو عمر بھر سابقہ رہتا ہے

کون ہے جسے اس خیال سے مفر ہوا ہو۔ یہ وہ کھیل ہے جو سب کو ایک دفعہ کھیلنا پڑا۔ مگر چالیں اس کی بے بازی ختم ہوئے کسی کو نہ معلوم ہوئیں۔ اور تب بھی "کشت و مات" کے سوا کچھ نہ سنا۔ اس حال میں کوئی نئی بات پیدا کرنے سے کیسی مایوسی ہے! لیکن گو اس طرف سے مایوسی ہو، ممکن ہے کہ پرانے ہی مسالے سے کوئی صورت ایسی اس مسئلہ کی نکل آئے جو سب کی نہیں تو بعضوں کی تسلی کا سبب ہو۔ کیوں کہ جس طرح کوئی لفظ کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو زبان پر الٹ پھیر کرنے سے رواں ہو جاتا ہے۔ اسی طرح امید ہے کہ زندگی سا لاحل اور مشکل مسئلہ بھی اور نہیں تو کچھ کچھ مانوس ہو جائے گا۔

چھوٹتے ہی بڑی الجھن ہمیں جبر و اختیار کے مسئلہ سے ہوتی ہے کہ نرے جبر سے تو آدھی زندگی چلی تھی مگر اختیار نے سنبھال لیا۔ تمام حکمائے یونان و روم تو اس میں جھک مارتے رہے۔ مذہب والوں نے خاص کر اہل اسلام نے انسان کو اپنی مرضی کا مختار کر کے بڑا احسان کیا۔ مگر اس بحث کو میں پھر کبھی کے لئے چھوڑ کر اس وقت انسان کو اپنی مرضی کے موافق آزاد فرض کرتا ہوں۔ یہ سنتے ہی جو لوگ محض رعایت سے اس مضمون میں یہاں تک میرے ساتھ آئے تھے کہیں گے کہ اول تو یہ مسئلہ ہی بہت مشکل لیا تھا۔ اس پر یہ فرض کر لینا اور بھی مہمل ہے۔ یہ جو محض احساناً ہم اس قدر ساتھ رہے کیا اس کا عوض یہی ہے کہ یوں راہ ہی میں سے ٹالا جاتا ہے؟ مگر نہیں صاحبو! جبر و اختیار کا مسئلہ علیحدہ ہی ہے۔ اور اسی قدر نازک ہے۔ یہاں اسے چھیڑا تو یہ مطلب رہ جائے گا۔ اس مسئلے کو میں ابکی کبھی لکھوں گا۔ اس وقت مجھے یہ کہہ لینے دو کہ انسان کی زندگی سے غرض کیا ہے؟

اس کا جواب زیادہ تر اس خیال و مآل پر منحصر ہے جو ہم اس سے (یعنی زندگی سے) سمجھ لیں اور پھر اس مآل کے امکان حصول کے اسباب پر۔

تمام دنیا کے آدمیوں کی زندگی کو اگر چپکے چپکے دیکھئے تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ سب کو اپنی اپنی زندگی سے غرض اس جہان میں یا جہان آیندہ میں "خوشی" سے ہے۔ اس میں اہل مذہب اس جہان کی خوشی کو یہاں کی خوشی پر ترجیح دیتے ہیں اور مذہب سے منکر یہیں کی خوشی کو غایت زندگی سمجھتے ہیں۔ یہ خیال اس طرح انسان کے دل میں جما ہوا ہے کہ آدمی بے اختیار اسی پر چلا جاتا ہے۔ گو اسے خبر نہ ہو کہ میں کس لئے چل رہا ہوں مگر ہیں اس کے سارے افعال و حرکات و خیالات و معتقدات اتنے ہی کے لئے کہ یہاں یا عاقبت میں چین ملے۔ نفس کشی اور روحانی ریاضتیں اس جہان کے لئے خوشی کے اسباب ہیں۔ اور بالضد اس کے نفس پروری اور عیش دوستی میں یہاں کی خوشی ہے۔

یہ تو انسان کا طبعی خیال زندگی کی نسبت ہوا۔ اسی پر اہل نیچر نے اپنی تحقیقات میں اسے محض کُل سمجھ لیا ہے۔ جس سے غرض اسی قدر رہے کہ غلط سلط کسی طرح چل رہی ہے۔ یعنی اس سے جہاں تک بنے سردست کام نکال لینا اور پھر پھینک دینا ؎

مخفی نماند از نظر نکتہ سنج من
دیوانِ عمر اگر ورقِ انتخاب داشت

میں ثابت کیا چاہتا ہوں کہ ان کا گمان کتنا غلط ہے۔ میں ابھی کہہ گیا کہ انسان کو اپنی زندگی سے غرض کسی طرح اپنے ذہن کے موافق اپنی ہی خوشی ہے۔ جسے زیادہ زور دینے کے لئے انگریزی میں ہیپی نس کہیے۔ غیر اس سے کہ یہ ہیپی نس یہاں کی ہو یا آیندہ کی۔ طبعی تو سب کو یہیں کی خوشی سوجھتی ہے۔ اب الہام کی رو سے دیکھئے۔

توریت سے تو صرف اسی قدر معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی شکل پر بنایا اور ساری مخلوق پر حکمراں کیا مگر پابندئ احکام کی سختی ضرور لگا دی۔ اس سے آگے تشریح نہیں کی۔ انجیل میں زیادہ ذکر آیا کہ انسان کی زندگی سے غرض بادشاہت

آسمانی کے لائق کرنا۔ اس میں توریت سے زیادہ سزا و جزا کا بھی بیان ہوا۔ قرآن شریف میں سب سے زیادہ تفصیل ہوئی کہ انسان کی عظمت تو وہی رہی جو توریت میں تھی اور پروردگار کا خلیفہ کہا گیا۔ مگر پروردگار کی اطاعت و عبادت کی ایسی شرط ہوئی کہ ہم پیدا ہی محض اسی لئے ہوئے۔ یہی مجھے ثابت کرنا ہے۔

آپ نے ابھی دیکھا کہ دونوں طرح انسان کی زندگی کا مآل خواہ از روئے نیچر لیجئے یا از روئے الہام اس جہان کی یا جہان آیندہ کی خوشی ہوئی۔ میں اس کو بار بار اس لئے لکھتا ہوں کہ جب تک یہ اچھی طرح سمجھ میں نہیں آجائے گا آگے چلنا مشکل ہے۔ اس لحاظ سے میں پھر کہا چاہتا ہوں کہ سوائے اپنے ذہن کے موافق ایک ہیپی نس تلاش کرنے کے جو اس جہان کے لئے ہو یا آگے کے لئے اور کچھ ہم اپنا مآل نہیں دیکھتے۔ ناخدا ترسی کرتے ہیں، خون کرتے ہیں، عیش دوست ہیں۔ خواہ چھوٹی بات کرتے ہیں خواہ بڑی، اگر نفس و طبیعت کی صلاح سے ہے تو محض اس ہیپی نس کی فکر میں ہے جس سے انسان از روئے نیچر اپنی زندگی سے غرض سمجھتا ہے۔ اگر برخلاف اس کے نفس کو مارتا ہے۔ ریاضات کرتا ہے۔ اپنے ذہن کے موافق جانے کیا کیا نیکیاں کرتا ہے اور تکلیفیں اٹھاتا ہے تو بھی محض اتنے ہی کے لئے کہ اس جہان میں چین ملے غرض بر اگریں یا بھلا ساری ہماری زندگی ایک ہی چیز کے حصول و تلاش میں بسر ہوتی ہے جسے انگریزی میں ہیپی نس کہتے ہیں، اور ہم خوشی۔ اس سے غرض نہیں کہ انسان کو معلوم ہو یا نہ ہو کہ میں کس لئے اپنی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ مگر جادہ سب کا ایک ہی ہے۔

اب دیکھئے کہ خوشی کیا چیز ہے؟ زندگی سے غرض خوشی ہوئی تو ہمیں معلوم کرنا چاہیے کہ خوشی کیا چیز ہے؟

اس کی نسبت ایسے اختلاف ہیں کہ خیال کے سوا اس کا کہیں ٹھکانا نہیں بلکہ بہتوں کے تو خیال میں بھی نہیں آتی۔ اس جہان کی خوشی تو قیاسی سمجھی ہی جاتی ہے جس کو کسی نے نہیں دیکھا۔ یہاں کی خوشی میں بھی ایسے جھگڑے پڑ رہے ہیں کہ کوئی ہی

کا قائل نہیں۔ یہی سبب ہے جو حکمائے یونان سے عقلمند خودکشی درست لکھ گئے۔ بلکہ ضرورت سے زیادہ جینے پر خودکشی کو ترجیح دے گئے۔ اور بہتیرے کر بھی گئے اور اب بھی فرانس و انگلستان میں بڑے بڑے لئیق و شریف کسی مایوسی کی حالت میں اپنے تئیں ہلاک ہی کر ڈالتے ہیں۔ بلکہ ہر انسان کے لئے اگر اس میں خیال اور احساس کا وفور ہے ایک نہ ایک وقت مصیبت کا ایسا آتا ہے جس میں مرجانے کو جی چاہتا ہے ؎

اے جاں کسے بہ دردِ نظیری نمی رسد
مرگے مگر بدادِ دلِ زیستن رسد

اس سے ثابت ہوا کہ خوشی یا ہیپی نس گو کتنی ہی موہوم چیز ہو مگر اپنے اپنے قیاس کے موافق تلاش سب کو اسی کی ہے۔ انسان کی طبیعت کا تقاضا یہی ہے کہ اپنی ہر تمنا اور آرزو کے پورے ہونے پر اس کا حصول منحصر سمجھے اور اسی کو مآل زندگی جانے۔

یہاں تک تو یہ ثابت ہو لیا کہ انسان اپنی ہر آرزو کے پورے ہونے میں گو وہ خیالی ہوں یا واقعی ممکن ہوں یا ناممکن، اپنا مآل زندگی سمجھتا ہے اور جہاں تک ہو سکتا ہے اپنے افعال و حرکات و تدبیر کو غرض جو کچھ اس کے بس کا ہو اسی طرف ڈھال دیتا ہے۔ مگر کبھی کبھی ساتھ ہی ایک کھٹکا سا بھی ضرور رہتا ہے کہ اس طرح محض نفس و تمنا کا ہو رہنا تیرے شایان بھی ہے یا نہیں؟ یہاں سے دو قسمیں نفس کی ہوئیں جو اہلِ اسلام کے مسلّمات سے ہیں۔ یعنی نفس امّارہ و نفس مطمئنہ۔ اسی سے انسان کی زندگی کو اپنی غرض پوری کرنے میں دو سے لڑنا پڑا کہ ایک تو وہ مآل زندگی، جیسا کہ نفس چاہتا ہے۔ دوسرا وہ جو ہونا چاہیے۔ یعنی ایک تو مقتضائے نفس دوسرے اس کے شایانِ حال۔ پہلے کا تو سامان و اسباب ہر نفس مہیّا کر لیتا ہے۔ رات دن اسے فکر ہی یہی رہتی ہے۔ رہی دوسری شق، یہ بے فضل خدا نہیں ملتی۔ کیونکہ ہمیں تو اپنے نفس کے مشغلوں سے اتنی فرصت کب اور اس کے رات دن کے جھگڑوں میں اس کی

گنجائش کہاں کہ جو ہمارے "شایان ہے" یا "جو ہمیں کرنا چاہیے" وہ جانیں، ہم تو اسی قدر جان کر چپ ہو جاتے ہیں جس قدر کہ "ہم چاہتے ہیں"

دوسری حالت کے لئے جو "ہمیں ہونا چاہیے" کی ہے، الہام ضروری ہوا جسے ہیں پہ(؟) افضل خدا کہہ آیا کہ اس کے بغیر یہ میسّر نہیں۔

کہاں گئے سیّد صاحب بہادر جو کہتے ہیں کہ سارے مذہب طبعی یا نیچری ہیں۔ اس سے ان کی غرض یہ کہ الہام و عقائد و وحی وغیرہ کو جو اہل مذہب کے یہاں ایمان کے اصول ہیں محض ڈھکوسلا بتائیں۔ مگر نہیں۔ آپ ہی دیکھئے کہ اگر الہام نہ ہوتا تو نفس کو اپنے مشغلوں میں اتنی فرصت و گنجائش کہاں تھی کہ اپنے خلاف کچھ کرنے دیتا جو حالت ثانی کے لئے ضرور ہے۔

اب رہا یہ فیصلہ کہ ان دونوں حالتوں میں جو ابھی بیان ہوئیں ہمارے لئے بہتر کون ہے؟ یعنی آیا ہم وہ کئے جائیں "جو ہم چاہیں" یا وہ کریں "جو ہمیں کرنا چاہیے"۔

یہاں پھر وہی مسئلۂ جبر و اختیار آڑے آیا کہ اگر ہم صرف پہلی حالت کے توغّل میں اپنا مآلِ زندگی سمجھیں تو اس کی غایت و کمال جانوروں کی ہمسری سے زیادہ نہیں کہ وہ بھی حوائج نفس کے پورا کرنے کے سوا کچھ نہیں چاہتے اور نہ کرتے ہیں ان کے ذہن ہی اس سے آگے نہیں چلتے۔ اب خواہ مخواہ شرافتِ انسانی اور تمیز آدمیت صرف دوسری حالت ہی میں رہی۔ "جو ہونا چاہیے" میں داخل ہے اور جس کے لئے پابندی مذہب و ادائے فرائض وغیرہ ضرور ہیں۔ اس سے فضیلت اسی کی رہی جو پچھلی حالت میں بیان ہوا۔ اور یہ بے الہام و ایمان ممکن نہیں۔ نفس فی نفسہٖ کبھی اپنے جھگڑوں سے فرصت نہیں دے گا کہ آپ اس کے سوا کچھ کیجئے۔ یہ صرف الہام و وحی کی بدولت ہے جو اس طرف توجہ ہوتی ہے۔ کیوں کہ جس طرح شکار میں وہی ہاتھی ٹھہرتے ہیں جو سدھائے ہوتے ہیں نہ کہ ہر جانور۔ اور سواری میں وہی گھوڑے کام دیتے ہیں جو اوگی

میں نکالے ہوئے ہوتے ہیں نہ کہ ہر جنگلی۔ اسی طرح انسان کو "جو کرنا چاہیئے" اس کا علم محض الہام سے ہوتا ہے۔ نہ کہ اپنی طبیعت سے۔ اس سے دیکھ لیجئے کہ مذہب الہامی ہوا کسی کی طبیعت کی گڑھت نہیں۔ جیسا کہ ہمارے سید صاحب فرماتے ہیں۔

یہ تو اس کی فضیلت کی ایک دلیل ہوئی۔ دوسری لیجئے کہ جیسا میں پہلے ثابت کر چکا خوشی انسان کے اختیار میں نہیں ؎

فلک سراسر بازار دہر غم چید است
نشاط نیست کہ یکجائے ہست ویکجا نیست

اس کا کیا ذکر ہے کہ ہر شخص کو ہر وقت اس پر دسترس ہو۔ اور کبھی حاصل ہوئی تو پھر ٹھکانا نہیں کہ ٹھہریگی بھی؟ مگر حقوق مذہب اور ارکان عقائد و فرائض الہامی کے پورا کرنے میں سب کو اختیار ہے۔ اس سے تعمیل احکام میں جو خوشی ہوتی ہے وہ سب کے لئے اختیاری ہوئی۔ یہ ایسی خوشی ہے جس سے کوئی فرد بشر محروم نہیں رہ سکتا یہ وہ تسلی ہے جس کے صدقہ میں کوئی زندگی بیکار نہیں ہو سکتی۔ کوئی محنت رائیگاں نہیں جا سکتی۔ اس کے طفیل میں کوئی مصیبت بے اجر نہیں۔ کوئی تکلیف بے ثواب و نتیجہ نہیں۔ کیسا ہی کوئی خزاں رسیدہ نخل ہستی کیوں نہ ہو ضرور ایک نہ ایک دن پھل لائے گا۔ ؎

ہم حشر کی امید پہ جیتے ہیں ابھی تک
ٹھہری ہے ملاقات قیامت پہ کسی کی

اس سے آپ نے دیکھا کہ واقعی انسانی خوشی در اصل ادائے فرائض کا نام ہے جو خدا کی عبادت اور اس کے احکام کی اطاعت سے غرض ہے۔ اس لئے ایک خدا پرست نے کیا عمدہ بات کہی کہ خدا کی خوشنودی اپنے عقیدے کے خلاف کرنے سے اسی قدر ناممکن ہے جسقدر اس کے موافق کرنے سے ممکن ہے، چاہے یہ عقیدہ بہکا ہی ہوا کیوں نہ ہو؟ یعنی پابندئ مذہب آزادئ نیچر سے کہیں بہتر ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ خدا کی اطاعت و عبادت جیسا کہ قرآن شریف میں آیا کہ "الا لیعبدون" ہی مآل زندگی ہے۔ یہاں میری غرض یہ نہیں کہ کوئی شخص جائز عیش ترک کرے۔ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ ہاں اس خوشی کے خیال میں ترک عیش ضرور چاہیے، جو فرائض یعنی ڈیوٹی کے بجالانے میں حائل ہوتی ہے۔ مثلاً نماز کے لئے صبح اٹھنا کہ عیش نائم السحری کے خلاف ہے، مگر اس عیش کا نعم البدل اس خیال میں ہو جاتا ہے کہ ایک فرض سے ادا ہوئے۔ یعنی ادائے فرض خود ایک تسلّی، نیکی اور "خوشی" ہے۔

ہاں ہمارے یار ارباب نیچر بھی سنیں کہ ان کا ایک بڑا مربّی ہیوم نامی انسانی ڈیوٹی یعنی فرض محض اپنے عیش کی فکر کو کہتا ہے۔ اب کریں سید احمد خاں ہمارے اور اس کے خیال سے مقابلہ؟ کہ اس کا کمال تو جانوروں تک پہنچتا ہے۔ اور ہمارا فرشتوں تک (جن کے اسی سبب سے وہ قائل بھی نہیں)

یہ نہیں تو آپ ہی دیکھیں کہ یہ عالم اسباب جس کو وہ کہتے ہیں کہ نیچر نے بڑی حکمت سے بنایا کتنا بے تُکا ہوا جاتا ہے۔ کہ کہاں ہماری غیر فانی روحیں اور کہاں، دنیا کے گندے جھگڑے؟ بھلا روح کو (جس کا ثبوت میں کسی مضمون میں دوں گا) غلّہ کے نرخ سے کیا غرض لون تیل کی فکروں سے روح سی نفیس چیز کو کیا نسبت؟ زندگی سی پاکیزہ چیز سے غرض محض سرگین کشی نہیں ہو سکتی ہے" اس سے غرض تو صرف عبادت پروردگار اور اس کے احکام کی اطاعت ہے جو ادائے فرض میں آ گئے۔ ۵

یہ تجھ سے بولے پس مرگ میرے بد اعمال
بُرے ہیں گو پہ اکیلا لحد میں تو تو نہیں

(تیرھویں صدی محرم ۱۲۹۷ھ)

"درشہر صد حکایت....."

کوئی ہمارے سید صاحب سے پوچھے تو سہی کہ ہمارے مذہب کی خرابی میں آپ کو ایسا کیا مزہ آنے لگا جو نیچریوں کے راگ کے سوا آپ کو کچھ بھاتا ہی نہیں۔ اہل یورپ کے اور ہزار کمالوں میں سے آپ کو کچھ بھی مد نظر ہے؟ یا جہاں دیکھئے بس نیچر ہی نیچر ہے یورپ والوں نے جو اس طرف توجہ کی ان کا حق تھا اور انہیں گنجائش بہت تھی۔ یعنی ؎

ہشدار کہ مجنوں نتواں شد بہ تکلّف
دیوانہ تواں گشت ولیکن بہ مدارا

مگر انہوں نے بھی اپنے اقرار کے موافق اس سے زیادہ نہیں کیا کہ ؏

حدیث زشتم ونیکو نوشتہ اند مرا

محض آرزوئے تجدید و تضیع جانفشانی کرکے نیچر کو گڑھا۔ مگر آپ سے تو یہ بھی نہیں بن پڑا۔ اس کے فراق میں مذہب کو بگاڑے دیتے ہو اور سمجھتے نہیں۔ پرائے کے لئے اپنے کو چھوڑتے ہو اور دیکھتے نہیں۔ اندھیر ہے کہ ادھار کے لئے نقد چھوٹتا ہے۔ بیگانوں کے خیال میں یگانوں سے رشتہ ٹوٹتا ہے ؎

بخود سری نتواں کوچہ گرد شد زاہد
رموزِ عشق وجنوں اوستاد می خواہد

تقریر وہ کرتے ہو جو مفلس و محتاج کو تقاضائے قرض خواہ کے برابر ہو۔ تحریر وہ کرتے ہو جو کسی گرفتارِ بلا کے لئے تحقیقات پولیس سے بدتر ہو۔ دنیا میں ایسا بے جگر کون ہے جو افلاس میں کسی کے تقاضے سے خوش ہو؟ اور وہ مبتلائے مصیبت کون ہے جسے شماتتِ ہمسایہ ناگوار نہ ہو' اس طرح کیوں نہیں لکھتے جس سے پیام یار کا مزہ آئے۔ یا گھر سے آئے ہوئے آدمی کی طرح جو یارانِ وطن کی خبر لائے۔

اہلِ یورپ نے جو اور علوم قدیمہ اور فنونِ جدیدہ میں محنتیں کی ہیں آپ ان کی داد کیوں نہیں دیتے؟ میٹفزیکس، اتھکس، استھٹیکس، سائی کولوجی، سائی کے ایٹری وغیرہ پر کیوں نہیں لکھتے پڑھتے؟ غالبؔ نے کیا اچھی بات کہی ہے کہ ؎

سخن پیشہ رندِ کژ اندیشہ را | تصوف نہ زیبد سخن پیشہ را

سخن سنج و میخور ستائی نہ | نشا مند ایں روشنائی نہ

ممکن تھا کہ یورپ کے مسائل محققہ کا ذکر مذہب سے بچا کر اس طرح کرتے کہ اہلِ مذہب خوش رہتے اور اہل تحقیق داد دیتے۔ نہ اس طرح کہ کہیں کا مضمون ہو توڑ مروڑ کر اسے مذہب و نیچر میں لے آنا۔ جہاں تک ہو سکے کد کر کے اسلام کی خرابی پر تان توڑنی۔ کیا اتنا نہیں جانتے کہ وہ صفائی نہیں جو آرائش دعویٰ سے بری نہیں؟ وہ خیر خواہی نہیں جو آلائش غوغا سے بچی نہیں۔ وہ خدمت ہی کیا جس میں تکلف ہو۔ ان سے بدتر ان کے اور لکھنے والوں کا حال ہے۔ جو "بدگمانی" اور "مصیبت" وغیرہ پر لکھ چکے ہیں۔ باوجود ایسے وسیع مضامین کے کہیں تو کوئی نئی بات کہتے؟ اور نہیں تو ان کی سرخیاں ہی ذرا پھڑکتی سی رکھتے۔ "بدگمانی" سے زشتی گماں لکھنا اچھا تھا۔ اور نری "مصیبت" وغیرہ سے "دادِ دردِ درماں" دل کو زیادہ چبھتا مگر یہ نئی روشنی والے اپنے پرانے چراغوں کو ذلیل سمجھ کر ولایتی لیمپ و فانوس کی طرف دوڑتے ہیں جن کے جلانے کے پیچوں سے ابھی تک واقف نہیں۔ تماشا ہے کہ یہ تو جلاتے نہیں بنتی اور گھر کے چراغ بجھائے دیتے

ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اندھیرے میں ٹٹولتے رہ جاتے ہیں۔

اس پرچے سے ہمارا ارادہ ہے کہ ہم بھی حکمائے اہل یورپ کی طرح میٹفزیکس پر کچھ لکھیں۔ یہ وہ فلاسفی ہے جس میں ذہنی باتوں کی تحقیق ہوتی ہے۔ "بدگمانی" و "مصیبت" وغیرہ اس مد میں آکر حل ہونی چاہیے تھی۔ میں سب سے پہلے "آرزو" کو چھیڑتا ہوں جو ایک بڑا مشکل مسئلہ ہے۔ اور سارے خیالات و افعال کا دیباچہ ہے۔ اس کے بعد پھر اور ایسے مسائل دیکھوں گا۔ ابھی تو اس کو سنو۔

خمارِ نیست خونِ عاشقاں را
سرت گردم بکش پیمانۂ چند

(تیرھویں صدی محرم ۱۲۹۷ھ)

بلا ہے جوششِ طوفان آرزو تو نہیں

جس طرح ہستی سے غرض کسی نے کچھ اور کسی نے کچھ رکھی ہے۔ خودی کی بحث بھی کسی نے ایک طرح تو کسی نے دوسری طرح لکھی ہے۔ اہل تصوف اسے کچھ سمجھتے ہیں اور اہل شرع کچھ۔ پھر ہمہ اوست و ہمہ از وست والے کچھ اور ہی بتاتے ہیں۔ غرض دنیا کے اور مشکل مسئلوں میں یہ بھی ہمیشہ سے تصفیہ طلب رہا ہے۔ کسی نے اس کو اب تک اس طرح حل نہیں کیا کہ موافق و مخالف سب مان جاتے۔

اس نا اتفاقی کا بڑا سبب ہمارے ہاں شروع سے یہی ہے کہ عقیدہ و تحقیق میں فرق نہیں کرتے۔ جو کچھ جس نے سمجھ لیا وہ اُسے عقیدے میں جانتا ہے اور گنہگار کی طرح اُس کو تحقیق کے حوالے کرتے ڈرتا ہے۔ مگر نہیں! عقیدہ اور چیز ہے اور تحقیق اور چیز ہے۔ عقیدے میں ہر شخص کو اپنا اختیار ہے مگر تحقیق میں لاچاری ہے کہ جب تک اس کی غلطی نہ ثابت کیجئے ماننا ہی پڑے گا۔ عقیدے میں البتہ اتنا آرام ہے کہ جو کچھ سن لیا آنکھیں بند کر کے مان لیا۔ تحقیق کی طرح نہیں کہ مانو پیچھے پہلے اچھی طرح ٹٹول لو۔ ساتھ ہی اس کے عقیدوں میں یہ دقت ہے کہ جو جس کے جی میں آیا سمجھ لیا۔ ایک بات اور ہزار عقیدے دیکھئے۔ تحقیق میں یہ ممکن نہیں۔ اس کی رو سے تو ایک ہی فیصلہ

ہوگا۔ اس لئے میں اس بحث میں عقیدوں سے غرض نہیں رکھتا۔ یہ نہیں کہ کسی کے عقیدے کا میری نگاہ میں وقار نہیں۔ مگر صرف اس خیال سے نہیں چھیڑتا کہ کہاں تک ان کا ذکر کروں گا؟ ایک ہو دو ہوں تو لکھئے۔ بے گنتی بے حساب کا کیا ذکر کیجئے؟ عقیدے تو دنیا میں ہمیشہ بے شمار رہے ہیں اور رہیں گے۔ البتہ تحقیق کو جوان دلوں فروغ ہوا کبھی نہ ہوا اس کی رو سے مجھے یہ کہنا منظور ہے کہ سب سے جی کو لگتی ہماری خودی کی حجت 'آرزو' ہے۔

'آرزو' سے میری مراد خواہش و تمنا یعنی محض کسی بات کا چاہنا ہے۔ اس میں اس کے مرادف اُمید و ہوس اور طول امل وغیرہ بھی آگئے۔ دنیا میں اس سے کوئی خالی نہیں، بڑی بھلی تھوڑی بہت یہ شرط سب کی ہستی کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ صرف یہی ذریعہ ہمیں اپنے تئیں فرداً اور شخصاً پہچاننے کا ہے یعنی اوروں سے الگ کر کے ہماری شخصی شناسائی کا ذریعہ ہمارے پاس یہی ہے جسے انگریزی میں "انڈی وی جوالیٹی" کہتے ہیں۔ اسی سے ہم، ہم ہیں اور میں میں ہوں۔ یہی رات دن ہمیں اپنی خودی سے آگاہ کیا کرتی ہے اور ہماری ساری حرکات و افعال کو اپنی راہ پر لگائے رہتی ہے۔ جتنی تدبیریں اور اسباب ہیں صرف اسی قوت کا عرض ہیں۔ آج کل کے محاورے میں اسے آپ خواہ نیچر کہیے یا جوہرِ ہستی سمجھئے۔

دعویٰ ہے کہ دنیا کا مدار اسی پر ہے۔ انسان کے لئے جو کچھ ہوتا ہے۔ اسی کی بدولت ہے، ممکن نہیں کہ آپ کسی بات کی خواہش کریں اور وہ ہو نہ جائے۔ نہ ہو تو آپ کی آرزو کا قصور ہے۔ اس کے برابر دنیا میں کوئی بات آسان نہیں۔ مگر اس سے زیادہ مشکل بھی نہیں۔ آرزو تو ایسا ولولہ ہے جو خود بخود پیدا ہوتا ہے۔ اس میں کسی طرح کی محنت انسان کو نہیں کرنی پڑتی۔ مشکل ہے تو اس آرزو کا ہر وقت پیش نظر رکھنا ہے۔ خواہ وہ آرزو اس جہان کی ہو یا جہانِ آیندہ کی۔ عاقبت

کے لئے اہل اللہ کیا کیا ریاضتیں نہیں کرتے اور اس کے سوا ساری خواہشوں کو مارتے ہیں۔ دنیا میں جب کسی کو چاہتے ہیں تو اور سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ اس کی کیفیت اہلِ عشق سے پوچھئے جس کو چاہا اگر اس کو خبر بھی نہیں تو بھی اثر ضرور ہوتا ہے۔ یہ ہزاروں وظیفے اور دعائیں جو حصولِ آرزو کے لئے پڑھی جاتی ہیں، کیا ہیں؟ صرف اُس ایک آرزو پر جمانے کے سامان ہیں کہ اور افکار میں اُس آرزو سے دل نہ ہٹنے پائے۔ "خواجہ صاحب" سے جو منتیں مانی جاتی ہیں اور پوری ہوتی ہیں، سبب وہی ایک بات پر دل کا لگانا ہے۔

"شیخ سدو" کی جو کڑاہیاں چڑھتی ہیں اور "میران" کے بکرے جو مانے جاتے ہیں، سب اتنے کے لئے کہ وہ آرزو دل میں جمتی جائے۔ ورنہ بات کیا ہے کہ ظاہراً مختلف و متباین اسباب سے نتیجہ وہی ایک ہوتا ہے؟ کڑاہی چڑھانے سے جس قدر فیصدی منتیں پوری ہوتی ہیں اُسی قدر چلہ کشی سے۔ وظیفوں سے جس قدر آرزوئیں بر آتی ہیں اُسی قدر پیروں کی قبروں پر چادر چڑھانے سے۔ پابندگانِ عقایدِ خاص کے ڈر سے اور تمثیلیں نہیں دیتا کہ کہیں ناگوار نہ ہو ورنہ یہ بھی ظاہر ہے کہ جو کچھ نہیں کرتے اور شاید خدا کے بھی قائل نہیں اُن کی آرزوئیں بھی اسی قدر بر آتی ہیں جتنی اوروں کی۔ پھر بات کیا ہے جو اتنے وسائل میں اوسط کامیابی سب کی ایک ہی ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ اس قدر ایک دوسرے سے مختلف سامان بلا سبب، اثر میں متفق ہوں۔ ان سب میں کوئی نہ کوئی بات ایسی ہوگی جو وہی ایک اثر پیدا کرتی ہے، وہ بات یہی ہے کہ تمنا تو محض چاہنے سے بر آتی ہے۔ مگر چاہنے کے لئے وہ شرط ضرور ہے کہ دھن لگانا اور جیسی تمنا مشکل ہو اُتنا ہی اُس پر جمے رہنا۔ صرف اتنے کے لئے یہ سب سامان ہیں جو میں ابھی عرض کر چکا۔ غرض دنیا میں سارا تماشا اسی کا ہے۔ اسی کو انگریزی میں "والیشن" VOLITION کہتے ہیں۔ اس سے کوئی بات

ایسی نہیں جو نہ ہو سکے۔ یہی سبب ہے کہ ہزاروں باتیں جو ظاہراً ناممکن تھیں محض ان کی دُھن لگانے سے ہو گئیں۔ اہل عشق کے کیسے کیسے افسانے ہر ملک و ہر قوم کی زبان پر ہیں۔ حکومت والوں میں دیکھو کہ تیمور، نادر، بوناپارٹ نے کیا کیا کیا؟ اہل اللہ کہاں سے کہاں پہنچے؟ غرض بھید ہے تو چاہنے میں ہے۔ اس میں چمٹنا شرط ہے۔ اصل یہ ہے اور سب عرض ہیں۔

اہل نیچر اس سے دیکھ لیں کہ عاقبت کے لئے محض ان کے حساب سے بھی کس قدر عبادات و ریاضات کی ضرورت ہوئی کہ اگر جہانِ آیندہ سچ ہے تو وہاں کی آرزو کے لئے کچھ نہ کچھ اسباب تو ضرور چاہیے۔ جہاں ہر تمنا بر آنے کے سامان ہیں، عبادتِ الٰہی عالم جاودانی کی تمنا بر آنے کے اسباب سمجھئے۔ اور جی کو بھی لگتا ہے کہ جیسی چیز ہو ویسا ہی سامان چاہیے۔ جب اُس جہاں کی آرزو ہو تو یہاں سے نفرت کے اسباب ضرور چاہئیں جس طرح جب کسی کو چاہتے ہیں تو اپنی بھی خبر نہیں رہتی۔ بے اپنے کھوئے دوسرا نہیں ملتا۔ اس جہان سے پیٹھ موڑے بغیر وہاں کیسے پہنچیں؟

طاق دگر از نظر فگندم کانیست رواق سربلندم
غیر از غم دوست سنگِ راہ است چوں عشق مرا یگانہ خواہ است
دریاب کہ عشق ترک ہستی است
نے شیوۂ کالبد پرستی است
خود گو کہ بہ پوست چست کارم چوں مغز تو گشت پردہ دارم
پلک و مژہ ہر دو سنگ راہ است چوں چشم تو راستیں نگاہ است
چوں دیدہ زصورتِ نوشتم
وقتیست کہ معنیت پرستم

مگر جس طرح یہ قوت ہماری ہستی کی دلیل ہے۔ بلکہ اس کل کی وہ کمانی ہے جس پر وجود کا سارا ڈھیچر چل رہا ہے۔ اسی طرح یہی اس کی خرابی کا بھی باعث ہے کہ زندگی بیکار کر دیتی ہے۔ آرزؤں کا بر آنا ہمارے لئے ایسا ہے جیسے لکڑی کا آگ میں جلنا کہ تھوڑی دیر کے لئے تو لکڑی میں کیسی حرارت آگئی مگر پھر خاک ہو جاتی ہے یا یوں کہئے کہ کسی بات کی دُھن ہماری ہستی کے لئے گُھن کے برابر ہے۔

جس قدر آرزوئیں پوری ہوتی جائیں گی ہم گُھلتے جائیں گے۔ یہی سبب ہے کہ وہ لوگ جن کے موافق زمانہ ہوتا ہے جلدی مرتے ہیں اور فقیر جو اپنی خواہشوں کو مارتے ہیں بہت جیتے ہیں۔ کون ہے جس کی نگاہ میں کوئی دلکش صورت نہیں پھرتی، جس کو زمانے کی نظر کھا گئی، مگر منحوس شکلیں ٹالے سے نہیں ٹلتیں۔ یہ بھی جانے دیجئے اکثر دیکھا ہے کہ جس تمنّا کے بر آنے پر ہم جانے کیا کیا نہ سمجھے ہوئے تھے جب بر آئی تو کچھ بھی نہ نکلی۔

آرزو کا بر آنا ہی بُرا ہے۔ جب تک تمنّا تھی تب تک کچھ کیفیت بھی تھی، جہاں بر آئی کچھ بھی نہیں رہا۔ یہی سبب ہے جو آرزو کو "شرار صاعقۂ جانسوز" کہتے ہیں۔ تمنّا آگ ہے اور اس کا بر آنا خاک ہونا ہے۔ یہ ایسا جھونکا ہے جو ہماری شمع ہستی کے لئے بادِ صرصر کے برابر ہے۔ خواہشیں بر آئیں اور ہم نہیں۔

بنا کسی کا جو مرنا تو دل نے مجھ سے کہا
خبر منگاؤ کوئی میری آرزو تو نہیں

یہ بِنا اُس افسانے کی ہے۔ جو سننے کے لایق ہے اُس کے لئے طبیعت کیسی کہہ رہی ہے کہ ؎

اٹھالو بارِ احساں آرزو کے
نہ روکو حوصلوں کو گفتگو کے

(تیرھویں صدی بابت محرم ۱۲۹۰ھ)

کہاں تک آرزو، آخر حیا بھی

صاحبو! دنیا میں ہر چیز کے لئے ابتدا ضرور ہے۔ کوئی کام بے آغاز نہیں چلتا بڑے پکے نیچریوں کو بھی لوکریشیس سے لے کر ڈارون اور ٹینڈال تک کو اپنی تحقیق و زعم میں الہام سے انکار رہا ہے۔ مگر آغاز عالم کہیں نہ کہیں سے سب نے مانا ہے۔ اُن کے بڑے بھائی دہریے جو زمانے کو قدیم جانتے ہیں کہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ تک رہے گا۔ اور نہیں تو قطع تسلسل کے لئے کبھی نہ کبھی اس کی بدایت رکھتے ہیں گو بتا نہیں سکتے کہ کب ہوئی؟ ایسا نہ کریں تو بالکل ہی مہمل کہلائیں۔ انہیں پر کیا ہے؟ حساب والے جو بہت ہی نپے تُلے لوگ ہیں۔ پہلے ایک فرض کر لیتے ہیں تب آگے چلتے ہیں، ریاضی داں جو اپنے تئیں بہت ہی محتاط سمجھتے ہیں نقطے کو ایک موہوم جگہ دے لیتے ہیں تب وہ خطوط و اشکال کھینچتے ہیں جن پر زمین و آسمان کی گردشوں کا ثبوت منحصر ہے۔ اس سے آپ نے دیکھا کہ بے وہم و خیال دنیا میں کام نہیں چلتا کتنی ہی احتیاط کیوں نہ کیجئے فرضی و قیاسی کی وخ اُن باتوں میں بھی لگی رہتی ہے۔ جنہیں اپنی صفائی و تحقیق کا بڑا دعویٰ ہے۔ بلکہ ایسے خشک و محتاط تحقیقوں کی بنیاد ہی اسی پر ہے۔ اسی خیال سے دانددرت ایک نامور فرنچ فلاسفر نے کیا اچھی بات کہی کہ کارخانۂ ایزدی میں اپنے اپنے قیاس کے موافق رائے لگانا اُلجھن کے سوا کچھ نہیں۔ الہام و عقائد کا ہم احسان مانیں جنہوں نے ان

جھگڑوں سے ہمیں چھڑایا۔ اس لئے ضرور ہے کہ جو کچھ از روئے دین فیصلہ ہو گیا ہے ہم اسی پر چلے جائیں۔ اس نے سید احمد خاں صاحب بہادر کی ساری محنتیں بیکار کر دیں جو تمام مذہبی عقائد کو نیچری تحقیق سے ملاتے ہیں اور اپنے ہی قول کے بموجب کہ کوئی اُن کا دوست تثلیث کے جھگڑے سے یونیٹرین ہونے گیا تھا۔ مگر ان کے کفارے کے مسئلے سے گھبرا کر نہ اِدھر کا رہا نہ اُدھر کا۔۔۔ ایک غلطی کے عوض دو کرتے ہیں اور پہلی بیوقوفی پر دوسری تہ اور جاتے ہیں۔ اُن کی دانست میں اگر ہمارا اس طرح مسلمان رہنا گمراہی ہے تو اس کا عقیدہ مسلمان زادگی پر کافر ماجرائی ہے۔ لیکن اس وقت ہم ایسے جھگڑوں کو چھوڑ کر تمام اہل مذہب کی نظر سے دیکھیں کہ سب نے آغاز عالم میں مرضی پروردگار کو مانا ہے یعنی اس نے جو چاہا سو ہو گیا "کُن فیکون" یہی ثبوت اس بات کا ہے کہ پروردگار کا محض "چاہنا" تمام کائنات کی ہستی کا سبب ہے۔ اسی سے آپ خواہش یعنی "ول" اور "ولیشین" WILL AND VOLITION کی قوت دیکھ لیں کہ آغاز عالم کا مدار اسی پر رہا۔

مگر یہ بحث تو پچھلے مضمون میں طے ہوئی ہے۔ یہاں اس قدر تمہید اتنے کے لئے ہے کہ جس طرح ہر چیز کے لئے ایک آغاز ہے میں نہیں جانتا کہ میں اپنے قصّے کو جس کے لئے آپ کو اب تک منتظر کر رکھا ہے، کہاں سے شروع کروں؟

آغاز عالم کی طرح جس کی نسبت توریت میں لکھا ہے کہ پہلے اندھیرا تھا اور محض "کے آس" CHAOS یعنی ایسی گڑبڑ تھی جہاں کچھ سوجھتا نہ تھا۔ ہر چیز کی ابتدا اُلجھن میں ہے۔ اسی طرح تمام فصاحت کی اصل کو دیکھئے کہ کیا ہے؟ یہی دو چار بے تکے کلمے مَا پَا دَا نَا وغیرہ جو بچے پہلے زبان سے نکالتے ہیں۔ اور غایت بلاغت کا آغاز غور کیجئے تو الف بے ہے۔ اسی سے پھر کیسی کیسی داد سخن ملی غرض آغاز کسی چیز کا دلکش نہیں ہوتا۔ یہی سمجھ کریں اپنے قصّے کو شاعری کی طرح جسے

کہتے ہیں کہ بیچ میں سے پیدا ہوئی یا یوں کہئے کہ حضرت حوا کی طرح جو آدمؑ کی پسلی سے نکلیں یا عروس کی طرح جو انسان کو شباب میں ہاتھ آتی ہے۔ اس جگہ سے شروع کرتا ہوں کہ جس کا ذکر منظور ہے۔

وہ لڑکپن کی آفات سے بچ کر بالغ ہوا اور خوبصورت و ذہین بھی نکلا۔ اس سے چونکہ آپ کو بہت سابقہ رہے گا ہم اِسے آپ سے ملائے دیتے ہیں۔ یہ جو چھبیس پچیس برس کی عمر کا نازک اندام آدمی آدھی رات گئے زانو پر سر رکھے بیٹھا ہے یہی ہے۔ زبان پر ہے کہ ؎

اے خنجرِ الم جگر و دل کو چاک کر اے موت جلد زیست کے قصے کو پاک کر
اے زندگی کی شکل بدل جا تو خوب ہے اے جانِ زار تن سے نکل جا تو خوب ہے

سبب یہ کہ ایسے بُتِ سنگ دل کو چاہا ہے جس نے اس کی دادِ محبّت نہ دی ہوس کی طرح اس سے ایسی بیباک رہی کہ ہاتھ نہ آئی۔ پہلے تو انہوں نے بہت محنت کی مگر ناتجربہ کاری کے سبب یہ اس کے تغافلہائے تمکین آزما کو نہیں سمجھے۔ یہ بیچارے تو گرفتارِ دامِ محبت تجاہل ہائے یار کیا جانیں؟ اثر محبت سے مایوس ہو کر چاہا کہ کسی طرح غم غلط کیجئے اور تکالیف عشق کا عوض دادِ عیش سے لیجئے! شاید یوں وہ راہ پر آئے۔ جوانی اور اُس پر یہ تہیّہ۔ کیا کچھ نہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرض و مصیبت نے آگھیرا — قمار بازی اور شراب خواری بھی شروع ہوئی کہ یہ دو آخری مرحلے عیش و نحوست کے ہیں۔ ایک سے تو یہ غرض کہ غم بھلایا جائے یعنی تہِ خُم ڈبویا جائے۔ دوسری اس لئے کہ بخت آزمائی کی جائے کہ شاید نصیب دھوکے میں آئے مگر انہیں کچھ راس نہ آیا۔ یہ وہی وقت ہے کہ جو کچھ پاس تھا سب ہار کر آئے ہیں۔ اور فکر میں ہیں کہ کسی طرح جان دیجئے۔ ٹھان لی ہے کہ اس حال میں جینا اچھا نہیں ؎

طبیعت کب سے مشتاقِ عدم ہے نکل اے روح اب وقفہ ستم ہے

اِسی فکر میں جو صبح ہونے لگی۔ تو ارادہ ہوا کہ پیشتر اس سے کہ لوگ جاگیں دریا میں ڈوب مریے۔ ہنوز جھٹپٹا ہی تھا کہ یہ باہر نکلا اور جمنا کی طرف چلا۔ پُل پر سے دریا میں کودنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اس وقت کسی فقیر نے سوال کیا۔ بابا کچھ خدا کی راہ پر۔ نہ اس خیال سے کہ خیرات خدا ترسی میں ہے کچھ دیجیے بلکہ کچھ تو عادت کے موافق کہ اچھی طبیعت سے سوال کے نام پر رہا نہیں جاتا۔ مگر زیادہ تر اس وجہ سے کہ کسی کے دیکھتے ڈوبنے میں شرم معلوم ہوئی۔ جیب میں ہاتھ جو ڈالا تو دو پیسے نکل آئے یہ تو جلدی سے سائل کی طرف پھینکے اور بیتابانہ ٹہلنے لگا کہ فقیر یہاں سے ٹلے تو کُود پڑے مگر قسمت کہ وہ ٹھہر گیا اور دعائیں دینے لگا تا کہ "خدا تمہاری عمر دراز کرے" اس انتظار میں کہ وہ فقیر کم بخت کب ٹلے یہ شخص ٹہلتے ٹہلتے بازار کی طرف نکل گیا اور صرف ٹالنے کے خیال سے ایک پُرانی دُکان کی چیزیں دیکھنے لگا۔ یہ دُکان محض آخور کی بھرتی تھی جس میں جانے کب کی دقیانوسی چیزیں دھری تھیں۔ کہیں پُرانا اسباب کہیں پھٹے پُرانے کپڑے کہیں ردّیاں اور چیتھڑے وغیرہ۔ انہیں دیکھتے دیکھتے اس کی نگاہ ایک پُرانے چرمی ٹکڑے پر گئی جس کے اوپر کچھ لکھا ہوا تھا۔ اس نے دُکان دار سے جو بہت بوڑھا آدمی تھا اس ٹکڑے کا حال پوچھا کہ کیا چیز ہے؟ اس نے کہا کہ "یہ کوئی پرانا طلسمی پوست کسی جانور کا ہے۔ اس پر حضرت سلیمان کی مہر ہے۔ اور ایک نقش بھی عبرانی میں ہے۔ اس کی تاثیر یہ ہے کہ جو شخص اسے اپنے پاس رکھے جو کچھ تمنا کرے اُسی وقت بر آئے۔"
آفات روزگار سہتے سہتے یہ شخص عقیدوں و قیدوں کا تو قائل نہیں رہا تھا۔ کیونکہ بہت مصیبتیں انسان کو ضرور نا خدا ترس کر دیتی ہیں۔ مگر چونکہ علوم مختلفہ سے واقف تھا خود اُس کھال کو اٹھا کر پڑھنے لگا۔ عبرانی میں لکھا تھا کہ "اے شخص! میں نقش آرزو ہوں۔ حضرت سلیمان کے وقت میں حکیموں اور نجومیوں نے بڑی محنت

کر کے مجھے بنایا۔ دیکھتا کیا ہے؟ مجھے نہ چھوڑ۔ تیری تمنائیں ایک ایک پوری ہو کے رہیں گی ہیں تیری، مگر تیری ہستی تیری نہیں، یہ میری ہو گئی — تیری عمر کہیں جانے کی نہیں مگر یوں مقدر ہو چکی ہے۔ کہ جس قدر تیری آرزوئیں بر آئیں اسی قدر ہیں گھٹوں اور ساتھ ہی تیری عمر بھی۔ سمجھ لے کہ تیرا ساغرِ عمر حصول تمنا کے ساتھ گھٹے گا۔ جتنی تیری خواہشیں پوری ہوں گی اتنی ہی کم ہوتی جاؤں گی اور اسی قدر تیرا پیمانہ عمر بھی لبریز ہوتا جائے گا۔ کیا سوچتا ہے؟ مجھے لے لے اور چین کر۔"

کہتے ہیں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے یہ تو نقش آرزو تھا! دوسرے زندگی سے تو تنگ تھا ہی خیال ہوا کہ اب نہ مرے ذرا ٹھہر کے مریں گے جسرتوں کے ساتھ بُری طرح نہ مرے، کیفیت سے اچھی طرح مریں گے۔ مریں گے مگر کسی تمنّا کا تو خون نہ ہونے پائے گا۔ اس بڈھے نے جو کوئی بڑا فلاسفر تھا سمجھایا بھی کہ "کیوں اپنی جان کا دشمن بنتا ہے۔ یہ طلسم محض آرزو اور اختیار کا کھیل ہے۔ جنون ان میں سے کسی کا وفور ہے جان بوجھ کر دیوانہ نہ بن" مگر یہ جوان کب سنتا تھا اُس پوست کو لے کر یہ کہتا چلا یا ؎

ساقی نخست پُر کن از بادہ گوئے مارا
وانگاہ غم نباشد بشکن سبوئے مارا

اسی وقت سے یہ شخص تو گویا ایک نئے عالم میں جا رہا۔ گویا آج ہی سے جینا اور مرنا ساتھ شروع ہوا۔ اسی دن سے جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے مگر ہر دفعہ جب کہ تمنا بر آتی ہے وہ نقش والی کھال گھٹتی ہے اور ساتھ ہی اس جوان کی طاقت بھی — آنکھوں کے سامنے اور ہاتھوں میں پکڑے پکڑے جب وہ پوست گھٹنے لگا تب تو اس شخص کے ہوش جانے لگے ؎

ہزاروں آرزوئیں خود بخود ہوئیں پیدا
ہمارے دل میں کوئی نخلِ آرزو تو نہیں

آرزو کے نام سے کانپنے لگا۔ خواہش کے خیال سے تھرانے لگا۔ تمنّا کے نام سے نفرت ہوئی۔ بھولے سے چاہنے کا لفظ زبان سے نکالنا چھوڑ دیا اور سارے جھگڑے چھوڑ چھاڑ کر الگ گھر میں بیٹھ رہا جہاں کسی کی آواز نہ آئے اور جہاں سے کچھ دکھائی نہ دے کہ نہ کسی طرف خیال جائے گا نہ تمنا کرنی پڑے گی۔

وہ رونا کچھ مزوں کی گفتگو سے
وہ بچنا ہر طرح کی آرزو سے

لیکن قسمت کو کیا کیجئے کہ جس چیز سے جتنا بچو اُتنی ہی سامنے آتی ہے۔ تنہائی میں حضرت عشق آموجود ہوئے۔ اُس شعلے نے جو پہلے دب گیا تھا پھر سر اٹھایا۔

ہم اپنی جان نہایت عزیز رکھتے ہیں
چھپا ہوا دلِ پر آرزو میں تُو تو نہیں

یعنی اسی پری وش کو چاہنے کا آزار ہوا۔ جیسے پھر ہزار دل سے چاہنے لگے۔ دیر کیا تھی؟ اس طلسم سے اقرار ہی تھا کہ جو چاہو ملے گا وہ دل آرا ان کی ہو گئی۔ انہوں نے اس کھال کا ذکر اس سے نہیں کیا مگر خوف کے مارے وہ کھال کنوئیں میں پھکوا دی اور جی میں خوش ہوئے کہ اس کی پابندی سے چھوٹے، مگر پھر وہی قسمت یا اتفاق کی بات کہ ایک دن اسی کھال کو باغ کا مالی لئے چلا آتا ہے کہ "حضور کنوئیں میں سے یہ چیز نکلی ہے۔" اب تو یہ پہلے کی نسبت بہت ہی چھوٹی ہو گئی تھی۔ کیونکہ میاں کو جب سے مرضِ عشق ہوا اور بھی دن بدن گھٹنے لگی تھی۔ یہ آزار ہی ایسا ہے جس میں رہ رہ کر مرتا ہے۔ اس میں تمناؤں کی وہ دُہائی مچتی ہے کہ دل کیا ایک محشرستان آرزو ہو جاتا ہے۔ بات بات پر اُمیدیں آلپٹتی ہیں۔ اشارے اشارے پر آرزوئیں ٹوٹتی ہیں۔

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

پھر تو اس شخص کا بُرا حال ہوا۔ شہر کے تمام حکیموں، عالموں، فاضلوں کو دکھایا کہ کس طرح اس کھال کو بڑھا دیں مگر وہ نہ پانی سے پھولی نہ آگ سے پھیلی۔ بال برابر بھی کسی سے نہ بڑھی۔ مگر ہر تمنا کے ساتھ گھٹتی رہی ؎

کہاں تک آرزو آخر حیا بھی
کبھی تو شرم، ترکِ مدعا بھی

جب وہ کھال بہت ہی چھوٹی رہ گئی تو یہ گھر سے بھاگا۔ بہ شکل آرزو چھپ کر نکلا اور کسی سے نہیں کہا کہ کہاں جاتا ہوں۔ یہاں تک کہ اُس عورت کو بھی نہیں بتایا۔ مگر عورت کی محبت بُری ہوتی ہے ؎

پکار اٹھی تمنا ہائے دلدار

درباری آیا اور کھال کا روز بروز گھٹنا دیکھ کر دیوانہ تو ہو ہی رہا تھا دماغ میں خلل ہو گیا اور ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ کہتے مر گیا کہ لو آج ؎

فراقِ عمر میں بے تاب ہو لیں
تمنّائیں گلے مل مل کے رو لیں

اُسی وقت سے وہ طلسم بھی ارمان یار کی طرح نہ ٹھہرا۔ دیکھتے دیکھتے غائب تھا جس کے ساتھ یہ جھگڑا تھا وہی نہ رہا تو یہ کیوں رہنے لگا؟

وہ آرزو ہے مجھے جس پہ دم نکلتا ہے
نہ پوچھ کوئی دم نزع آرزو ہی نہیں

آپ نے دیکھا؟ ارمان پورے ہونا کیسی بلا ہے۔ جب یہ ہوئے تو ہم نہیں، اسی لئے اہل اللہ نے کہا ہے کہ ؎

رَوا ز ہوس، بتاب، کہ مردانِ راہِ حق
محرابِ طاعت از دلِ بے آرزو کنند

(تیرھویں صدی - محرم ۱۲۹۷ھ)

اے گلشن از بہار خیال تو سینہ ہا

یہ اسی خیال کی خوبی ہے کہ ہمیں ایک دلکش تماشا نظر آرہا ہے۔ جس کے لئے نیرنگئ روزگار سے رنگ لیا گیا ہے۔ اور چرخ شعبدہ پرداز سے اس کا سامان۔ اوپر دیکھئے تو ایک اوندھا پیالہ چھت کا کام دے رہا ہے۔ جیسے فانوسِ خیال کی طرح رات دن چکر ہے۔ اس کے اندر ہجوم آرزو نے وہ شور بپا کر رکھا ہے کہ کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ بھیڑ سی بھیڑ ہے کہ معلوم نہیں ہوتا کون آیا اور کون گیا۔ جو دروازہ آنے کا ہے اس میں ایک بچہ دکھائی دیتا ہے، جسے حیرت ہے کہ الٰہی میں کس اجنبی جگہ میں آگیا ہوں۔ جہاں کوئی اپنا صورت آشنا نہیں۔ کسی سے پہلے کی صاحب سلامت نہیں۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے؟ آسمان کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ چھولوں، ہوا کو ٹٹولا کہ کچھ ہاتھ آئے تو پکڑلوں۔ مگر وہاں کیا دھرا ہے؟ آخر کو ایک چیخ ماری اور سو گیا۔ دوسرے روز دروازے پر دیکھا کہ کسی کو نہلا رہے ہیں۔ سپید لباس پہنایا جاتا ہے، اس لئے کہ خاک میں ملائے جائیں گے۔ تعجب ہے کہ نہلا دھلا کر نئے کپڑوں پر خاک ڈالنے کی رسم یہیں دیکھی۔ لوگوں نے کہا کہ یہاں کی رسمیں ساری عجیب ہیں۔ یہ کارخانہ ہی عجیب ہے۔ یہاں کس

کس بات پر تعجب کروگے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کارخانہ کس کے ہاتھ میں ہے؟ جواب ملا کہ صاحبِ خانہ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک عمر گزر گئی کہیں پتا نہیں لگتا۔ ایک عورت جو سبز لباس پہنے بڑی فکر و تعمق میں کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر آتے جاتے دیکھتے ہو۔ یہی منتظمہ معلوم ہوتی ہے۔ سنا ہے کہ اس کارخانے کی کُنجیاں ان کی تحویل میں ہیں۔ قرینے سے میں سمجھ گیا ہوں کہ ہوں نہ ہوں یہی بُوا نیچر ہیں۔ نیچر کا لباس سبز ہے سر سے پا تک سبز لباس میں مکلف رہنا ان کی شان ہے ؎

حسرت بھری نگاہ سے نرگس نہ دیکھنا
نازک بہت ہے رنگ عروسِ بہار کا

بہر حال میں ڈرتا ڈرتا پاس گیا۔ مدت سے نام سنتا تھا بڑے ادب سے کھڑا رہا کہ دیکھیے ادھر بھی کچھ خیال ہوتا ہے؟ کسی نے نہ پوچھا کہ تو کون ہے؟ مگر نیچر کے چہرے سے یہ معلوم ہوا کہ اس وقت انہیں کوئی سخت فکر ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس قدر فکر کی وجہ پوچھی۔ جواب ملا کہ مکھی کی حفاظت کا خیال ہے تاکہ مکڑی کے جالے میں اس قدر نہ پھنسے۔ مگر مکڑی کی طاقتِ گرفت اور مکھی کے سامانِ حفاظت میں بڑا فرق ہے جو ازروئے تحقیقِ علمی غیر موزوں ہو رہا ہے۔

چاہتی ہوں کہ عالم اسباب میں کوئی چیز بلا تحقیق نہ رہے۔ خلقت میں کوئی فرق و امتیاز ایسا نہ ہو جس کی وجہ سے ازروئے علوم و فنون اچھی طرح بیان نہ ہو سکے۔

میں نے عرض کیا کہ انسان کا آپ کو خیال نہیں۔ خفا ہو کر کہا انسان اور حیوان کیا ہے۔ میرے نزدیک سب برابر ہیں۔ انسان کا میری نگاہ میں کُتّے سے زیادہ مرتبہ نہیں۔ دونوں کا وجود عالم اسباب سے ہے۔ دونوں فنا ہو جائیں گے ؎

اپنی خزاں کی کیا کہوں نازک مزاجیاں
یہ چاہتی ہے نام نہ آئے بہار کا

میں نے کہا ہائے ستم! یہاں حضرتِ انسان کا کچھ مرتبہ ہی نہیں۔ عذاب و ثواب جزا و سزا۔ انصاف والطاف کچھ نہیں ؎

پژمردہ ایک شاخ ہے نخلِ امید کی
دھوکا نہ کھائیے نگہِ انتظار کا

سخت چیں بہ جبیں ہو کر کہا کہ مجھے اُن سے کیا غرض۔ یہ سب تمہارے گھڑے ہوئے قصے ہیں۔ ؎

فرقت میں ہم نے اپنی تسلی کے واسطے
رکھا ہے نام شوخ دلِ بے قرار کا

میرا انصاف یہ ہے کہ انسان و حیوان و نباتات سب کو بنا دیا اور سب کو فنا کر دوں۔ مجھے تمہارے جھگڑوں سے غرض کیا؟ میں ایک سے چھینتی ہوں تو دوسرے کو دیدیتی ہوں۔ اس میں نازک خیالی کی کوئی بات نہیں۔ ایک موٹی بات ہے کہ آدمی بھی پیدا ہوا اور سؤر بھی۔ جس طرح یہ فنا ہوا وہ بھی فنا ہو جائے گا۔ جھگڑا کیا رہا؟ مادرِ گیتی کے نزدیک سب برابر ہیں، یوں چاہے اپنے جی میں کوئی کچھ سمجھے رہے۔ یہ امتیاز کا مقام نہیں خبردار! جو یہاں ڈون کی لی!

چیخے تو بہت زور سے کعبے میں موذن
پر ان سے نکلتا رہا ناقوس صدا ہیں

یہ کہہ کر نیچر کا بدن غصّے سے کانپنے لگا۔ جس سے سارا زمانہ ہل گیا مجھے اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ آگے کہنے کی جرات نہ رہی۔ سارا خیال خواب ہو گیا۔ لیکن دل میں کہتا تھا کہ الٰہی خیر کیجیو ؎

ہر نالہ کہ کرد فراموش سینہ ام
پیغامے از زبانِ اثر میدہد مرا

زیں انجمنے فراز تر ہست
نظارہ گہے بساز تر ہست
ایں نقش ز پیش گاہ بردار
ویں سنگ ز پیش راہ بردار

کہتے ہیں کہ کسی پہاڑی کی گھاٹی میں ایک بڑا نامور شہر آباد تھا جو دور سے دکھائی دیتا تھا۔ اس کی شہرت سُن کر لوگ دور دور سے دیکھنے آئے۔ یہ بات مشہور تھی کہ یہاں کے لوگ ہر طرح کے علوم و فنون و کمالات علمی اور ایجاداتِ عقلی میں لاجواب ہیں۔ کسی روز ایک مسافر بھی اس شہر میں آنکلا۔ اور گو کہ یہ شخص اس جگہ رہنے کی نیت سے نہیں آیا تھا۔ لیکن یہ شہر اُسے ایسا دلکش معلوم ہوا کہ اُس نے بھی یہاں ٹھہرنے کا ارادہ کرلیا۔ جی میں کہا پہلے اس شہر کو اچھی طرح دیکھ لیجئے تب آگے کا ارادہ کیجئے۔ روز سرائے سے نکل کر شہر کے کوچہ و بازار کی سیر کرتا۔ اور اپنے جی میں کہتا کہ شہر تو واقعی رہنے کے لائق ہے۔ جوں جوں اس نے شہر کی سیر کی اسے پسند آنے لگا شہر والوں سے ملا تو معلوم ہوا کہ بڑے ذہین اور محنتی ہیں۔ بہتیرے دولت مند ہیں اور بہت سے غریب بھی ہیں شہر میں دولت مندوں کا زیادہ نام ہے اور حکومت بھی انہی کی ہے۔ اکثر دولت منداس سے بہ اخلاص پیش آئے اور کہا کہ تم بھی یہیں سکونت اختیار کرلو۔ اس نے جواب دیا کہ میں سیاح ہوں پھرتے پھرتے اِدھر چلا آیا۔ جب تک آب و دانہ ہے تمہارا مہمان ہوں۔ آگے جہاں خدا لے جائے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ تمہارا شہر رہنے کے لائق ہے اس کے جواب میں کسی نے کہا کہ واقعی شہر تو بہت عمدہ ہے۔ لیکن پڑوس اچھا نہیں یہاں بھینٹ بیگار

کی بڑی بیخ ہے۔ اس وقت تو یہ بات نہیں سمجھا۔ لیکن ایک دن بازار میں دیکھا کہ کسی کو روتے پیٹتے لئے جاتے ہیں۔ اس نے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے؟ کہا اس شہر کی سرحد ایک ایسے بادشاہ سے ملی ہوئی ہے کہ وہ چین نہیں لینے دیتا۔ جسے چاہتا ہے بلا بھیجتا ہے۔ یہ بیگار کی مصیبت ہمیشہ سے اس بستی پر لگی ہوئی ہے اور غضب یہ ہے کہ جب طلبی آتی ہے تو دم لینے کی فرصت نہیں ملتی۔ آدمی تیار ہو یا نہ ہو جانا پڑتا ہے۔ یہ بھی امتیاز نہیں کہ جوان ہے یا بوڑھا ہے۔ برا ہے یا بھلا ہے۔ امیر ہے یا غریب ہے۔ کوئی نہیں دیکھتا کہ بے چارے کے پیچھے اس کا گھر بار بگڑے گا یا رہے گا۔ گھر کا بندوبست تو کر لینے دیں۔ کوئی نہیں سنتا۔ جاڑا ہو یا گرمی۔ دن ہو یا رات ہو۔ وقت ہو بے وقت ہو جب حکم ہوا اسی وقت جانا پڑتا ہے اگر یہ دقّت نہ ہوتی تو یہ شہر واقعی لاجواب تھا۔ کوئی دن نہیں جاتا کہ دو چار یہاں سے پکڑے نہیں جاتے۔ اور غضب یہ کہ کسی کو خبر نہیں ہوتی کہ باری کس کی ہے اور بستیوں میں باری مقرر ہے کہ آج فلانے کی بیگار ہے کل اس کی۔ یہاں جس کو چاہتے ہیں پکڑے لے جاتے ہیں۔ مسافر نے کہا کہ اس فکر میں تمہیں نیند کیسے آتی ہوگی؟ زندگی وبال نہیں ہو جاتی۔ کہا کہ ہم نے بہتیری تدبیریں کیں۔ لیکن نیچر نامی ایک بڑی ڈائن شحنۂ شہر ہے۔ وہ کسی کی نہیں سنتی۔ جس کی خبر آئی پکڑ کر بھیج دیتی ہے۔ اور دھمکاتی ہے کہ میرے نزدیک تم سب برابر ہو۔ بُرے بھلے سب ایک ہیں۔ کسی کو نہیں چھوڑنے کی۔ آدمی ہو یا جانور درخت ہو یا پتھر کوئی نہیں بچنے کا۔ انسان ہو یا حیوان۔ بُرا ہو یا بھلا۔ نیک ہو یا بد سب کا ایک حال ہوتا ہے۔ اپنے مالک کے پاس جانے میں کیا ذلت ہے۔ مگر افسوس ہے تو اس کا کہ نیچر کی معرفت بُلا لے جاتے ہیں۔ اس میں بڑی خواریاں اٹھانی پڑتی ہیں۔ اور وہاں جانے کا بھی کچھ نتیجہ نہیں ہوتا یہاں سے نکلے تو پھر پتا نہیں کہ کیا ہو کیا نہ ہو۔ نیچر سے پوچھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے؟ صاف جواب ملتا کہ وہی حال ہوتا ہے جو سُوروں کتّوں کا حال ہوتا ہے۔ اس طرح وہاں جانے

سے کچھ غرض نکلے سو بھی خیریت ہے بلکہ رہی سہی آبرو ریزی ہے کہ سب کا ایک حال بتاتے ہیں مسافر نے کہا کہ اس بیگار سے بچنے کی کوئی صورت ؟ کہا کہ بچنے کی کوئی صورت تو نہیں ہے ۔ لیکن ایک سہارا ہے جس سے زندگی اجیرن نہ معلوم ہو اور بیگار کا دھڑکا نہ رہے ۔ مسافر نے بیتاب ہو کر پوچھا کہ خدا کے لئے وہ تدبیر بتاؤ ۔ جواب ملا کہ اس بستی میں نیک خیال نامی ایک محلہ ہے وہاں کے رہنے والے اس بیگار میں خوشی سے چلے جاتے ہیں اور لوگ تو ڈرتے ہیں کہ خدا جانے کیا معاملہ ہوگا ؟ پھر ملنا نصیب ہو نہ ہو ۔ جانے کیا بنے ؟ برخلاف اس کے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جگہ جہاں اپنے اور عزیز گئے ہوں ضرور دلکش ہوگی اور نہیں تو اسی بہانے سے اپنے مالک کو دیکھ لیں گے ؎

در پر جو ترے قبر کی جا ملنے لگی ہے

بیٹھے ہوئے ہیں لوگ تمنائے قضا میں

واقعی ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کا معاملہ بچھڑوں کا سہارا تہی دستوں کا خزانہ زندگی کا فسانہ جس سے شب ہستی کٹے نیک خیالی ہی ہے یہ وہ عالم ہے جہاں خفا بھی ہوتے ہیں تو مسکرا کر ۔ مبارک ہے وہ شخص جس نے ؎

دل را ز خیال گلستاں کرد

زیں بہ چہ بود اگر تو آں کرد

(تیرھویں صدی)

بساطِ خیال

خیالش را بساطے بہر پا انداز می جُستم
پسندیدم بہ مستی مخملِ خوابِ زُلیخا را

آدھی رات ابھی ڈھلی ہے۔ شمع بھی آدھی سے زیادہ جل چکی ہے۔ جدھر دیکھئے، ایک عالم بے ہوشی ہے جس کو دیکھئے محوِ بیخودی ہے۔ دن بھر کے مارے تھکے بے ہوش پڑے ہیں۔ جو اب تک جاگے تھے ابھی سو گئے ہیں۔ جس کو دیکھئے غافل پڑا ہے۔ پاسبان بھی اونگھ رہا ہے آپ نے دیکھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے دن رات میں کیا فرق ہو گیا۔ دن کا وہ شور غل کہاں گیا۔ وہ سارا خیال خواب ہو گیا۔ وہ دماغ جو دن بھر فانوس خیال کی طرح پھرتے رہے اس وقت تھکے جو دن بھر گردشِ دوراں کی طرح چکر میں رہے اس وقت ؎

برنگِ اشک نامقبولِ مژگاں

بے اختیار تھک کر گرے۔ کسی کی اتنی رات دلِ مضطر کی طرح مشکل سے کٹی۔ مگر اس وقت خوابِ اجل کی طرح نیند آ ہی گئی۔ اور کسی کو بسانِ طفلانِ نوعمر شام سے خبر نہ ہوئی۔ کوئی خوش نصیب ہم آغوشِ ناز، تو کوئی گرفتارِ بلا کسی گلی میں پڑا ہے۔ کسی

کی روتے روتے ابھی آنکھ لگی ہے اور کوئی یار کی گردن میں ہاتھ ڈالے سوگیا ہے۔ اِدھر لغزشِ پا تو اُدھر جنبشِ مژگاں بیکار ہوئی۔کہیں فدائے چشمِ خُفتہ بخت بیدار ہے کہیں خموشی قفلِ دہنِ روزگار ہے۔غرض جدھر دیکھئے۔ بے ہوشی کے سوا نظر نہیں آتا جس طرف دیکھئے غفلت چھارہی ہے۔ایک عالم و ب۔ وسکوت میں ہے۔ زاہد بھی عبادت میں جاگتے جاگتے اس وقت لیٹے ہیں کہ ذرا سولیں۔پھر تہجد کو اٹھیں گے۔رندانِ بادہ نوش نے آخری جام بھرے ہیں کہ اس کو پی کر دونوں جہاں سے بے خبر ہو جائیں۔لو، آخری دَور بھی ہو چکا ہے۔ سُبو خالی ہوا ساغر لب سے چھُٹے۔ شیشے سامنے سے ہٹے اسباب شوق گھٹے۔ دستِ ہوس کھنچے۔ سامانِ غفلت بڑھے ہیں۔ آرزو نے مُنہ پر پردہ لیا ہے۔تمنّا نے سر گریبان میں کیا ہے۔ ساغر سرنگوں ہوئے ہیں۔ بادہ نوش غافل پڑے ہیں۔کون ہے جو اس وقت بے ہوش نہیں۔ تمام عالم شہر خموشاں ہے۔بیدار ہے تو مایوسی و حرماں ہے، آنکھیں کھلی ہیں تو حسرت زدوں کی۔جاگتے ہیں تو دل افگار۔اس حرماں نصیب کو نیند کہاں جس کے دیدۂ تر دامن کو تک رہے ہیں۔ یا بے اختیار آنسو ٹپک رہے ہیں۔سر گریبان آشنا ہو رہا ہے یا غم سے زانو پر دھرا ہے آنکھ سقفِ آسماں سے لڑ رہی ہے، زباں وقفِ خاموشی ہے جس کا خونِنابہ دل وقفِ لب جس کے لئے حجاب آرزو دامانِ شب ہے دنیا سے تنگ آکر مرنے پر تیار ہوا ہے موت کو زندگی کا سہارا سمجھا ہے ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نا امیدی اُس کی دیکھا چاہیے

یہ وہ شخص ہے جو ہر طرح کے عیش کی داد دے چکا ہے دولت و اقبال سب کو دیکھ لیا ہے۔عشق و محبت کی کیفیت خوب دیکھی عیشِ وصال کے لطف اچھے

اُٹھائے کوئی عیش نہیں جس کو جی کھول کر نہ کیا ہو۔ بلکہ ہر طرح کا عیش کرتے کرتے تنگ آگیا۔ اور جس قدر ایک عیش کو دوبارہ کرتا ہے اُسی قدر نفرت ہوتی ہے۔ دنیا کے سب عیش نئے نئے تو اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ دوبارہ کرنے میں عذاب ہو جاتے ہیں۔ زیرِ فلک کوئی عیش ایسا نہیں جو جلدی ہی اجیرن نہ ہو جائے دنیا میں کوئی سامانِ فرحت نہیں جس سے آدمی جلدی ہی تنگ دل نہ ہو۔

اس کو بھی عین جوانی میں عیش اجیرن ہو گیا۔ زندگی اُلجھن ہو گئی۔ گھبرا اُٹھا کہ الٰہی جوانی میں جب زندگی اس قدر ناگوار ہے تو آگے کیا ہوگا۔ جو چیز اس شباب میں اجیرن ہے، آگے بلائے جاں ہو جائے گی۔ بڑھاپے میں جانے کیا گزرے گی۔ یہی دل میں ٹھان کر اس وقت جان و تن کا قصہ مٹانے بیٹھا ہے کہ آدمی جیے کیوں۔ اپنے واسطے اگر جینا ہے تو ناگوار ہے کسی اور کے لئے جیتے ہیں تو بے کار ہے۔ یہ سمجھ کر جامِ ہلاہل مُنہ سے لگایا۔ تقاضائے اجل کا انتظار نہ کیا۔ یہ نہ سمجھا کہ زندگی کی قدر جتنی ہماری عمر زیادہ ہو زیادہ ہوتی جاتی ہے اور گو عیش کی قوت نہ رہے مگر جینے کی ہوس بڑھتی جاتی ہے۔ بلکہ ہزار مصائب اسی لئے جھیلے جاتے ہیں کہ کسی طرح زندگی رہے کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جوان بوڑھوں کی نسبت جان دینے میں زیادہ دلیر ہوتے ہیں حالانکہ بوڑھوں کو زندگی سے زیادہ بیزار ہونا چاہیے۔ کیوں کہ زندگی کے لطف تو اس عُمر میں نہیں رہے۔ چاہیے کہ زندگی سے نفرت ہو جائے۔ مگر نہیں ہوتی۔ بلکہ جوں جوں عمر زیادہ ہو جینے کی ہوس بڑھتی جاتی ہے اس کا سبب بہت دور نہیں۔ دُنیا ایسا تماشا ہے۔ جس کو جس قدر دیکھیے اُسی قدر اس میں زیادہ جی لگتا ہے۔ اس کو جوئے کی دھت سمجھیے کہ جس قدر ہاریے اُسی قدر کھیلنے کی ہوس بڑھتی جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ اسبابِ عیش زندگی کی قدر بڑھاتا ہے بلکہ اس سے جس قدر سابقہ زیادہ رہے اُسی قدر اُس کی محبت بڑھتی جاتی ہے یعنی جتنا اُس کا ہمارا ساتھ

زیادہ ہو اُسی قدر اُس سے جُدائی ناگوار معلوم ہوتی ہے۔ اس حساب سے بچّوں کو مرنے میں قلق نہیں ہوتا۔ جوانوں کو بوڑھوں سے کم اور بوڑھوں کو سب سے زیادہ۔ سبب وہی کہ جس کو جتنا سابقہ دنیا سے رہا۔ اُس کو اتنا ہی زندگی سے محبت ہوئی اس سے غرض نہیں کہ زندگی کسی طرح گزری ہو۔ سارا مدار خلطے پر ہے۔

کہتے ہیں کہ کسی تقریب میں کہیں قیدی رہا کئے گئے تقریب کوئی بڑی تھی۔ پُرانے پُرانے قیدی چھوڑے گئے۔ ان میں ایک قیدی ایسا تھا کہ تمام عمر اُس کی وہیں گزری تھی۔ حُکم حاکم مرگِ مفاجات سمجھ کر اسیری سے نکلا تو سہی۔ مگر آخر کو دو چار دن پھر پھرا کر قید خانے کے دروازے پر آپڑا زار زار روتا تھا کہ کسی طرح مجھے اندر آنے دو۔ بادشاہ کو خبر ہوئی بلایا اور دریافت کیا کہ تجھے قید خانے کی ہوس کیوں ہے؟ کہا کہ میری ایک عمر قید خانے میں گزری، جوان آیا اور بوڑھا نکلا سیاہ بال لایا اور سفید لے چلا شہر کی گلیوں سے زیادہ قید خانے کی دیواروں سے مانوس ہوگیا تھا۔ یہاں کے رہنے والوں کو عزیزوں سے زیادہ جانتا تھا۔ قید سے نکل کر تمام شہر میں پھرا کوئی ایسا نہ ملا جو مجھے جانتا ہو۔ کوئی پہچاننے والا نہیں رہا۔ میرے ساتھ والوں میں بہتیرے کہیں چلے گئے۔ کتنے مر گئے تمام شہر میرے لئے اجنبی ہوگیا۔ دو چار برس جو میری زندگی کے ہیں میں چاہتا ہوں کہ اسی قید خانے میں کاٹنے کی اجازت مل جائے۔ جہاں ہر کونا میرا آشنا سا ہے اور ہر در و دیوار آشنا ہے۔ یہی آرزو ہے کہ باقی زندگی بھی وہیں کٹ جائے جہاں اتنی عمر کٹی جس کا ساتھ اس قدر رہا ہو اُس کو اِس وقت چھوڑا نہیں جاتا۔ آخر لاچار ہو کر اُس کو قید خانے میں لے لیا۔ بعینہٖ یہی حال زندگی کا ہے اس

سے بھی جتنا ہمارا سابقہ بڑھتا جاتا ہے۔ زیادہ اُنس ہوتا جاتا ہے۔ بُری ہو یا بھلی اس کا ساتھ چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ بلکہ درد دکھن کا جانا بھی دل کو کھاتا ہے۔ دلِ درد مند نہیں مانتا کہ مصیبت میں بھی جس کا ساتھ رہا ہو چھوٹے۔ درد بھی جب رہا ہو داغ ہو جاتا ہے اور زخم جو پرانا ہو۔ ناسور کہلاتا ہے جس کا جانا مشکل ہے ؎

چشمِ خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم نے جانا تھا کہ بس اب تو یہ ناسور گیا

اس خیال سے کون ہے جسے اپنا اسلام عزیز نہ ہو تیرہ سو برس کا ساتھ بھی کہیں چھوٹتا ہے نئے ولولے نیازِ قدیم کو کب پہنچتے ہیں۔ نئی ملاقاتوں میں پُرانی محبتیں کب چھوٹتی ہیں۔ نئی روشنیاں شعاعِ آفتاب نہیں مٹاتیں۔ تیرہ سو برس کے عقیدوں کو نیچری "ایجادِ بندہ" کیا کرے۔ نئے خیال نئی باتوں کو اُکھاڑ چکے۔ پُرانی جڑیں تازہ صدموں سے نہیں ہلتیں۔ نئے رنگروٹ پرانے سپاہیوں کو نہیں پہنچتے وہ اور ہیں جن کو ہوائے تازہ سے خللِ دماغ ہوتا ہے۔ وہ اور ہیں جو دوڑتے ہیں۔ اور گر پڑتے ہیں بادِ مخالف میں جو جہاز نہ چلے۔ اُس کا اعتبار نہیں۔ مصائب میں جو کسی کا ساتھ چھوڑے وہ آدمی نہیں لڑائی میں جو دشمن سے جا ملے کمینہ ہے اور خود کشوں کی طرح جس نے کسی نئے ولولے میں ساتھ چھوڑا وہ ہیز ہے جو لشکر چھوڑ کر بھاگا۔

(تیرھویں صدی)

از گہوارہ تا گور

گہوارے سے گور تک انسان کی زندگی عجیب الجھن میں گزرتی ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا الجھن ہوگی کہ اسے اپنے اس عالم میں آنے کی بھی خبر نہیں۔ نہ اس کو یہاں کے آنے میں کچھ مداخلت ملی۔ ضمناً دوسرے کی مرضی پر (سو بھی اس وقت شاید یقینی نہ ہو) میاں کو دنیا میں آنا نصیب ہوا۔ نہیں معلوم کہ کیوں آئے کب آئے اور کہاں سے آئے نہ یہ معلوم کہ ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ اس طرح ہمارے یہاں سے جانے میں بھی کوئی ہم سے صلاح نہیں لیتا ہے۔ بلکہ برخلاف اس کے ہمارے بغیر اطلاع اور جبکہ ہمیں سخت ناگوار ہو ہمیں یہاں سے باہر نکالتے ہیں۔ ہمارے نکالنے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا جاتا۔ بات بات پر نکالے جاتے ہیں اور نکلنے میں خبر نہیں کی جاتی کہ کہاں لئے جاتے ہیں، اُس برگِ خزاں رسیدہ کی طرح جو شاخ پر کانپ رہی ہو کہ اب گری، اب گری اور جسے آخر کو ہوا کا جھونکا جانے کہاں سے کہاں لیجائے۔ ہم بھی جانے کہاں پھینکے جاتے ہیں۔ ان لاچاریوں پر بھی "نیچریوں" نے ہمارے کان میں یہ پھونک رکھا ہے کہ جو کچھ ہیں ہم ہی ہیں — تمام عالم ہمارے لئے پیدا کیا گیا۔ ہم جو چاہیں سو کریں ہاں اے بندگانِ نیچر!

یہ خبط تمہارا غضب کا ہے ایسے ہٹری نہ ہوتے تو واقعی جینا مشکل تھا ہزاروں حماقتیں کرکے اور لاکھوں لاچاریوں کے بعد تمہیں ہو جو ایسا سمجھ رکھا ہے۔ عقل کا تمہاری یہ حال ہے کہ خدا کو بھی اب تک نہیں پہچانتے، تمہیں نہیں معلوم کہ یہ عالم کیا ہے اور اس کے بعد کیا ہوگا۔ اختیار کا جو تمہارا حال ہے وہ ناگفتہ بہ، کہ تھوڑے ہی ہیں، جنہیں روٹیوں کی طرف سے بھی اطمینان ہوگا ساری زندگی تمہاری اتفاق پر ہے کہ اتفاق سے جس کے یہاں پیدا ہوئے ویسے ہو گئے۔ یا لڑکپن میں جیسی تعلیم ہوئی ویسے نکل گئے۔ یہ دو باتیں بھی تمہارے اختیار میں نہیں۔ تمہیں اپنی قسمت کے بنانے اور بگاڑنے میں دخل نہیں شادی وغم کے بندے ہو۔ ایک کے سرور یا دوسرے کے وفور میں تمہارا عجیب حال ہوتا ہے۔ زندگی تمہاری کیسے دھوکے میں گزرتی ہے کہ رات دن تلاش ہے تو اُس چیز کی جو کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ وہ ہے "خوشی" یا "ہے پی نس" جس کے لئے تم مہد سے لحد تک سرگرداں رہتے ہو۔ کسی نے آنکھ سے نہیں دیکھی — "ہے پی نس" یعنی دُنیوی راحت کو کسی نے خواب میں نہیں دیکھا۔ دنیا میں آج تک چین کسے نصیب ہوا۔ "ہے پی نس" ہائے "ہے پی نس تیرے نام کا زمانے کو مشتاق پایا، مگر تو کہاں! جسے دیکھئے تیرے تغافل کا کُشتہ ہے جس سے ملئے تیری جان کو رو رہا ہے تیرے اقرار ہمیشہ جھوٹے نکلے اور تیرے اسباب بیہودہ۔ کون ہے جس پر تیرے فقرے نہیں چلے تیرے وعدے کبھی پورے ہوتے نہیں سُنے۔

انتظار اس کا پیش خیمہ اور مایوسی اس کی رفیق ہے انتظار میں بیچارے تصور کی جان پر بن گئی۔ اور مایوسی سے ہر شخص کو رات دن کا سامنا سمجھئے۔ جنہوں نے اسے نہیں دیکھا وہ جانے کیا سمجھے ہوئے ہیں۔ جن کو سابقہ پڑ گیا۔ وہ

تمام عمر روتے رہے یہ وہ آفت روزگار ہے جس نے اپنے چاہنے والوں کو جانے کیسے کیسے ناچ نچائے۔ کیسے کیسے کنوئیں جھکائے۔ کیسے کیسے سبز باغ دکھائے کسی نے اُسے عیش میں ڈھونڈا، کسی نے اس کے لئے نفس کو مارا۔ کسی نے تحصیلِ کمال کا یہی نتیجہ سمجھا۔ کوئی اس کی دھن میں دنیا عاقبت کھو بیٹھا۔ غرضکہ اس فتنۂ دہر نے ہر شخص کو ہر رنگ پر لگایا اور آپ الگ رہی۔ ایک زمانے کو محو رکھا۔ اور آپ کسی کے بس کی نہ ہوئی۔ فقرا نے دیکھا کہ یوں بس میں نہیں آتی تو اُلٹی چال چلئے اس سے بھاگئے تو شاید یہ ساتھ دوڑے اس سے بیزار رہیے تو شاید چاہنے لگے۔ لیکن ان چالوں میں کب آتی تھی مگر نہیں کبھی بے تلاش بھی مل گئی اور بے انتظار ہی آگئی اور جنھوں نے اس کی تلاش میں جان لڑا دی۔ اُس کے پاس بھی نہ بھٹکی۔ اس میں زیادہ قصور ڈھونڈنے والوں کا ہے کہ اسے اکثر وہاں ڈھونڈتے ہیں جہاں یہ جاتی نہیں۔

قارون نے دولت میں، سکندر نے سلطنت میں، قیس نے جنون میں، افلاطون نے فنون میں ڈھونڈا اور کسی کو نہ ملی، دولت میں ذلت، سلطنت میں مصیبت، جنون میں خواری اور فنون میں لاچاری کے سوا کچھ نہ ملا۔ ہاں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے اس بیگانہ وش کی طرف سے بھی اظہار شوق ہوتا ہے۔ نادر سے نپولین سے کچھ دنوں نباہ رکھا۔ مگر اس سے صرف غرض اتنی تھی کہ پھر فراق کے صدمے بھی اتنے ہی جانکاہ دیے جائیں جن کو اس نے ایک نگاہ بھر کر دیکھ لیا۔ اُن کو ستمِ روزگار کی کیا حاجت۔

غرض آپ نے دیکھا کہ "ہے پی نس" کسی کے بس کی نہیں۔ اس تک رسائی بھی کیسی مشکل ہے مگر چاہتے سب یہی ہیں کہ کسی طرح ہاتھ آئے۔ نازک مزاجوں اور عالی دماغوں کی طرح اس کے یہاں کسی کو بار بہت دشوار ہے۔ اس کی بارگاہ بہت بڑی ہے جہاں

تک پہنچنا بڑے حوصلے کا کام ہے فرض کریں کہ اس کے کاشانے پر اس وقت سب جمع ہیں۔ اور باریابی کی تدبیریں کر رہے ہیں۔ دروازے پر آرزوؤں کا پہرا ہے جو بے اطلاع کسی کو آنے نہیں دیتیں۔ دو چار بوڑھے اگلی وضع کے نیک بخت سیدھے سادے لوگ بے اطلاع جانے لگے اس پر انہیں روکا اور پوچھا تم کون ہو۔ کہا کہ ہم اگلے وقت کے لوگ ہیں۔ خدا کے فضل سے تیرہ سو برس سے مسلمان کہلاتے ہیں۔ کیا اتنا بھی ہمارا حق نہیں کہ بغیر اطلاع جاسکیں جواب ملا کہ ابھی نہیں بلکہ گور سے ادھر نہیں بہت سے حکیم و فلاسفر و عالم آئے اور اطلاع کرائی جواب آیا کہ پھر آنا۔ دولت و اقبال کی اطلاع کی گئی۔ جواب ملا۔ نہیں ہیں۔ جوانی اور حُسن وجمال کی طرف سے اندیشہ ہوا کہ انہیں بھی مایوسی نہ ہو۔ کہیں یہ بھی نہ رہ جائیں۔ مگر اُن کو بھی جواب ملا کہ ابھی فرصت نہیں۔ دل دردمند و خونیں جگروں کو کہلا بھیجا کہ تمہارا یہاں کیا کام۔ سلطنت وحکومت کی اطلاع بڑی دھوم سے ہوئی جس کے لینے کے لئے اندر سے تزک واحتشام بہت کرّ و فر کے ساتھ آیا مگر خود بدولت کا پتا نہیں ہوا نہ یہ معلوم ہوا کہ، کہاں گئیں۔ پتا لگا کہ کسی غریب کے یہاں 'قناعت' کے ساتھ چھپ کر نکل گئیں وہاں سے خیال ہیں کسی کے ساتھ ہولیں مکان پر اُن کو تلاش کیجئے تو مل چکیں۔ گھر پر تو اُسے ملیں گی جس نے اپنی آرزوؤں کا خون کیا ہوگا کہ اس وقت تعزیت کو ضرور آتی ہیں۔ اس میں ان کا ذکر رہ گیا جو زبردستی نیچر کے گھمنڈ پر گھسا چاہتے تھے اور بُری طرح ہاتھ پکڑ کر نکالے گئے۔

(تیرھویں صدی)

عجب تماشائیست

پیرایۂ آغاز

بہ کہ بنامِ صمد بے نیاز
نامہ نواز آیم و عنواں طراز

رہگزرِ جامۂ اصحاب بشید
دام نہ عابد گم کردہ صید

زہر چکانِ مژہ دلبراں
حسن فزایندۂ عصمت وراں

زمزمہ کارِ لب ناقوسِ دل
داغ فروزِ دُم طاؤس دل

زیورِ آوازۂ ناقوسیاں
چشمۂ آرائشِ طاؤسیاں

انجمن آرائے حریم سماع
نوحہ طرازِ لب گرم وداع

سُرمہ کش عنبر زرّیں قدح
وسمہ نہ ابروئے قوسِ قزح

شمع مہ افروزِ سیستانِ شب
شیر سحر دوش زپستانِ شب

شمع فروزِ حرمِ احترام
نامیہ سازِ چمنِ انتقام

نغمۂ ناقوس فروشاں ازوست
سینۂ ہر زمزمہ جوشاں ازوست

برشفقِ گریہ عطارد شمار
بر ورقِ دیدہ تماشا نگار

پہلے ہم آپ کو ایسے میدان میں لئے جاتے ہیں۔ جہاں عالم ہُو کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اس سنسان میدان میں ایک آوازِ کُن سنائی دیتی ہے۔ جس کے سنتے ہی سارا جہاں روئے جاناں کی طرح روشن ہو گیا۔ آفتاب، چاند، تارے ثوابت و سیارے حُسن مہ وشاں کی طرح اپنا اپنا جوبن دکھلانے لگے۔ نورِ عارض یار کی طرح کون و مکاں میں روشنی ہو گئی تمام عالم بزم چراغاں بن گیا۔ زلفِ ہوا کو حکم ہوا کہ صحنِ زمیں اس طرح جھاڑے کہ روئے نکو کی صورت تمام آفاق اک عالم نور نظر آئے، پیر فلک کو حکم ملا کہ تمام جہان حاضر کیا جائے۔ خالق کو اپنی قدرت کا تماشا دکھانا ہے ؎

اے آنکہ تُراست چشمِ بینش
بنگر خط و خال آفرینش

یہ سنتے ہی سارا جہاں ہمرنگ وادئ ایمن ہو گیا۔ تمام عالم میں شور ہوا کہ ؎

از پس ایں پردۂ سیماب گُوں | آنچہ بنالیست نیاید بُروں
بُتکدہ آرائے بتان بہار | تاب دہِ خُمکدۂ لالہ زار
از گُل رُوے مجلسے انگیختہ | بوئے گُل و مے بہم آمیختہ
خضر یکے سبزۂ بُستانِ او | نوح یکے شبنم طوفانِ او
نطق یکے والۂ گفتارِ او | درک یکے مفلسِ بازارِ او

جلّ جلالہ علم شانِ اوست
عمّ نوالہ مگس خوانِ اوست

سب سے پہلے پیر فلک نے مادر گیتی کو حاضر کیا کہ تقدیر الٰہی کی تعمیل کرے مادر گیتی نے حاضر ہو کر عرض کیا ؎

اے دلِ لم آزردہ اندیشہ ات　　غارت خواب و خور من بتیہ ات

حرف تو اندیشہ شبگر دمن　　وقف خیالت دل پُر درد من

شوق کجُا تاب صبوری کجُا

عشق کجا طاقت دوری کجا

اس عمر میں میں نے کیا کیا تماشے نہیں دیکھے۔ انسان کی تو اب آنکھیں کھلی ہیں۔ اس سے پہلے جانے کیا کیا نہیں ہوا؟ یوں تو مشیتِ ایزدی میں دم مارنے کی مجال نہیں۔ مگر یہ تماشا انسان کی بدنامی کا گھر ہے، اس میں ایک جہاں کی برائی میرے سر رہ جائے گی۔ مشیتِ ایزدی کو کوئی نہ کہہ سکے گا حکم ہوا کہ معشوقہ روزگار دنیا نامی اپنے ساتھ لے لے جس کو دیکھتے ہی انسان ایسے محو تماشا ہو جائیں گے کہ کسی کو کسی کا خیال نہ رہے گا۔ جس کی سے

نگاہیں کچھ اشارت آشنا ہیں

نہیں ثابت کسی کو بھی یہ کیا ہیں

اگر دیکھے نہ دیکھے پھر کسی سو

نہیں ممکن رہے خاطر پہ قابو

دیکھئے وہ آفتِ روزگار جسے دنیا کہتے ہیں آئی۔ جی تو یہ چاہتا ہے اور موقع بھی ہے کہ اس پرکالۂ آفت کی آمد دھوم سے بیان ہو سے

وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے

شکیب و صبر اہل انجمن کی آزمائش ہے

اس وقت آپ کو ہوش ہو تو ہو مجھے تو ہوش نہیں کہ اس کو دیکھ کر اس کی آمد کا مضمون سُوجھے۔ بھلے کو حضرت منیر اس وقت پہنچ گئے۔ جن کی خوش بیانی سے اہلِ سخن کی آبرو رہ گئی سے

کہوں میں اُس صنم عشوہ گر کی کیا آمد
لطیف نکہت گُل سے زیادہ جس کا چلن

اس سے زیادہ کیا سُبک روی ہوگی کہ سبزہ خوابیدہ کو بھی خبر نہیں کہ کون آیا اور فرشِ گل تر میں شکن نہ آئی کبک و طاؤس و برق کو حسرت ہوئی کہ یہ چال ہمیں نصیب نہ ہوئی ؎

وہ حُسن گرم کا جلوہ وہ چمپئی رنگت
کہ جس کے آگے ہو شرما کے زرد رو کندن

چمپئی رنگت گندم گوُں ہونے سے بہار دے گئی جس کی ہوس میں حضرت آدم بہشت سے نکلے - پر ؎

بہم متانت و تمکین و شوخی و تیزی
ملی جلی ہوئی ترکیب کا نیا جوبن

عالم اسباب کی کونسی خوبی ہے جو دنیا کو نہیں ملی ؎

ہلال طوق مرصّع بنے مہِ کامل
جو ایک شب بھی میسّر ہو جلوۂ گردن
تجلئ لب و دنداں جو دیکھ کر شرمائے
تو کھائے کوٹ کے الماس بھی عقیق یمن
طلب کرے رُخ گلگوں خط غلامی اگر
خوشی سے مہر کرے داغ لالۂ گلشن
حلب میں شام نہ ہو صبح ہی رہے تا حشر
پڑے جو آئینہ میں عکس عارض روشن

نظر جو اس میں پڑے عکس عارضِ انور
تو آرسی سے بدل لے قمر کو چرخِ کہن
ادائیں طرفہ قیامت کی چال موزوں قد
شریک شوخیوں کے ساتھ چلبلی چتون

آواز آئی کہ غضب کا سامنا ہے کیا نمونہ قدرتِ خدا ہے اس کو دیکھ کر مادرِ گیتی نے اجازت چاہی کہ سارا عالم اسباب دنیا کے سپرد کیا جائے کہ تماشے کا ٹھاٹھ درست کرے۔ اتنے میں شور ہوا کہ دنیا ہم سے جانے کیا کیا ناچ نچوائیگی۔ اس کی ہوس میں ہمیں ایسے ایسے سوانگ بھرنے پڑیں گے جو ہمارے وہم و خیال میں بھی نہیں۔ اس پر تقدیر الٰہی جواب تک چپکی کھڑی تھی، بول اٹھی کہ تمام عالم محض سوانگ ہے اور ساری دنیا ایک ڈھکوسلا ہے تھوڑی دیر کا تماشا ہے جس سے جو بن پڑے۔ اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ یہ سن کر تمام ابنائے زماں میں غل ہوا کہ یہ کیا تماشا ہے جس میں ایک کو خوشی ہے تو دوسرے کو رنج، کوئی ہنس رہا ہے اور کوئی رو رہا ہے جو ہنس رہے ہیں، انہیں تو فکر نہیں، رونے والا کہہ رہا ہے کہ خدایا میرے پیدا کرنے سے تیری کیا غرض تھی۔ جس کی طرف سے جامی کہہ رہے ہیں۔ ؎

مرا اے کاشکے مادر نمی زاد
دگر میزاد کس شیرم نمی زاد

عورتوں سے نظامی کا کلام ہے ؎

زن از پہلوئے چپ گویند برخاست
نیاید ہرگز از چپ راستی راست

آدھی دنیا تو رونے میں گئی اور آدھی عورتوں میں۔ وہاں باقی کیا رہا جس کے

لئے سوانگ کیا جائے۔

لیکن یہ شکایت اس طرح مٹا دی گئی کہ اس تماشا (ڈراما) کے دو حصے کر دیئے گئے ایک کمیڈی دوسرا ٹریجڈی یعنی اس تماشا گاہ کے دو وسیع کمرے بنائے گئے دارِ ہستی د دارِ فنا دونوں کے دو دروازے علیحدہ علیحدہ قرار پائے ایک دروازے کا نام گہوارہ دوسرے کا نام جنازہ رکھا گیا۔ ان دونوں کے درمیان صحن خانہ کا نام زندگی سمجھ لیجئے اور تماشوں میں کامیڈی اور ٹریجڈی کو علیحدہ رکھنے میں زندگی کے ڈراما میں دونوں ساتھ ساتھ رہا۔ اب ہر ایک کو اپنے اپنے پارٹ کے موافق یعنی جس کے ذمے جو تماشے کا حصّہ سپرد ہے اسی کے موافق سامان عطا ہوا۔

عدم میں تو سب ایک حمام کے ننگے تھے۔ دنیا میں آکر کپڑے لتے اسباب و سامان میسر ہوتا ہے۔ گہوارے نامی دروازے پر سامان تقسیم ہوا ہے چوپس پردہ عالم اسباب کی دار و غائی میں جمع تھا سب سے پہلے مادر گیتی نے ایک بچہ سامنے لاکر کہا کہ اس کا پارٹ عالم فانی میں بہت مختصر ہے یہ ابھی آغوش مادر سے نکل کر آغوش گور میں جائے گا۔ اس کے لئے عالمِ اسباب میں سے بالشت دو بالشت کفن مل جائے اتنے میں بچّے نے ایک چیخ ماری اور سو گیا۔ لوگوں نے کہا ٹریجیڈی تو شروع ہو گئی بچے کو ابھی اس دروازے سے لے جا رہے تھے جس کا نام جنازہ ہے کہ اُکبارگی دولت مندوں نے شور کیا کہ ہمیں بڑا سوانگ بھرنا ہے اس تماشے کی رونق ہم سے ہے عالم اسباب کو حکم ہوا کہ جو کچھ یہ مانگیں دے دیا جاوے۔ اور کراماً کاتبین سے کان میں کہدیا کہ ایک ایک رتی کا حساب رکھنا کہ چلتے وقت اُن سے لے لیا جائے گا۔ دولت مند یہ اشارہ نہیں سمجھے اور دنیا کے سامان عیش میں سے اتنا بہت سے لے چلے جو اُن سے لے چلنا مشکل ہو گیا۔ چلنے

کے لئے پیر کافی تھے۔ اُنہوں نے متعدد سواریاں لیں کہ پیر بے کار ہو گئے۔ بھوک سے زیادہ کھانے کے لئے نسخے تلاش کئے جس سے بھوک جاتی رہی اولاد کے لئے نکاح بس تھا اُنہوں نے عیش میں اپنی زندگی اجیرن کر لی یہ تو یہ سمجھے کہ بڑا سامان لے آئے مگر دراصل گرہ کا بھی کھو آئے۔ یہ آغاز کمیڈی سمجھے خوبانِ عالم کو بڑی بڑی آنکھیں ملیں جو گویا اُبلی پڑتی تھیں زلفِ سیاہ خدنگ نگاہ، برگ گل سے زیادہ نازک ہونٹ۔ دستِ حنائی، قیامت کی چال عطا ہوئی۔ مگر ساتھ ہی شب ہجر، دردِ فراق، خیال یار بھی ملا۔ جس سے ان کا پارٹ نصف کمیڈی اور نصف ٹریجیڈی ہو گیا۔

گدا نے کہا کہ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ جواب ملا کہ یہ عالمِ اسباب ہے تھوڑا بہت سامان لینا پڑ گیا۔ گدڑی کاسۂ گدائی، فاقہ کشی اور ایسی ہی دو مختصر چیزیں لے لو۔ اب یہ سب تماشا گاہ میں جمع ہوئے۔

دولت مند نے فقیر کو دیکھ کر کہا کہ ہٹ کے کھڑا ہو۔ فقیر نے جواب دیا کہ کیا تیرا پیدا کرنے والا اور ہے اور میرا اور، کیا یہ تماشا، اُس کا نہیں جس نے تجھے اور مجھے دونوں کو بلایا۔ دولت مند نے کہا کہ میں تو بلایا ہوا آیا ہوں لیکن مجھے یقین نہیں کہ تو بھی بلایا گیا ہو تیرے آنے سے تو تماشے کی رونق نہیں۔ گدا نے کہا کہ بلائے ہوئے تو دونوں ہیں لیکن آپ بھول گئے۔ اس پر تقدیر نے سمجھایا کہ دولت مند جب خود اپنے تئیں نشۂ دولت میں بھول جاتے ہیں تو تُو کس گنتی میں ہے یہاں پر مجھے یہ کہنا ہے کہ ڈراما میں ایک پرامٹر بھی ضرور ہوتا ہے جو تماشا کرنے والوں کو ان کے سہو بتاتا جاتا ہے اس تماشے میں تقدیر اس کام پر مقرر ہے یہ کام کبھی کبھی "اُس کے فضل" سے بھی لیا جاتا ہے مگر یہ رعایت نیک بندوں کے ساتھ ہے ؎

بسکہ بود تشنۂ عفو و عطا　　دست نیاز دہرہ سہو ما
لغزشِ مستانہ دہد سہو را　　چشمۂ افسوس کند لہو را

تقدیر کی بات یہ ہے کہ اس تماشے میں سب برابر ہیں۔ دولت مند اور گدا سب ایک ہیں۔ خوبی خال و خط بولی کہ میرے برابر کون ہو سکتا ہے، دولت مند کا اگر زور چلتا ہے تو ظاہری اسباب پر میرا قابو انسان کے دل پر ہے ؎

زاہد و راہب سوئے من تاختند　　خرقہ و زنّار در انداختند
ذوقِ جنوں از سرِ دیوانہ پرس　　لذّتِ سوز از دل پروانہ پرس

تقدیر نے کہا کہ یہ اختیار کے دن کا، جوانی تک اس کا مزہ لیجئے۔ جب جوانی گئی گویا زندگانی گئی۔

دل نہ بہر چشم سیہ مبتلاست
تیر نگہ گردنِ خوباں بلاست
در شکنِ زلف چہ سودا کہ نیست
در خمِ گیسو چہ ملا ہا کہ نیست

(تیرھویں صدی)

حصّۂ دوم

(انتخاب از "زمانہ" "افسانۂ ایام" و "ناصری")

افسانۂ زبانِ اُردو

کہتے ہیں کہ مغلوں کے زمانے میں "اردو" نامی ایک عورت لشکرِ شاہی میں آگئی۔ جو پہلے ممالک ایران و عرب و روم میں رہ چکی تھی۔ لشکر میں رہتے رہتے اکثر زبانوں کے لب و لہجہ سے واقف ہوگئی، اس کو آوارہ سمجھ کر خاص لوگ، جو فیضی سے یہ سُن چکے تھے کہ ؎

مردانہ بہ رہ جنوں تواں دید
زن بادیہ گرد چوں تواں دید

اس ہرزہ گرد کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ لیکن اس کی مختلف زباں دانی سے عوام کو بازار کی خرید و فروخت میں آرام ملا۔ سودا سلف کے لئے بڑے کام کی نکلی۔ اس کے خاندان کا حال اس سے زیادہ معلوم نہیں کہ یہ اپنے تئیں کبھی فارسی کبھی عربی اور اکثر ہندی نژاد بتاتی تھی۔

مگر مشہور تھا کہ اس کے گھر بار کا اعتبار نہیں۔ خدا جانے کہاں کہاں رہی ہے۔ بازاری عورت ہے اس کا گھر بازار ہے۔

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

اس زمانے کے بے فکروں نے دیکھا کہ اُس کا کوئی وارث نہیں۔ اسے دلّی میں رکھ لیجئے۔ دیکھئے کیا رنگ لاتی ہے۔ عورت آوارہ اور صحبت بازاری۔ رفتہ رفتہ اس سے دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ بڑی کا نام نثر چھوٹی کا نام نظم ہوا۔ نثر اس وقت پیدا ہوئی جبکہ اُردو کا زمانہ عروج پر نہ تھا۔ یہ لڑکی گھر کے دھندوں میں کہیں جانے آنے نہ پائی۔ کسی بڑے جلسے اور نمود کی تقریب میں شریک ہونا اسے نصیب نہ ہوا۔ گھر کے چکی چولھے سے اسے فرصت نہ ملی۔ اس وجہ سے پڑھے لکھوں کے سامنے اسے بات کرنے کا سلیقہ نہ آیا اور گو عمر میں نظم سے بڑی ہے لیکن کسی نے اسے نہ پوچھا۔ ناچار ایک معمولی جگہ جن کا خاندان سیدھے سادے ملاؤں کا مشہور رہے اُس کا ہاتھ پکڑا دیا گیا۔ یہاں اُسے اگلے وقت کی بہو بیٹیوں کی طرح معمولی کاموں کے سوا اور کوئی مشغلہ نہ ملا۔ اس بے کاری کے کارناموں میں "صبح کا ستارہ"۔ "دوزخ نامہ"۔ "بہشت نامہ" اور ایسی ہی دو ایک یادگاریں سننے میں آئیں جن کو اب لوگ بھول بھی گئے۔ اس حال میں اُسے اپنی جوانی کا لطف کیا خاک آتا جوانی میں بھی اسے بڑی احتیاط سے رہنا پڑا گویا ؎

جاں را بہ کفِ ہراس میداشت
دل را بہ دو دیدہ پاس میداشت
از سایہ خود رمیدہ مے بود
بر سایہ فسوں دمیدہ مے بود

برخلاف اس کے اس کی چھوٹی بہن نظم غضب کی نکلی یہ اس وقت پیدا ہوئی۔ جب ہندوستان میں عیش ونشاط کے چرچے تھے۔ گھر کے کاروبار یعنی ملک کے نظم ونسق سے بے فکری تھی۔ ہر کوچہ وبازار بزم طرب ہو رہا تھا حسن وعشق کا وہ رنگ جم رہا تھا کہ بازار اُردو (کیمپ) مصر کے بازار سے بڑھا ہوا تھا۔ جہاں جنس نازوادا کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ سودا تھا تو جنون کا اور شور تھا تو خود فروشی کا ——— زلف سیہ کے ساتھ سر کا سودا ہو رہا تھا اور درہم داغ کے لئے کوئی کلیجہ پکڑے کھڑا تھا۔ قیس کا عرس جو کبھی نجد میں نہ ہوا۔ یہاں ہر کوچہ گرد بڑی دھوم سے منانے لگا۔ اور شیریں و فرہاد کا نام جسے نظامی بھی بھول گئے ہونگے یہاں نقل محفل ہو گیا۔ گردش چشم یار کے سامنے گردش فلکی کا کوئی قایل نہ رہا جوش طرب سے تمام لشکر (اُردوئے معلیٰ) راجہ اندر کا اکھاڑا سمجھا گیا ؎

سب رعیت تھی چار دہ سالہ ہر جواں غیرت گل لالہ
تھا وہ بازار جادۂ اُلفت تھا ہر اک کوارادۂ الفت
خاک تھی اس جگہ کی عشق آمیز چل رہی تھی ہوائے الفت خیز
تھے دکاں دار خوب رُو سارے فلک حُسن کے تھے جو تارے
ہر دکاں تھی سجی دلھن کی طرح صاف آراستہ چمن کی طرح
تھی گل افشاں وہ ان کی شاخ زباں پھول جھڑتے تھے منہ سے وقت بیاں

یہاں یہ کہنا ضرور ہے کہ اس سے پہلے "فارسی" نامی اُردو کی بڑی بہن ہندوستان میں عرصے سے آئی ہوئی تھی۔ اُس کا کارخانہ اچھا جما ہوا تھا۔ کچہری دربار میں اس کی بات خوب بن رہی تھی۔ محل شاہی تک رسائی تھی۔ نظم اردو کے پیدا ہونے سے فارسی اُردو دونوں بہنوں میں ایک اچھا خاصا سلسلہ

ایشیائی شاعری کا پیدا ہو گیا۔ کیوں کہ اتفاق سے فارسی کی بھی دو بیٹیاں اسی نام کی تھیں، جو عمر میں اُردو سے بڑی تھیں۔ نظم اُردو کی پیدائش کی خبر سن کر خانہ زاد بہن نظم فارسی نے مُلّا آزاد کی زبانی مبارک بادیں کہلا بھیجا۔

زحُسن و عشق زادہ نازنینے
بُت خورشید روئے مہ جبینے

یہ رعایت اس کی ملی جلی پیدائش کی وجہ سے ہوئی اس کے ہندی لب و لہجہ سے فیضی نے کہا ؎

جادو سُخنے صنم فریبے — نگزاشتہ در جہاں شکیبے
بتخانۂ ہند چشم مستش — ہندی صنماں صنم پرستش
صد برہمنش بخوں نشستہ — در بتکدہ بت بہ بت شکستہ
جادو صنمے فریب ناموس — پیچیدہ صدائے او بنا قوس

اور چونکہ عربی خون بھی اس کے رگ و پے میں تھا۔ اس رشکِ لیلیٰ کی تعریف میں مکتبی کی زبان سے نکلا ؎

پر تنگ ز انگبیں دہانش — وز گرد ز سرمہ استخوانش
چشمش بہ ستارہ راہ میزد — مژگاں سناں بماہ میزد
مژگاں بہ دلے خراب کردہ — بر آتش دل کباب کردہ
در دِ چو فلک خمے فگندہ — در گردن عالمے فگندہ
از نازکی کمر کہ او داشت — گفتی کہ بدل خیال سودا شت
از جلوہ سرو آں برفتار — صد خانہ ملک و دل گرفتار

قصہ مختصر نظم اُردو نے تھوڑی سی عمر میں وہ طراری و شوخی دکھائی کہ اچھے اچھے خداوند طبع لوگ اس کی محبت کا دم بھرنے لگے۔ آغاز عمر میں میرؔ و میرزاؔ و مصحفیؔ و انشاؔ پھر آتشؔ و ناسخؔ، ذوقؔ و مومنؔ نے حق محبت ادا کیا۔ اس کے چاہنے والوں کے نام کی تعداد لکھنی مشکل ہے کسی کو اس کی کوئی بات بھائی اور کسی کو کوئی، کوئی نگاہ پر مٹا تو کوئی اُس کی ادا پر، کوئی خیال زلف میں پریشان رہا تو کوئی آئینۂ رخسار کا حیران بنا لیکن سب سے زیادہ اس کے خرام ناز اور صدائے دلفریب یعنی بول چال نے غضب ڈھایا اسمٰعیلؔ منیرؔ نے گویا اسی شاہد بازاری کی تصویر کھینچی ہے کہ ؎

کہوں میں اُس صنم عشوہ گر کی کیا آمد
لطیف نکہت گل سے زیادہ جسکا چلن
وہ حُسن گرم کا جلوہ وہ چمپئی رنگت
کہ جس کے آگے ہو شرما کے زرد رُو کندن
پھسل کے صاف گرے چکنی چکنی باتوں سے
اگر نہ روک لے پائے نگہ کو چین شکن
حلاوتِ لب شکّر فشاں کی چاہت سے
بھرا ہے قند کا شربت میان چاہِ ذقن
بھر آئے قند کے کوزوں کے منہ میں بھی پانی
شکر فشاں دم تقریر ہوا گر وہ دہن
بہم متانت و تمکین و شوخی و تیزی
ملی جلی ہوئی ترکیب کا نیا جوبن

ہر ایک بات میں دُہرے نکلتے ہیں پہلو
یقین اپنی طرف کھینچے اپنی جانب ظن
جو دیکھے لے کے موافق بھوؤں کے ملنے کو ص۹
تو بھولے اپنی کمانی کی جنبش ارگن
سبک روی جو دمِ رقص ہو اسے منظور
تو فرشِ برگ گل تر میں بھی نہ آئے شکن
مجال کیا کبھی گھنگرو جو بڑھ کے بول سکیں
کرے اشارہ نہ جب تک کہ جنبشِ دامن
حباب و شعلہ و طاوس و برق پاؤں پڑیں
کہ اپنی چال کا صدقہ ہمیں سکھا دو یہ فن
اندھیرے میں ہو اُجالا وہ نور کی آواز
اثر وہ لَے میں کہ تصویر کی ہلے گردن
وہ گٹکری کی چمک زمزمے کا وہ لچھا
اُڑاتے ہیں شب مہ میں کتر کتر کے کرن
طلسم سحر ہے بردار پاٹ دار آواز
کسی پری کا نہ اُڑنے میں پھیلے یوں دامن
جو دیس گاتے ہوئے ایک بار سن پائیں
مسافروں کو نہ تا حشر یاد آئے وطن
برس کے کاغذِ ابری ابھی بھرے جل تھل
بیاض میں جو لکھوں اُن کے گانے کا ساون

ترانے پٹے پڑی عمدہ ٹھمریاں غزلیں
سنیں تو پھر نہ ترنُّم سرا ہوں مُرغِ چمن
گلے میں اس لئے پڑتا ہے نور کا دانہ
کہ مُرغ دل کے لئے دام ہے وہ صوتِ حسن
کمند ہے کہ اثر اس صدائے دلکش کا
کھچے ہوئے چلے آتے ہیں سُن کے صاحبِ فن
ادائیں کھینچیں جو مُرلی بجانے کی تصویر
کرشن جان کے لے رادھیکا کی روح، چرن
کدم کی چھاؤں بھی خیابھی سب یہیں دیکھیں
کبھی نہ گوپیوں کو یاد آئے بندرابن
فرشتے کاندھوں کے چاہیں کہ ہم بھی جوگی ہوں
جبیں جو بھاؤ ہیں جوگن کے ڈھنگ سے سمرن
زمانہ تخت سلیمان کی بھی تلاشی لے
جو گائیں "سیج پہ بھولی ہوں دو ہرا کنگن"
غرض محال ہیں اوصاف اس کے سرتاپا
مری زبان ہے گنگ اور ناطقہ الکن

یہ قصیدہ واقعی بڑی دھوم کا ہے لیکن کہاں تک نقل کیا جائے۔ اس سے میری غرض اسی قدر ہے کہ یہ حال تو اس کے اقبال کا سنا۔ دنیا میں کسی کا حال ایک سا نہیں رہتا۔ اتفاق سے گردشِ ایام کی نظر اس کے چاہنے والوں کو کھا گئی اور گو ابھی اُس کا (اُردو کا) کچھ بگڑا نہیں مگر چاہنے والے نہ ہوں تو کیا

کیجئے۔ میرے حساب سے تو اُس کا حسن و جمال ترقی پر ہے، انسان میں جو بات پانچ برس کی عمر میں دیکھئے دس برس میں دُگنی چاہیے۔ دس برس کی عمر میں جس قدر ہوش ہو بیس میں اُس سے زیادہ ہونا ضرور ہے اس کم بخت کے دن ابھی ترقی کے تھے لیکن بقول حضرت بیاں ؎

نہیں تجھکو آئندہ نسلوں سے لہنا　　گیا چھن صنائع بدائع کا گہنا
دیا تجھکو دنیا نے رنڈسالہ پہنا　　سہاگن مناسب نہیں تجھکو کہنا
یہ بے پردہ جلوے اکارت ہیں تیرے
کہ تا حشر ایام عدّت ہیں تیرے

(زمانہ)

حدیثِ عشق

اگرت کتاب الفت بہ نظر رسیدہ باشد
ورقے شمردہ باشی و خطے کشیدہ باشی

فارسی میں عشق و محبت کی داستانیں اس دھوم سے لکھی گئی ہیں کہ یہ مضمون زیادہ تر اُسی زبان کا حصہ ہو گیا، اُردو میں بھی یہاں کے شاعروں نے اسے خوب نبھایا۔ لیکن ہندی میں اس مضمون کو جس خوبصورتی سے ادا کیا، یہ اہل ہند کا حق تھا یہاں تک اور اب تک تو جو کچھ ہوا سو ہوا۔ جب سے نیچرل شاعری کا نام نکلا ہے عشق و محبت کا نام مٹتا جاتا ہے۔ زلف و سنبل کے ذکر سے پریشانی ہوتی ہے۔ خط و خال سے جی گھبراتا ہے۔ نئی تہذیب والے نہیں جانتے کہ نظم میں عشق و محبت کے بغیر چارہ نہیں اور نثر میں بھی اس کا ذکر بُرا نہیں ہے

احوال ما اگرچہ مکرر شنیدۂ
سوگند مے خوریم کہ کمتر شنیدۂ

جی چاہتا ہے کہ آج اسی ذکر سے دل بہلائیے اور اس طرح سماں باندھیے

کہ شاہدان خیال نظارہ گیان آئینہ شوق بنیں۔

دیکھئے اب آئینہ خیال کی بدولت کیسی کیسی پاکیزہ شکلیں اور دل کش

صورتیں دیکھنے میں آرہی ہیں ؎

آئینہ دارئ دل عالم نظارہ کن

از من مپرس دیدن و نادیدن کسے

عرب سے لیلیٰ اور عجم سے زلیخا گلرخانِ فارس میں سے شیریں و عذرا بتانِ ہندی میں سے دمن و پدم ان کے چاہنے والے ان سے کب جدا رہ سکتے ہیں۔ فرہاد و مجنوں، وامق و نل اور اُن کی گرمئ بازار کے باعث حضرت جامی و سعدی اور فیضی غرض اس فن کے سب اہلِ کمال جمع ہوئے اور عشق و محبت کا ذکر شروع ہوا۔ کسی نے پوچھا عشق کیا چیز ہے۔ جامی نے فرمایا کہ اس کا حال زلیخا سے پوچھو سب سے پہلے شہادت سندی الٰہی کی ہے جسے احسن القصص کہتے ہیں۔ زلیخا نے جواب دیا کہ یہ لوگ جنہوں نے دفتر کے دفتر عشق کے لکھ ڈالے۔ کیوں نہیں بولتے۔ اور شیخ سعدی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ تم سے اس مسئلے میں اس لئے دریافت کیا جاتا ہے کہ تم کو زمانے کا حال بہت معلوم ہے اور گو تم کسی پر مرے یا نہ مرے، مگر دُور سے یہ تماشا خوب دیکھا۔ شیخ نے جواب دیا کہ مجھ جیسے روٹیوں کے مارے ہوئے کو عشق سے کیا تعلق۔ اس مسئلے میں میرا تو عقیدہ فلسفیانہ ہے ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق

کہ یاراں فراموش کردند عشق

میری تو عمر صرف اس فکر میں کٹی کہ ع

مرا ناں بدہ کفش برسر بزن

اس پر نوجوانان عشق بولے — اگر تمہیں اس کا حال معلوم نہ تھا تو گلستان میں باب پنجم کہاں سے آیا۔ شیخ نے اس بات کو اس طرح ٹالنا چاہا کہ ؎

دراں مدت کہ مارا وقت خوش بود
زہجرت شش صد و پنجاہ و شش بود

ہجرت سے جتنے برس اس طرف گزرے تھے اُس سے زیادہ اب گزر گئے وہ زمانہ نہیں رہا، مدت ہوئی کہ طبیعتیں بدل گئیں۔ اس پر رانجھے ہیر کے دیکھنے والے بولے کہ زمانہ بدلے تو بدلے مگر دل نہیں بدلتے ؎

نگویم بیوفا گل را کہ رمیر نجد دل بلبل
شکستِ حُسن لیلےٰ حسب مجنوں است در معنی

وہی بات جو لیلےٰ اور مجنوں، شیریں و فرہاد میں سنی پدماوت نے چیتور کی لڑائی میں، رانجھے اور ہیر نے پنجاب میں کر دکھائی۔ لیکن اس بحث میں وہ سوال رہا جاتا ہے کہ عشق کسے کہتے ہیں۔ لوگوں نے قیس سے کہا کہ تم کیوں نہیں بولتے۔ قیس نے جواب دیا کہ لیلےٰ کا ذکر آئے تو مجھ سے بولا جائے ؎

سوالے کرد از مجنوں نشر ندے
کہ بر معشوقہ ات ناید گزندے
خدا را مے شناسی گفت لیلےٰ
کہ در ہر ذرّہ اش بینم تجلّےٰ

عشق کی تعریف ہی کیا اس کا حال تو وہی جانے جو کسی پر مرے اور حضرت سعدی کے فرمانے کے موافق (بر نہ آید زکشتگان آواز) محبت کے مارے ہوئے اکثر چُپ دیکھے۔ شیخ نے کہا کہ سب نے مجنوں کا قصہ لکھا

میں نے اس لئے اُن کو نہیں چھیڑا کہ اُن سے امید کم تھی کہ یہ میری سنیں گے یا اپنی کہیں گے اُن کا عشق تو بقول غالب عجیب ڈھنگ کا تھا کہ جس پر مرے اُسے مار رکھا۔ فرہاد کا عشق بھی بھلے آدمیوں کا سا نہیں۔ سر پھوڑ لینا مُنڈچرا پن سمجھا گیا ؎

نا توانی قوّتے دارد کہ خارا موم اوست

کوہ کن را در حساب مردم دانا مگیر

لیلےٰ نے زلیخا سے کہا کہ تم محبت کیا جانو۔ تم تو جمالِ یوسف پر فریفتہ تھیں۔ اچھی صورت کی گاہک تھیں اس لئے حضرتِ یوسف کو تمہارا خیال نہ ہوا۔ ؎

دونوں رُخ لاگیں اگر ہوتیں تو کیوں کرتا بھلا

دامنِ یوسف سے یوں دستِ زلیخا کو تہی

یہ بھی کوئی عقلمندی تھی کہ جو آفت صد دودمان ہو اُسے ہم اپنا آفت جان سمجھ لیں۔ اسی طرح شیریں کی محبت نے نازک خیالی کا خون کر دیا۔ خسرو کے سامنے فرہاد سے مزدور پیشہ آدمی پر مری۔ اس بحث میں فیضی کی بن آئی کیا کہتے ہیں ؎

آں غمزدہ کز جنوں سجل بست | وز دشت عرب بریگ دل بست
واں ہم کہ نگار ارمنی جست | واں نیز کہ بے ستوں کنی جست

ہر یک بدرونہ سوز خس داشت

تابے ز شرارۂ ہوس داشت

عشق ہے اور ہندوستان کا جہاں کی خاک محبت افزا، جس کا تنکا تنکا کہربا ہے۔ کوئی پھول سورج کو دیکھ کر کھلتا ہے اور کوئی چاند کو دیکھ کر جیتا ہے۔

مرغانِ صحرائی میں وفا کا یہ خیال ہے کہ اگر ایک صید اجل ہو گیا ہو تو دوسرے کو جینا محال ہے۔ پپیہا آب نیساں کی محبت میں آب حیواں کی طرف

نگاہ نہیں کرتا اور پتنگا جس خوشی سے شمع پر نثار ہو جاتا ہے آج تک کسی سے بن نہ پڑا ؎

این شعلہ بہند گرم خیز است
اینجاست کہ آفتاب تیز است
این رشتہ بہ سحر ہند رستند
ویں سبزہ بخاکِ ہند گشتند
ہند است ہزار عالم عشق
ہند است و جہاں جہاں غم عشق
بے نقش وفا خط جبیں نیست
بے رنگ جگر گلِ زمیں نیست

عرب کی ریگِ رواں اور سموم بیاباں ابر بہار ہندوستاں کو کیا سبق عشق پڑھائیں گے۔ جہاں خط و خال کا دکھانا عیب ہو، وہاں خوبصورتی کیا منہ دکھائے گی۔ تمام دنیا میں مرد کی طرف سے اظہار عشق سنا ہے۔ یہ بات ہندوستان میں ہے کہ عورت کی طرف سے محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک تو شکل اچھی اس پر محبت بھی اسی طرف سے۔ اس عشق کا کیا کہنا ؎

بیٹھے بیٹھے دلِ پُرسوز یہ آہیں کیسی
چپکے چپکے دلِ بیتاب یہ رونا کیسا

عورت کی طرف سے اظہار محبت میں زیادہ لطف اس لئے آتا ہے کہ جیسی صورت ویسا ہی دل۔ دونوں نرم اور بمقابلہ مرد، عورت کو یارائے ضبط زیادہ سنا ہے لیکن جوش اُسے کہنا چاہیے کہ اس ضبط پر بھی بے تابی رہی ہے۔

دل را بہ بزم نالہ خروشاں چہ میبری
ایں شعلہ را بہ سیر شبستاں چہ میبری

بہ حسنِ خویش مغروری کہ در آئینہ ساں بینی
چہ خواہی کرد اگر خود را بچشم بیدلاں بینی

اس پر، دمن نے پدم سے کہا کہ اب لطف کی باتیں ہو رہی ہیں۔ تمام دنیا کے عشق میں شائبہ ہوس نکلے گا یہاں شکل سے واقف نہیں اور وفا کا بیڑا اٹھا چکے ؎

دلبرے دارم کہ نامش را ندانم ہنوز
بیدماغی از دلِ من یاد می باید گرفت

اور اگر جدائی ہو گئی تو بھی عشق و محبت کا ساتھ نہیں چھوڑتے ؎

عشق باروئے خراشیدہ و پیراہن چاک
دست بر سینہ زناں از پئے تابوت من است

لیکن یہ عشق افسانوں کا ہے مدت ہوئی کہ یہ قصّے تقویم پارینہ ہو گئے۔ زلیخا کو جامی سے بزرگ مل گئے اور شیریں کو نظامی۔ لیلیٰ کی ہوا باندھنے والے اتفاق سے اتنے نکل آئے جن کے نام بھی یاد نہیں۔ اگر خوبصورتی و جوانی کے خیال سے عشق ہوتا تو بھی ایک بات تھی۔ لیلیٰ خوبصورت نہ تھی اور زلیخا کی عمر ڈھل چکی تھی۔ شیریں کی پاکیزہ مزاجی دیکھئے کہ خسرو کو چھوڑ کر لوہار پر مری۔

اس میں غالب کا قول زیادہ تر صحیح معلوم ہوتا ہے یعنی ؎

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

عاشقوں کی آشفتہ مزاجی اور معشوقوں کی نازک دلی کو ان باتوں کی

تاب کہاں۔ ایک تو عشق میں ناکامی کا سامنا اس پر یہ طعنہ کہ عشق و جنون میں فرق نہیں۔

کانرا کہ شکستہ باشد اقدام
حالش چہ بود گر افتد از بام

افسوس ہے کہ اس جھگڑے میں حدیث عشق ناتمام رہ گئی۔ اور مجلس برخاست ہو گئی ۔

بخت بد بنگر کہ دوش از بیخودی در بزم وصل
صد سخن گفتیم و آخر مدّعا ناگفتہ ماند

(زمانہ)

حکایتِ درویشے تارک الدنیا

از روئے لطفِ سخن

(درویش کی زندگی)

کہتے ہیں کہ کسی شہر میں ایک بڑا عابد درویش تھا۔ جس کو دنیا ترک کئے ہوئے چالیس برس ہو گئے تھے۔ چالیس برس سے صحرانشینی اختیار کرلی تھی۔ یکّہ وتنہا ویرانے میں ایک غار کے اندر رہتا تھا اور ہمیشہ دن میں پانچ دفعہ (نماز صبح وچاشت واشراق وظہر وعصر) اور رات کو تین دفعہ (نماز مغرب عشا وتہجّد کے بعد) دنیا ومافیہا پر لعنت کرتا تھا۔ اُس کے سجدوں سے جو چالیس برس تک کرتا رہا پتھر میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ چالیس برس سے انسان کی شکل نہیں دیکھی بات تو درکنار تھی۔ ایک دفعہ شروع میں جب گوشہ نشینی اختیار کی تو آغاز جوانی میں جس عورت سے اُسے محبت تھی وہ بیچاری محبت کی ماری کھانا لائی۔ اس پر درویش کو اتنا غصّہ آیا کہ غار کے دروازے پر روٹیاں پھینک دیں۔ (جس کی نسبت بیان کرتے ہیں کہ کرامت سے پتھر ہوگئیں) اور اس گناہ

کے کفارے میں کہ عورت کی شکل کیوں دیکھی مدّت تک غار سے نکلنا چھوڑ دیا ؎

کثرتِ طاعات عابد دیکھ کر | تھے تعجب میں فرشتے چرخ پر
دھوم تھی طاعت کی اُسکی تافلک | عالمِ علوی پہ حیراں تھے ملک

حال یہ تھا کہ کھانا کم اور سونا اتنا بھی نہیں۔ دن کو روزہ اور رات کو جاگنے کے سوا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ دُھن تھی تو اس بات کی کہ عاقبت نہ بگڑے۔ اپنے خیال کے موافق طاعت میں کسی طرح کی کمی نہ رہے۔ درگاہ ایزدی میں ہر وقت حضوری کا دعویٰ تھا۔ اور بہشت کے مستحق ہونے میں کوئی شبہ نہ رہا تھا ؎

نفس پر اپنے کیا تھا اُس نے جبر | تھا وہ قانع حکمرانِ ملکِ صبر
دھوپ میں رہتا تھا دن بھر تا بہ شام | بھیگتا تھا اوس میں شب کو مدام
مینہ برستا تھا تو کچھ پروا نہ تھی | آندھی آتی تھی تو کچھ ایذا نہ تھی
نام کا طالب نہ مال و جاہ کا | حال تھا اُس کا فنا فی اللہ کا

شہر کے لوگ جیسا کہ اکثر بندگانِ خدا کا حال ہے دُنیا دار تھے۔ دنیا کے مشغلوں میں لگے رہتے تھے۔ اُن سے درویش کو کمال نفرت تھی۔ شہر والوں میں سے کسی کو اپنے پاس نہ آنے دیتا تھا اور از راہِ ملامت کہا کرتا تھا کہ عاقبت سے غافل ہو رہے ہیں۔ دیکھئے اُن کا کیا حال ہوتا ہے۔؟ خدا سے کہتا تھا کہ میری طرح ان کو بھی توفیق دے کہ دنیا کو چھوڑ بیٹھیں ؎

دمبدم کہتا تھا کھا کر پیچ و تاب | اے شیاطیں دور ہو مجھ سے شتاب
دفع ہو گم ہو لعینان و غل | مت کرو اوقات میں میرے خلل

یہ تو درویش کی زندگی کا حال عرض کیا گیا اب خاتمے کا حال سُنئے جو اُس کے دعوے اور دُعا کا جواب ہے اور واقعی سننے کے لائق ہے۔

(حصہ دوم)

مرگِ درویش

ادھر تو درویش کو خدا کی یاد میں مدت گزر گئی۔ اُدھر شہر والے اپنی زندگی شادو ناشاد جس طرح دنیادار بسر کرتے ہیں بسر کرتے رہے۔ درویش کو طاعتِ الٰہی سے اور شہر والوں کو اپنی شادی و غمی کے جھگڑوں سے فرصت نہ ہوئی۔

ایک دن اتفاق سے ایک ضعیفہ اس ویرانے میں نظر آئی جہاں درویش رہتا تھا۔ درویش سمجھا کہ شیطان نے جس کا ذکر کتابوں میں اکثر آتا ہے میرے بہکانے کے لئے یہ شکل اختیار کی ہے۔ دل میں کہنے لگا ؎

ذکر جاری ہے زباں پر ہر نفس　　مجھ پہ شیطاں کو نہیں ہے دسترس

ہے زیادہ عقل و دانائی مجھے　　اب نہیں ہے خوفِ گمراہی مجھے

ضعیفہ بولی کہ "شاہ صاحب!" جواب ملا کہ "میں دنیا کو ترک کر چکا ہوں" ضعیفہ نے عرض کیا کہ "بجا ہے۔ لیکن یہ دنیا کا کام نہیں۔ خدا کا کام ہے۔ اس میں ایک خدا کے بندے کا بھلا ہوتا ہے۔" شاہ صاحب نے فرمایا کہ "جس طرح میں دنیا سے بھاگا تو بھی بھاگ" بڑھیا نہایت عاجزی سے بولی کہ "آپ کا فرمانا درست لیکن اس وقت مجھ پر رحم واجب ہے۔" ؎

" پہلے تم میری داستاں سن لو
عرضِ حالِ ستم کشاں سُن لو"

"میں غریب بیوہ ہوں۔ بیوہ ہوئے مجھے عرصہ ہوا۔ میرا ایک لڑکا ہے جو بری صحبت میں بگڑا جاتا ہے۔ تمام عزیز و یگانہ سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے کچھ اثر نہیں ہوتا۔

سب نے صلاح دی کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کروں آپ کے قدموں کی برکت سے راہِ راست پر آجائے۔"

درویش نے خفا ہو کر کہا "یادِ الٰہی سے مجھے اتنی فرصت کہاں کہ تیرے ساتھ چلوں۔ مجھے شہر اور شہر والوں کو چھوڑے ایک عمر ہو گئی۔ کیا تو یہ چاہتی ہے کہ دنیا اور دنیا کے لوگوں کی شکل دیکھوں؟ جن سے خدا اور رسولؐ خوش نہیں۔"

ضعیفہ نے پھر عرض کیا کہ "تکلیف میں تو شک نہیں۔ لیکن اسی دنیا کے لوگوں کے لئے خدا نے نبی بھیجے۔ شفاعت کے وعدے کئے۔ ہمیں آپ ہی کا سہارا ہے۔"

یہ سُن کر درویش کو کچھ ترس آیا۔ اور اُٹھ کر بڑی بی کے ساتھ ہو لیا۔

اس وقت ہم دیکھ لیں کہ اس درویشِ ژولیدہ مُو کی کیا صورت ہے؟ جٹاؤں سے بڑے سَر کے بال ہیں۔ ایک کملی گلے میں ہے۔۔ رات دن کی ریاضت سے ہاتھ پاؤں سُوکھ گئے۔ پسلیاں دکھائی دیتی ہیں۔ تمام بدن مضمحل ہو رہا ہے۔ سارا جسم کاہیدہ اور ہاتھ پاؤں کا رنگ زرد مثلِ برگِ خزاں دیدہ ہے۔

شہر کی صورت دیکھے اِسے اتنا عرصہ ہو گیا تھا کہ نہ اس نے شہر کو پہچانا اور نہ شہر والوں نے اسے۔ تماشے کے خیال سے دو چار بے فکرے اس کے ساتھ ہو لئے، کوئی ہنستا تھا تو کوئی کچھ کہتا جاتا تھا۔ شاہ صاحب بھی اپنی دُھن میں بڑبڑاتے جاتے تھے کہ "ان لوگوں پر افسوس" بڑھیا سے پوچھا کہ "تیرا لڑکا کہاں ہے؟" کسی نے جواب دیا کہ ابھی "فلانے باغ میں جہاں رقص و سرود کا سامان ہو رہا ہے لڑکے کو شاہدانِ بازاری کے ساتھ دیکھا تھا۔"

باغ کے دروازے پر گو روک ٹوک تھی لیکن شاہ صاحب سے بزرگ کو کون روک سکتا تھا۔؟ شاہ صاحب سیدھے باغ میں چلے گئے۔ دیکھا کہ باغ کسی امیر کا ہے جہاں بہت سا سامان عیش مہیّا ہے۔ شہر کے مشہور اربابِ نشاط جمع ہیں۔

ناچ گانا ہو رہا ہے۔ دور ساغر چل رہا ہے۔ بہت سے نوجوان مرد اور عورتیں ہیں جن میں وہ لڑکا بھی بیٹھا ہے۔ اس مجمع کو دیکھ کر درویش نے آواز دی کہ "اے کمبختو! کیوں عاقبت خراب کر رہے ہو۔ اپنے اعمال سے توبہ کرو۔"

لڑکے نے جو یہ آواز سُنی اور اپنی ماں کو شاہ صاحب کے ساتھ دیکھا تو کچھ شرم اور کچھ خوف کے مارے وہاں سے بھاگا۔ شاہ جی نے پکار کر کہا کہ "جتنا تجھ سے بھاگا جائے بھاگ"۔

لڑکے کے اٹھ جانے پر صاحبِ محفل نے اُس زہرہ خصال سے جس کا ناچ تھا کہا کہ ایک آدمی کھویا گیا اُس نے جواب دیا کہ "ایک آدمی بڑھ بھی تو گیا۔ کہو تو میں شاہ جی کو رکھ لوں"۔ لوگوں نے کہا کہ "کمبخت کیا کہتی ہے؟ کہاں یہ بزرگ اور کہاں یہ صحبت"؟ کسی نے ہنسی میں کہا "بھلا دیکھیں تو سہی" اس پر اُس لُعبتِ ناز نے جواب دیا کہ "اچھا یہ تماشا بھی دیکھو ع

مری ان کی بھری محفل میں ہو گی"۔

اب میں آپ کو دکھایا چاہتا ہوں کہ اس پرکالۂ آفت نے کس طرح اپنا دعویٰ پورا کیا ؎

دکھاؤں گا تجھے زاہد اُس آفتِ دیں کو
خلل دماغ میں تیرے ہے پارسائی کا

جب شاہ صاحب اہل محفل کی طرف مخاطب ہو کر کہہ رہے تھے کہ "خدا سے ڈرو اور اپنے اعمال سے توبہ کرو"۔ اتنے میں اُس دشمنِ دیں نے ایک ادائے خاص سے بڑے میاں کے پاؤں پکڑ لئے اور کہا ؎

پریزادوں کے کوچے میں ہوئے ہیں گرد آلودہ
ہمارے پاؤں کو دھوئیں گی حوریں آبِ کوثر سے

"لوگو دیکھو! انھی قدموں کی برکت سے آسمان و زمین قائم ہے"۔ بڑے میاں اپنے پاؤں پر کھینچ کر کہنے لگے کہ "میں صرف تمہارے سمجھانے کے لئے یہ تکلیف گوارا کر کے آیا ہوں" اس آفتِ روزگار نے کہا۔ "ذرا بیٹھ تو جائیے اور بیٹھ کر تسلّی سے سمجھائیے فرمائیے تو سہی ؎

شاہ صاحب کہاں سے آنا ہوا
کتنا اس جوگ کو زمانہ ہوا"

یہ کہہ کر کوچ پر بٹھالیا اور ساتھ بیٹھ کر لوگوں سے کہنے لگی کہ "اب میری ان کی باتیں سنو۔ شاہ صاحب۔ آپ کی کیا عمر ہوگی؟" جواب ملا "کچھ اوپر سو برس کی"۔ "اب بہت دیر نہیں کہ آپ کی محنت ٹھکانے لگے"۔ گھڑی بھر بھی نہیں ہوئی کہ بڑے میاں کو عورت کیا عورت کے نام سے غصہ آتا تھا۔ اب اس غنچہ دہن کے سامنے سوچ میں۔ بیٹھے ہیں ؎

سُن آئے خوش الحانیاں کس غنچہ دہن کی
رٹی ہے جو بھولی ہوئی مرغانِ چمن کی

اس وقت شاہ صاحب کو کبھی بارگاہِ الٰہی نظر آتی ہے کہ لمبا چوڑا عرش نامی ایک تخت ہے جس کی بلندی آسمان سے آگے نکل گئی ہے جہاں انسان کے وہم و گمان کی رسائی نہیں۔ صرف اس قدر خیال آتا ہے کہ بہت سی بے کام و زبان شکلیں جنھیں فرشتہ سمجھئے جمع ہیں۔ یہ نقشہ جلد ہٹ جاتا ہے اور اپنا پرانا غار جس میں ساری عمر اکیلے کٹی نگاہ میں پھرنے لگتا ہے۔ اس سے بھی اب طبیعت خوش نہیں ہوئی۔ اس کو بھی بچوں کے گھروندوں کی طرح مٹا دیتے ہیں۔ کیفیت آ رہی تھی تو اس بات کی کہ ایک شیریں دہن پاس ہے اور بلا کا جان فزا سامان نظروں کے سامنے ہے۔ ؎

دل سے کہتا تھا وہ اسیرِ ستم ہاں کہیں آج آئے دل پُرغم
نکہتِ زُلفِ یار آتی ہے بُوئے شاخِ نگار آتی ہے

اس پر عطر کی تیز خوشبو اور پھولوں کی بھینی بھینی مہک۔ وہ آوازِ غناوہ باغ سے بُوئے گل و نسرین کی لپک، یہ سب مل کر درویش کے دماغ میں افسوں کا کام کر رہی تھیں سامنے وہ غضب کی شکلیں جمع تھیں جن کی ؎

انکھڑیوں پر نشہ ہے چھایا ہوا منہ پہ جوبن ڈیل گدرایا ہوا
رختِ نازک سے عیاں اندام سب جس طرح شیشے میں ہو بنت العنب
گورے گورے چھوٹے چھوٹے دست و پا اُن میں وہ ظالم غضب رنگِ حنا
مسکراہٹ لب پہ آنکھیں لال لال بے تکلف منہ پہ چھوٹے سر کے بال

ایسی کیفیت میں اُس غیرتِ ماہ نے پوچھا کہ جناب کو یادِ الٰہی میں کتنا زمانہ گزرا، اس کا اجر کیا ملے گا؟ درویش نے ازروئے عادت (جی سے نہیں) جواب دیا کہ "خدا مجھ کو بہشت میں لے جائے گا جبکہ تم لوگ دوزخ میں جل رہے ہوگے"۔ ؎

اللہ رے میری حُسن پرستی کی گرمیاں
دوزخ میں حوریں آئیں ملاقات کیلئے

دوزخ کے نام سے وہ رشکِ حُور ذرا چیں بجبیں ہوئی مگر اخفائے ملال کر کے پُوچھا کہ "بہشت کا حال تو فرمایئے۔ کہاں ہے اور آپ کے غار سے کتنی دُور ہے"؟ ؎

اس قدر گلشنِ جنت کی تمنا کیوں واعظ
کوچۂ یار کو اے مشفقِ من بھول گئے

شاہ جی نے کہا کمبخت! توبہ کر — مجھے یہاں سے جانے دے" یہ کہہ کر اُٹھنے

کا ارادہ کیا مگر اُس بُتِ خوش خُو نے ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا اور کندھے سے اس طرح لگ گئی کہ بالوں کی خوشبو بڑے میاں کے دماغ میں چڑھ گئی اور منت سے یوں کہا کہ آپ مدّت سے غار میں تشریف رکھتے ہیں دو چار گھڑی یہاں ٹھہریے گا تو ایک عمر کی ریاضت کے سامنے خدائے ازل چند لمحوں کا حساب نہ لے گا۔ مجھے یہ جوشِ رشک مارے ڈالتا ہے کہ آپ کا ارادہ اکیلے بہشت میں جانے کا ہے۔ میں بھی ساتھ ہوئی تو بہشت کا لطف کم نہ ہوجائے گا۔ بتایئے تو سہی بہشت میں کیا کیا ہے۔"

درویش نے کہا "بہشت میں عجب سامانِ عیش ہے۔ کسی طرح کے اسباب طرب کی کمی نہیں۔ نغمہ و سرود سننے کو، حوریں خدمت کو۔"

اس پر وہ بُتِ پر فن بولی کہ "یہاں بہشت سے کیا کم سامان ہے؟ رقص و سرود ہو رہا ہے، دور شراب چل رہا ہے۔ حوریں جن پر آپ کو اتنا غرّہ ہے مجھ سے اچھی ہو چکیں ؎

آرزو رکھتی ہیں یہاں حوریں
کہ یہ پوچھیں کسی طرح سے ہمیں

ذرا میری طرف تو دیکھئے۔" بڑے میاں نے آنکھیں پھیر لیں اس حور وش نے ہمجولیوں سے اشارہ کیا کہ گانا چھیڑو۔ اشارے کی دیر تھی کہ وہ لُعبتانِ ناز اس ڈھنگ سے سجی ہوئی آئیں کہ انسان کیا فرشتے کا دل بھی قابو میں نہ رہے۔ وہ دوپٹے کی گاتیں۔ وہ پھنسی کُرتیاں جو بدن کو چھپانے سے زیادہ دکھائیں اور دکھانے سے زیادہ سجھائیں اس پر غضب کا گانا اور ناچنا گویا قیامت کا سامنا ہے ؎

تم بازنی تھی گھنگروں کی صدا — ہر قدم پر نیا تھا حشر بپا
نہ دبالا ہوئی وہ ساری زمیں — ہوش باقی نہ تھا کسی کو کہیں

جی اُٹھے مردہ ہائے صد سالہ مست بچّے سے تا نوَد سالہ

گلنے والیوں میں سے کسی نے یہ گانا شروع کیا ؂

دیکھو کیا چاندنی پہ جوبن ہے جانفزا کیا ہوائے گلشن ہے
گلِ انجم غضب چمکتے ہیں تختے پھولوں کے کیا جھکتے ہیں
آج کیا لطفِ ہمنشینی ہے روشنی کیسی بھینی بھینی ہے

اور گاتے گاتے درویش کے گلے میں شمع کافوری سی باہیں ڈال دیں۔ اس وقت اس کمبخت (درویش) کی زبان سے آہستہ سے یہ نکلا کہ "مجھے جانے دو" مگر جنبش نہ کی صرف مُنہ سے کہہ کر رہ گیا۔ پھر وہی پہلی پرکالۂ آفت بولی کہ "ان کے خرامِ ناز سے محشر تو بپا ہو گیا۔ اب بہشت بھی دیکھ لو۔ دیکھو وہ شیشہ و ساغر ابتک اچھوتے رکھے ہیں"۔ یہ کہہ کر ایک ساغر بھر لائی۔ پارسائی کے دماغ میں جو برسوں کی ریاضت سے خشک ہو رہا تھا یہ طاقت کہاں کہ بُوئے مے کی برداشت کر سکے کہنے لگا کہ "بہشت میں شراب ضرور ہے لیکن ؂

میں نہیں واقف رہِ مے خانہ سے
اجنبی ہوں لغزشِ مستانہ سے

اتنا کہنا تھا کہ اس غارت گرِ ہوش نے ساغر منہ سے لگا دیا اور سمجھایا ع

ایں خطائیست کہ در روزِ جزا نیز کنند

کثرتِ عبادت سے درویش کا لہو سُوکھ چکا تھا بُوئے مے جو دماغ میں چڑھی دفعتہً آنکھیں لال ہو گئیں۔ چہرے کا رنگ جو خون کی کمی سے زعفرانی ہو رہا تھا ارغوانی ہو گیا۔ پارسائی رخصت ہوئی ؂

عقل نے دیکھا تو چھپ کر ہٹ گئی زاہد و ساقی میں میزان پٹ گئی
دخترِ رز نے ستم برپا کیا زاہد و ساقی میں گٹھناپا کیا

درویش بے اختیار پکارنے لگا "میں بندۂ عشق ہوں" وہ دشمنِ دیں بولی "وجودِ عشق مجھ سے ہے! دیکھ تجھے جیتے جی بہشت میں پہنچا دیا اور اب کیا چاہتا ہے" درویش کھڑا ہو کر چیخنے لگا ؎

برائے پرستیدن آں صنم | بملکِ وجود آمدم از عدم
وگرنہ مرا میلِ ہستی نبود | سر و برگِ یزداں پرستی نبود

حوروں کے عوض مجھے الٰہی | دنیا میں تو ایک نازنیں دے
کب مجھ کو بہشت کی ہے خواہش | دینا ہے جو کچھ تو لا یہیں دے

پھر تو ساغر پر ساغر چلنے لگا۔ درویش بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا جس کے صدمے سے سر پھٹ گیا اور دم نکل گیا۔ درویش کی نعش دیکھ کر اہلِ محفل میں تہلکا پڑ گیا۔ کوئی کسی طرف سے نکل گیا اور کوئی کسی طرف سے تمام مجلس خالی ہو گئی۔ میں نے سنا آپس میں لوگ کہتے جاتے تھے کہ ایک عمر کی ریاضت بری طرح برباد ہوئی۔ ان میں سے کسی نے کیا اچھی بات کہی کہ تازہ واردانِ بساط ہوا اور کہنہ زاہدانِ تارک الدنیا دونوں کے لئے یہ عبرت کا مقام ہے۔ ؎

بہ توبہ داد تم اے شیخ اضطراب مکن
مرا برائے رضائے خدا عذاب مکن

(" زمانہ ")

افسانۂ ایّام

امرائے ہند میں قدیم سے دستور ہے کہ سونے سے پہلے افسانہ خوانی ہوتی ہے۔ جب مجلس اُٹھ گئی تو قصہ خوانی شروع ہوئی۔ افسانے بیان ہونے لگے زمانے کے قصے چھڑے۔ ہر شخص اپنا حال کہنے لگا۔ جو جس پر گزری سنانے لگا ؎

ہر یک بفسانۂ سخن بیز

ایں نکتہ فشان و آں گہر ریز

یہاں تک کہ اگلا زمانہ نظر میں پھر گیا۔ جو باتیں فسانہ ہو گئیں پھر سُن لیں، جو خیال کہ خواب ہو گئے پھر دیکھ لئے۔ جو جس کے جی میں آیا کہنے لگا، جس نے جو حال دیکھا یا سُنا، بیان کرنے لگا ؎

ہر کس بزبانِ حال و دانہ

میگفت فسانہ در فسانہ

اور افسانوں کے سوا مقامات حریری اور مقاماتِ حمیدی کا ڈھنگ بھی اس سے کچھ ملتا جلتا ہے کہ جو مقام شروع کیا ہے "حکایت کرد مرا دوستے" سے آغاز کیا ہے۔ ہم بھی اپنے مضامین کا یہی ڈھنگ رکھا چاہتے ہیں کہ ؎

کردند بصد فسانہ گوئی

در دفع ملال چارہ جوئی

افسانہ کزاں خرد بہ سازاست

دیباچۂ پندولوح رازاست

ایک دن ذکر تھا کہ دنیا میں آرام نہیں۔ کوئی کہتا تھا عیش میں البتہ آرام ہے کسی کا گمان تھا کہ فقیری میں آسایش ہو تو ہو۔ غرض ؎

ہر کس بخیالِ این و آں گفت

صاحب نظرے ازمیان آں گفت

ع این نسخہ از بیاضِ مسیحا نوشتہ ایم

دنیا میں سب سے اچھی تدبیر آرام سے زندگی بسر کرنے کی یہ ہے کہ کارخانۂ عالم کو دور سے بیٹھا دیکھا کرے اور جس طرح جو دن گزریں بسر کردے ایک دن کا ذکر ہے کہ میں دو چار دوست آشناؤں کے ساتھ بازار میں جاتا تھا۔ ایک اندھا فقیر خدا کی راہ پر مانگ رہا تھا ہم میں سے کسی نے کچھ خیال نہ کیا نہ اس وجہ سے کہ سنا نہیں بلکہ باوجود اس کے کہ کوئی ہم میں سے محتاج نہ تھا کسی نے اس وقت اسے کچھ نہ دیا۔ فقیر بدستور ہاتھ پھیلائے مانگتا رہا۔ ابھی ہم دور نہ گئے تھے کہ ایک دوسرے فقیر نے جس کی ایک ٹانگ نہ تھی اور مبتلائے جذام تھا اِس اندھے کے ہاتھ میں آنکھ بچا کر کچھ رکھ دیا۔ اندھا دُعائیں دینے لگا لنگڑا فقیر جلدی اُس جگہ سے بڑھنے لگا کہ میں اس کے پاس جا پہنچا تاکہ دیکھوں کہ یہ شخص جس نے ہمیں اتنے آدمیوں کو اپنی سخاوت سے ذلیل کیا کون ہے؟ میرے اور ساتھی اس وقت پیچھے رہ گئے۔ لنگڑا دوسری جگہ بیٹھ کر مانگنے لگا۔ میں اس کی ہمت کا غلام تو ہو ہی

چکا تھا۔ پہلے اُس کے ہاتھ میں کچھ دیا اور پوچھا کہ تم اس اندھے کو جانتے ہو؟

جواب ملا "بابا میں مسافر ہوں اور یہ اندھا یہاں کا رہنے والا معلوم ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ تم نے اُسے کچھ نہیں دیا اور شام ہو گئی ہے۔ اُس کی لڑکی جو اپاہج تھی اُسے لینے آئی۔ خیال ہوا کہ یہ دونوں بھوکے گھر کو چلے جائیں گے اور یونہی سو رہیں گے۔ میرے پاس جتنے پیسے تھے جو دے آیا کہ اندھے کی ضرورت مجھے زیادہ دکھائی دی۔ مجھے مصیبت کی عادت پڑ گئی ہے میں نے سمجھ لیا کہ یہ بھی کٹ جائے گی۔ خدا تمہیں زندہ رکھے۔ میری ضرورت بھی خدا نے رفع کر دی۔" یہ کہہ کر لنگڑا چلنے لگا میں نے کہا کہ آج تم میرے ساتھ چلو اور مضائقہ نہ ہو تو اپنا حال سناؤ۔ فقیر نے کہا کہ میرا حال جب چاہو سُن لو۔ اور راستے ہی میں کہنا شروع کیا کہ "میں دُور دُور ہو آیا ہوں اور یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ خدا نے اوروں سے زیادہ مصیبتیں مجھے دیں بلکہ خدا کا شکر ہے کہ سوائے اس ٹانگ ٹوٹنے اور اس مرضِ جزام کے اور کوئی شکایت بھی نہیں۔ دنیا میں بہتیرے ایسے ہیں جن کے آنکھ ناک کان بھی نہ ہوں گے مجھے خبر نہیں کہ میرا وطن کہاں ہے؟ شروع میں کچھ پڑھا بھی تھا لیکن جوانی میں محنت کرنے کو جی نہ چاہا۔ جس شہر میں جاتا چوروں اچکوں بدمعاشوں کے ساتھ رہتا کہ سب سے آرام اور بے فکری کی صحبت انھی کی ہے دو چار دفعہ پکڑا گیا، خراب ہوا، پھر چھوٹ گیا اس میں خدا نے دولت بھی بہت دی جو اکثر اُس کی راہ میں لٹائی گئی اچھے وقت میں بہت دوست آشنا ہو گئے۔ لیکن جب بُرا وقت ہوا دوست دشمن سب چھوڑ بیٹھے، دوست اچھے کے ساتھی تھے اور دشمنوں کو میری بدحالی سے کچھ غرض نہ تھی۔ بہر حال جب بُرا حال ہوا ارادہ ہوا کہ کچھ کھا کر مر رہیے۔ ایک دن یہی قصد کر کے بیٹھا تھا کہ اتنے میں آنکھ لگ گئی، دیکھتا کیا ہوں کہ کوئی پکار کر کہہ

رہا ہے کہ کیا تجھے اپنی کمائی کا جو خدا کی راہ میں دی افسوس ہے میں نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ آواز آئی کہ پھر اوروں کو اسی طرح تجھے دینے سے کیوں محروم رکھتا ہے۔ اُسی وقت سے میں نے گدائی شروع کر دی" یہاں تک کہہ کر وہ فقیر میری نظروں سے غائب ہو گیا۔ زبانِ حال سے چلتے چلتے یہ کہہ گیا۔

کیا بادِ بہاری سے ہرے داغِ جنوں ہوں
یہ پھول کھلیں گے کسی جنگل کی ہوا میں
کیوں دور ہوا اے چارہ گر آزار ہمارا
کچھ روحِ مسیحا تو نہیں تیری دوا میں

(افسانۂ ایام۔ اگست ۱۸۹۸ء)

نثر کے رسالوں کا ریویو

ریویو لکھنے میں سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ بُری بھلی ہر تصنیف پڑھنی پڑتی ہے جی چاہے یا نہ چاہے، سِرے سے اخیر تک سارا کلام دیکھنا ہوتا ہے یہ تکلیف ریویو لکھنے والے کو اٹھانی پڑتی ہے۔ اخبار دیکھنے والوں کو مگر اس سے بڑا فائدہ ہے کہ ریویو کے سبب کتاب کی بھلائیوں برائیوں سے واقف ہو کر اُسی طرح کتاب سے پیش آتے ہیں یہ نہیں کہ بغیر جانے دھوکے میں پڑیں اور خواہ مخواہ کتاب سند ہو یا نہ ہو ہماری طرح ساری کتاب پڑھیں۔ آج کے ریویو میں پہلے ہمیں

"دلچسپ"

دیکھنا ہے۔ یہ افسانہ، ناول کے طرز پر منشی عبدالحلیم صاحب شرؔ نے لکھا ہے اس کا پہلا حصّہ یعنی "فرخ و مہدی" ہمارے پاس پہنچا۔ "دلچسپ" سے پہلی الجھن یہ ہوئی کہ معلوم نہیں اس کا کونسا حصّہ دلچسپ ہے، یا سب حصوں کا نام دلچسپ رکھا گیا۔ ولایت میں اکثر ناول کے افسانے تین جلدوں میں ہوتے ہیں

مگر ہر جلد کا نام علیحدہ نہیں ہوتا۔ میں نے دیکھا کہ "فرخ و مہدی" جس حصے کا نام ہے یہ بھی ناتمام ہے۔ ان دونوں بیچاروں کا ذکر ایسی جگہ چھوڑا ہے جیسے کوئی کسی کو عین جنگل میں چھوڑ دے جہاں راستے کا کچھ پتا نہ ہو نہ کوئی اور سامان منزل پر پہنچنے کا ہو۔ اچھا ہوتا کہ اس حصے میں جس کا نام "فرخ و مہدی" ہے ان دونوں کو منزل تک پہنچایا ہوتا یا جس قدر اور حصے اس کے کرنے ہوں ان سب کا نام "فرخ و مہدی" رکھا جائے۔ بہرحال پہلی اللہ نام ہی سے اُلجھن سمجھئے۔ یہ تو ٹائٹل پیج ہوا۔

"عرضِ مصنف" ہم بڑے شوق سے سنتے اگر سیدھے روزمرّہ میں مطلب ادا کیا جاتا۔ یہ نہ ہوتا کہ گویا اُردو میں انگریزی بول رہے ہیں" اس قدر ٹھیک ہے کہ "غالباً جو قلم رائے زنی کے لئے اٹھیں گے وہ میری استدعا کے موافق بہت تیز نہ ہوں گے یعنی اِسٹیل پن (آہنی قلم) نہ ہوں گے"۔ (اتفاق سے میں یہ ریویو اسی قلم سے لکھ رہا ہوں)

آخر میں جو معذرت روکنے کی نسبت ہوئی ہے وہ بھی درست ہے کہ قصّہ گوئی میں اپنا جھگڑا کیا۔ اب رہا قصّہ، اس کی پلاٹ تو ماہ رویانِ آشفتہ مزاج کی جالی کی کرتیوں سے بھی زیادہ باریک ہے جس میں سے سارا بدن نظر آئے۔ پلاٹ ہمیشہ ایسی چاہیے کہ پڑھنے والے کا شوق اس طرح بڑھے کہ معلوم نہ ہو کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ اور مصنف کی خوبی یا کمال یہ ہے کہ ہر ناگہانی معرکے کے لئے ناظرین کو آمادہ رکھے اس طرح کہ بیگانگی نہ معلوم ہو۔ اس افسانے کے معرکوں میں مہدی کا جوتیوں سے پٹتے پٹتے بچنا یا ایک مُسٹنڈے کا تلوار لے کر کوٹھی میں آجانا یا عدالت میں مقدمہ دائر ہونا ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے دل میں کوئی عالی حوصلگی نہیں رہی' یہ زمانے کی خوبی ہے۔

انگریزی کے اکثر افسانوں میں ڈویل کے سبب رونق ہو جاتی ہے کہ ایک

عورت کے دو چاہنے والے تلوار سے فیصلہ کر لیتے ہیں۔ بر خلاف اس کے یہاں جُوتیوں سے کام لیا گیا ہے۔

بڑا مدار ناول کا انگریزی میں لَوْ (LOVE) یعنی عورتوں کی محبت ہے اور ان کے رسم ورواج کے موافق اس مشغلے کا اظہار بھی اس طرح ہوتا ہے جس سے افسانے کی رونق ہو جاتی ہے کہ عورت کی کمر میں ہاتھ ڈال دینا یا بوسہ لے لینا وغیرہ ایسے ہیبت ناک واقعات نہیں سمجھے جاتے۔ بر خلاف اس کے یہاں پردہ نشین عورتوں کے قصوں میں پاک نگاہ اور نامحرموں کا جھگڑا کچھ ہونے نہیں دیتا یا خُرافات پائی جاتی ہے یا فحش ہو جاتا ہے مگر انگریزی میں اس کا حُسن یہی ہے کہ ؎

فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ
بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیبِ داستاں کیلئے

اسی لئے ولایت کے اکثر شرفا ہر قسم کے افسانے اپنے گھروں میں نہیں آنے دیتے ہمارے یہاں انگریزی ڈھنگ پر لَوْ (LOVE) (جسے حضرت شرر کی خاطر سے ہم عشق ہی کہدیں) کا بیان بازاری عورتوں کے سوا ممکن نہیں اور یہ ذکر بدترین قصایص ہے۔ پھر بار بار "معشوقہ" کا لفظ جو کتاب کے آخر تک لکھا گیا کس قدر بھدا ہے۔ اس کی جگہ حسین ماہ رو، پری وش، ماہ پیکر وغیرہ کچھ کہدیا ہوتا۔

لیکن یہ تو سرسری باتیں ہوئیں، سرے سے چلئے۔

دہلی میں اس افسانے کا سین یعنی مقام اس قدر بے گانہ ہے جس قدر کہ شیرین و فرہاد کا امریکہ میں۔ یہ شاہزادوں کی بول چال نہیں نہ اُن کا روزمرّہ اہلِ پورب کو (جن میں ہمارے حضرت شرر ہیں) کبھی نصیب ہو سکتا ہے صفحہ ۹ میں جو جہدی اور فرخ کی پہلی ملاقات ہوئی ہے محض تماشا ہے۔ یا معمّا ہے کہ کس مہمل طور سے

جان پہچان ہوئی ہے۔ پھر یہ روزمرہ کہاں کا ہے کہ "اسباب مال گاڑی میں دے دیا تھا اس لئے بریک میں دینا مناسب نہیں معلوم ہوا" (ص ۱۰) اسباب کا گاڑی میں دینا اور بریک میں دینا شہر والوں کا روزمرہ نہیں پورب کے بنگالی بابوؤں کی بول چال ہے یا گلزار نسیم میں ایک غزل کا مصرع مجھے یاد ہے کہ ع مہتاب میں آفتاب دیدے۔ یہی غزل اُس ساری مثنوی کی ننگ ہے اسی صفحے (یعنی ۱۰) میں "اُس نے ایک ایرانی بی بی حاصل کرلی تھی"۔ بی بی نہ ہوئی یونیورسٹی کا ڈپلوما ہوا جسے حاصل کرنا پڑا۔ (باب سوم) بڑی فصاحت سے لکھا ہے کہ "اسی جگہ خاک میں مل گئی"۔ خاک میں مل جانے سے یہ ضرور نہیں کہ مرگئی، گو آپ نے اسی غرض سے لکھا ہے 'اجنبیت' کے ساتھ (صفحہ ۱۳ سطر ۵ اکالم راست) "اجنبیت" کی صحت آپ کے ذمے "ایک جاہل اور نہایت ہی بامذاق"۔ گویا جہالت کے لئے مذاق ضروری ہے۔ 'جاہل لیکن بامذاق' ہوتا تو بھی غنیمت تھا (وہی صفحہ قریب آخر کالم راست) (صفحہ ۱۶ اسطر ۹ اکالم راست) "گرمی کا کوٹ" درزیوں کی بول چال ہے جو گوروں سے بولنے میں کام آتی ہے اور نہ انگریزی ہے نہ اردو۔

"ماں کی بھیانک آواز" ماں کی آواز اور بھیانک!۔ چہ خوب!! (صفحہ ۱۴ سطر ۲۷ دوسرا کالم) صفحہ ۲ سطر کالم راست) میں "مذہبی غُسل" ہے حالانکہ غسل میت اور غسل صحت یا غسل جنابت تک سنا تھا۔ مذہبی غسل نیا محاورہ ہے صفحہ ۱۰ اسطر ۸ اور پھر جہاں کو جوان آیا۔ کو پچ مین بن کر آیا ہے۔

باب دہم میں گو دوپہر کا وقت ہے اور بہت سے غیر ضروری سامان اس وقت کے بیان ہوئے ہیں یہاں تک کہ میز کے پاس دو ٹوکریاں ردی ڈالنے کی بھی موجود ہیں مگر کہیں پنکھا ہے نہ پنکھا قُلی۔ معلوم نہیں کہ کس طرح انگریزی وضع کے موافق گرمی کا سامان پورا ہو گیا؟ اور نہیں تو خس کی ٹٹی ضرور چاہیے تھی

پھر ان کو ردی کی لوکریوں کی بھی کہیں ضرورت نہیں ہوئی جو حضرت شرر نے بڑی احتیاط سے ہمیں بتائی تھیں کہ دیکھ رکھو۔ دوسرے انگریزی تہذیب کے سامان میں بڑا نقص یہ رہ گیا کہ کتا، ڈنڈا، چرٹ وغیرہ خیال سے نکل گیا ورنہ انگریزی سوٹ کے لئے گرمی کا ہو یا جاڑے کا بغیر ان کے مفر نہیں۔

مہدی کا نام کونسی ایسی بیگانہ زبان کا لفظ تھا کہ کس مشکل سے صفحہ ۱۵ میں فرخ کو ماں کے سامنے یاد آیا، باوجودیکہ پہلے خود ہی فرخ کی زبانی ہے کہ "مہدی کی کیسی شہرت ہے" وغیرہ۔

"پچاس روپے ماہوار کی کوٹھی کرائے پر لی گئی اور روپیا وٹکٹ منی بیگ میں گلے میں لٹکائے خود پھرتے ہیں۔" کیا خوب روزمرہ ہے۔

محض مشتاق کی جگہ مشتاق حسین یا مشتاق علی وغیرہ بہتر تھا۔ سبب اُس سے پوچھو جو ذرا بھی ہمارے روزمرہ سے لگاؤ رکھتا ہو۔ اسی طرح فرخ مرزا یا مرزا فرخ اور مہدی کے عوض مہدی حسن وغیرہ بہتر تھا کہ غیر جب نام لیتے ہیں یوں بیہودگی سے نرا فرخ یا نرا مہدی نہیں کہتے۔

ایک "یونہی سی" کا خون حضرت شرر نے اس طرح کیا ہے جس طرح مومن نے عدو کا کہ کہیں نہ کہیں ضرور دھر گھسیٹا ہے ایک ہی جگہ (صفحہ ۱۴ میں) تین دفعہ ملاقات ہوئی اور ساری کتاب میں تو بے گنتی سمجھئے۔ صفحہ ۲۱۔ دوسرے کالم کی ۱۲ ویں سطر کہ فرخ "ٹانگیں سمیٹ کے اکڑوں بیٹھ کر" فرخ نہ ہوا بھان متی ہوا یا نٹ۔ فرخ کی زبانی اُسی صفحے میں ۴ سطر بعد ہے کہ "شام کے آنے کا وعدہ بھی لیتا آؤں گا۔" بالکل بنگالی بابو ہو گئے۔ صفحہ ۲۲۔ سطر ۲۶ کالم راست۔ "ایک خاندانی جوش "گویا کڑھی کا ابال ہوا۔

صفحہ ۲۳ سطر ۲۲، ۲۳ کالم راست۔ "ایک کے دانت دوسرے کی طرح

نوکیلے اور باہم ملے ہوئے نہیں" اس قدر تلاش کی کیا ضرورت تھی؟ گھوڑے بیل وغیرہ کے دانت دیکھے جاتے ہیں۔ آدمی کے لئے اس قدر ضرورت نہیں ـــ

صفحہ ۳۲۔ سطر ۱۵ کالم راست عورت کی زبانی ہے ان کی بھی سماعت نہیں کرتا۔ نہیں سنتا بس تھا۔ صفحہ ۳۸ سطر ۲۶ دوسرا کالم کہ "عربی کے مذہبی مقدس جملے ہائے کتنی بیگانگی ہے! نادِ علی یا کلمہ یا آیاتِ قرآنی بھی نہ کہہ سکے۔

اندیشہ ہے کہ ایسی زیادہ تحقیق کرنے میں ضد نہ معلوم ہو۔ اس لئے اس طرح کی پتے دار باتیں چھوڑ کر عموماً رائے دینی بہتر ہے کہ گویہ افسانہ اردو میں لکھا گیا ہے اور ہندوستان کے ایک عمدہ شہر یعنی دہلی میں اس کا مقام رکھا گیا ہے۔ لیکن بول چال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اچھی انگریزی بُری اُردو میں آگئی ہے اور بلدہ دہلی کے سوا کسی اور شہر کا ذکر ہو رہا ہے وہ بھی قیاس کے موافق، واقعی وقوعی معاملات نہیں۔ نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ افسانہ SENSATIONAL ہے۔ افسانے کی تعریف SENSATIONAL ہونا عمدہ بات ہے کہ خواہ مخواہ محض واقعات سننے کے لئے انسان پڑھتا جائے عجیب عجیب معاملات اور سُننے کے لائق باتوں کا ذکر ہو INTEREST سے غرض یہ کہ پڑھنے والے کو انتظار رہے کہ پھر کیا ہوا پھر کیا ہوا۔

فرخ و مہدی کا قصہ اسی قدر ہے کہ دونوں ایک باپ کے بیٹے ہیں۔ مہدی دوسری ماں سے ہے مہدی نے باپ کی جائداد کا دعوے کیا پھر دونوں مل گئے۔ آخر میں کوئی لڑکی فرخ نے دیکھی جس کو اس طرح دیکھ لینا لڑکے کے ماں باپ کی بہت شرافت ثابت نہیں کرتا۔ کنواری کو کیوں یوں دیکھ لے؟

غرض نہ کوئی ہنگامہ ہے، نہ معرکہ ہے نہ کہیں ہنسی آتی ہے، نہ رونا آتا ہے نہ کسی طرح جی لگتا ہے۔ فرخ کی محبت بھی کس مہمل طور سے کھلی کہ فرخ کے سوا سب کو

بیہودہ معلوم ہوئی ہوگی۔ چلو قصہ تمام ہوا۔ آگے جب حضرت شرر کچھ کہیں تو حال معلوم ہو۔

اس ریویو میں ہم نے اس کتاب کے حقوق سے زیادہ محنت کی لیکن چونکہ یہ پہلا معاملہ تھا مناسب معلوم ہوا کہ آگے کو مصنف کے واسطے ایسے عیوب سے بچنے کے سامان ہو جائیں۔

رسالہ تذکیر و تانیث معروف بہ مفید الشعرا

(تصنیف حکیم ضامن علی صاحب جلال لکھنوی)

شروع میں اس رسالے کے دوبارہ چھپنے کی وجہ عجیب لکھی ہے پہلی دفعہ جناب نواب کلب علی خاں صاحب بہادر دام اقبالہ والئ ریاست رامپور کا نام اس کے خطبے میں رہ گیا تھا۔ اس سبب سے وہ ناقص و ناتمام سمجھا گیا۔ معلوم نہیں کہ لفظوں کی تذکیر و تانیث کا فیصلہ بغیر اس نام کے کیوں ناقص سمجھا گیا؟ کیا اس بات کے بغیر یہ فیصلہ غلط رہتا مجھے تو کچھ بھی نسبت اس میں نظر نہیں آتی۔ ایسی ہی بے کار باتیں ہمارے یہاں کی تصانیف کو فضول کئے دیتی ہیں۔ جناب نواب صاحب بہادر کی مدح سرائی سے اور الفاظ کی تذکیر و تانیث کا کیا تعلق ہے؟ جس کے بغیر سارا رسالہ پھر چھاپا گیا۔ پہلا رسالہ میں نے نہیں دیکھا لیکن اگر یہی رسالہ چھپا جس کا اعلان ہے کہ ..... "زر کثیر صرف کر کے طبع کرایا" تو میری دانست میں ابھی اور صرف کثیر کی ضرورت باقی ہے اور سہ بارہ چھاپنا پڑے گا۔ جو رسالہ میں نے دیکھا بڑے صرف سے چھپا نظر نہیں آیا جب تک اچھا کاغذ اور عمدہ چھپائی نہ ہو اس لائق نہیں جس کے لئے کہا جائے کہ "یہ شاہد معنی بامداد و اعانت بندگان والا اعلیٰ حضرت قدر قدرت حاجئ حرمین شریفین فرزند دلپذیر دولت انگلشیہ۔ مشیر قیصر ہند دلاور اعظم طبقہ اعلائے ستارۂ ہند جناب نواب فلک رکاب نواب محمد کلب علی خاں صاحب

بہادر والیٔ ریاست مصطفٰے آباد معروف بہ رامپور لازالت شموس دولتہم بازغۃ الیٰ یوم النشور کے زیور ترتیب لو سے مرتب و مزیّن ہو کر بزم ناظرین بالغ و انجمن مشتاقان دیدہ ور میں جلوہ دکھاتا ہے۔"

دوسرے تذکیر و تانیث کی بحث میں اس اطلاع کی کیا سخت ضرورت تھی کہ "مولفِ ہیچمدان ایک بیس۲۰ بائیس۲۲ برس کے زمانے سے بوجہ پرورش فرمائی و قدردانی و عزت افزائی اپنے آقائے نعمتِ مذکور والی ریاستِ رامپور دام اقبالہم لازالت شموس دولتہم بازغۃ الی یوم النشور کے ملازم ریاست مذکور ہے۔"

کیا اس اظہار کا موقع اور کبھی نہیں ہوتا جو خواہ مخواہ مسئلہ تذکیر و تانیث کی بحث میں ناظرین کے سامنے سب سے مقدم سمجھ کر پیش کیا گیا۔

پھر میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے حکیم جی کو جس قدر شاعری میں دخل ہے نثر لکھنے میں اسی قدر عاری ہیں اسی فقرے میں دو جگہ "مذکور" کتنا واہیات لکھا ہے۔ اسی طرح اور بھی نثر ان کی اسی قدر گری ہوئی ہے جس قدر کہ شاعری اچھی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ہمارے یہاں کے اہل کمال نظم گو کتنی اچھی لکھ لیں سیدھی نثر نہیں لکھ سکتے حالانکہ نثر کی زیادہ ضرورت ہے۔

(افسانۂ ایام۔ اگست ۱۸۹۵ء)

آج کل کے اُردو اخبارات

از دامنت کیم مگر پردہائے چشم
مارا بایں نگاہ تماشا نمیرسد

ناصری کے اشتہار سے بعضے اخبار والوں کو شکایت ہوئی کہ ان کی ساتھ سختی کی گئی۔ اشتہار میں روئے سخن کسی کی طرف نہیں تھا۔ صرف اس بات کا گلہ تھا کہ ہندوستانی اخبار از روئے لٹریچر عموماً اس مرتبہ کو نہیں پہنچے جس کا لوگوں کو انتظار تھا۔ اس کے ثبوت میں ضرور ہے کہ ہندوستان کے چند مشہور اخباروں کا ذکر کیا جائے جن سے ہمیں سابقہ رہتا ہے۔ پہلے ہم پنجاب سے شروع کرتے ہیں۔ یوں تو پنجاب کے اکثر چھوٹے چھوٹے قصبوں میں سے بھی اخبار نکلنے لگے۔ مثلاً بھیرہ وغیرہ۔ مگر خاص لاہور کے نامور اخباروں میں کوہِ نور، پنجابی اخبار، انجمن پنجاب، رفیق ہند، اخبار عام، سمجھئے۔ کوہِ نور سب میں پرانا اخبار ہے۔ اس کے مالک کو اس فن سے پرانا تعلق ہے لیکن اخبار کی حالت و پالیسی اس کے اڈیٹروں کے "داخل خارج" پر منحصر ہے۔ پہلے اس اخبار کو کشمیر سے خصوصیت تھی۔ یعنی جس بات کا اخبارِ عام کو اب دعویٰ ہے وہ پہلے کوہِ نور میں تھی۔ لاہور کے اخباروں سے کوہِ نور کے لئے

لٹریچر بُری نہیں رہی۔ پنجابی کا لٹریچر میں کبھی خاصا نام رہا لیکن وہ بھی اب اس بات میں اس قدر مشہور نہیں۔ اخبار انجمن پنجاب کا اہتمام پنجاب یونیورسٹی سے متعلق تھا اس سبب سے کاغذ سیاہی وغیرہ سب عمدہ سہی لیکن لٹریچر کی کوئی خصوصیت نہیں دیکھی۔

رفیقِ ہند کے اڈیٹر کو لٹریچر سے لگاؤ سنا ہے! اور نئی جھول کے لکھنے والوں میں سُنا ہے کہ بُرے نہیں۔ لیکن خاص لٹریچر سے ان کے اخبار کو تعلق نہیں ــــ اخبارِ عام کی بڑی تعریف یہی ہے کہ عوام کے پسند زیادہ ہے۔ ان میں سے کسی اخبار کو لٹریچر سے کوئی خاص تعلق نہ ہوا۔

ظرافت کے اخباروں میں ایک خاص قسم کے لٹریچر کا لطف ہے۔ لیکن اس کا لطف اس لئے بے کار ہے کہ یہاں ہر طرح کے اعلےٰ لٹریچر کا ذکر ہے۔ دہلی کے اخباروں سے زبان و لٹریچر کی ترقی کا انتظار تھا۔ ان میں اس بات کی کمی ہے۔ لکھنؤ کے اخباروں سے اودھ اخبار روزانہ، کارنامہ، آزاد، مشیر قیصر، وغیرہ مشہور اخبار ہیں۔ ان میں اودھ اخبار سب سے پرانا اخبار ہے۔ اس اخبار کے مالک کو جس قدر عروج ہوتا گیا۔ یہ اخبار از روئے لٹریچر گرتا گیا۔ روزنامہ کچھ رہا ہی نہیں کارنامہ صرف چل رہا ہے۔ مشیر قیصر کے مہتمم پہلے اودھ اخبار کے اڈیٹر تھے وہیں سے اُنھوں نے اخبار نویسی سیکھی اور اودھ اخبار سے نکل کر اپنا اخبار علاحدہ نکالا۔ انہیں یہ مرض ہے کہ نظم و نثر میں ان کا شمار دلّی والوں میں رہے۔ آزاد احمد علی شوق کے سبب اچھا ہے۔ یعنی جہاں تک وہ لکھتے ہیں از روئے لٹریچر اعتبار کے لائق ہے۔ دلگداز سے صرف عبدالحلیم شرر کی لٹریچر شائع ہوتی ہے۔ انہیں اپنے طرزِ خاص کی ایسی پابندی ہے کہ لٹریچر کی ترقی تو درکنار اس سبب سے اردو کی زبان داتی محدود ہوئی جاتی ہے۔ اودھ پنچ

میں ایک عرصے تک نہایت پاکیزہ اردو دیکھی۔ احمد علی کسمنڈوی کی موت کے ساتھ اس کا خاتمہ ہوگیا۔ باقی اخباروں میں ریاض الاخبار بہت غنیمت ہے اس میں اُردو لٹریچر کا مشغلہ کچھ نہ کچھ مدت سے چلا آتا ہے۔ فتنہ جو اس کے ساتھ نکلتا ہے شروع میں بہت دھوم کا پرچہ تھا۔ اب بھی اس وضع کے پرچوں میں اچھا ہے — رہے مدراس و بمبئی اور بنگال کے اُردو اخبار، اردو لٹریچر سے ان کا تعلق ہماری زبان کی عزت کا سبب نہیں۔ نظم کے رسالوں میں دو ایک رسالے شروع میں دھوم کے تھے وہ بھی اب نظر سے گرے جاتے ہیں باقی جس قدر نظم کے رسالے نکلتے ہیں ان کے نکلنے سے نہ نکلنا اچھا ہے۔

غرض آپ نے دیکھا کہ اردو کے لٹریچر کی ترقی کے سامان کتنے تھوڑے ہیں۔ حالاں کہ اُردو کی ترقی اگر ممکن ہے تو اخباروں ہی کی بدولت۔ انہیں کی وجہ سے اُردو اس قدر سنبھل گئی۔ جو بات کہ اخباروں کی بدولت اسے نصیب ہوئی کسی سلطنت سے نہ بن پڑی۔ میری دانست میں اُردو کی ترقی کا مدار صرف اخباروں ہی پر سمجھئے۔ ورنہ دفتروں کی اُردو، صاحب لوگوں کی زبان، پادریوں کے ترجمے، تعلیم انگریزی، سب اس کے دشمن ہیں۔ شروع میں جب اخباروں کا مشغلہ چھڑا تو بہت کم اس طرف توجہ ہوئی۔ تھوڑے دنوں بعد اچھے اچھے لکھنے والے پیدا ہوگئے۔ میرے زمانے میں اکثر اہل کمال اس طرف متوجہ ہوئے ہمارے سیّد احمد خاں صاحب نے تہذیب الاخلاق نکال کر اُردو لٹریچر کو بہت بھڑکا دیا۔ جس کی وجہ سے مدت تک یہ مشغلہ اچھی طرح جاری رہا۔

میں نے دیکھا کہ لکھنے والے تو شاید اب بھی اچھے اچھے ہیں لیکن ان اچھے لکھنے والوں کے لئے اچھا پرچہ نہیں جس میں ہر طرح کے کمال کی داد دی جاتی ہے۔ حالی کا کلام اور "دہلی چھوڑ کر سر مور نا ہمن جا" کوئی پاکیزہ مضمون ادبی ہو وہ مسخرے اخباروں میں

چھپے۔ اچھے یادگار مضمون فتنہ سے کم حیثیت پرچے میں شائع ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر لکھنے والوں نے اس طرف سے ہاتھ کھینچ لیا ہے ــــ اودھ اخبار میں تو سوائے اجورہ کے دو ایک لکھنے والوں کے کوئی شخص جس کو اپنے کلام کا پاس ہے نہیں لکھتا۔ اسی طرح علی گڑھ گزٹ کا حال ہے کہ نیچری جھگڑوں کے سبب کسی طرح کے کمال کا اظہار وہاں ممکن نہیں۔ یہ اخبار ناصرؔی اس لئے نکالا جاتا ہے کہ اہلِ کمال جب کچھ لکھا چاہیں یہاں بھیج دیں یہ پرچہ صرف اہلِ کمال کے لئے جاری کیا گیا ہے۔

آخر میں عموماً اخباروں کی بے قدری کی نسبت سر سید احمد خاں صاحب کی معقول رائے سننے کے لائق ہے۔ جو انہوں نے میرے نام اپنے تازہ خط میں بھیجی ہے۔

"میری تو یہ رائے ہے کہ کیسا ہی عمدہ پرچا نکالا جائے اور کیسا ہی عمدہ اہتمام کیا جائے مگر چل نہیں سکتا۔ اس کی لاگت وصول ہونا بھی ناممکن ہے۔ البتہ اگر ایسا پرچا نکلے جس میں شُہدہ پن و مسخرہ پن ہو اور بیوقوف اور دولتمندوں کو ہجو اور بدزبانی سے ڈرا کر خریدار بنایا جاوے۔ یا شادی و تولد فرزند میں درِ دولت پر حاضر ہوا جاوے تو البتہ چل سکتا ہے۔ قومی فائدے کی غرض سے جو اخبار نکالنا چاہے اس کو لازم ہے کہ وہ سمجھ لے کہ اس کے اخراجات کو میں اپنی جیب سے ادا کروں گا اگرچہ کہنے کی بات نہیں ہے مگر میں آپ کو لکھتا ہوں کہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ آج تک اسی اصول پر جاری ہے۔ اس کی آمدنی اس کے خرچ کی مکتفی نہیں ہے۔ جس قدر زائد خرچ آمدنی سے پڑتا ہے اس کو وہ شخص اپنی جیب خاص سے ادا کرتا ہے جس نے ناعاقبت اندیشی سے اس کو جاری کیا تھا۔ اور اپنے کیے کی شرم کو نبھاتا ہے۔"

(ناصری۔ شمارہ اول ۱۳۰۷ھ)

حصّۂ سوم

(انتخاب از صلائے عام ۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۱ء)

ساقی کے آنے کی یہ تمنا ہے بزم میں
دست سبو بلند ہے دست دُعا کے ساتھ

پیرایۂ آغاز

آغاز میں دو ایک سخن گسترانہ باتیں کہنے کا اہل علم میں دستور ہے۔ ڈراما میں "پرولوگ" کے طور پر اسٹیج پر پہلے کچھ پکارا جاتا ہے۔ اس کے بعد تماشا شروع ہوتا ہے اور افسانہ خواں پہلے ایک آدھ قطعہ سناتے ہیں پھر افسانہ ــ اسی طرح مرثیہ خوانی میں بھی پہلے دو ایک رباعیاں پڑھنے کا دستور ہے۔ اس لئے مجھے بھی آغاز کلام میں دو ایک باتیں عرض کرنی ضرور ہوئیں ؎

دکھاؤں جلوۂ آغاز ایسے نہ دیکھے ہوں کبھی انداز ایسے

در رہ منزل لیلےٰ کہ خطرہا ست بسے شرطِ اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

لیلیٰ کی محبت میں پہلی شرط اگر جنون ہے تو قیس کی قسمت۔ صلائے عام کے لئے یہاں شرط دل و دماغ کی خوبی ہے اور دیباچے کی خوش بیانی سب سے پہلے، آگے چل کر لڑکا پڑھے یا نہ پڑھے، بسم اللہ میں دھوم کرنے کی رسم ہے۔

زبان سے یہی غرض نہیں کہ بھوک لگی تو روٹی مانگ لی اور پیاس لگی تو پانی مانگ لیا، یہ کام تو گونگے بھی صرف اشاروں سے نکال لیتے ہیں۔ دل و دماغ کو خوش کرنے کے لئے ضرور ہے کہ اچھے خیال پاکیزہ طرز سے ادا کئے جائیں، مشکل مضمون اس طرح بیان کئے جائیں کہ سننے والے خوش ہو جائیں۔ یہی سبق اور کتاب کا مضمون، دیکھئے، استاد ذوقؔ نے کس خوبصورتی سے ادا کیا ہے ؎

کتابِ محبت میں اے حضرتِ دل بتاؤ کہ تم لیتے کتنا سبق ہو
کہ جب آن کر تم کو دیکھا تو وہی لئے دستِ افسوس کے دو ورق ہو

اگلے مصنفین کی یہ طرز مجھے پسند ہے، جو لکھا کرتے تھے کہ اگر ان کی تصنیف سے آپ خوش ہوں تو دعائے خیر سے یاد کریں اور اگر کوئی خطا دیکھیں تو معاف فرمائیں، صلائے عام کی طرف سے عرض ہے کہ اس کی بات جو آپ کو پسند آئے، اس کی داد ضرور دیجئے اور جی کھول کر دیجیے، مگر جو بات پسند نہ ہو اس کی شکایت نہ کیجیے۔ صلائے عام زبان و خیال کی خوبیوں کے اظہار کے لئے نکالا گیا ہے، شکوہ و شکایت اور بحث و مباحثہ سے اسے غرض نہیں۔ صلائے عام سے خفگی میرے ساتھ نہیں اپنے ساتھ ہے کہ اس کی زبان اس کے گھر کی نہیں، آپ کی ہے۔ اس سے خفا ہونا گویا یار کا اپنے بالوں کا عکس پانی میں دیکھ کر جھجکنا اور چیخنا سمجھیے کہ "ہائے سانپ!" میری خطا اس سے زیادہ نہیں کہ زلف یار کو مشکبو کہوں اور آپ اس پر ناک بھوں چڑھائیں، اگر کوئی بات انوکھی زبان سے نکل جاتی ہے تو اس سے کسی کو ناراض کرنا منظور نہیں۔ آپ کو نہیں تو خود اپنے آپ کو خوش کرنا منظور ہے زبانِ اساتذہ سے اور اگلی صحبتوں کے ذکر سے دل کا خوش ہونا سخن سنجی اور نیک نیتی کی دلیل ہے۔ صلائے عام کی آتش بیانیاں یادگار کاروانِ سوختہ سمجھیے ؎

گرد دیتی ہے کارواں کا پتا
یادگارِ گزشتگاں ہوں میں

آپ دیکھ رہے ہیں کہ اپنی زبان کی لٹریچر میں صلائے عام رسمی و معمولی رسالوں میں نہیں رہا - اس نے اہلِ علم میں نازک خیالی اور پاکیزہ بیانی کا صرف شوق ہی پیدا نہیں کیا بلکہ جو لوگ دل و دماغ کے لئے لٹریچر کی ضرورت سمجھتے ہیں ان کے واسطے ستّہ ضروریہ میں داخل ہے کہ اس میں اگلے کمالاتِ علمی، گزری صحبتوں کے تذکرے

شعر و سخن کی پاکیزگیاں، تحقیق و فلاسفی کے مسئلے، آجکل کی معلومات کے مسالے، سب اس خوبی سے جمع ہو رہے ہیں، گویا ماضی و حال کا مرقع ہے۔ اس کا معمولی مضمون بھی کارنامے سے کم نہیں ہوتا اور ادائے بیان، جس پر شعرائے نازک خیال کو ناز تھا اس کا روزمرہ ہو رہا ہے۔ اس کے مضمون نگار سب ذی مرتبہ اور اہل کمال ہیں، ان میں سب سے گیا گزرا، یہ جامع اوراق ہے جس کو لکھنے پڑھنے کے سوا اور کوئی کام نہیں آتا۔ عمر بھر اسی میں لگا رہا۔ اور لوگ اپنی اپنی طرز میں لکھتے ہیں، میں اپنی طرز پر لکھتا ہوں صلائے عام سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ آپ کو ایک مضمون پسند نہ آئے تو دوسرا دیکھئے، وہ بھی پسند نہ ہو تو تیسرا دیکھئے، میرے مضمون آپ نہیں پڑھنا چاہتے، نہ پڑھیے، آپ اپنی وضع پر لکھیے، میں جی لگا کر پڑھوں گا۔ جوانی کے لطفِ صحبت میں میں نے دیکھا ہے کہ چاہنے والے کے ہاتھ سے پان کھاتے اور کھلاتے ہیں، اگر آپ کو میرے ہاتھ کا پان پسند نہیں تو آپ اپنے ہاتھ کا پان کھلایئے! دنیا میں جی بہلانے کے اسباب اتنے تھوڑے ہیں کہ اپنی زبان کی لٹریچر سے جس قدر جی بہل سکے، اس سے غفلت نہ کیجئے، افکارِ جہاں سے بچنے کے لئے صلائے عام سے بہتر ذریعہ نہیں، اور اپنی زبان کی خوبیاں دیکھنے سے بہتر کوئی مشغلہ نہیں ؎

رفع اندوہ ہو جو منظور　　　کافی ہے یہ شغل چشم بد دور

آپ کی زبان پروردگار کی نعمتوں میں سے ہے اور اپنی چیز سے محبت فطری بات ہے۔ محبت سے پہلے یہ فکر ہوتی ہے کہ غیر کا جادو نہ چلنے پائے، صلائے عام یہی چاہتا ہے کہ آپ غیر زبانوں کو جیسا چاہیں سمجھیں مگر اپنی زبان کو سب سے اچھا جانیں ؎

تیری لیلےٰ کو برا ہم نہیں کہتے مجنوں　　　مگر اس فتنۂ عالم کے سے انداز نہیں

پچھلی صحبتیں اگر بری نہ تھیں تو صلائے عام انہی کی یادگار ہے اور اگر اب زمانہ

پہلے سے زیادہ ترقی کر رہا ہے تو آجکل کی جس زبان سے آپ چاہیں اپنی زبان کو ملا کر دیکھ لیں ؎

کیوں قصہ کوہکن کا سناتے ہو بار بار　　کیا اس زمانے میں کوئی جانباز ہی نہیں

آپ یہ وہم جانے دیجئے کہ ہمیں اپنی زبان میں اپنا مطلب ادا کرنا نہیں آتا، یہ کہیے کہ ہم اب تک غافل تھے۔ یار کی جفا اور ناز میں فرق یہ ہے کہ ناز کے لئے فریب مہر ضرور ہے، یہی وجہ ہے کہ ناز ناپسند نہیں ہوتا، اور جفا کی شکایت ہوتی ہے۔ اپنی زبان سے آپ کا تغافل، ناز نہیں بلکہ جفا میں داخل ہے کہ سرے سے نظر مہر ہی کے لالے ہیں آپ جانیں اور آپ کا کام، صلائے عام اپنا حق ادا کر رہا ہے کہ حُسنِ یار کی طرح غیر کی نہیں آپ ہی کی خوبیوں پر مٹا ہوا ہے۔ جس کا کچھ نہ کچھ نتیجہ ضرور ہے۔ ؎

مہرباں وہ نہ ہوئے دل ہی کو تسکین ہوئی　　یہ غلط ہے کہ دم سرد میں تاثیر نہیں

آپ ہی انصاف سے کہدیں کہ کسی زبان میں اس سے زیادہ کیا ہوگا جو اس وقت صلائے عام میں موجود ہے ؎

وہی سبزہ وہی وحشت وہی ویرانی ہے　　اور کیا دشت میں ہوگا جو مرے گھر میں نہیں

صلائے عام میں آپ آئینے کی طرح سب کچھ دیکھ لیجئے، دیر ہے تو آپ کے دیکھنے کی ؎

روئے دلبر، رشک دشمن، درد ہجراں، شوق وصل
مثلِ آئینہ ہمارے گھر میں کیا ہوتا نہیں

اَلف لیلہ میں کسی طلسمی محل کا ذکر ہے، جہاں عجیب عجیب سامان عیش مہیا تھے مہمان نے ایک ماہ وش سے وہاں کے طلسمی اسرار دریافت کرنے میں زیادہ کد کی تو اس لُعبتِ ناز نے سمجھایا کہ زیادہ قیل و قال کرنے سے شبِ ماہ کا لطف اٹھانا

کہیں اچھا ہے ؎

زیادہ اس میں کد کرنے سے حاصل
وہ دیکھو چاند آ پہنچا مقابل

آپ بھی اب صلائے عام ملاحظہ فرمائیں ، آپ کے سامنے موجود ہے ؎

دیکھنا یہ ہے کہ ہم نے تمہیں کیسا چاہا
پوچھنا یہ ہے کہ تم نے ہمیں کیسا پایا

ہست صلائے سرخوان کریم ـــــ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یاران نکتہ داں کے لئے

صلائے عام

ساقی صلائے عام است کارے بکام گرداں   داماں خم فراخ است دورے تمام گرداں

جغرافیہ کی اصطلاح میں صلائے عام کے حدود اربعہ یہ سمجھیے کہ، نقشے کی طرح، اس کی چار سمتوں میں (۱) سرے پر لٹریچر (۲) داہنے نیکی (۳) بائیں نازک خیالی اور (۴) پائیں میں، تحقیق و معلومات ہے۔ اس کی سرزمین کہیں کالے کوسوں دور نہیں۔ یہ ساری اپنی ملکیت، یعنی اپنے گھر کی زبان کا نقشہ ہے:-

لٹریچر

نیکی   **اردو**   نازک خیالی

تحقیق و معلومات

پروانے کو آفتاب سے غرض ہے، نہ چاند سے، ہزار آفتاب ہوں اور لاکھ چاند ہوں یہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، شمع پر جان دینے کو موجود ہے کہ شمع کو اپنا سمجھتا ہے اور اسی تک رسائی چاہتا ہے۔ شمع بھی اس سے دور نہیں۔ اپنی چیز سے جس قدر اپنے پاس ہو زیادہ انس ہوتا ہے۔ تنہائی میں آنسو پونچھنے کے لئے اپنی ہی آستین کام

آتی ہے۔ نہ کہ بزاز کی دکان کے تھان۔

آزردہ خاطروں کی جو آنکھوں سے نم چنے پیارے تمہارے ہاتھ کی وہ آستین ہو

رہ و رسم محبت کے لئے سب سے پہلے زبان کی ضرورت ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کی زبان سمجھنی، اپنی کہنی، دوسرے کی سننی چاہیے اور یہ اپنی زبان بغیر ممکن نہیں، مجھ سے قسم لے لیجئے جو لیلٰی نے مجنوں سے غیر کی زبان میں بات کی ہو، یا شیریں نے فرہاد سے غیر زبان کا ایک لفظ بھی منہ سے نکالا ہو، کوئی کہا کرے میں نہیں ماننے کا کہ نل نے دمن سے اپنی زبان میں درد فراق کا اظہار نہیں کیا، یا ہیر نے رانجھے سے اپنی زبان میں بات نہیں کی، غیر کی زبان سے واسطہ رکھتے تو ان کا نام کب کا مٹ گیا ہوتا۔ محبت میں غیر کا نام لینا باعثِ ننگ ہے اور غیر کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی بے حیائی ہے ؎

وہ، سر اٹھا کے دیکھ لیا غیر کی طرف
آنکھوں میں کچھ حیا ہو تو نیچی نظر رہے

یار کی "قم باذنی" یار ہی کی زبان میں اثر رکھتی ہے نہ کہ غیر کی، جلوۂ طور کی "لن ترانی" زبان موسیٰ میں تھی نہ کہ مصریوں اور کالدیوں کی زبان میں، گو اس زمانے میں ان زبانوں کا بڑا زور تھا، جس طرح حسنِ خداداد کی خوبیوں کو کوئی خوبی نہیں پہنچتی، اسی طرح خدا کی دی ہوئی زبان کے برابر کوئی نعمت نہیں، مرغانِ سحر بھی اپنی اپنی بولیوں میں خدا کی حمد کرتے ہیں، نہ کہ میری آپ کی زبان میں ؎

مرغانِ سحر بہر صباحے خوانند ترا بہ اصطلاحے

جانور بھی اپنے ہم جنس کی آواز سے خوش ہوتے ہیں بلکہ خود اپنی آواز پر فریفتہ ہیں، یہاں تک کہ صیاد چڑیوں کے پکڑنے کے لئے چڑیوں ہی کی آواز کی نقل

کرتے ہیں۔ جس سے چڑیاں وارفتہ ہو کر اس کے دام میں آجاتی ہیں ؂

غضب کے آپ ہیں شیریں نوائے گلشن فن اسی شکر کے ندیدے ہیں طوطیانِ سخن

انسان کو ہزار زبانیں آتی ہوں اور اپنی نہ جانتا ہو، گونگا ہے، سوسن کو ہزار زبانوں پر بھی مجال سخن نہیں، اور شمع کی ایک زبان جس میں سوز و گداز ہے آتش بیاں کہلاتی ہے، خانۂ زنجیر وحشت کا گھر سہی مگر زنجیر کی آواز سے وحشیوں کا جی بہل جاتا ہے؛ آہ کی یہ خوبی نہیں کہ آسمان پر چڑھ جائے اور عرش معلّٰی ہلا ڈالے آسمان پر جائے یا نہ جائے، کسی کے دل میں اثر نہ کیا تو کچھ بھی نہ کیا ؂

تمہاری شوخیاں برہم زنِ عالم سہی لیکن ہماری آہ سے بھی حشر برپا ہو ہی جاتا ہے

آپ اپنا حال اپنی زبان میں کسی سے کہہ کر دیکھ لیجئے، اگر اثر نہ کرے تو میرا ذمّہ ؂

اثر لُبھانے کا پیارے تری زبان میں ہے
کسی کی آنکھ میں جادو، ترے بیان میں ہے

اپنی زبان میں اَدنٰی سی بات دوسرے کی گہری نظر التفات سے زیادہ اثر کرتی ہے۔ دل کو دل سے راہ غیر کی گلی سے ہو کر نہیں جاتی، غیر کی زبان پھر پرائی بات ہے، اپنی نہیں، غیر کی زبان اور آپ سے اچھی ـــ؟

چُپ رہیے، بس یہ آپ کے کہنے کی بات ہے۔!

انسان غیر زبانوں پر کتنی ہی محنت کرے، غیر اسے اپنا نہیں سمجھتے، اہل عجم نے عربی میں نہایت کمال پیدا کیا لیکن اہل عرب نے اہل عجم کے ذی کمالوں سے بدوی لب و لہجہ *زیادہ مستند جانا، فارسی میں اہل ہند نے غضب کی خوبیاں دکھائیں مگر اہل ایران نے انہیں نہیں مانا۔ ہم نے انگریزی میں بلا کی محنت کی کہ اپنا لب و لہجہ بھی وعدۂ جاناں

کی طرح بھول گئے مگر اہل یورپ کی نگاہ میں بہت نہیں جچے، جب یہ حال ہو تو ہم اپنی زبان کیوں ترک کریں، ؎

کیوں ترک کریں بندگیِ مے کدہ واعظ
کعبے میں نہ ہو جائیں گے بندے سے خدا ہم

فرض کیجئے کہ اپنی تعریف عربی فارسی میں بہت زور سے لکھی گئی، انگریزی اور یونانی زبانوں میں تمام یورپ میں شائع ہوئی، لیکن ماں بے چاری جس نے مجھے اپنی زبان میں لوریاں دے کر پالا وہی میری تعریف میں جو کچھ کہا گیا نہ سمجھ سکی تو فرمایئے، وہ تعریف اس بے چاری کے کس کام کی؟ محلے والے خوش ہوئے تو کیا، گود میں پالنے والوں کا تو حق ادا ہی نہ ہوا۔ آپ کچھ کہا کریں، اپنے فسانہ ہائے محبت میں وہ اثر ہے جو دارا و سکندر کی داستانوں میں نہیں، پرائی زبان میں چرچے ہوا کریں بات آئی گئی ہو جاتی ہے۔ اپنی زبان، اپنے گھر کی بات بن کر دلوں میں سما جاتی ہے۔

ہو گا غضب جو حشر میں جھگڑا یہ جائے گا
مانو کہا کہ بات ابھی گھر کے گھر میں ہے

میں اس کا قائل نہیں کہ کوئی زبان اپنی ضرورتیں پورا کرنے میں ناقص ہے اور اگر ہے بھی تو اپنی مختصر غیر کی مطول سے زیادہ کارآمد ہے۔ بچے جب آپس میں باتیں کرتے ہیں تو دو چار چھوٹے چھوٹے جملوں میں اس خوبصورتی سے اپنا سارا مطلب ادا کر لیتے ہیں جو ابوالفضل اور طاہر وحید سے جلدی سمجھ میں آجاتا ہے ؎

دُون کی ہم جو یہ لیتے ہیں بجا لیتے ہیں
چار باتوں میں فرشتوں کو لگا لیتے ہیں

کسی قوم نے جس کی زبان کیسی ہی محدود کیوں نہ ہو، اپنی زبان کو ترک نہیں کیا اور ہماری زبان کا دعویٰ ہی یہی ہے کہ مشکل سے مشکل مضمون بھی اس آسانی سے ادا ہو سکتے ہیں جو غیر زبان سے زیادہ دلکش دیکھ لیجئے۔ صلائے عام نے دعوے کے ثبوت بہم پہنچانے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے ؎

ہے جب تک آب اسکی تیغ میں خنجر میں پیکاں میں
کیے ہی جائیو اے دل شکایت تشنہ کامی کی

آپ نے دیکھا ہے کہ کوئی صدمے سے گرتا ہے اور کوئی فرطِ نزاکت سے، آپ کی زبان نزاکتِ بیان سے گری ہوئی نہیں، آپ کی بے قدری سے گر رہی ہے، زبانیں تو خدا نے بہت پیدا کی ہیں لیکن ہم زبان اس کو کہتے ہیں جو اپنے منہ میں ہے، غیر کی زبان قینچی سے زیادہ تیز ہے تو آپ کو کیا ــــــ؟ آپ کے منہ میں زبان نہیں تو آپ کسی کو کیا جواب دے سکیں گے ؎

بس جاؤ بھی کیا آنکھ دکھاؤ گے کسی کو
تم پہلے ذرا پوچھ تو لو اپنی زباں سے

اب حضرت موسیٰ نہیں تو آواز لن ترانی بھی نہیں، کوئی کچھ کہے تو جواب ملے ؎

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

خداوند تعالےٰ نے کسی کو کوئی نعمت دی اور کسی کو کوئی، آپ کو بہت نعمتیں دی گئی تھیں، اب صرف زبان باقی رہ گئی ہے، اس کی قدر جتنی کیجیے، تھوڑی ہے ؎

نقشے تو بہت خانۂ قدرت نے بنائے
لیکن نہ بنا پھر دہن ایسا، کمر ایسی،

اس عمر میں جو میں نے لکھنے پڑھنے کا مشغلہ اختیار کیا ہے، اس کی ضرورت مجھے بالکل نہیں، اول تو یہ وقت دکان بڑھانے کا ہے، میلہ چھٹنے کو ہے، محفل برخاست ہونے والی ہے، قصیدے کے دو چار دعائیہ شعر باقی ہیں، یا مرثیے کے بین کے دو ایک بند رہ گئے ہیں، غزل میں مقطع سننا ہے، اب پچھلی رات کا اعتبار کیا ؎

پس شباب ہے کیا اعتبار جمع حواس
کہ ایک شب کے سوا کارواں رہے نہ رہے

دوسرے صلائے عام اگر میری شہرت کا سبب ہوا بھی تو میرے لئے مزید شہرت بے کار ہے کہ جس حسین کے سر کے بال خدا کے دیے کمر کے نیچے پہنچ جائیں اور پھر مصنوعی بالوں کی تلاش کرے تو سمجھ لیجئے کہ اسے خداداد خوبی کی قدر نہیں ؎

شکر ہر نعمت کہ بخشیدہ است او
ہر سرِ مو کن زبان و شکر گو

پہلے تو صلائے عام میں نے اپنی زبان کی محبت میں نکالا کہ میرا جی لگا رہے گا، اب یہ تقاضے کے اسباب میں ہو گیا کہ پڑھنے والے اس کے بغیر نہیں رہ سکتے، اب میرا جی چاہے نہ چاہے صلائے عام کے پڑھنے والے نہیں مانتے، اگر اب چھوڑنا چاہوں بھی تو یہ سلسلہ چھٹتا نظر نہیں آتا، ؎

چھڑا لینے کی اب تو پوچھتے پھرتے ہیں تدبیریں
کبھی یہ فکر تھی ہم کو کہ دل کیوں کر لگاتے ہیں

صلائے عام پہلے میرے شوق کا نتیجہ تھا، اب اوروں کے واسطے یہ ضروریات میں داخل ہو گیا ؎

نہیں ہوتی تو دعا میں نہیں ہوتی تاثیر
اور ہوتا ہے تو باتوں میں اثر ہوتا ہے

حسن اتفاق سے صلائے عام کا خرچ اس کی آمدنی پر منحصر نہیں۔ ہندوستان میں لکھنے پڑھنے کا مدار آمدنی پر مشکل ہے۔ سر سید احمد خاں نے میرے سامنے دو دفعہ تہذیب الاخلاق نکالا اور دونوں دفعہ انہی کے سامنے بند ہو گیا گلستاں اگر دام دے کر تصنیف کرائی جاتی تو شیخ سعدی سے کبھی نہ لکھی جاتی اور حافظ سے اجرت دے کر کوئی غزل لکھواتا تو حضرت شاید ہی لسان الغیب کے مرتبے کو پہنچتے، اپنی عمر میں

مجھے بہت سے مشکل کاموں کی سرانجام دہی کا اتفاق ہوا لیکن صلائے عام نکال کر ثابت ہو گیا کہ تمام دنیا کے کاموں میں سب سے زیادہ مشکل لکھنے پڑھنے کا خرچ نکالنا ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ خرچ کے سوا اور کوئی شکایت صلائے عام کی میرے ذہن میں نہیں۔ پھر خدا کے فضل سے یہ بات صلائے عام ہی کو نصیب ہے کہ اس سے غرض دکان داری نہیں، اس کو اس کا خیال ہی نہیں ہے کہ نفع ہوتا ہے یا نقصان، حضرت شیخ سعدیؒ کے "ابر و باد و مہ و خورشید" کی طرح اسے اپنے کام سے کام ہے اور میں تہیہ کر چکا ہوں کہ جہاں تک مجھ سے بن پڑے گا آپ صلائے عام میں روزافزوں ترقی کے سامان ہی دیکھئے گا۔

فسانہ تری زلف شب رنگ کا
بڑھے گا جہاں تک بڑھائیں گے ہم

آپ نے دیکھا ہے کہ اچھی چیز اچھے سامان سے اور بھی اچھی ہو جاتی ہے، شراب اچھی اور ساقی بھی اچھا ہو تو زیادہ لطف ہے۔ مطرب خوش گلو ہو اور غزل حضرت داغ کی ہو تو کیا سماں بندھتا ہے، آپ کی زبان تو اچھی تھی ہی، گو آپ کو اس کا خیال نہ ہوا، مگر صلائے عام میں اور بھی اچھی معلوم ہونے لگی اور اب جو اس کی عادت ہو چلی ہے تو صلائے عام کے بغیر لکھنے پڑھنے کا لطف ہی نہیں، شراب وہی اچھی جو منہ کو لگ جائے اور اسی جام میں جس سے پینے کی عادت ہو۔ رندانِ مے آشام اسی خم کو پسند کرتے ہیں جس سے ہمیشہ پیتے رہے۔

از جوش و خروش خود چہ گویم
ایں بادہ نوئی و من سبویم

خواجہ قمرالدین راقم کا شعر ہے ۵

مقصد تمہارے ہاتھ ہے قسمت خدا کے ہاتھ
جو کچھ خدا سے ہو وہ تمہاری زباں سے ہو

صلائے عام کا عقیدہ ہے کہ کسی ملک و قوم کی ترقی تو پروردگار کے اختیار میں ہے لیکن جہاں تک اس قوم کی تدبیر کا تعلق ہے اس کے لئے اپنی زبان کی قدر پہلی شرط ہی اگر اپنی ہی زبان کی فکر نہ ہو تو ترقی کے ہزار دعوے کیجئے، سب بیکار ہیں۔ جس قوم کو اپنی زبان میں کمال پیدا کرنے کی جستجو نہ ہو وہ کبھی علوم میں اور قوموں سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔

یہ رسالہ اپنی زبان میں اظہار کمال کی غرض سے جاری ہے کہ اردو لٹریچر کی ترقی کے لئے ہر طرز اور ہر مضمون پر لکھنے کا مسالا جمع ہو تاکہ ادائے بیاں میں ہماری زبان کسی سے کم نہ ہے ؎

دیکھ کر تجھ کو مٹے جاتے ہیں دنیا کے حسیں
جمع ہوتا ہے مسالا تری یکتائی کا

ہماری لٹریچر کی ساری پونجی شاعری ہے۔ نثر سے نہ غرض تھی نہ ہے۔ نری شاعری سے لٹریچر کی ایک آنکھ درست ہوگئی تو ایک آنکھ والے کو حسین نہیں کہا جا سکتا، لٹریچر کے لئے ہمیں نثر کی زیادہ ضرورت ہے۔ نثر یہ نہیں کہ مذہبی مباحثے کی چند کتابیں لکھ ڈالیں، یا کسی خاص فن مثلاً طب یا قانون کی کتابیں جمع کرلیں، یا غیر زبانوں کے نرے ترجے شائع کر دیے، یہ لٹریچر میں داخل نہیں ؎

واعظوں کی بھی یہ توقیر ہے اللہ اللہ
پاسبانِ درِ خمار بنے بیٹھے ہیں

اردو نثر کا مدار اس وقت رسالوں پر ہے، چند اخبار جو اس وقت چل رہے ہیں ان

پر لٹریری ہونے کا اطلاق نہیں ہو سکتا کہ لٹریچر کو روزمرہ کی خبروں اور پالیٹکس سے واسطہ نہیں، ایک دو لٹریری رسالے جو کبھی کبھی بہت اچھے نکلتے ہیں ان میں زیادہ تر تو انگریزی لب ولہجہ کی تقلید کی جاتی ہے۔ خالص لٹریچر اور اپنی زبان کے لٹریچر کا کوئی رسالہ دیکھنے میں نہیں آتا، لٹریچر کے لحاظ سے ماہوار رسالوں کی زیادہ ضرورت ہے بلکہ کتابوں سے بھی زیادہ کہ کتاب تو جہاں ایک دفعہ پڑھ لی پھر تازہ نہیں رہتی اور ماہوار رسالے میں ہر مہینے میں تازہ مضامین دیکھ لیجئے۔ صلائے عام کی اشاعت سے بڑی غرض یہی ہے کہ اپنی زبان کی نازک خیالیاں حسن کی ادائے بیان میں پاکیزہ بیانی کی شرط ضروری ہے، دکھائی جائیں۔ یہ اس کی اپنی چیز ہے اور پاس کے پاس موجود کسی سے مانگنے، کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔

عظمتِ کعبہ مسلّم ہے مگر بت کدے میں
ایک آرام یہ کیسا ہے کہ کچھ دور نہیں

صلائے عام کی خوبیوں میں اس بات کا زیادہ خیال رہتا ہے کہ نازک خیالی اور پاکیزہ بیانی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ ہو، کمال فصاحت اور کمال انشا پردازی کی داد دی جائے۔ ہر طرز کے اور ہر طرح کی تحقیقات اور معلومات کا مسالا جمع کیا جائے مشکل سے مشکل مطالب ومضامین اس خوبی سے ادا کئے جائیں کہ کسی زبان میں اس سے بہتر ادائے بیاں دیکھنے میں نہ آئے، ہماری اگلی اور پچھلی خوبیاں جمع ہو جائیں، جو باتیں کہ ہم بھولے ہوئے ہیں ہمیں یاد آجائیں اور جو کچھ اس وقت ہو رہا ہے ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے ؎

نشانِ صحبتِ یارانِ ہم زباں مل جائے
کہ ہم شریک تھے جس میں وہ کارواں مل جائے

اچھی طبیعتوں کو اس بات کے سمجھانے کی ضرورت نہیں کہ اپنی قوم و ملک کی خیر خواہی کے لئے اس سے بہتر مشغلہ ممکن نہیں جس سے اگلوں کے کمال اور پاس وضع کے خیال جو ہم بھول چکے ہیں ہمیں یاد آتے رہیں اور آجکل کی تحقیق و تہذیب کے سامان جو غیروں میں نظر آرہے ہیں ان سے واقفیت پیدا ہو تاکہ جس قدر ہم نئی تعلیم میں ترقی کریں اسی قدر اپنی وضع اور خیال کے پابند رہیں۔

صلائے عام کی ضرورت یوں بھی ہو رہی ہے کہ اس سے ہماری اگلی تہذیب اور گزری ہوئی صحبتوں کی یاد قائم ہے۔ اگلی صحبتیں رنگِ گل کی طرح اڑی جارہی ہیں، میں چاہتا ہوں کہ صلائے عام سے پچھلی بہار کے ان پھولوں کی بو دماغ میں بسی رہے۔ پھول مرجھا جاتے ہیں مگر عروس کا جوڑا جو پھولوں کی خوشبو میں بسایا جاتا ہے عرصے تک معطر رہتا ہے۔ اگلی صحبتوں اور اگلی تہذیب کی یادگار ہماری اردو زبان ہے۔ اس کی قدر جس قدر ہو سکے کیجیے کہ اس سے ہمارے بزرگوں کا، ہمارا، میرا اور آپ کا نام دنیا میں باقی رہ سکتا ہے، آجکل کی زبان کے نمونے آپ کو ہر جگہ کثرت سے مل سکتے ہیں کہ فصل میں جس چیز کی رت ہو ٹکے سیر بکتی ہے، جس چیز کی فصل گزر گئی اس کا ملنا مشکل ہے ابھی کی کھینچی ہوئی شراب میں وہ بات کہاں جو بادۂ کہن میں ہے اور بادۂ کہن ہر گلی کوچے میں نہیں ملتی ؎

گل رو کوئی حسیں نظر آتا نہیں ہمیں
رت ایسی پھر گئی چمن روزگار کی

اساتذہ کی زبان اور اگلی تہذیب کے نقشے جواب نایاب ہیں صلائے عام کے سوا اور جگہ ملنے مشکل ہیں ؎

رنگیں سوا ہے اب کے گل نو بہار سے
اگلا جو برگِ زرد کوئی اس چمن میں ہے

صلائے عام کو دیکھتے دیکھتے لوگوں کو صلائے عام سے محبت سی ہوگئی کہ ہر بہانے سے دیکھتے ہیں، جن کو مقدور نہیں، مانگ کر دیکھتے ہیں، بعض نمونے کے حیلے سے منگاتے ہیں، اکثر اخبار اور رسالے بے طلب چلے آتے ہیں کہ اس بہانے سے صلائے عام تبادلے میں مل جائے۔ کسی کو کوئی پرچہ کسی وجہ سے نہیں پہنچتا تو غصے میں خدا جانے مجھے کیا کیا لکھ بھیجتا ہے یا اپنی بے تابی دکھانے میں ضرورت سے زیادہ مبالغہ کرتا ہے، دونوں باتیں وفورِ اشتیاق کی دلیل ہیں، لے دے صلائے عام کے معترضین، ان کا میں ہمیشہ خیر مقدم کرتا ہوں۔ اکثر رسالے اور اخبار اسی غرض سے دیکھتا ہوں، اگر اعتراض صحیح ہوتا ہے تو طبیعت خوش ہو جاتی ہے اور اس کے موافق اصلاح کر لیتا ہوں، گو جواب نہیں دیتا کہ مجھے اپنی اصلاح منظور ہے نہ کہ معترض کی ؎

سمجھو تو کیا سمجھتے ہیں ہم تم کو دیکھ کر
دیکھو تو دیکھتے ہیں تمہیں کس نظر سے ہم

صلائے عام دامنِ یار کی طرح مکروہاتِ زمانہ سے ایسا بچ کر نکلتا ہے کہ کسی طرح کی کدورتِ مزاج کی اسے ہوا بھی نہیں لگی، اسے غیروں کی رقابت سے بالکل بے فکری ہے مگر اپنی رقابت سے اسے فرصت نہیں، اپنے سے رقابت یوں ہے کہ ہر ایک پرچہ پچھلے پرچے سے بہتر نکالنے کی فکر رہتی ہے اور گو آپ سنیں یا نہ سنیں، یہ آپ کی زبان کی خوبیاں دکھانے سے نہیں تھکتا ؎

بیانِ دردِ دل سے تھک نہ جائیگی زباں میری
مجھے کہنے دو، اچھا تم نہ سننا داستاں میری

صلائے عام نے تکلیف کے دن جھیل لئے، اب اس کی ہوا باندھنے کی ضرورت نہیں رہی ؎

آپ کے بیمار نے تو سختیاں جھیلیں بہت
شبِ بحرال اور دھاوا آخری منزل کا ہے

لیکن اس بات کے مکرر عرض کرنے کی ضرورت ہے کہ اپنی زبان کی ترقی سے بہتر کوئی قومی خدمت نہیں، خدا کا شکر ہے کہ اکثر ذی کمال اس طرف متوجہ ہو رہے ہیں اور دکھا رہے ہیں کہ معمولی زبان کا تو کیا ذکر ہے دنیا میں دعوے کی زبانوں میں بھی اس سے زیادہ پاکیزہ بیانی مشکل ہے، یہ نعمت گھر بیٹھے خدا نے ہمیں دے رکھی ہے اسکو رائیگاں نہ جانے دیں، صلائے عام کا دعویٰ ہے کہ پاکیزہ لٹریچر کی اردو سے بہتر کسی زبان میں گنجائش نہیں ؎

ابھی بھولا ہوا ہے اک ذرا وہ کوچہ یاد آئے
تو پھر سالک کو دیکھیں کون لے جاتا ہے گلشن کو

صلائے عام نے اپنی زبان کی خوبیوں کے بیان میں جو محنت اور جانفشانی اب تک گوارا کی اس کا ذکر یہاں بیکار ہے ؎

فلک سے پوچھ لو کیا کر چکی اب تک فغاں میری
اٹھا کر حشر بیٹھی ہے صدائے ناتواں میری

سنا ہے آج مے خانے میں جام مے پرستوں نے
لٹائے دین و دنیا دونوں ہمت اسکو کہتے ہیں

قدیم یونانیوں کے بہادروں میں سے کسی کی نسبت روایت ہے کہ ایک دن کہیں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ انسان کو زندگی کیسے بسر کرنی چاہیے، اتنے میں دو شکلیں عشرت اور نیکی کے بھیس میں سامنے آئیں، دونوں نے اپنی اپنی وضع پر ایسی پاکیزہ تقریریں کیں کہ بے چارے کو تامل ہوا کہ کس کی مانوں اور کس کی نہ مانوں، آخر توفیقِ الٰہی اس کے شامل حال ہوئی اور اس نے عشرت کے مقابلے میں نیکی کو پسند کیا۔

اپنی پچھلی علالت میں جامع اوراق کو بھی کچھ ایسا ہی معاملہ پیش آیا، کہ ایک طرف صلائے عام اور دوسری طرف چارہ گروں کی نصیحت کہ اگر لکھنے پڑھنے کا مشغلہ نہ چھوڑا تو صحت کی خیر نہیں، اگر کچھ دن اور جینا چاہتے ہو تو صلائے عام کو خیرباد کہو۔

میں خوش ہوں اور شاید آپ بھی یہ سن کر خوش ہوں کہ توفیق الٰہی سے میں نے صلائے عام کی خدمت کو ترجیح دی اور فیصلہ کیا کہ؎

آتش دل از گریباں سر کشید
تا نفس باقی ست داماں میزنم

اپنی زبان کی محبت مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے کہ زندگی کا لطف زبان کے ساتھ ہے، ورنہ جینے کو تو جانور بھی جیتے ہیں؎

کس کو جی جانے سے ناصح تو ڈراتا ہے
یہی جاتا ہے محبت میں تو کیا جاتا ہے؟

موت میں محبت کا مزا شب ہجراں سے بھی بہت گیا گزرا سمجھا جاتا ہے۔ یہ داغ جو غیروں نے ہماری زبان پر لگا رکھا ہے کہ اردو میں کیا رکھا ہے؟ اگر مجھ جیسے ناتوان و ضعیف سے مٹ سکے تو اس خیال میں ہزار بار مرنا جینے سے افضل ہے؎

اس مرگ پہ سو جان مری صدقے کہ دم نزع
گھبرا کے کہے تو کہ بس اب دیکھیے کیا ہو!

اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل حال رہی تو جامع اوراق کی زندگی تک تو صلائے عام ضرور جاری رہے گا؎

یہ ضد ہے تو اب لیجئے ہم بھی نہیں مرتے
کیا آپ کریں گے اگر اچھا نہ کریں گے

یہ ممکن نہیں کہ آپ ہندوستان کو اپنا وطن جانیں اور اردو کو اپنی زبان نہ

سمجھیں، نہ یہ ممکن ہے کہ اردو کو آپ اپنی زبان کہیں اور صلائے عام کی قدر نہ کریں اور صلائے عام کے لئے بھی یہ بات ناممکن ہے کہ آپ کی زبان کو کسی اور زبان سے گرنے دے ؎

وہ چال کیا کہ جس سے نہ برپا ہوں زلزلے
قامت وہ کیا جو آفتِ جانِ حزیں نہ ہو

صلائے عام سے یہ غرض نہیں کہ حقے کے دَم یا گنجفے کی بازی کا کام دے اس کے لئے پورا دل و دماغ درکار ہے۔ اس کے مضامین لکھنے میں جس قدر دل و دماغ کی ضرورت ہے اسی قدر ان کے پڑھنے ہیں، بلکہ لکھنے سے اس کے سمجھنے میں زیادہ لطف ہے کہ مضمون لکھنے میں تو خونِ جگر پینا ہوتا ہے اور سمجھنے میں نشۂ مے کی کیفیت ہے ؎

ذرا کاندھا تو دے دو تم بھی تا عالم میں شہرہ ہو
ہماری جاں فشانی کا، تمہاری قدردانی کا

صلائے عام جس طرح اب تک ترقی کرتا آیا اس سے زیادہ آگے کو کیوں نہ امید کی جائے۔ ہ مجھے تو اس کی ترقی کے سوا اور کوئی فکر ہی نہیں، آپ بھی قدردانی میں دریغ نہ کریں، پھر دیکھئے، آپ کی زبان کی لٹریچر کسی سے کم رہے تو میں گنہگار، جس قدر آپ اپنی زبان کی قدر کریں گے، اس کی طرف سے بے وفائی نہ ہوگی یہ دعویٰ آپ کی زبان کی طرف سے صلائے عام کا ہے اور اس کا ثبوت آپکے ذمے۔

شیخی تو حسن تیری بری لگتی ہے واللہ
اک تُو ہی تو ہے اہلِ وفا، اور نہیں تو!

(صلائے عام: انتخاب)

اُردوُ لٹریچر

شروع سے ہر زبان کے لٹریچر کے دو حصے سمجھے جاتے ہیں۔ نظم و نثر؛ نثر انسان کی روزمرہ کی زبان ہے جس کے بغیر آدمی کو چارہ نہیں، اور نظم تکلف کی چیز ہے۔ نثر کی ضرورت ہر وقت ہے اور نظم، عیش کی طرح کبھی کبھی چاہیے۔ نثر کی یہ مثل ہے کہ بہو بیٹیوں کی طرح زندگی کا دھندا اس سے چل رہا ہے اور نظم کا یہ حال ہے کہ جس طرح ناچ گانے کی محفلوں میں شاہدانِ بازاری و اربابِ نشاط کی ضرورت ہوتی ہے، اس کا رواج بھی عیش کے لئے موزوں ہے۔ ایک سے گھر کی رونق ہے تو دوسری سے محفل کی زینت، لیکن اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک کا چاہنے والا دوسرے کے کام کا نہیں رہتا، یہ بات بہت شاذ ہے کہ جو شعر اچھے کہے وہ نثر بھی ایسی ہی لکھ سکے۔ شعر میں تو غزل پر خاتمہ ہو گیا کہ دو مصرعوں میں دفتر کے دفتر ختم کر دیے۔

جستجو، اور پھر کمتر کی جستجو؛
کوشش، اور پھر غیر ممکن کے لئے

نثر میں یہ بہت دور میں بیان ہو سکتا تھا، خدا کی قدرت میں کسی نے کیا اچھا کہا ہے ؎

بد و نیک پر ان کے کیا اعتراض
جو چاہا کیا، جو کہا ہو گیا

اس سے بہتر نثر میں کوئی بیان کرسکتا ہے ؟ یا یہ بات نثر میں ادا ہو سکتی ہے جو اس شعر میں ہے ؎

وہم ہم خلوتیٔ غیر غلط ہے لیکن
کیوں مجھے چین ترے سایۂ ایوان میں نہیں

اسی لئے مجھے تعجب ہوتا ہے کہ جو لوگ ایسی پاکیزہ خیالی پر قادر ہوں، نثر میں کیوں عاری رہیں، لیکن مجھے اس وقت اردو کی شاعری کی تعریف میں لکھنا منظور نہیں، یہ دکھانا ہے کہ ہر زبان کی لٹریچر میں نثر کو زیادہ دخل ہے شاعری کو اگر اس کی شکل وصورت ادا و ناز کی وجہ سے محض جی بہلانے کے لئے چاہیئے تو نثر کی قدر بیاہی عورت کی طرح زیادہ کیجئے کہ اس سے گھر کی آبادی ہے۔ ہماری زبان کی بربادی کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے شاعری کو اس طرح چاہا جس طرح اہل عیش شاہدان بازاری کی محبت میں گھر کی عورتوں سے غافل ہو جاتے ہیں۔ اردو میں نثر کی طرف توجہ بہت کم کی گئی، جسے کچھ سوجھا وہ نظم کی طرف جھکا۔ ہر زبان کے لٹریچر میں پہلے نثر کو ترقی دینی چاہیئے، تمام کلاسیکل زبانیں اس لئے لاجواب سمجھی جاتی ہیں کہ انھوں نے نثر میں کمال کر دیا۔ نثر زبان کی حسن صورت ہے اور نظم محض زیور۔ پہلے شکل اچھی چاہیئے پھر زیور کا بھی لطف ہے۔ اچھی صورت پر انسان کا مرنے کو جی چاہتا ہے اور زیور چرانے کے لئے ہے، مرنے کے لئے نہیں۔

ہر زبان کی ترقی ایشیا میں بادشاہوں کی قدردانی پر منحصر رہی اور یورپ میں پبلک، یعنی اہل ملک پر، آجکل اردو لٹریچر کا مدار اخباروں پر آرہا ہے، یوں تو کچہریوں کی اردو علیحدہ ہے اور پادریوں کی علیحدہ ہے۔ لیکن اس سے اردو کی ترقی نہیں ہوسکتی، اردو کی ترقی کا تو صرف اخباروں پر مدار ہے۔ نظم

کے لئے تو دو چار گلدستے نکلتے ہیں اور نثر کے متفرق رسالے اور اخبار ہیں انگلستان میں بھی انگریزی نثر کی ترقی اخباروں اور متفرق رسالوں سے ہوئی؛ اس قسم کی نثر نے ایک طرز خاص اختیار کیا جس سے کریٹی سزم کا فن پیدا ہو گیا، یہ فن انگریزی میں کمال کو پہنچ گیا۔ ہمارے ہاں کی قدیم زبانوں میں اس فن کی طرف بہت کم توجہ ہوئی۔ عربی میں لٹریچر بڑے مرتبے کو پہنچی لیکن یورپ کے فلاسفر شاکی ہیں کہ اہل عرب کی ہائی کریٹی سیزم بہت کم ہے۔ نہ فارسی میں اس کا پتا چلتا ہے اردو میں اس کو تنقید کے نام سے شروع کیا ہے، لیکن ہنوز دلی دور است، ایام جہالت میں عرب تو رات دن ریگ بیاباں میں بسر کرنے اور تمام دنیا سے جدا رہنے کی وجہ سے معلومات علمی سے عاری رہے۔ اسلام کے عہد میں جب اور قوموں اور ملکوں سے واسطہ پڑا تب کچھ تحقیق کی طرف خیال ہوا اور ابھی تحقیق کمال کو نہ پہنچی تھی کہ یہ مشغلہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا، فارسی والے زلف وسنبل کے شوق میں اس قدر مبتلا رہے کہ انہیں مبالغے سے فرصت نہ ہوئی۔ کریٹی سیزم کے لئے غایت درجے کی تحقیق علمی اور معلوماتی ذخیرے کی ضرورت ہے۔ دماغ پاکیزہ اور ہر طرح کی غلطیوں سے پاک چاہیے۔ تعصب اور توہمات کا ذکر نہ ہو۔ نثر کی جان" ہائی کریٹی سیزم" ہے۔ اس کی گنجائش مجھے اخباروں اور رسالوں کے سوا اور کہیں دکھائی نہیں دیتی میں چاہتا ہوں کہ اردو میں ہائی کریٹی سیزم کا مسالا پیدا ہو اور یہ مسالا اخباروں کے ذریعے سے جمع ہو سکتا ہے۔

کریٹی سیزم کے لئے یہ زمانہ زیادہ موزوں ہے کہ معلومات تازہ کا جو ذخیرہ اس وقت میسر ہے، پہلے نہ تھا اور یہ بات زیادہ خوش ہونے کی ہے کہ زبان انگریزی میں اس فن کا مسالا بہت عمدہ ہے۔ اس فن میں ہم زبان انگریزی سے جس قدر مسالا چاہیں اپنی زبان میں لے لیں۔ زبان انگریزی کے اچھے واقف کاروں سے

آپ پوچھ لیں کہ میرا بیان صحیح ہے یا غلط۔

یہاں آپ کہیں گے کہ اس بکنے سے فائدہ؟ تم یہ بات ہم سے کیوں کہہ رہے ہو؟ کچھ کرکے دکھاؤ۔ اس کے جواب میں یہ عرض ہے کہ اس کی تعمیل میں مجھے دریغ نہیں، لیکن یہ فن مجھ سے اکیلے میری آرزو کے موافق ممکن نہیں، اس کے لئے اور اہل کمال بھی متوجہ ہوں۔

خمُ خانۂ جاوید

خم خانے میں کیا لطف ہے کیا مانگ ہے ساقی آواز چلی آتی ہے لا اور پلا اور

پیو بھی پلاؤ بھی اس کا مزا ہے

یہ شیشہ بھرا ہے، یہ ساغر دھرا ہے

(حضور آصف شہریار دکن)

یہ تقریب اس بات کی ہے کہ خم خانۂ جاوید میں نے ابھی ایک کرمفرما کی عنایت سے دیکھا، دیکھ کر جی بہت خوش ہوا، ایسے مشغلے جاری رہیں تو ہم اپنی زبان کی بے قدری کو نہ روئیں۔ خم خانۂ جاوید اچھا تذکرہ ہے اور بہت اہتمام سے تیار ہو رہا ہے۔ اس زمانے میں شعر و شاعری کے پوچھنے والے بہت کم رہ گئے تھے، خدا کا شکر ہے جس نے صاحب خم خانۂ جاوید[1] کے سے قدردان پیدا کر دیئے۔ تذکرے تو میں نے اکثر دیکھے۔ خم خانۂ جاوید میں اس فن کے لوگوں کے ساتھ محنت زیادہ کی گئی ہے۔ اس میں صرف نامور شاعروں ہی کا ذکر نہیں جس کا حال مصنف کو ذرا بھی معلوم ہوا اس کا ذکر اس میں ضرور کر دیا۔ اس فن

---

[1] لالہ سری رام

کے امتیاز کا خیال بہت نہیں کیا۔ شاعروں کی یہ خاطر دیکھ کر مجھے اپنے شعر نہ کہنے کا افسوس ہوا کہ شعر کہنا جانتا تو میرا بھی خم خانہ میں نام ہوتا لیکن میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سے ڈرا ہوا تھا جنھوں نے گلشن بے خار میں نظیر اکبر آبادی کو شاعروں میں نہیں رکھا۔

میرا عقیدہ شعر و شاعری میں یہ ہے کہ شاعری ہو تو کمال کی ورنہ ہر رطب و یابس کو شعر نہ کہنا چاہیے۔ اس جلد میں جو پورے تذکرے کی صرف الف ب سمجھئے، یعنی اس میں صرف ان دو حرفوں کے نام کے شاعروں کا ذکر آیا ہے جن کی تعداد قریب ۶½ سو کے پہنچ گئی۔ اس حساب سے باقی دو جلدوں میں اندازاً تین چار ہزار نام اور آئیں گے۔ ان میں سے آپ ہی بتائیں کہ اب زمانہ کو کے نام یاد رہیں گے۔ اب بھی صرف چند اساتذہ کے نام زبان زد ہیں باقی لوگوں کے خیال میں نہیں رہے۔

شعر سے غرض سننے والوں کی یہ ہوتی ہے کہ گھڑی بھر کے لئے جی خوش ہو جائے اور شاعر کو یہ شوق ہوتا ہے کہ واہ واہ سنے۔ اب زمانہ دن بدن تنگ ہوتا جاتا ہے اگر زمانے کی طرف سے فرصت اتنی ہی سمجھیے کہ جتنی پہلے تھی تو بھی ا ور ضرورتیں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ شعر کے سننے والوں کو اتنا وقت نہیں ملتا کہ اچھے کلام کی داد دے سکیں۔ پھر سارے شاعروں کا کلام کون سنے اور اگر فرض کیا کہ سب کا کلام اچھا ہے تو جب شاعری کی کثرت ہوئی تو محض زیادتی سے ہر چیز، گو سامان نشاط میں ہو، اجیرن ہو جاتی ہے، جہاں ہر چیز کی حد ہے، انسان کے شوق کی بھی حد ہے، نرا شوق کب تک ساتھ دیگا، میں دیکھتا ہوں کہ اگلے تذکروں میں اتنے شاعروں کے نام نہیں جتنے کہ اس تذکرے میں ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ شاعروں کی تعداد ترقی پر ہے، غدر کے بعد مجھے گمان تھا کہ شاعروں کی تعداد کم ہو جائے گی کیونکہ علوم انگریزی کے سامنے اردو شاعری بھلا کیا پنپتی، نہ اس کی قدر کی کوئی وجہ معلوم ہوتی ہے لیکن اتفاق سے ان دنوں شاعروں کی تعداد زیادہ ہے اور اگر یہی شرح اس کی ترقی کی رہی تو شعر کے سننے والوں سے شعر کے کہنے والے زیادہ ہو جائیں گے اور دنیا کا کوئی کام نہ ہو سکے گا۔ مگر یہ بحث پہلی

جلد سے متعلق نہیں۔ جب ساری جلدیں اس تذکرے کی شائع ہو جائیں گی۔ اس وقت اس کا ذکر مناسب ہوگا۔ اس وقت تو مجھے صرف جلد اول کی نسبت لکھنا ہے۔ اس کی قدر سے دیباچے میں مصنف نے نثر معمولی لکھی بلکہ شعر و سخن کے مرتبے سے گری ہوئی۔ اس سے تو تقریظیں دھوم کی ہیں۔ دیباچے کے شروع فقرے میں ہے کہ "اوس سے منہ موڑے سرتی ہے"۔ "سرتی" خم خانہ کے لب ولہجہ سے نہیں ملتی، خاص کر جہاں ایسے لفظ ہوں جیسے "مذاق سخن" "دامن گیر" "گلوگیر"۔ ابکے جو خمخانہ چھپے تو اس کی رعایت سے اہل سخن سے پہلے ساقی نامے لکھوالئے جائیں کہ کچھ تو نام کی رعایت ہو، اس بہانے سے ساقی نامے اردو میں جمع ہو جائینگے کیونکہ اردو شاعری نے بالکل فارسی کا ڈھنگ اختیار کیا، جس میں کمال شاعری ساقی ناموں میں دکھایا گیا ہے۔ فارسی کے چند ساقی ناموں کے نام میں عرض کرتا ہوں۔ ظہوری، غیاثائے شیرازی، ملا منیر لاہوری، ملا محمد حسین، ملا صبحی، مرزا بیدل، ملا مجرم، ملا مرشد، رونقی میر عزوری، ہمتائی۔ میر علاء الملک، شکیبی، اقدسی، سید محمد بھکری، رکنائی، رکنا بادی میر نظام، دست غیب، میر طائر، ابراہیم ادھم، ملا محب علی، ملا ذہنی، مشرقی، فضولی مرزا رضی دانش۔ ابوی۔ میر محمد عزت، میر محمد جعفر، جرأت وغیرہ، ان کے کلام سے خم خانہ کی رعایت سے مے خانے کی صفت میں یہ شعر سننے کے قابل ہیں،

دل من ز مے خانہ بوئے شمید — حذر کن کہ دیوانہ ہوئے شنید — مرزا رضی دانش

چہ مے خانہ باغِ پراز سرو گل — صراحیش سرو گلشن جام مُل — میر علاء الملک

چہ مے خانہ قصر فلک منظرش — بود ماہ نو حلقۂ بر درش — عزت

چہ مے خانہ آرام گاہ حضور — درو تا ابد پائے در گل سرور — رونقی

چہ مے خانہ خرم بہشتی نباز — درو ہرچہ خواہی بود غیر آز — غیاثائی

چہ مے خانہ خلد بریں پیکراں — مصفا پر از سینۂ دلبراں — عزت

چہ مے خانہ خرج تمام آفتاب — چہ مے خانہ فانوس شمع شراب — جرأت

شمال و صبا خاکروب فضا | ز حجّاب درگہ بیچے رحبا | ظہوری
در از سدرۂ بوستان ثواب | ز گلمیخش روشناس آفتاب | ظہوری
شکوہے بچشم خلایق نمود | کہ زو نگزرد محتسب بے سجود | ظہوری
بنازم باں قصر عالیجناب | کہ بر درگہش خضر پاشیدہ آب | ظہوری

وِکرم اُروسی

ازگلشن زمانہ چہ گلدستہ بستۂ
دامِ کہ گشتۂ زخیالِ کہ جستۂ

اردو میں وکرم اُروسی کے دیکھنے سے طبیعت کو جو لطف حاصل ہوا اسکا عوض مجھ سے یہی ہوسکتا ہے کہ اوروں کو اس کی تعریف سے خوش کر دوں۔ اس بہانے سے کالیداس جیسے صاحبِ کمال سے ملنا نصیب ہوا جاتا ہے۔

کہن صحرانورد وادیٔ عشق، | دریں وادی دلیلش ہادیٔ عشق
جہاں پیمودۂ آگ زکالے | زغم فرسودۂ کامل عیالے
زجزو آشنائی نکتہ دانی | رموز عشق را روشن بیانی

آپ ہی انصاف کریں ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

کہ دریائے دلش از گل عذالے | بود خارے بدامن گیر خارے
زخود رائی جفائے دیدہ باشد | جفا از بے وفائی دیدہ باشد
شب ہجرش جگر خوں کردہ باشد | ز رنگش چہرہ گلگوں کردہ باشد
دلش را خوردہ باشد شیشہ بر سنگ | رخ از غم کردہ باشد کہربا رنگ

بہ بے کوئے بت بیہودہ باشد — حسیں بر خاک پائے سودہ باشد
برخسارنگاہے کردہ باشد — بدل در دیدہ آہے کردہ باشد

کالی داس سا لکھنے والا اور اروسی سی شیریں ادا، نزاکت خیال اور حسن مقال کا کیا کہنا، نامی نے شیریں کی تعریف میں جو لکھا ہے کہ

چو شیریں شہرہ شد در دل ربائی
غرورش کرد دعوائے خدائی

یہ دعویٰ اروسی کو زیب دیتا ہے کہ کس طرح پیدا ہوئی اور کہاں رہی۔ کالیداس نے اس تماشے میں اس کو جا بجا دیبی لکھا ہے ؂

بلے خوباں خدائے عاشقانند
و لے اسم خداوندی ندانند

کالی داس و اروسی سے تقریب ملاقات کے بعد اس ڈراما کی نازک خیالیاں سن لیجئے کیوں کہ ؂ — چو اسباب جنیں آمادہ باشد
ستم باشد کہ در فرصت زدہ باشد

(۱) رتھ کی تیز رفتاری دیکھیے کہ گرد ڈر کے آگے نکل جانے کے بعد بھی پکڑ لینا بھی کچھ بات نہیں ہے۔

(۲) رات کو آگ اور دھوئیں سے پاک ہو کر زیادہ روشنی دیتی ہے۔

(۳) اروسی کو راجہ جب راکششوں (جنوں) سے چھڑا لائے تو راجہ پر نظر پڑتی ہے اروسی کیا کہتی ہے، مجھے الٹا راکششوں کا ممنون ہونا پڑا،

رسم ست کہن کہ شحنۂ عشق
ہشیار بجائے مست گیرد

(۴) اروسی آسمان کو جاتے وقت (کسی قدر جھجک کر) کہتی ہے کہ او ہو میری موتیوں کی مالا اس کم بخت بیل میں الجھ گئی (اور اس بہانے سے مڑ کر راجہ کی طرف دیکھتی ہے)

"میری اچھی چترلیکھا، ذرا چھڑانا۔ چترلیکھا جواب دیتی ہے کہ ابھی بھی بے ڈھب ہے"
اس پر آروسی کہتی ہے" ابھی جو تم نے کہا تھا اسے دل میں رکھنا۔

گفتا کہ مگو رازِ عشقم بہ کسے
من باکہ نگویم ہمہ کس میداند

(۵) سین (موقع) یہ ہے کہ رانی نے راجہ کے ہمراز برہمن کے پاس اس غرض سے لونڈی بھیجی ہے کہ راجہ کا دھیان ان کی (رانی) کی طرف سے کچھ اڑا سا معلوم ہوتا ہے برہمن نے پوچھا کہ یہ بات کیسے معلوم ہوئی تو لونڈی نے بیان کیا کہ راجہ جی، رانی جی سے آروسی کے نام سے خطاب کر بیٹھے۔

گفتگوئے عشق خود مشاطۂ راز خود است
شانہ را در زلف ایں افسانہ پنہاں کردہ اند

(۶) ہمراز برہمن راجہ سے پوچھتا ہے کہ آروسی کی نظر کبھی حضور پر بھی پڑی۔ راجہ جی جواب دیتے ہیں کہ پڑی بھی تو کیا ہوا۔ برہمن کیا معقول جواب دیتا ہے کہ اگر یہ ایسا ہوا تو آپ اس قدر اضطراب نہ کریں۔ ع

نوجواں ہیں انھیں خود سیکڑوں ارماں ہوں گے

(۷) کالیداس نے شکنتلا میں شکنتلا کی طرف سے راجہ کو جو خط لکھا ہے اسے میں نے لاجواب سمجھ رکھا ہے، جس میں شکنتلا کی طرف سے شکایت ہے کہ راجہ ہو کر تم چوری کرتے ہو کہ ہم جیسی کم سن لڑکیوں کے دل چرالتے ہو، راجاؤں کا کام تو چوریاں بند کرنے کا ہے نہ کہ خود چوری کریں، اور چوری بھی ہم جیسی گرفتاران محبت کی۔ مگر آروسی کا خط بھی بڑے درد کا ہے کہ اگر تمہیں میری طرف سے سردمہری کی شکایت ہے تو پھر میری جان میں یہ آگ کیسی لگی ہوئی ہے ؎

اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی
شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ

(۸) اردسی کے جانے کے بعد راجہ کہتے ہیں کہ اردسی کو بھی مجھ سے محبت ہے کیونکہ وہ جاتے وقت اپنے جسم کی تو مالک نہ تھی مگر اپنا دل جو اس کے اختیار میں تھا اپنی سرد آہوں کی وساطت سے جو اس کے سینے میں بار بار اچھلنے سے ظاہر تھیں، میرے حوالے کر گئی۔

(۹) رانی کے من جانے کی امید ہے کہ وہ میری منت سماجت کی تحقیر کر گئی ہے، اس لئے مجھے اس سے پوری امید ہے۔

(۱۰) رانی کا اس وقت چلا جانا ہی اچھا ہوا" جس شخص کی آنکھیں دکھتی ہوں وہ چراغ کی تاب نہیں لا سکتا، لیکن ایسی ایسی نازک خیالیوں کی تفصیل کہاں تک لکھی جائے، سارا ڈراما مجھے نقل کرنا پڑیگا۔

کس راہِ چمن نہ بستہ آما

بیروں زچمن نمی تواں رفت

لیکن آخر کی دعا ضرور سن لیجئے۔

" کاش نیکوں کے بھلے کے لئے دولت اور علم میں جو شاذ ہی ایک جگہ جمع پائے جاتے ہیں اور اکثر برسر جنگ رہتے ہیں. ہمیشہ کے لئے اتفاق ہو جائے۔" ع

اے میوۂ امید فرود آئے خود ز شاخ

یا آں کہ دست کوتۂ ما را دراز کن!

مولوی محمد عزیز مرزا صاحب کا ہم پر بڑا احسان ہے، جن کی محنت اور لیاقت سے یہ ڈراما ہمیں نصیب ہوا، یہ اتفاق کی بات ہے کہ خم قارۂ جاوید کے مصنف اہل ہنود میں سے ہوں اور وکرم اروسی کے مترجم مسلمانوں میں سے، اس سے زیادہ کیا اہل عالم کی خوبیٔ اتحاد کی دلیل ہوسکتی ہے ع

سجودِ آشنائی کن دلے را

کہ ذوقِ صحبتِ بیگانہ داند

مجھے شکایت ہے تو اس بات کی کہ مترجم کی طبیعت مصنف کی سی نہیں، مترجم کی زبان سنسکرت کی تحصیل اگر کامل نہیں تو اردو بھی لاجواب نہیں، اور شعروشاعری سے تو محبت معلوم نہیں ہوتی۔

صفحہ ۲۹ کے فٹ نوٹ میں جو اروسی کا نامۂ محبت نظم کیا ہے اس سے نثر اچھی ہے "مکاشفہ کی جگہ" "تاثیرِ محبت" بہتر تھا، ورشک کو ہمراز برہمن کی بجائے راجہ کا ندیم، ہم نشیں یا رازداں کہا ہوتا۔

صفحہ ۲۲ سطر ۱۳ " گویا کہ بسنت اٹھتی جوانی اور شباب کے درمیانی زمانے کی بہار دکھا رہا ہے۔

کچھ جوانی کی ادا کچھ ہے لڑکپن ان کا
دو دغا بازوں کے قبضے میں ہے جوبن ان کا

صفحہ ۲۷، سطر ۲ اروسی کی زبان سے ہے کہ " او بے قرار دل، ذرا اب تو مطمئن ہو" یار کی زبان سے ایسا موٹا لفظ " مطمئن" ٹھیک نہیں۔ یہ کہنا بہتر تھا کہ اب تو ٹھہر ع

دکھاتے ہیں تماشا برقِ رخسارِ درخشاں کا
ٹھہر اے بے قراری ہم تری تدبیر کرتے ہیں

صفحہ ۴۳، فٹ نوٹ - یہ شرم و حیا کی تصویر قابل دید ہے، یہاں پر یہ کہنا تھا کہ ع

یاد چشمت چو بسیر دل ملامے آید
نفس از سینہ بہ لب مست حیامے آید

صفحہ ۶۰، سطر ۷ " راجہ مجنونوں کے لباس میں آتا ہے" مجنونوں سے دیوانہ بہتر ہے کہ مجنوں کے لئے لیلی چاہیے - ع

در صحرا بروئے ما کشودند کلید خانۂ دیوانہ دادند

گو ایسی باریکیاں اگر مترجم سے نہ نبھ سکیں تو نہ سہی تو بھی یہ بات تعریف کی مستحق ہے کہ ڈرامے پر مولوی صاحب نے بہت پاکیزہ مقدمہ لکھا۔ اس کا ریویو اگر نظر انداز کیا جائے تو انصاف سے بعید ہے لیکن وکرم اروسی نے اس قدر جگہ لے لی کہ ڈرامے کی بحث کے لئے علیحدہ مضمون لکھنا مناسب ہے۔

وکرم اروسی کے لئے تو مترجم نے یہ کیا کہ گویا آتش شوق دلوں میں پیدا کر دی، میں نے اس ریویو سے وہ آگ بھڑکا دی جس طرح تھوڑی آگ ہو تو دامن کی حرکت سے زیادہ بھڑک جاتی ہے ؎

گوہر چشم ترم را آب و رنگِ دیگر ست
مصلحت مے بارد از تحریف نیساں کردنم

(صلائے عام شمارۂ اول ۱۹۰۸ء)

زندگی کی شام

جوانی گو بڑی نعمت ہو، مگر جوانی کے بعد جو عمر ہو لطف سے خالی نہیں، دن گو کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، شام کو غروب کے وقت عجیب سماں ہوتا ہے، پرندے جو فضائے آسمانی میں پھرتے رہے شام کو اپنے بسیروں کی طرف چلے، جانور جو دن بھر کھیتوں میدانوں میں چرتے رہے، شام کو اپنے اپنے گھروں کو مڑے، دن ڈھلا اور کسانوں نے گٹھریاں باندھیں کہ دن بھر کی محنت کا حاصل اپنے گھروں کو لے جائیں، آفتاب جس کے دیکھنے کی دن میں تاب نہ آئے شام کو کتنا اچھا معلوم ہوتا ہے، دن بھر نگاہوں کو خیرہ کرتا رہا، اس وقت نگاہوں کو خوش کر رہا ہے، جب تک عروج پر تھا، گویا غصے میں تھا، نقابِ شام میں یار کے رخ و گیسو کو شرمانے لگا، اس لئے مصور جنھیں اپنا کمال دکھانا ہوتا ہے غروبِ آفتاب کا وقت پسند کرتے ہیں کہ دوپہر کی تیزی نیچر کے خدوخال کے لئے مناسب نہیں۔

دن تو دنیا کے خیال میں کٹ گیا، شام کو ہمیں اپنا خیال آیا کہ چلو آرام کریں، در و دیوار دھندلے ہوئے تو ہم اپنے تئیں نظر آئے، تمام دن غیروں کا ساتھ تھا تو اب اپنا ساتھ ہے، حرارتِ شباب رخصت ہوئی نگاہوں میں ٹھنڈک آگئی، مسافر کو وطن یاد آیا، فرقت زدہ کو خیالِ یار ہوا، بچے دن بھر کھیلتے رہے، شام اپنی ماؤں کی گود کی طرف ہاتھ بڑھانے لگے، دن بھر ہمیں عالم خاک یعنی زمین سے واسطہ رہا شام کو عالم بالا یعنی آسمان کا لطف نظر آنے لگا کہ چپ چاپ بے گنتی تارے، ثوابت و سیارے

آنکھوں کے سامنے آگئے۔ یہی آسمان جس کی طرف آفتاب کے ڈر سے دن بھر آنکھ اٹھا کر دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس وقت لبانِ نقشِ تمنا کیسا دلکش ہو رہا ہے، گویا نقش کا چمن کھل رہا ہے۔

اگر دن کے بعد شام نہ ہوتی تو انسان کی زندگی اجیرن ہو جاتی۔ شمعیں کافوری صراحیاں بلوری، ساغر و سبو، عارض و گیسو، گلہائے مشکبو سب بیکار رہ جاتے ہیں شام کیا ہے؟ دن بھر کا خلاصہ ہے، یا یوں سمجھیے کہ سارا دن سمٹ کر شام میں سما گیا۔ اس تھوڑے سے وقت میں سارے دن کا مزہ آگیا ع دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشا گزری کا

اس وقت آپ میری شوخ بیانی معاف فرمائیں کہ آج مجھے جوانوں سے بازی لینی ہے۔ جوانوں کو بہار میں جنوں ہوتے سنا ہے۔ یہاں خزاں میں جنوں ہو رہا ہے

غافل مشو ز نشۂ عشقِ کہن اساس

چنداں کہ سال خوردہ شود نوجواں بود

جوانی کا بڑا مشغلہ عشق و محبت سمجھا جاتا ہے لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جوانی نے حسینانِ ماہ وش کا بھی ساتھ نہ دیا ع

عمر رواں جو تیز چلی، جلد کٹ گئی

اس کے برخلاف بڑھاپا قبر تک ساتھ ہے ؎

کرنی ہے روشنی مجھے کنجِ مزار میں

اے دل چراغِ داغِ محبت بڑھے نہیں

جوانوں کا دل کبھی چہِ ذقن میں سنا، کبھی زلفِ پرشکن میں دیکھا اور ہمارا دل ہمارے پاس ہے، جوانوں کو بڑھاپا نصیب نہیں اور جوانی ہماری دیکھی بھالی ہے، جوانی میں عشق و محبت کا لطف اس لئے بے کار گیا کہ جنوں تھا اور جنوں کا علاج معلوم نہ تھا، جوانی گئی تو وصل و ہجر ایک ہو گیا جو حاصلِ محبت ہے۔ ؎

ثنائے گیسو و عارض مرے سخن میں نہیں

کمر میں بحث نہیں، گفتگو دہن میں نہیں

لیکن جس طرح چاہنے والوں کو اپنے خط و خال کی خوبی سے حسن یار زیادہ پسند ہے، مجھے اپنی جوانی سے اوروں کی جوانی زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے اور اسی بہانے سے میں نے اپنی طبیعت کی جوانی کا مزہ لے لیا۔

گر پڑکے اس گلی میں پہنچتا ہے بار بار　　ہمت کا خاتمہ ہے ہمارے غبار پر

یہ تو شاعرانہ گفتگو تھی، فلسفیانہ سنیے ؎

بیان بے ثباتِ گل تو اک تمہید تھی گویا

بہت کچھ ہم کو کہنا ہے ابھی تو ہم صفیروں سے

ہم نہیں جانتے کہ زمانہ شروع سے کیوں بدنام ہے، سب اسی کی جان کو روتے آئے۔ کوئی سمجھے ہوئے ہے کہ جس قدر بڑھتا جاتا ہے درست ہوتا جاتا ہے، کسی کا گمان ہے کہ جس قدر گزر گیا اچھا تھا، غرض اس کا بڑھنا اور گھٹنا دونوں موردِ الزام آفات ہیں بلائے صحبت لیلیٰ و فرقت لیلیٰ، کی طرح اس بے چارے کو چین نہیں، لڑکے چاہتے ہیں کہ کہیں جلد ہی جوان ہوں تو آدمیوں میں شمار ہوں، جوان اس فکر میں ہیں کہ خدا عمر دے تو دنیا کو جی بھر کے دیکھ لیں، زمانے میں جوان مرگ سے زیادہ کسی کا ماتم نہیں، بوڑھوں سے پوچھیے تو کہتے ہیں —— جوانی مگو زندگانی بگو —— جوانوں کو جب لڑکپن کی بے فکریاں یاد آتی ہیں تو سر پیٹتے ہیں کہ وہ وقت اب کہاں، کبھی یہ حال ہے کہ بوڑھے جوانوں کو اسی نظر حقارت سے دیکھ رہے ہیں جس سے جوان بچوں کو دیکھتے نظر آتے ہیں کہ ابھی ہیں کیا؟ ان کی بساط کیا؟ ان کا اعتبار کیا؟ میں نے اکثر بوڑھوں کو بڑی حسرت سے یہ کہتے سنا ہے کہ ہائے جوانی! میں کہہ نہیں سکتا کہ بوڑھے کیوں جوانی کی ہوس کریں، ہر شخص جو بڑھاپے کو پہنچا، ایک دفعہ جوانی دیکھ چکا ہے۔ ہر شخص کو درازیٔ عمر کی آرزو ہے۔

لیکن بڑھاپے بغیر درازئی عمر ممکن نہیں، اور کوئی جوان اپنی جان کا دشمن نہیں جو بڑھاپے کا آرزومند نہ ہو۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک کو جوانی پر رشک آرہا ہے، دوسرا بڑھاپے کو حقیر سمجھے ہوئے ہے ؟

ترا واقف ز پیری پشت خم شد
بنہ ہر طاق اکنوں میرزائی

میں ثابت کیا چاہتا ہوں کہ جوانوں کا بڑھاپے کو خوار سمجھنا اسی قدر حماقت ہے جس قدر بوڑھوں کو جوانی کی ہوس کرنا، جو شخص جوانی میں شباب کی حماقت سے بچا رہا بڑھاپے کو کیوں برا سمجھے گا اور جسے عالم شباب کی حرکتوں کی پھر ہوس نہ ہو اسے جوانی کی حسرت کیوں ہو۔

سودا مکن بہ زلف کہ ایں کج معاملہ
ما را تمام عمر پریشاں نگاہ داشت

بوڑھوں کو جوانی اس وقت یاد آتی ہے جب کہ کوئی حرکت ناشائستہ عالم شباب میں کر گزرے وہ اب نہیں ہو سکتی، ان سے پوچھیے کہ ان دنوں ایسی حرکتوں کا نتیجہ کیا ملا جو اس کی ہوس پھر کی جائے بلکہ خوش ہونا چاہیے کہ خجالتِ دوبارہ سے خدا نے بچایا، عالمِ اسباب میں شیاطین و بھوت پریت کے سوا سب کے ساتھ بڑھاپا لگا ہوا ہے۔ انسان کا بڑھاپے پر افسوس کرنا کارخانۂ ایزدی میں گویا عیب لگانا ہے۔ یہ بھی جانے دیجئے۔ مسافرت کے لئے کتنا غنیمت ہوتا ہے جب کہ سفر میں چلتے چلتے آفتاب کی تیزی کم ہو جائے اور دن ڈھلنے لگے۔ ڈھلتی دھوپ میں آدمی آرام سے چل سکتا ہے، حرارت شباب میں جب دھوپ تیز ہو تو سفر کتنا مشکل ہو جاتا ہے آفتاب کی تپش میں چلنا انسان کے لیے کیسی مصیبت ہے، میں نہیں کہہ سکتا کہ جوانی کا خیال ہمیں بڑھاپے میں کیوں ستائے۔

چوں پیر گشتہ ام غزل عاشقانہ چیست
آتش فرو نشست دگر ایں زبانہ چیست

تپ میں جو دردِ سر ہو، تپ اترنے کے بعد یاد آئے تو پھر کیا اسی حالت کی ہوس ہوتی ہے، شباب کو اگر ہر طرح اچھا ہی سمجھیے تو بھی دورانِ سر کے برابر ہے جو تپ میں لاحق ہوتا ہے۔ اگر اس وقت وہ ہذیان نہ ہو تو کیا زندگی تلخ ہو جاتی ہے؟ جو شخص گرمی میں لُو کے صدمے سے ایک مرتبہ مرتے مرتے بچے کیا اسے پھر ہوس ہوتی ہے کہ ہائے وہ بادِ سموم نہیں، وہ ہوائے گرم کہاں؟ یا جسے سرسام ہوا ہو وہ چاہے کہ ہر وقت وہی ہذیان رہے، جوانی ان حالتوں سے کم نہیں، ان کا بڑا ہنر حضرتِ عشق ہیں جن کا کمال جنوں ہے ع

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

میں خوش ہوں کہ زمانے کو بوڑھے سے نسبت دیتے ہیں۔ یہ وقت انسان کے لئے بہت غنیمت ہے کہ ولولہ ہائے سکبر جو اپنے زور میں مدت تک جادۂ طاعت سے منحرف رہے، اس وقت پھر پھرا کے عقل کے دروازے پر آپڑے، کسی حرکت ناشائستہ کو دل چاہے بھی تو بوا عقل میاں تجربہ خاں کے حوالے کر دیتی ہیں، میاں تجربہ خاں وہ زمانہ دیدہ ہیں کہ انہیں ساری باتیں ایک ایک کرکے یاد ہیں، اس عمر میں حافظہ ہی حافظ رہ گیا ہے اور کانوں سے ایسے بہرے ہیں کہ کسی کی نہیں سنتے، پیری و صد عیب۔ جس نے کہا غلط کہا، اس وقت تو ہنر ہی ہنر رہ جاتے ہیں، عیب تو اپنے جوش میں زورِ جوانی کے ساتھ چلے گئے کہ جب صاحبِ خانہ میں ان کے رکھنے کی طاقت ہی نہیں تو رہ کے کیا کریں ؎

یہ تو ممکن ہی نہیں دل لگے اور جان بچے
صاحبِ خانہ پہ آفت ہو و مہمان بچے

رہا موت کا اندیشہ کہ بوڑھوں کو جلدی مرنے کا ڈر ہوتا ہے، یہ بھی وعدۂ جاناں کی طرح بے ثبات ہے، طبیبوں سے پوچھیے کہ جوانوں کو بوڑھوں کی نسبت زیادہ بیماریاں

ہوتی ہیں اور سخت تپ میں امراض باردہ سے امراض حادّہ زیادہ ہیں اور مہلک۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عشق کے سوا بھی جوانوں کو مرنے کے بہت سے سامان ہیں۔ بڑھاپے کی صرف دو چار بیماریاں سخت ہیں، ان سے احتیاط کیجیے تو ہم ہیں اور عمر نوح، یہ بات اس لئے کہتا ہوں کہ میں نے ایک بڑھیا سے پوچھا، جس کی عمر بہت زیادہ نظر آئی کہ بی بی تمہاری کیا عمر ہوگی، جواب دیا، بیٹا خدا جانے سَو برس کی ہو، ہزار برس کی ہو۔" اس سے مطلب یہ کہ بڑھیاں اپنی عمر بھی اس طرح بھول جاتی ہیں گویا کبھی مرنا ہی نہیں، اور سچ پوچھیے تو جوانی سے نکلنا گویا عمر کا اجارہ لینا ہے کہ جس طرح حکیم جی کسی سخت بیمار کی نسبت کہہ جاتے ہیں کہ آج کی رات بچ گیا تو جاننا کہ زندگی ہے۔ یہ بوڑھے وہی لوگ ہیں جو اس رات کو بچ گئے، جوانو! تمہیں ابھی یہ رات جھیلنی ہے، یہ رات غضب کی ہے ؎

وہ شب جو ہے خال روئے شامت
یا مردم دیدۂ قیامت

(صلائے عام۔ شمارۂ اول، ۱۹۰۳ء)

نثر بمقابلہ نظم

صلائے عام کے پہلے پرچے سے میری یہ غرض تھی کہ دو ایک مضمون اچھے لکھنے والوں کے سامنے پیش کئے جائیں تاکہ جو لوگ اس طرز کو پسند کریں تو اس طرز پر لکھیں، نہیں تو جو طرز جس کو پسند ہو اس پر لکھے۔ جواب میں میرے پاس کلام نظم زیادہ آیا اور نثر نہ ہونے کے برابر، حالانکہ اس وقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے ؎

اثر زاری مجنوں ہمہ ایں بود کہ زود

از فغاں ناقہ بوجد آید و محمل برود

دنیا میں ہر ملک و قوم کے لٹریچر کا مدار نثر پر سمجھا گیا ہے اور اردو میں اسی کی کمی نظر آتی ہے۔ نظم میں شاعری کا کمال غزل میں ہے کہ شعر کے دو مختصر مصرعوں میں سارا مضمون ختم ہو گیا، ہے تو یہ کمال کی بات، لیکن درحقیقت عبارت آرائی کی ہزار دقتوں سے بچنے کے لئے بھی کبھی یکی رسوئی سے گزارا ہو جاتا ہے، ادائے بیاں کی مشکلوں سے بچنے کے لئے نظم کی ترکیب بری نہیں لیکن نرے تاگے جمع کرنے کا نام کپڑا نہیں۔ محنت اس میں ہے کہ سوت کو تانے بانے میں کھپا کر قاعدے سے پورا تھان بُنا جائے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ دنیا کی تمام ضرورتوں کا مدار نثر پر ہے، خرید و فروخت، حساب کتاب، تمسک و قبالے، علاج معالجے، موت و زندگی کے جھگڑے سب نثر میں طے ہوتے ہیں، نظم کو سمجھنے والے نثر کے سمجھنے والوں سے ہمیشہ کم دیکھے اور نثر کی سمجھنے والی تمام دنیا ہے بلکہ شاعر خود اپنی ضروریات میں نثر کے مقابلے میں نظم سے کم کام لیتے ہیں۔

آپ نے خیال کیا ہوگا کہ ہر قوم کے آغاز معاشرت میں نظم کا وجود پایا جاتا ہے جوں جوں وہ قوم ترقی کرتی ہے، نثر بھی ترقی کرتی جاتی ہے۔

ایام جہالت میں اہل عرب میں شاعری کا بہت زور رہا مگر جب قرآن نثر میں اترا اور اسلام نے علوم و فنون میں ترقی کی، نثر کا رواج بڑھ گیا،

کبھی یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ سوسائٹی کے آغاز میں نثر کی قدر نہیں ہوئی، وجہ یہ کہ شروع میں ہر سوسائٹی کی ضرورتیں تھوڑی ہوتی ہیں، ان کو یاد رکھنے کے لئے روزمرہ کے چند گر موزوں کر لیے جاتے ہیں، جس قدر سوسائٹی کی ترقی ہوتی ہے، معاشرت کی ضرورتیں بڑھتی ہیں جو قافیہ و ردیف میں نہیں سماتیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بچے لوریوں سے ایسے خوش ہوتے ہیں کہ نیند آجاتی ہے، پھر جوں جوں ہوش آتا ہے لوریاں فضول ہو جاتی ہیں۔

آغاز آفرینش میں جب انسان نے اپنا تعلق عالم بالا سے زیادہ سمجھ رکھا تھا، وہاں کے اسرار سمجھانے کے لئے نظم کو زیادہ موزوں قرار دیا۔ جب ہم نے دیکھا کہ ہمیں زمین سے زیادہ سروکار ہے اپنا لب ولہجہ بدلا جس کے لئے نثر سے کام لینا پڑا، عالم بالا سے رسم و راہ کیلئے نظم اچھی چیز ہے لیکن انسان کو انسان سے سروکار رکھنے کے لیے نثر ہی بکار آمد ہے۔

قوت ناطقہ میں میں نثر کو نظم سے زیادہ عجیب سمجھتا ہوں۔ جس شخص نے پہلے پہل کوئی مشکل بات نثر میں بیان کی ہوگی سب کو تعجب ہوا ہوگا۔ نظم میں تعلی و مبالغہ معمولی چیز ہے نثر میں ان کا نباہنا ذرا مشکل ہے، یہی وجہ ہے کہ قدیم الہامی کتابیں، اسرار آسمانی کی زیادہ تر نظم میں ہیں اور قرآن میں جو اسرار آسمانی نثر میں اترے تو معجزہ قرار پایا۔

کسی نے نظم و نثر کی نسبت کیا اچھی بات کہی ہے کہ عالم بالا کی خبر لانے اور ہاتف غیبی سے باتیں کرنے کے لئے نظم کو پَر قرار دیجئے، مگر نثر کو خدا نے پیر دیے ہیں کہ گو اڑ نہیں سکتی مگر دنیا میں چلنے پھرنے کے لئے پیر زیادہ بکار آمد ہیں، جس قوم

نے نثر میں ترقی نہیں کی اس کے پر نہیں، لیعنی دنیا میں اس کا ٹھہرنا مشکل ہے۔

اس پر مجھے خیال ہوا کہ کسی زبان کی لٹریچر نظم ہو یا نثر، بغیر پبلک کے، لیعنی اہل ملک کی قدر دانی کے چل نہیں سکتی اور گو یہ کہنے کی بات نہیں لیکن مجھے تو اردو لٹریچر کی قدر دانی کے سامان نظر نہیں آتے، پہلا پرچہ نکالنے کے بعد میں نے مضامین کا بہت انتظار کیا، کیونکہ جیسا پہلے عرض کیا گیا، صلائے عام سے میری غرض صرف یہی ہے کہ اور لوگ مضامین لکھیں، زیادہ عمر ہو جانے سے لکھنے پڑھنے کی مجھ میں بہت طاقت نہیں رہی اور سنا ہے کہ ؎

رسم ست کہ مالکان تحریر
آزاد کنند بندہ پیر

دوسرے جب کبھی معلومات علمی کا ذکر آتا ہے، اکثر سنا کرتا ہوں کہ اگلے کیا کچھ نہیں کر گئے، میں پوچھتا ہوں کہ وہ ذخیرہ اب کیوں نہیں نکالا جاتا، اگلے وقتوں میں تو محض علمائے دین پر تحقیق کا مدار تھا اور کسی خاص بحث کے خلاف کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا، اب تو ان کی تحقیق کے سوا ہر خاص و عام کو تحقیق کا موقع ہے، ان کا اور اپنا، اگلی اور پچھلی تحقیق کا نتیجہ جو کچھ ہو پبلش کیا جائے، لبعض ایسے مسئلے جو تحقیق طلب ہیں میں علیحدہ لکھتا ہوں جن پر طبع آزمائی کی جائے۔

یہ کہ اسلام سے دنیا کی تہذیب میں کیا اعانت ملی؟ قرآن کی نسبت جو پہلے خالق و مخلوق کی بحث میں فساد ہوئے اس کی کیا وجہ تھی؟ تصوف اور اہل شرع میں اختلاف جو تھا وہ کس طرح مٹا۔ اب اگر آجکل عقاید میں اختلاف ہے تو اس کے لئے اصلاح کی ضرورت ہے یا پھر سرے سے چلنے کی ــــ یہ مختصر خیالات میں نے تمثیلاً عرض کئے، ایسے اور بہت مسئلے ہیں جن کی تحقیق ازروئے انصاف کی جائے تو خاصا علمی ذخیرہ ہماری زبان میں جمع ہو جائے۔

تا، ز نو آراستہ گردد سخن
معنئ نو یابد و لفظِ کہن

(صلائے عام دوسرا شمارہ ۱۳۲۶ھ مطابق اکتوبر ۱۹۰۸ء)

ڈراما

وکرم اردسی کے ریویو میں میں نے اقرار کیا تھا کہ اس ڈراما کے مقدمے پر لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ مولوی صاحب[1] نے مقدمہ اچھا لکھا لیکن اس سے زیادہ "انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا" میں ڈراما کا مضمون ہے۔ اس لکھنے سے میری غرض یہ ہے کہ انگریزی خوانوں کے لیئے تو یہ محنت بیکار گئی ؎

فرنگستانی از ہر گردش چشم
کہ دارد لے مسلماناں کہ دارد

مقدمے کی زبان اچھی شروع کی گئی۔ پہلے ہی صفحے میں ایسے پاکیزہ لفظ دیکھے کہ "خانہ برانداز معاشرت"۔ "جنت نگاہ"۔ "فردوس ہوش"۔ اس سے گمان ہوا کہ شاید غالب کا کلام اس وقت پیش نظر تھا، اور خاص کر وہ غزل جس میں یہ شعر ہے کہ ؎

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ

اس کے ساتھ دوسرے مصرع کا لطف ہے کہ

یہ جنت نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

اور "فردوس ہوش" جو مولوی صاحب نے لکھا ٹھیک نہیں۔ آگے چل کر میرا گمان غلط نکلا کہ پھر یہ طرز بیاں نظر نہیں آیا بلکہ ایسی ترکیبیں ملیں جیسے کہ "لوکل کلر' یا مقامی رنگ وہ محض عدم موجودگی سے نمایاں نہ ہوتی"۔ (صفحہ ۳۰۸، سطر ۱۵) مگر اس وقت تکرار لفظی منظور نہیں، خیال یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ مسلمانوں نے اہل یونان کے علوم و فنون اپنی زبان

---

[1] مولوی عزیز مرزا

میں لئے ڈراما کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا ع

ننگ ہے گر زخت حاصل کند کام

بر دنام رخ خوباں بہ دشنام

وجہ یہ ہے کہ ڈراما کے لئے "پیگن ازم" (Paganism) یعنی غایت درجے صنم پرستی درکار ہے جس کے لئے یونانی "متھالاجی" یعنی " افسانہ ہائے بت و برہمن" موزوں تھے، یونانیوں اور ہندوؤں میں ڈراما ان کے عقائد مذہبی کے لئے بہت معین سمجھا گیا برخلاف اس کے مسلمانوں کو ڈراما سے بچ کر نکلنا پڑا کہ کسی کو بت پرستی کا شبہ نہ ہو۔ ع

چناں گزر ربیگانگاں زمن کایشان،

گماں کنند ترا با من آشنائی نیست

اس کے سوا پردے کی تاکید کو کیا کرتے کہ تمام دنیا کی قوموں میں اسلام ہی نے اسے ایجاد کیا اور یہی ڈراما بنا کر اس کی پردہ دری کرتے۔

غمگین و گردش فلک پردہ درنیم

جورِ بتانِ پردہ نشیں می کشد مرا

پھر آپ نے دیکھا کہ مسلمانوں کو عرب چھوڑ کر کہاں کہاں جانا پڑا۔ رات دن کی دوا دوش سے انہیں اس قدر آرام کب ملا کہ بیٹھ کر کمالِ عیش کی داد دیتے۔

بہ لذتے کہ نہاں در نگاہ پنہان ہست

بگو کہ یک دو سہ عمرِ ابد بہ من سازد

پہلے پہل تو عرب سے نکل کر شام پہنچے، یہاں خلفائے عباسیہ کو ذرا فرصت ملی جس میں یہ روزمرہ کے علوم و فنون کی طرف متوجہ ہوئے اور ابھی یہ مشغلہ پورا نہ ہونے پایا تھا کہ وہ بساط الٹ گئی۔ یورپ میں فتح اسپین کے بعد ذرا ہوش آیا تھا کہ زمانے کی نظر کھا گئی؟ ۵

چمن میں آیا جو صیاد واہ رے قسمت صبا جھکانے لگی شاخِ آشیاں میری

لیکن سب سے بڑا سبب یونانی ڈراما سے بے توجہی کا یہ ہے کہ عرب اپنی شاعری کے سامنے تمام دنیا کو گونگا (عجم) کہتے تھے، ان کا دعویٰ تھا کہ ہمارے سامنے کون منہ کھول سکتا ہے، ہم نے یونان کے اور علوم و فنون کی بڑی قدر کی مگر ان کی شاعری ہماری نظر میں کبھی نہ جچی ؎

رہینِ منتِ بدخوئیِ دلِ خویشم
بغیرِ من بہمہ عالم آشنائی کرد

جب یونانیوں کی شاعری ہی ہماری سمجھ میں نہ آئی تو ڈراما کو کون پوچھتا، میری بات آپ مانیں تو نہیں لیکن میں نے شعر کے سمجھنے میں چالیس پنیتالیس برس محنت کی ہے، یورپ کی تمام اگلی پچھلی شاعری ہمارے یہاں کے کلام کو نہیں پہنچتی، ہم ہر بات میں ناقص ہے لیکن شاعری میں ہمیں کوئی نہیں پہنچتا ؎

مشکیں خطاں برائے تماشائے خطِ تو
مشقِ نگاہ بر ورقِ لالہ می کنند

فرہاد کی سنگ تراشی کی تعریف میں ہے ؎

تراشد چوں شود دستش سبک پے
زلعلِ دلبراں آلائشش مے

شیریں کی سواری دیکھئے ؎

صنم فرمود مرکب ہا کشیدند بُتاں در خانۂ زر آرمیدند
ہزاراں دیو شد از بند رستہ بہر دیوے پری زادِ نشستہ
پری پیکر بتانِ نازک اندام بیک دست عناں دست دگر جام
عناں دہ ہر گزر گاہے کشیدے کشیدے جامے و آہے کشیدے

اس سے زیادہ کیا شوخی ہوگی کہ ایک چسکی لی اور ایک پھریری۔

کشیدے جامے و آہے کشیدے

مسلمانوں کی شاعری کا میں اس لئے زیادہ قائل ہوں کہ اسلام کے احکام کیسے سخت کہ ذرا سی بات میں کفر کا الزام کہیں نہیں گیا۔ پھر بھی مثنوی و غزل میں کیا کچھ زور نہ دکھا دیا ڈراما کے نام سے ڈر رہا لیکن زلیخا و لیلیٰ و شیریں کے قصے ڈراما سے زیادہ لکھدیے ؎

مثال بلبل ازاں شاخِ گل کہ نتوانی
بشاخِ دیگر ازو آشیاں بہ گردانی

ولایت میں شعر و شاعری کا ایسا ٹوٹا ہے کہ ڈراما چاہے نثر میں ہو مگر ڈراما لکھنے والا شاعر ہی کہلاتا ہے۔

رہا ہندی شاعری کی طرف جو ہم نے بہت خیال نہیں کیا تو اس کا سبب یہ ہے کہ اول تو اہل ہند کا کام تھا کہ اپنا کمال ہمیں دکھاتے جس سے ہماری آنکھیں کھلتیں لیکن ان کی شاعری انھی کو راس نہیں آئی ؎

در میکدہ از من نہ خریدند بہ جامے
ایں دانش و دیں بود کہ اندوختہ بودم

دوسرے اب بھی کیا گیا ہے۔ ہندی شاعری کے کمالات اردو میں دکھائے جائیں تو ہم پر احسان ہے کیونکہ ؎

اے وائے بر اسیرے کز یاد رفتہ باشد
در دام ماندہ باشد صیاد رفتہ باشد

جس طرح وکرم اروسی کا ترجمہ ہوا ہے، سنسکرت کے جاننے والے ایسے ایسے کلام اور بھی اپنے فائدے کے لیے اردو میں ترجمہ کردیں ورنہ تب تک ہندی کی طرف سے بھی شکایت رہے گی کہ:

قفس دانستہ در جائے نہادی
کہ دیگر نشنوی فریاد ما را

اردو میں ایسے مسالے جمع ہوجائیں تو پھر اردو کا کیا کہنا ؎

این ست گر اسیر بدل التفاتِ عشق
زود این گدا بہ حشمت جمشید می رسد

ہندوستان کے اور کمال اگر خاک میں مل گئے تو زبان کا لطف تو نہ جائے ؎

در محبت اشک و آہِ بے محابا را چہ شد
دل اگر گم گشت سامان دلِ ما را چہ شد

اس میں شک نہیں کہ غیر قوموں کے کمالات علمی میں سے ہم نے وہ علوم و فنون لئے جو عقائد اسلامی کے خلاف نہ تھے جن کو اس وقت کے علما نے مضر خیال کیا، ان کا نعم البدل کر دیا

خرد باشد چراغے بر فروزد
کہ دل روشن شود اما نہ سوزد

کیونکہ تمثیلاً عرض ہے کہ مصوری و بت تراشی کا عوض یوں کر دیا کہ فن خوشنویسی اور کپڑے کی بُنائی میں مشجر یعنی گل بوٹے میں وہ کمال پیدا کیا جو پہلے کسی کو نصیب نہ ہوا، اسی ڈراما کے مقابلے میں مثنویاں ایسی لاجواب لکھیں جن کے صرف ناموں کی فہرست ایک معمولی جلد میں مشکل سے آئے اور ان کی نازک خیالیاں دیکھئے تو یہ ایک عمر کا مشغلہ ہے، نازک خیالیوں کا ذکر آیا نہیں اور مجھے شوقِ سخن نے گدگدایا نہیں، ایسے میں آپ مجھے چھوڑیں نہیں ؎

وفا سرشار و او سرمست و ساقی سرگران او
نگہ را بے خودی مے را طرب دل را فغاں زیبد

یہ میں عرض کر چکا ہوں کہ ڈراما کی کسر فارسی والوں نے مثنوی سے نکال دی۔ سب سے زیادہ مثنویاں زلیخا کے نام سے ہیں، ان میں سے پہلے میں ناظم ہروی کا کلام نمونے کے طور پر کہیں کہیں سے لکھتا ہوں۔ حمد میں ہے ؎

دلم را یوسف مصر بیاں کن　　　زلیخائے امیدم را جواں کن

پھر ہے ؎

میم را در خمار جوشش مگزار　　زبانم دادۂ خاموش مگزار

اس خدا کی تعریف میں ہے جس نے ۔

بہ نظم شوخ و مضمون بدائع　　چناں آراست دیوان صنائع
کہ پیش معنی آگاہان اسرار　　زمین و آسماں بیتے ست بیکار
چو تعمیر نگارستان تن کرد　　زباں فرہاد و شیریں سخن کرد
عزیز مصر تجلیاتِ جلالش　　شریف مکہ دلہائے خیالش
ز شوقش مہر و ماہ عالم افروز　　دو مجنوں در بیابان شب و روز
نہ صبح ہستیش را دہشت شام　　نہ بر دامان عہدش گرد ایام
ازل آخر زمان مدت اوست　　ابد آغاز صبح دولت اوست

کیفیت عشق یہ ہے ۔

حریف شور و عاشق نیست گردوں　　چہ نسبت بید مجنوں را بہ مجنوں
اگر باشد مصاف عشق تیشہ　　توانی سنگ را کشتن بہ شیشہ

سین (موقع) یہ ہے کہ زلیخا کے حال پر گھر والوں کو کیسی پریشانی ہو رہی ہے ۔

قدیمی خدمتاں تا خانہ زاداں　　بحالش روز و شب بودند حیراں
یکے می گفت زیں شاخ گل افسوس　　کہ آتش زد بحسن آباد ناموس
یکے چوں نرگسش نمناک می دید　　بساط گریہ تا افلاک بپیچید
یکے در آتش از بوسیدہ داغش　　یکے خشک از تحیر چوں دماغش
یکے زرد از گل رویش چو کاہے　　یکے از قامتش لرزندہ آہے
یکے از گفتگویش یاد میکرد　　ز حسرت دیگرے فریاد میکرد
یکے جاں دادی حرزش خریدے　　یکے دم بر عزائم خواں دمیدے

یکے دردشس تصور کردہ جسمے — شدہ بیمار وارو ہائے رسمے
یکے می گفت سودائی مزاج است — بمجوئے مزاجش احتیاج است
یکے را از منجم بود امید — کہ بیند طالعاں تیرہ خورشید
یکے دیدے چو زلفش را مشوش — زدے از شانہ سوزی دم چو آتش
یکے چوں قرعہ می غلطید ہر سو — کہ رمالے کہ باشد غیب داں کو
یکے دیواں حافظ دست درد است — کہ از میخانہ ہم رّاہے بحق است

(حضرت یوسف زلیخا سے کہہ رہے ہیں کہ خوف معصیت سے ڈر)

بد از ہر کس زند سر بد نماید — بود مو تیرہ از ہر جا بر آید
گنہ آلستن قہر الٰہی ست — طلاق شرم و عقد روسیاہی ست

(زلیخا جواب دیتی ہے)

مدہ غم را بخود زیں جرم رّاہے — گناہے بہ کہ خون بے گناہے
نبودی عفو گر منظور راہب — نمی شد توبہ و کفارہ واجب

(پھر زنان مصر حضرت یوسف علیہ السلام سے یوں سفارش کرتی ہیں)

گرفتی دل بدہ کام دلش را — کہ شرط ایلنست در بازار سودا
کجا رسم ست ایں دنیا و ایں من — گرفتن قیمت و کالا نہ دادن

(عزیز مصر زلیخا کا اس قدر زن مرید تھا)

نمی دانم چہ مشرب داشت آں مرد — کہ خون مردہ راے نام میکرد
گر آتش را زلیخا گفت آب ست — شدے عریاں کہ غسل اینجا صواب ست

(زلیخا کو حضرت یوسف کے انکار سے رنج ہوا اور تہمت لگانے کا سامان کیا)

چو بلبل مست شد بر طرف گلزار — زند بر روئے گل ناخن زمنقار
بدیوان عزیز آں تہمت آہنگ — تظلم بردو نالاں شد بدیں رنگ

که یوسف بر سرم امرد زدر خواب — شبے خونی چو زلف آورد بیتاب

(حب میں جاگی)

بقہرم بردپے در پردۂ راز ، — گریزاں شد چو خاموشی ز آواز

دویدم از پیش مجنون دغمناک — چو دنبال رفو گر سینۂ چاک

حمیت را بر آری گر ز پردہ — نہ با من ایں خیانت با تو کردہ

ممیّز گر کنی مردانگی را ، — سزا بیش است دزد خانگی را

(آخر میں ترغیب ازدواج پر خوب کہا)

ازیں سنت بہ واجب آشنا شو — مزن لاف خدائی کدخدا شو

ایسی نازک خیالیاں کہاں تک لکھی جائیں ۔ ایک ہی مثنوی کے ایک ہی مضمون کی پوری داد کے لئے ایک دفتر چاہیے ، آپ بھی تھک گئے ہوں گے اس لئے آخر میں ضعف پیری کے دو چار شعر عرض کئے دیتا ہوں ۔

خزاں پیریم در بر کشیدہ — بہار شوخی از شاخم بریدہ

بہ بوئے بشکند رنگ دماغم — ز دزدے خم شود پشت چراغم

چو خورشیدم کلاہ رعشہ بر سر — چو گردوں تم لباس لرزہ در بر

دلم آئینہ اما زنگ بستہ — زبانم شمع اما دم شکستہ

پشیمانی گل جیب وکنارم — ندامت نقشبند پود و تارم

خورم چوں مجمر از بس آتش خشم — بجائے اشک چو شد دود از چشم

بدیں حالت کہ از ضعف قوی رگ — اجل نتواندم دیدن بہ عینک

چو رفتن یادم آید زیں گلستاں — چناں لرزم کہ عریاں در زمستاں

مکن عیبم کہ از مردن ہراسم — کہ قدر زندگی را می شناسم

آخر میں کہتا ہے :-

بسوئے رفتگاں لب تشنہ بشتاب
کہ در زیر زمیں صافی تراست آب

صلائے عام :- جناب اشہری کی تصنیف "حیات انیس" میرے پاس ایسے وقت پہنچی کہ پرچہ تیار ہوچکا تھا...... اس کا ریویو تو بعد میں لکھا جائے گا۔ اس میں سے ذیل کی عبارت جو میرے اس مضمون "ڈراما" سے متعلق ہے نقل کرتا ہوں۔

اصطلاح شعرا میں ڈراما اس صنف کو کہتے ہیں جس میں شاعر فاعل کو حاضر باش کرکے اس کے اقوال نقل کر دیتا ہے اور افعال سے کچھ بحث نہیں رکھتا۔ ہماری مثنویوں میں یہ لطف ہے کہ ہم ڈرامے کی طرح اقوال کا چربا اتارتے ہیں اور ساتھ ساتھ افعال کی بھی جھلک دکھاتے جاتے ہیں، یعنی وہ سخت اور دشوار کام جو شاعر ڈرامے میں ایکٹر کے لیے چھوڑتا ہے جس کو اصطلاح ناٹک میں لفظ موشن سے تعبیر کرتے ہیں اور جس پر ڈرامے کی عمدگی یا خرابی یہاں تک منحصر ہوتی ہے کہ اگر کوئی ناتجربہ کار یا بدسلیقہ ایکٹر کسی ایک پارٹ کو خراب کردے تو تمام تماشے کا لطف بگڑ جاتا ہے۔ ہماری مثنویوں میں شاعر خود ہی دکھا دیتے ہیں۔

مشہور ہے کہ لندن میں ایک بار آتھیلو کی بی بی ڈیسڈی مونا کا پارٹ آئرلینڈ کی ایک نووارد ایکٹریس نے کیا تو ہیروئن کے دردناک انجام پر حاضرین جلسہ غم کے آنسو بہانے کے بجائے اس قدر ہنسے تھے کہ خوشی کے آنسو ڈبڈبا آئے اور انگلستان کے مشہور ٹریجک ایکٹر مسٹر سڈنس (Mr. Siddons) نے سٹیج پر اپنا کمال دکھانے کے لئے چند مضحک پارٹ ایسی سنجیدگی اور متانت سے ادا کئے کہ بجائے ہنسی کے غم کا پہلو نکل آیا۔"

(صلائے عام پرچہ ثانی ۱۳۲۶ھ - اکتوبر ۱۹۰۸ء)

عید

صباح عید کہ در تکیہ گاہ ناز و نعیم
گدا کلاہِ نمد کج نہاد و شہ دیہیم

عرفی نے اس شعر میں کمال فصاحت کی بات کہی کہ عید کی خوشی جس طرح بادشاہ کو ہوتی ہے اسی طرح فقیر کو بھی۔ شاہ کی کج کلاہی تو مشہور ہے مگر فقیر بھی آج کلاہ نمدی ترچھی لگا کر نکلا یعنی اور کچھ اسباب عشرت میسر نہیں تو وہی کملی کے ٹکڑے کی ٹوپی جس میں تعجب نہیں کہ پیوند بھی ہوں فقیر نے عید کی خوشی میں بانکی ترچھی جمائی جس سے دیکھنے والے جانیں کہ یہ بھی عید کی خوشی منا رہا ہے۔

مسلمانوں کے زمانے میں اہل سخن عید کی تقریبوں میں اپنے اپنے کلام اہل کرم کی نذر کیا کرتے تھے، وہ وقت اور امید تو باقی نہیں رہی لیکن صلائے عام کی طرف سے آج یہ تقریب منانی منظور ہے۔

عشرتِ عید کیا ہے؟

عید کوئی ایسی نئی بات نہیں جو ابھی ہوئی اور کبھی نہ ہوئی یا نہ ہوگی۔ یہ تقریب بارہا ہوئی، اس سے پہلے بھی ہوئی، نہ کوئی سبب ایسا ہے جس سے شبہ ہو کہ بارھویں مہینے پھر نہ ہوگی بلکہ میں جانتا ہوں کہ جہاں مسلمان ہیں فرد اسی طرح کم و بیش ہر تین سو ساٹھویں دن قیامت تک عید ہوتی رہے گی۔ پھر اس میں ہمیشہ خوشی کا کیا سبب ہے؟

زاہدوں کو خوشی ہے کہ خیریت سے رمضان کٹے، روزہ دار ثواب کے مستحق ہوئے، رند خوش ہیں کہ خدا خدا کرکے روزے ٹلے۔ پینے کا ڈھنگ جما۔ مہینے بھر تک منہ بند ہونے کی عملداری تھی کہ نہ کھا سکتے تھے، نہ پی سکتے تھے۔ آج تو بھلا کوئی ٹوکے۔

کشائش درمے خانہ مسیدہد آواز
کہ روز عید صبوحی کنید بعد نماز

بچّے خوش ہیں کہ دودھ سویّاں ملیں گی، نئے کپڑے پہنیں گے۔ متقی خوش ہیں کہ نماز کو چلیں گے، جبّہ و تسبیح دکھانے کا ایسا موقع پھر کہاں، فرقت زدوں کو بچھڑی صورتیں یاد آرہی ہیں، کیسی کیسی شکلیں جو سامنے سے اٹھ گئیں، نگاہ میں پھر رہی ہیں، کوئی کسی سے ملنے کو تڑپ رہا ہے، کوئی کسی کو یاد کر رہا ہے، دردمندوں کے لئے جیسا نازک وقت ہے مسافروں کے دلوں کو معلوم ہے، بے خانماں جانتے ہیں کہ اس وقت کیا گزرتی ہے۔ کسی آوارۂ وطن سے آج کی کیفیت پوچھیے کہ ہزاروں کوس سے خیال ملنے کو دوڑتے ہیں، تصور میں کہاں سے کہاں پہنچتے ہیں، جو سفر میں ہیں محنت کر رہے ہیں کہ کسی طرح عید کو گھر پہنچ جائیں۔ جو گھر سے دور ہیں، دعائیں مانگ رہے ہیں کہ عید کو بال بچوں سے مل آئیں۔ عورتیں گھروں میں کوئی بدشگونی نہیں ہونے دیتیں کہ برس کا برس دن ہے، رات بھر مہندی لگتی ہے، دن بھر کنگھی چوٹی ہوتی ہے۔ بوڑھیاں جوانوں کو دعا دے رہی ہیں کہ دونوں کی سلامتی میں خدا نے یہ تیوہار دکھایا، پھر دکھائے اور ایسے ہزار تیوہار لائے، جنھوں نے کبھی قبلہ نہیں جانا کس طرف ہے جلدی جلدی نہا رہے ہیں، کپڑے بدل کر عیدگاہ کو چل دیے کہ کہیں دوگانہ نہ رہ جائے، آپ سوار ہو لئے تو ہم پیادہ ہی چل دیے اور عیدگاہ پہنچے اور آگے پیچھے جہاں جگہ ملی گھس بیٹھ کر نماز میں شریک ہوئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عید کی عشرتوں میں اس سے بڑی عشرت نہیں کہ دو دل ملیں زمانے کے جھگڑوں سے چھوٹ کر ایک جگہ بیٹھیں اور باتیں کریں۔ اس حال میں تعجب کیا ہے جو ہمیں بھی اس تقریب میں ناظرین صلائے عام سے ملنے کی آرزو ہوئی۔

لیجیے عید مبارک ہو :

زبدلِ ناطقہ گنجِ معانی افشاں ہست
بخانمانِ معانی صلا مبارک باد

ایسے میں دو ایک شاعر حسب رسم قدیم بلا امید صلہ خیال میں آگئے ان سے دو چار شعر عید کی مبارکباد میں بھی سن لیجیے۔

حضرت امیر خسرو رح فرماتے ہیں۔

رسید موسمِ عید و صلائے خوش در داد   پیالہ بر کفِ خوبانِ ماہ پیکر داد
عجوزِ چرخ نگر صد ہزار مروارید   چکوند از پئے یک گوشوارۂ زر داد

ہلال عید جہاں را ز نور خویش آراست   شراب چوں شفق و جام چوں ہلال کجاست
مگر شراب شفق خورد شب ز جام ہلال   کہ ہر گہر کہ درو بود جملہ در صحراست

برآمد ماہ عید از اوج گردوں !   طرب چوں ماہ نو ہر دم شد افزوں
بلوح آسماں نونے ہست واژوں   کہ بیروں آمد ہست از کلک بیچوں

قزلباش خاں امید کس دھوم سے کہتے ہیں۔

عید ہست و بہار ہست و چمن جلوہ فروش ہست   گل خندہ فشاں گشتہ و بلبل بہ خروش است

صائب کا کلام ہے۔

ہلال عید از گردونِ زنگاری ہویدا شد   بروں شد از دریائے غم کشتی ہویدا شد
بیک ناخن گرہ نتواں کشود از عقدۂ مشکل   دل عالم ز ماہِ عید حیرانم کہ چوں وا شد
نہ گردد ساز چوں قانونِ عشرت مے پرستاں را   کہ مضراب دگر صائب ز ماہ عید پیدا شد

عرفی شیرازی کا کیا کہنا۔ ان کے قصائد اگر چھپ نہ گئے ہوتے تو ان کا سارا کلام سننے کے لائق تھا اس سے بہتر کوئی کیا کہے گا۔

منادی ہست بہر سو کہ اے خواص و عوام   مے و نشاط حلال و شراب عشرہ حرام

فضائے عالم ہستی ز عرصہ تنگ آمد | مشابہ دل عاشق مثال چشم لیام
ہوائے روضۂ گیتی شگفتہ شد ز انسال | کہ نو بہار خط گل رخان سیم اندام
قضا نہادہ بکام زمانہ معجونے | کہ بہر ساختن آنقدر گرفتہ بوام
بشاشت دل اطفال در شب نوروز | نشاط خاطر صائم بہ صبح عید صیام

جب آپ نے اتنے شاعروں کا کلام سنا تو غالب دہلوی کی مثنوی تہنیت عید شوال میں سے یہ شعر سن لیجئے۔

خامۂ من گشتہ بہ تقریب عید | قفل در گنج سخن را کلید
نکتہ طرازی بمن آموخت عید | سینہ بنور خرد افروخت عید
پائے فرد رفتہ قلم را بہ گنج | خامہ بہ رقص ست و نفس نغمہ سنج

اس قدر کلام سننے کے بعد اب اتنی فرصت نہیں کہ خاقانی و قاآنی و انوری اور شعرائے قدیم کے کلام سننے کا موقع ملے۔ پھر بھی بزم آخریں سے قلعہ معلیٰ کی عید کا ذکر مختصراً نقل کرنے کو جی چاہتا ہے، کیونکہ بقول ظہوری۔

توئی ساقیا غیرت نو بہار | منم کہنہ تاریخنے نو بہار،
بدہ مے کہ گویم بہ آواز نے | کہ کے کے طرب کرد و کاؤس کے

عید الفطر

"رات کو توپیں دغیں، ڈیرے، خیمے، فرش فروش عیدگاہ روانہ ہوئے، سواری کا حکم ہوا، ہاتھی رنگے گئے۔ صبح کو بادشاہ نے حمام کیا، پوشاک بدلی، جواہر لگائے، خاصے والیوں نے جلدی سے دسترخوان بچھایا، سویاں، دودھ، اولے، بتاشے، چھوہارے، خشکا، کھڑی مسور کی دال اس پر لگادی، بادشاہ نے نیاز دی، ذرا ذرا سا چکھ کے کلی کی، باہر برآمد ہوئے، جسولنی نے خبرداری بولی، باہر ترئی ہوئی، سب جلوس قاعدے سے کھڑا ہوگیا۔

فوجدار خاں نے ہاتھی بٹھا دیا۔ کہاروں نے ہوا دار تلووں کے برابر لگا دیا، بادشاہ ہودے میں سوار ہوئے، دیوان عام میں سواری آئی۔ اختتامی توپخانے کی اکیس توپوں کی آوازیں ہوئیں قلعے کے دروازوں پر پلٹنوں نے سلامی اتاری، عیدگاہ کے دروازے پر سواری پہنچی، جلوس دو طرفہ کھڑا ہو گیا، سلامی اتاری، توپیں سلامی کے لیے چلنے لگیں، دروازے پر سے بادشاہ ہوادار میں اور ولی عہد نالکی میں اور سب پیدل عیدگاہ کے اندر آئے، چبوترے پر سے اتر کر خیمے میں اپنے مصلوں پر کھڑے ہو گئے۔ مکبّر پر تکبیر ہوئی۔ سب نمازیوں نے صفیں درست کیں، امام جی کے ساتھ سب نے نیت باندھ لی، دو رکعتیں پڑھ کر سب نے سلام پھیرا، سب کھڑے ہو گئے، بادشاہ، ولیعہد، شاہزادے اپنے مصلوں پر بیٹھے رہے۔ امام جی کو خطبے کا حکم ہوا، توشہ خانے کے داروغہ نے امام جی کے گلے میں کلابتونی پرتلہ اور تلوار ڈالی، امام جی نے کھڑے ہو کر تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ، خطبہ پڑھا۔ جب بادشاہ کا نام آیا، توشہ خانے کے داروغہ نے امام جی کو خلعت پہنایا، خطبے کی ایک توپ چلی، دعا ہوئی اب دھوپ چڑھ گئی تھی، بادشاہ نگدمبر میں سوار ہوئے، دیوان خاص میں آئے، تخت طاؤس پر بیٹھ کر دربار کیا، نذریں لیں، پھولوں کے طرّے اور ہار سب کو مرحمت ہوئے۔

عیدست و صلائے طرب و زمزمہ عام است
مے نوش گنہ برمن اگر بادہ حرام است

صاحبو۔ نماز عید کے بعد جب لوگ گھروں میں ہوتے ہیں تو دوست آشنا ملنے آتے ہیں۔ یوں تو از روئے تہذیب کسی سے ملنے کے لئے اطلاع و اجازت درکار ہے، عید کے دن ہم بغیر بلائے پہنچ جاتے ہیں۔ اب آئے ہیں تو خالی بیٹھنا مناسب نہیں۔ اس تقریب میں اگلے لوگوں نے قصیدوں میں وہ کمال دکھایا ہے، جس سے بہتر تو کیا، جس کے برابر ممکن نہیں

زیں بزم چوں کنم طمعِ مے کہ بارہا!
مستاں فشردہ اند چو انگور شیشہ ہا

ایسی تقریبوں میں جو قصیدے مسلمانوں کے وقت میں لکھے گئے ان کا جواب کسی زبان کی شاعری میں شاید ہی ہے کہ ہو، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا اس وقت اظہارِ کمال فرور نہیں ہے لیکن چپ رہنا بھی منظور نہیں ہے اس لئے میں نثر میں وہی طرز اختیار کرتا ہوں جو اہلِ سخن نظم میں کر گئے ہیں اور اس تقریب کو اس لئے غنیمت سمجھتا ہوں کہ تمام عمر میں دو ایک ہی دن ایسے ہیں جن میں معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں سرور و نشاط کا پتا گو دراصل کہیں نہیں مگر کبھی کبھی خیال ہی میں جی خوش ہو جائے تو عشرت کا نام بنا ہے۔

شائستہ دریافتنِ عمر دمے ہست

بحمد اللہ مرا گوشش ہست بانالۂ واعظ مستاں
تو ساقی را بگو کز گوشِ مینا پنبہ بردارد

دستور ہے کہ صبح کو دروازے کھلتے ہیں، درِ مے کدہ جو مہینے بھر سے بند تھا اس کی کنجی (نور جہاں بیگم سے سنا کہ[۱]) کل شام کو مل گئی۔ لیجئے، درِ توبہ کی طرح میکدہ کھلا، ساغر نے صبوحی کے سامنے سجدۂ شکر ادا کیا، یہ نمازِ عید ہوئی، آج سے یہ در برابر کھلا رہے گا درِ توبہ تو قیامت کے دن سنا ہے کہ بند بھی ہو جائے گا لیکن ہم سے پوچھیے تو (رمضان کی تو ہم کہتے نہیں) درِ میکدہ قیامت تک کھلا رہے گا اور اس کے بعد بھی کھلا رہنا مناسب ہے، کہ کوثر کا راستہ یہیں سے ہے تو اچھا ہے، کیونکہ اگر آپ نے یہاں شراب نہیں پی تو وہاں مئے کوثر پینی پڑے گی۔ میں نے یہاں نہیں پی۔ آپ بھی ہرگز نہ پیئیں لیکن مئے کوثر کے خیال میں کیفیتِ مستی دیکھئے، جس میں بے پئے نشہ ہے اور خمار کا دردِ سر نہیں۔

---

[۱] کلید مے کدہ گم گشتہ بود پیدا شد

جس طرح چہرۂ گلرنگ یار دیکھنے میں اچھا معلوم ہوتا ہے۔ آپ بھی کیف دستی دیکھیں ع

زمن پنہاں چہ داری از کجا مے خوردہ مے آئی
چناں مستی کہ از رنگ رخت بوئے شراب آید

آپ دیکھتے ہیں کہ اس وقت مجھ سے چپ نہیں رہا جاتا۔ ع

ایں جلوۂ حسن است کہ در پردہ نگوید
ایں قصۂ عشق است کہ پنہاں نتواں داشت

مہینہ بھر کی ریاضت نے دماغ میں وہ خشکی پیدا کردی ہے کہ مے تو کیا بوئے مے دماغ کو چڑھی جاتی ہے، اس وقت میرا زہد و تقویٰ ملاحظہ ہو کہ مے سے کیسا بچا رہا، صرف بوئے مے نے جس سے میری مراد ذکر مۓ ناب ہے دماغ میں شور پیدا کر دیا ہے۔ نعرۂ مستانہ سے دعا ہائے سحری آغوش اثر میں بے ہوش ہو کر آ پڑیں جن کے لئے نونہالان چمن کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے اس طرح تماشے کو نکلے جس طرح کم سن لڑکیاں چھوٹی بڑی کے کندھے سے لگی ہوئی کسی شادی کے باجے کی آواز پر صحن سے دروازے کو دوڑیں۔ شوق سا شوق ہے جو خندۂ ابر کو ذوق چمن کے ساتھ نصیب نہیں اور وہ شورِ گل ہے جو بلبل کو فغاں میں میسر نہیں، خم مے دل عشاق سے زیادہ بھرے ہیں، خون جگر میں مۓ گلرنگ کے مزے ہیں ع

سہیلے مغفرت اشکے زما کش — تجلی کودک دامان پاکش
شدے گر بردے از اشکے ذخیرہ — نگاہ کاتب اعمال خیرہ

یہ وہ مے ہے جو غم دنیا کو شادی مرگ کر دے، جس کے لئے گردش چشم بتاں پیالہ اور لب یار مے فروش ہے ؎

چو بر سرخی زند خون ہزار است — چو در رجوئے دماغ آید بہار است
بہ شیشہ دیو آتش خانہ باشد — پری باشد چو در میخانہ باشد

ایسی مے، مے پرستی چاہتی ہے جس کے لئے جام و شیشہ کی طرح چشم و گوش بھی کھول لیجئے۔

دیکھئے طلوع صبح نے پیر مے فروش بن کر وہ مے دیر سالہ قدح آفتاب میں ڈالی کہ ع

مے چوں آتش سوزاں درخشاں

شرارے مردہ اتش کان بدخشاں

اس وقت نسیم سحر نے کروٹ لی اور شبنم سے منہ دھو کر اس طرح آہستہ چلی کہ غنچوں نے جو اونگھ رہے تھے اور ابھی آنکھ پوری نہ کھولی تھی چاک پیراہن اسطرح کھولے جس طرح بتان سیمیں تن کے کچھ جاگتے کچھ سوتے میں سینہ و گردن سے دوپٹہ سٹ جائے اور جن کے سینہ و گردن کے لگنے سے ہوا میں مستی آجائے۔ اس مستی میں مرغان چمن بھی رندان برہنہ پا کی طرح غزلخوانی کرتے نکلے۔

رشک آیدم وگرنہ نقابت کشودمے

دست ترا گرفتہ بہ بنا صبح نمودمے

اتنے میں کسی مرغ خوش الحان کی آواز سے یہ سنائی دیا کہ ع

قدح کشاں زنشاط ایں قدر قیامت چیست

بیاض گردن میناست صبح محشر نیست

(صلائے عام شوال ۱۳۲۶ھ نومبر ۱۹۰۸ء)

اِسلام
خلفائے عباسیہ کے عہد میں

مذہبی بحث کو نظر انداز کر کے اسلام کی تاریخ از روئے اقبال و ترقی، علوم و تہذیب دیکھئے تو ایسی دلکش معلوم ہوتی ہے کہ دنیا کی نامور سلطنتوں میں اس سے بڑھ کر کسی کی تاریخ نہیں ملتی، عرصے سے میری تمنا ہے کہ اسلام کی تاریخ از روئے تہذیب و ترقی، علوم و فنون لکھی جائے، آجکل کے مسلمانوں کے لئے بڑے کام کی ہے۔ سبب یہ کہ عربی میں جو تاریخیں ہیں، اول تو نایاب ہو چلی ہیں۔ اہل یورپ ایسی کتابیں یہاں سے لے گئے، دوسرے جو کتابیں عرب میں باقی ہیں ان کو سمجھنے والے باقی نہیں رہے، فارسی کا بھی کم و بیش یہی حال ہے، میرا ارادہ ہے کہ جب تک مجھ سے اچھے لکھنے والے اس طرف متوجہ ہوں ایسی تاریخ کا مسالا صلائے عام میں مہیا ہوتا رہے۔ اس غرض سے اسلام کی تاریخ کو چار حصوں میں تقسیم کر لیا جائے، ایک شروع سے بنی امیہ کے آخر عہد تک دوسرا خلفائے عباسیہ کا پورا زمانہ، تیسرا خلافت قرطبہ یعنی سلطنت اسپین کا حال، چوتھا مسلمانوں کا عہد ہندوستان میں۔

میرے قیاس میں اسلام کی تاریخ میں سب سے پاکیزہ عہد خلفائے عباسیہ کا گزرا ہے۔ یوں تو اسلام کی عظمت اس سے پہلے کی ہے مگر سلطنت عباسیہ میں مسلمانوں کی تحقیق و ترقی علوم کی دھاک تمام دنیا کی شائستہ قوموں کے دلوں میں بیٹھ گئی۔ ہر طرح کی تحقیق اور علوم و فنون کی ترقی میں یہ زمانہ ایسا مشہور رہا کہ پھر یہ بات کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ اس لئے آج میں اس عہد کی ترقی و تہذیب کا حال خاکے کے طور پر جابجا سے عرض کرتا ہوں

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ خلافت عباسیہ کا آغاز معرکۂ کربلا کے قصاص سے شروع ہوا کہ اس وقت سے عرب وعجم میں ضد پیدا ہوگئی۔ آپس کے اختلافات سے اندیشہ تھا کہ اسلام میں ضعف پیدا ہو جائے لیکن خدا کا فضل دیکھئے کہ اس وقت سے اور بھی اقبال بڑھ گیا اور ترقیٔ تہذیب وعلوم وفنون میں خلفائے عباسیہ کا عہد سب سے بازی لے گیا، دل و دماغ کی ترقی میں ایک ہی خاندان برامکہ کا کیسا نامور گزرا ہے جس کے ثبوت میں یحییٰ برمکی کی یہ نقل سننے کے لائق ہے۔

اس خاندان کو برباد کرنے کے بعد خلیفہ ہارون رشید نے حکم دیا کہ کوئی شخص خاندان برامکہ کی بربادی کا مرثیہ نہ کہے، جو شخص اس خاندان کی تباہی پر افسوس کرے گا وہ مارا جائے گا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن کسی سپاہی نے ایک شخص کو دیکھا کہ قبر برامکہ کے کھنڈروں کے پاس رو رہا ہے اور اس خاندان کی بربادی کا مرثیہ پڑھ رہا ہے۔ سپاہی اس شخص کو گرفتار کر کے خلیفہ کے حضور میں لے آیا۔ خلیفہ نے دریافت کیا کہ تو نے میری حکم عدولی کیوں کی کہ برامکہ کا مرثیہ پڑھا، مجرم شاہی نے عرض کیا کہ یا امیرالمومنین، پہلے میری سرگزشت سن لیجئے، پھر جو چاہے سزا دیجئے۔ سرگزشت یہ ہے:۔

"میں یحییٰ بن خالد کی کچہری میں بہت تھوڑی تنخواہ کا محرر تھا ایک دن یحییٰ نے مجھے کہا کہ تو اپنے گھر بلا کر میری دعوت کر۔" میں نے عرض کیا کہ "میں اس لائق کہاں، نہ میرا گھر اس قابل ہے جس میں آپ تشریف لائیں۔" یحییٰ نے کہا "نہیں تجھے یہی کرنا ہوگا جو میں نے کہا۔" میں نے پھر عرض کیا کہ "مجھے مہلت دی جائے تاکہ تھوڑی بہت جس قدر مجھ سے ہوسکے تیاری کرلوں۔" یحییٰ نے کئی مہینے کی مہلت دی۔ مجھ سے جس قدر ہوسکا تیاری کر کے میں نے یحییٰ کو خبر دی۔ یحییٰ نے اپنے دونوں بیٹوں جعفر اور فضل اور چند دوستوں کے ساتھ میرے مکان پر قدم رنجہ فرمایا، سواری سے اترتے ہی بے تکلف مجھ سے کہا کہ کچھ کھانے کو لاؤ۔ میں نے سالن روٹی جو تیار کی تھی حاضر کی۔ کھانا کھا کر یحییٰ نے میرے

گھر کا ملاحظہ کیا اور جب سارا گھر دیکھ لیا تو پوچھا کہ اس کے ملحق جو مکان ہے وہ کیوں نہیں دکھاتا۔ میں نے عرض کیا کہ حضور نے میرا سارا گھر ملاحظہ فرما لیا، اس پر یحییٰ نے کہا کہ نہیں، تیرے پاس ایک مکان اور بھی ہے۔" ہر چند میں نے سمجھایا کہ میرے پاس یہی ایک مکان ہے مگر یحییٰ نہ مانا۔ اور معمار کو بلا کر میرے مکان کے پیچھے کی دیوار تڑوائی اور مجھ سے کہا کہ آگے چل کر مکان دکھا۔ میں نے جواب دیا کہ دوسرے کے مکان میں کیسے چلوں۔" یحییٰ نے کہا کہ کچھ مضائقہ نہیں۔" جب میں اندر گیا تو طلسم کا سا عالم نظر آیا کہ نہایت نفیس باغ ہے جس میں فوارے چھوٹ رہے ہیں اور بیچ میں نہایت خوشنما مکان ہے جو بڑے تکلف سے آراستہ ہے اور مہ جبیں لونڈیاں اور غلام خدمت کو حاضر ہیں۔ میں حیران رہ گیا۔ یحییٰ نے مجھ سے کہا کہ یہ سب کچھ تیرے لئے ہے"۔ میں نے اس کے ہاتھوں پر بوسہ دیا اور اس عطیہ کا شکریہ ادا کیا۔

بعد میں پتا چلا کہ جس دن یحییٰ نے مجھ سے دعوت کی فرمائش کی تھی اسی دن سے اس نے میرے مکان سے ملحق قطعۂ زمین خرید کر باغ و مکان بنوانا شروع کر دیا تھا۔ مکان کی تعمیر تو میں بھی دیکھتا تھا لیکن یہ گمان کسے تھا کہ یہ عمارت میرے لئے تیار ہو رہی ہے۔

یحییٰ نے اپنے بیٹے جعفر سے کہا کہ مکان اور نوکر چاکر تو سب موجود ہیں لیکن ان کا خرچ کس کے ذمے ہے؟" جعفر نے کہا کہ اس کے واسطے جاگیر کی سند بھیج دی جائے گی"۔ یحییٰ نے کہا "یہ درست ہے لیکن جب تک جاگیر کی آمدنی وصول ہو تب تک یہ بیچارا کیسے بسر کرے گا؟ فضل د یحییٰ کے دوسرے بیٹے) نے کہا کہ مجھ پر اس کی ہزار اشرفیاں آتی ہیں، میں گھر جا کر بھجوا دوں گا"۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس دن سے میں آج تک عیش و آرام سے بسر کر رہا ہوں اور خاندان برمک کو دعا دیتا ہوں، خلیفہ کو اختیار ہے میری گردن مار دے، میں مرنے کو حاضر ہوں۔"

یہ سنکر خلیفہ ہارون رشید کو بڑی حیرت ہوئی اور اس دن سے حکم دے دیا کہ خاندانِ

برمک کی تعریف میں جو چاہے کہے، کچھ اعتراض نہ کیا جائے۔

خلیفہ مامون کی شادی کا حال ہے کہ وزیر خلافت حسن ابن سہیل کی بیٹی بوراں کے ساتھ جب شادی ہوئی تو انیس دن تک بزم نشاط گرم رہی۔ تمام ملک کے باشندے امرائے شاہی سے لے کر ساربان و ملاح اور اونٹ و گھوڑے تمام جانور وزیر کے یہاں مدعو تھے گئے، محفل میں مشک کی گولیاں برسائی گئیں، کسی گولی میں جاگیر کی سند، کسی میں حسین لونڈی کی چٹھی، کسی میں مرصع ساز کے گھوڑے یا اور کوئی بیش قیمت تحفے کا حکم تھا، ایک افسر اس کام پر مقرر تھا کہ جو شخص چٹھی لائے اس کو جاگیر و تحفہ جو کچھ لکھا ہو حوالے کر دیا جائے۔ نوشہ کی مسند سونے کے تاروں سے بنی تھی جس پر موتی بکھرے ہوئے تھے۔ اس پر مامون نے ابونواس سے مخاطب ہو کر کہا کہ شراب میں پانی ملاتے وقت جو بلبلے تو نے شعر میں باندھے تھے اس کی کیفیت آنکھ سے دیکھ لے۔ محفل میں ایک بتی عنبر کی چالیس سیر وزن میں تھی جو ٹھوس سونے کے شمع دان میں روشن تھی۔

عقائد و تحقیق کا حال دیکھئے کہ ایک طرف تو تصوف کا وہ عروج ہے کہ صوفیائے کرام کے نامور بزرگ جیسے کہ حضرت معروف کرخی، حضرت ابو سلمان فارسی، حضرت ذوالنون مصری۔ منصور حلاج رحمہم اللہ علیہم اور ایسے ایسے بزرگ اس زمانے میں پیدا ہوئے، آپ جانتے ہیں کہ تصوف میں حجت و استدلال سے کیسی ضد ہے اور دوسری طرف دیکھئے تو فلسفہ و علم کلام اور معقول کا وہ زور ہے کہ خلیفہ خود اسی تحقیق میں محو ہو رہا ہے، اخوان الصفا سی نامور سوسائٹی اور معتزلہ سے پابند عقل فرقے کو اسی زمانے میں عروج ہوا۔ مذہبی عقائد میں بال کی کھال کھینچنے والے اسی وقت پیدا ہوئے کہ قرآن کو خالق مانیے یا مخلوق جس پر ہزاروں آدمی مارے گئے، اس مسئلے کا زور خلیفہ مامون، معتصم، واثق تک رہا اور معتصم خود اس بحث میں علما کے ساتھ رہتا تھا، اس بحث میں حنبلی اور شافعی بہت ستائے گئے، خود حضرت امام احمد بن حنبل کو نہایت تکلیف ہوئی اور محمد بن

نوح اور ابو یعقوب یوسف شافعی شہید ہوئے۔

پابندیٔ عقائد اور آزادیٔ عقائد دونوں باتوں کے بڑے بڑے کارنامے اسی عہد میں ملیں گے، حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی وفات پر جو ۲۴۱ھ میں واقع ہوئی۔ سارے شہر بغداد نے ماتم کیا، ایک لاکھ مرد اور ساٹھ ہزار عورتیں جنازے کے ساتھ تھیں اور ۲۰ ہزار عیسائی و یہودی و مجوسیوں نے اسی دن اسلام قبول کیا۔

ان کے شاگردوں میں سے کسی نے جناب امام احمدؒ کو خواب میں دیکھا کہ جناب کو پروردگار کا دیدار نصیب ہوگا یا نہیں، علماء معتزلہ کو اس سے انکار تھا۔ زمانے کے دلوں میں علوم عقلیہ کی وہ دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ اندیشہ تھا کہ علماء معتزلہ کا زور کبھی نہیں گھٹے گا کہ اتنے میں خدا نے اشعری کو پیدا کر دیا۔

اشعری ۲۷۰ ہجری میں بصرے میں پیدا ہوئے۔ ان کا عقیدہ پہلے معتزلہ کا سا تھا۔ انہوں نے اپنے استاد سے اس قصے پر لگا ڑلی :-

تین سگے بھائی تھے، ایک ان میں سے پکا مسلمان متقی، پابند صوم وصلوٰۃ، دوسرا کافر اوباش تھا، تیسرا دودھ پیتا بچہ، تینوں مر گئے۔

اشعری نے اپنے استاد ابو علی سے پوچھا کہ تینوں کا کیا حشر ہوگا۔؟ استاد نے جواب دیا کہ نیک بھائی تو بہشت میں بڑے مرتبے کو پہنچا، کافر جہنم میں گیا اور بچے کو نجات ملی (یعنی دوزخ سے بچ گیا۔) اس پر اشعری نے سوال کیا کہ " فرض کریں کہ بچے کو اپنے نیک بھائی کے ساتھ بہشت میں پہنچنے کی آرزو ہوئی تو یہ بچہ بھی بہشت میں جا سکے گا یا نہیں جواب ملا کہ نہیں۔ اس بچے سے کہا جائیگا کہ تیرا بھائی تو خدا کی طاعت سے اور نماز روزے کی وجہ سے بہشت میں پہنچا۔ تیرے پاس ایسے اعمال صالح نہیں۔ بہشت کے لئے نیک اعمال چاہئیں، اس پر اشعری نے کہا۔ لو فرضنا، بچہ یہ کہے کہ اس میں میرا کیا قصور ہے کہ میری عمر ہی نہ ہونے پائی کہ میں خدا کو اپنی طاعت کا ثبوت دیتا اور اچھے اعمال کرتا،

اس پر جواب ملا کہ خدا بچے سے یہ کہے گا کہ ہمارے علم میں تھا کہ تو بڑا ہو کر نافرمانی کریگا، اور دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ اس لئے تیرے فائدے کے واسطے ہم نے تجھے جلدی دنیا سے اٹھالیا۔ یہ تیرے ساتھ سلوک کیا گیا۔"

اس پر اشعری نے استاد سے سوال کیا کہ فرض کیجئے کہ وہ کافر بھائی بھی اس وقت خدا سے یہ کہے کہ خدایا تو علام الغیوب ہے اور میرے چھوٹے بھائی کا تجھے علم تھا، مجھے میرا بھی علم ضرور ہوگا یہ کیا بات ہے کہ تونے اس کا خیال رکھا، میرا خیال نہ رہا۔؟

اشعری نے اسی دن عقائد معتزلہ سے توبہ کی، اور بصرہ میں جمعہ کی نماز سے سب مسلمانوں میں اس کا اعلان کردیا۔ یہ بحث قدیم کتابوں میں بڑے لطف کی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ پابندئ عقائد کی بڑی تاکید رہی، پھر بھی آزادئ خیال کو کسی نے نہیں روکا، یہودی، عیسائی، پارسی، دہریے، علمائے اسلام سے بحث مباحثہ کرتے تھے اور لطف یہ ہے کہ سب کو سلطنت کے عہدوں پر مسلمانوں کے برابر ترقی دی جاتی تھی، علمائے نصاریٰ یورپ سے بلاکر خلافت کے مہمان رہتے اور جس قدر علوم یونانی اس وقت تک ترقی کر چکے تھے سب پڑھائے جاتے تھے، اس وقت غیر مذہبوں کے علوم وفنون اس قدر بڑھے کہ کبھی اپنے وقت میں اس قدر ترقی نہ کرسکے۔ انھی علوم کی ترقی کی وجہ سے غیر مذاہب والوں کو بھی بڑا عروج ہوا، سلطنت کے اکثر عہدے یہودیوں، مجوسیوں اور نصرانیوں کے ہاتھ میں تھے یہاں تک کہ جب متوکل خلیفہ ہوا تو اس وقت سارے سرکاری محکموں میں غیر قوموں کے لوگ ملازم تھے بلکہ امرائے اسلام کے نجی کے ملازم بھی اکثر غیر مذہب کے لوگ تھے، اہل عرب نے خلیفہ سے شکایت کی کہ ہماری روٹی غیر قومیں چھینے لیتی ہیں اور ملازمت میں اختیار پاکر ہم سے اس کا عوض لیتی ہیں کہ عرب نے ان کے ملک فتح کرکے انھیں ذلیل سمجھا تھا، اس پر خلیفہ نے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے امتیاز کے لیے احکام جاری کیے۔ لیکن یہودیوں کا نامور ربی بنجمن ساکن ٹوویلا جب بغداد آیا تو اس نے اپنے سفرنامے میں یہودیوں کی عظمت کا حال لکھا ہے کہ بغداد کے یہودی بڑے عالم اور دولت مند ہیں، یہودیوں کے ۲۸ معبد شہر میں ہیں، ان میں ایک تو اس عظمت وشان کا ہے جس کا جواب نہیں۔

(صلائے عام، جنوری ۱۹۰۹ء)

اَب فلسفیانہ بھی ہی تم سے سخن اپنا

انسان کو جب لہو و لعب اور رنج و تعب سے ذرا بھی ہوش ہوتا ہے تو اس بات کا خیال آتا ہے کہ ہماری ہستی سے کیا غرض ہے۔ عالم اسباب میں راحت زیادہ ہے یا مصیبت، دنیا میں ہم مزے اڑانے کے لئے آئے ہیں یا مصیبت کے دن کاٹنے۔ یہ مسئلہ از روئے مذہب تحقیق کرنے کے قابل نہیں۔ عقائدِ مذہبی میں جو بات ہے حکماً ہے کہ فیصلہ پہلے سنا دیا گیا، مسل پیچھے مرتب ہو یا نہ ہو، میری دانست میں اس مسئلے کی تحقیق فلسفیانہ طرز پر مناسب ہے جس میں دل و دماغ دونوں کو تسلی ہو جائے۔

از روئے تحقیقِ فلاسفی، اس مسئلے کی نسبت دو عقیدے ہیں۔ یا تو دنیا کو ایسا مقام قرار دیجئے، جس میں اس کے خالق نے ہمارے آرام کا سارا سامان اس طرح مہیا کر دیا ہے کہ اس سے بہتر ممکن نہیں یا اس عالم اسباب کو ہم اپنے لئے مصیبت کا گھر سمجھ لیں، دنیا میں جب ہم نے اپنی ہوس کے مطابق کام چلتا دیکھا تو خوش ہوئے کہ خالقِ عالم کو ہمارا بڑا خیال ہے، اس کے فضل و کرم کا کیا کہنا، جس نے ہمارے آرام کے لئے کیا کیا نعمتیں پیدا کر دیں اور جب ہماری ہوسوں کے پورا ہونے میں ہرج ہوا، جس میں رنج و مصیبت و تکلیف جھیلنی پڑی تو زمانے کی شکایت کرنے لگے۔ فلاسفی میں پہلی صورت کو "آپ ٹم ازم" (Optimism) کہتے ہیں اور دوسری کو پیسیمِ ازم (Pessimism)۔ انسان کو دونوں حالتوں سے مفر نہیں۔ اقبال و جوانی میں اکثر نغمہائے الٰہی کا لطف آتا ہے اور جب عمر زیادہ ہوتی ہے، اور قویٰ ضعیف ہو گئے تو افسوس ہوتا ہے کہ زندگی یونہی برباد گئی

اسلام کی فلاسفی میں دونوں صورتیں بڑی خوبصورتی سے نباہی گئی ہیں، کہ ہماری کتابوں میں سب سے پہلے حمد ومناجات کے نام سے خدا کی نعمتوں کا ذکر وشکر کمال فصاحت سے کیا جاتا ہے جس سے بہتر کسی زبان میں ممکن نہیں اور اس کے بعد ہی اہل سخن، مذمتِ روزگار اور شکایت ابنائے زماں میں وہ دادِ فصاحت دیتے ہیں کہ دنیا کے نام سے نفرت ہو جاتی ہے

چرخ ظالم دوست چوں عاجز کشی را سر کند | تیر را پرواز بخشد مرغ را بے پر کند
چو دل بوصل ہم جو ریار تنگ زار د | چو یار رحم کند روزگار نگزارد
شاہد دنیا کہ زلفش بود از طولِ امل | از کفِ افسوس دارد ابروئے پیوستہ
زمردہ دک بیدل چناں نمی ترسد | کہ من ز دیدنِ ایں زندگاں ہراسانم
دریں حدیقہ بہار و خزاں ہم آغوش ست | زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش ست
وضع زمانہ قابل دیدن دوبارہ نیست | رو پس نکرد ہر کہ ازیں کارواں گذشت
بہ چارہ دست مزن در بلاکہ شست قضا | نشاں غلط نہ کند تیر بر سپہر زند
بر ساغرم کہ داد فلک گرچہ زہر بود | تا خوں نکرد در دلِ من دیگرے نداد
گر پس از مرگ ہم آسودہ نباشم چہ عجب | کلفت روز بشب خوابِ پریشاں آرد
اجل ز ہر غمم آسودہ کرد دانستم | کہ شمع را اگر آسائش ست از باد ست

اس اسکول کی فلاسفی یورپ میں بڑے زوروں پر ہے۔ ان کا مسلمہ ہے کہ دنیا میں خوشی کا پتا نہیں، جسے ہم خوشی سمجھے ہوئے ہیں، یہ محض رنج ومصیبت کے نہ ہونے کا نام ہے، یعنی دنیا کی حالتِ اصلی رنج ومصیبت ہے، اس کی عدم موجودگی کا نام خوشی رکھ لیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا کا کوئی عیش کتنا ہی دلکش کیوں نہ ہو آخر کو اجیرن ہو جاتا ہے ؎

حصول آرزو سے انسان اس قدر خوش نہیں ہوتا جس قدر کہ حصول آرزو کے انتظار میں اسے لطف آتا ہے اور تکلیف کا خیال تکلیف سے زیادہ رنج دیتا ہے۔ مصیبت میں بڑا سہارا یہ سمجھا گیا ہے کہ خدا کے اور بندے ہم سے زیادہ مصیبت میں گرفتار نظر آتے ہیں

اس سے دنیا کے دل کش ہونے کا کونسا ثبوت ہو گیا، مداری کے تماشے کی طرح دنیا کا تماشا ایک دفعہ دیکھ لیجئے، وہی تماشا بار بار اچھا نہیں لگتا اور جب اس کی چالاکیاں معلوم ہو گئیں تو پھر دیکھنے کو جی نہیں چاہتا، عالم اسباب میں جانوروں سے زیادہ، انسان گرفتارِ مصیبت ہے کہ جانوروں کو تو اس وقت صیغۂ حال کے سوا کسی سے سروکار نہیں۔ انسان اگلے پچھلے جھگڑوں میں گرفتار رہتا ہے، خاص کر آگے کا فکر کر کے اپنی زندگی وبال کر لیتا ہے۔ جانور کو جس وقت موت آئے اسی وقت دکھائی دیتی ہے، انسان موت کے خیال میں پہلے سے غلطاں پیچاں رہتا ہے۔ انسان کو مرنے سے پہلے رات دن موت کا ڈر رہتا ہے، اس سے بچنے کے خیال میں جانے کیا کیا ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ چھری کے نیچے جس قدر زیادہ تڑپے اسی قدر زیادہ تکلیف ہو گی۔

از روئے عقل یہ بھی اچھی طرح ثابت نہیں ہوا کہ انسان دنیا میں آنے پر خوش ہو کہ یہاں سے جانے پر۔ یہاں سے جانے کے سامان میں ہر مذہب والے نفس کشی کو تو اب سمجھتے ہیں لذات نفسانی کو حرام بتاتے ہیں موتوا قبل ان تموتوا کی تاکید ہے۔ انسان کی ہستی سے اس کا مٹا دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جب دو میں باہمی تکرار ہو جیسے کہ ہم سے اور زمانے سے ہے اور تکرار بھی کیسی کہ مٹائے سے مٹتی نظر نہیں آتی تو ان میں سے ایک کا علیحدہ ہو جانا اچھا ہے۔ زمانہ ہمارے مٹائے سے نہیں مٹتا، ہم آپ مٹ جائیں جس سے یہ عمر بھر کی ایک دوسرے سے ضد تو مٹے۔

تجھ پہ قابو نہیں، دل پر تو ہے قابو اپنا

زندگی کی بڑی شرط یہ ہے کہ دوسرے کی تکلیف۔ بلکہ موت، جانور کو جانور کے مارنے میں جو مزہ آتا ہے وہ بلی سے پوچھئے، جب چوہے کا شکار ہاتھ آئے۔ ہم خود اپنی غرض کے لئے مخلوقات میں سے کسی پر رحم نہیں کرتے، زندگی صرف موت کا وظیفہ ہے

خوشی نام ہے تمنا کے برآنے کا، اور انسان کی تمناؤں کی حد نہیں۔ سب کا برآنا ممکن نہیں جو تمنا پوری نہیں ہوتی اس کا رنج ہزار پوری ہوئی تمناؤں سے بڑھ کر ہوتا ہے، اس کے سوا ہر خوشی کے بعد ایسی الجھن ہوتی ہے جس سے خوشی کا آدھا لطف جاتا رہتا ہے۔ اس حساب سے خوشی کی مثال یوں ہوئی جس طرح چند قطرے بحر مصائب میں۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ یہ مسئلہ ولایت میں پیش ہوا کہ ہماری زندگی جینے کے قابل بھی ہے یا نہیں، اول تو یہ ثابت نہیں کہ خدا نے تمام زمین و آسمان کسی خاص مخلوق کے لئے پیدا کیا ہو، خاص کر انسان سے خود غرض کے لئے جس کے بڑھ کے نمونے جیل خانے میں نظر آتے ہیں۔ بہر حال دنیا کسی کی خاطر سے بنائی گئی ہے یا نہیں، یہ ہمیں بنی بنائی نظر آتی ہے۔ اس کی نسبت یہ کہنا کہ یہ سب سے اچھی یا سب سے گئی گزری ہے دونوں باتیں صحیح نہیں معلوم ہوتیں، اس میں بھلائی برائی دونوں ملی ہوئی ہیں۔ پہلے تو انسان یہ سمجھا کہ دنیا میں خوشی ہے، کیونکہ اگر خوشی کا وجود نہ ہوتا تو یہ لفظ کبھی کا فرہنگ انسانی میں سے نکل گیا ہوتا، اس کا شبہ اگر عالم اسباب میں ہے تو عاقبت میں اس کا ہونا ضروری سمجھا گیا، دنیا میں زندگی کا لطف ہے تو خوشی کی امید پر ہے لیکن محض خوشی کو زندگی کا نتیجہ سمجھ لینا اسی قدر غلط ہے جس قدر کہ یہ سمجھ لینا کہ دنیا میں مصیبت کے سوا کچھ نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا نری بزم رقص و سرود نہیں، لیکن کبھی کبھی اس خرابے سے پرانے بوریئے اٹھا کر فرش مخملیں میسر ہو تو گھڑی دو گھڑی ناچ کو دیکھئے۔ پھر ویسے ہی بوریئے بچھا دیجئے ؎

انو رمن و کنج طرب و بستر خواب — کو شور قیامت کند آفاق خراب
در کیش شہیداں نبود حشر و حساب — ہر قطرہ کہ دُر شد نہ شود دیگر آب

مسلمانوں میں یہ مضامین بڑی خوبی سے بیان کئے گئے ہیں۔ شیخ الاسلام حضرت شیخ احمد جامی قدس اللہ سرہٗ العزیز فرماتے ہیں۔

قطعہ:-

درِ میخانہ و مسجد کدام است | کہ ہر دو بر منِ مسکیں حرام است
نہ در مسجد گزارندم کہ رندی | نہ در مے خانہ کایں خمار خام است

میانِ مسجد و مے خانہ راہے ہست
غریبم عاجزم آں رہ کدام است

ابن یمین کا قطعہ ہے جس سے بہتر ڈاروِن صاحب کو بھی نہ سوجھا ہوگا ؎

زدم از کتم عدم خیمہ لبصحرائے وجود | از جمادی بہ نباتی سفرے کردم و رفت
بعد ازانم کشش نفس بہ حیوانی کرد | چوں رسیدم بوئے زوے گذرے کردم و رفت
بعد ازاں در صدف سینۂ انساں بصفا | قطرۂ ہستی خود را گہرے کردم و رفت
با ملائک پس ازاں صومعۂ قدسی را | گرد برگشتم و نیکو نظرے کردم و رفت

بعد ازاں رہ سوئے او بردم و چوں ابن یمین
ہمہ او گشتم و ترک دگرے کردم و رفت

کسی دل جلے نے کیا خدا لگتی بات کہی کہ دنیا میں ہم اپنی غلطیوں سے اپنا ستیاناس کر رہے ہیں سو کر رہے ہیں۔ کوئی سمجھائے تو سہی کہ ہماری عاقبت برباد ہو جانے سے کسی کو کیا ملے گا ؎

چاکہائے سینہ تا دامن رساندن کار من
سینہ کاویدن جگر سوراخ کردن کار کیست

کس بلا کی بات کہی ہے کہ ؎

گر دل بمذہب تو ہمیں گوشت پارہ ایست
قصاب شہر بہ ز تو داند بہائے دل

مذمت روزگار یعنی پے سم ازم (Pessimism) کی فلاسفی میں ولایت میں اچھے اچھے لکھنے والے ہوئے ہیں۔ شوپن ہار نامی فلاسفر نے اس کی تعلیم

کا اسکول قایم کیا اور لیو پارڈی نامی عالم و شاعر نے زمانے کی شکایت اور مذمت روزگار دمیں بہت کچھ کہا جس کے کلام کی ولایت میں بہت شہرت ہے، ان سے بہتر یا ان کے برابر کوئی کیا لکھے گا ؏

دل گرفت از پستیٔ ایں سقفِ زنگاری مرا
دامن ایں خیمۂ کوتاہ را بالا زنید

خوں بود دل کہ لذت درد نہاں شناخت — ایں غنچہ قطرہ بود کہ رنگ خزاں شناخت

شنیدم از زبان شمع و روشن گشت برمن ہم
کہ یک شب اختلاط خلق جاں بگزارد و جاں ہم

شمع می گوید با ہل بزم با سوز و گداز — سر بریدن پیش ایں سنگیں دلاں گلچیدن است

فغاں زستی بازوئے موج ایں دریا — کہ کشتیم نشکست و کنار نزدیک است

فریب تربیت باغباں مخور اے گل — کہ آب اگر دہد از تو گلاب مے گیرد

ق بدنامیٔ حیات دو روزے نبود بیش — گویم کلیم با تو کہ آنہم چناں گزشت
یکروز صرف بستن دل شد بایں و آں — روز دگر بکندن دل از جہاں گزشت

دنداں چہ تیز کرد لقصد من آسماں — آخر چہ لذت است دریں خشک استخواں

تن را با گزاشتم از ترس جان خویش — تن را بجور باک و گرفت است پائے جاں

نیست از خورشید و مہ ایں گنبد گرداں سپید
ز استخوانِ بے گناہاں است ایں زنداں سپید

(صلائے عام - شوال ۱۳۲۶ھ نومبر ۱۹۰۸ء)

زمانے کی صبح و شام

یعنی

سال کا آغاز و انجام

جہال اور غلطیہائے مضامیں زباں زد خاص و عام ہیں ان میں انقلاب روزگار کا خیال بھی سمجھ لیجئے زمانے کی گردش کا ہمیشہ ایک سا حال رہا ہے۔ اس میں انقلاب نظر نہیں آتا۔ ابتدائے آفرینش سے گردش فلکی ایک سی چلی آ رہی ہے۔ اس کی وہی صبح وہی شام، وہی آغاز وہی انجام ہے۔ طلوع آفتاب کا نام صبح اور غروب آفتاب کا نام شام ہے، جہاں دیکھئے وہی دن وہی رات، وہی زمین وہی آسمان ہے۔ سیلاب کی طرح ایک موج آئی اور دوسری گئی، اس کا دور و تسلسل نہ مٹا نہ مٹے گا، گردش روزگار میں نہ انقلاب ہوا ہے نہ ہوگا۔ لیکن یہ رات دن کا الٹ پھیر جو ہم دیکھ رہے ہیں محض ہمارے خیال کا اثر ہے کہ جو خیال میں آیا وہی صورت پکڑ گیا۔

شرح ہنگامۂ ہستی ہے گزرگاہ خیال

کسی کی رخصت کا خیال ہے تو شام ہی سے شب رخصت بلائے جاں ہوگئی۔ شام ہوئی نہیں اور دل گھبرایا نہیں، ابھی سے کسی کا خیال بندھا، کسی کی آس ٹوٹی، کوئی بے قرار ہوا، کسی نے آہ کی۔ اس وقت میں کچھ تو اثر ہے جو دل بیٹھے جاتے ہیں، کلیجے بے اختیار منہ کو چلے آتے ہیں، دن تو جس طرح ہوا گزر گیا، شام ہوتے ہی کیوں بے قراری ہوئی، آپ سے آپ اس وقت دل کیوں تڑپنے لگا۔؟ جس طرح کوئی دل ربا دم رخصت گلے میں باہیں ڈال کر کہے کہ ابھی نہ جاؤ اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں، دامن یار نہ چھوڑے کیا شام بھی جدائی کے خیال سے دن کو جانے نہیں دیتی۔؟ اس مختصر وقت سے اس لئے

بھینچ بھینچ کر لپٹ رہی ہے کہ کہیں چلا نہ جائے اور آخر جب دیکھتی ہے کہ نہیں مانتا تو ساتھ ہو لیتی ہے۔ اب رات کیا آئی اک بلا آئی — خاص کر اس کے لئے جس کی یہ آخری رات ہے، جو ارمان کی طرح چند ساعت کا مہمان ہے، جس سے زمانہ صورت یار کھینچ رہا ہے جس کی نظر کے سامنے سارا جہان اندھیر ہو رہا ہے جس کو حسرت دل بھر منہ نہ دکھائے گی، جس کے لئے یہ رات گویا قیامت کا سامنا ہے اس کے لئے سارا عالم اسباب سنسان ہو رہا ہے:۔ جہاں کسی کے کراہنے کی آواز ہے ؎

کیا مجھ میں دم بھی لینے کی طاقت نہیں رہی
کیوں شور نالہ ہائے عزا یار کم ہوا

یہ تو جانے والے کی رخصت ہوئی۔ لیکن دنیا عجیب مقام ہے، ایسے ہنگامۂ جا و بے جا اور ایسے کارگاہ ہستی و فنا کا نام ہے، جہاں رات دن عدم و وجود میں لڑائی ہے، موت سے زیادہ ہستی کا کام جاری ہے، جہاں موت کو زندگی سے لاچاری ہے، اس میں مرنے پر بھی زندگی سے مفر نہیں۔ پیدائش کی وہ دھوم ہے کہ کسی کو موت کی خبر نہیں، ایک جاتا ہے تو دوسرا اس سے پہلے آجاتا ہے، دو گئے تو چار آگئے۔ زمین میں ایک دانہ چھپا تو دس دانے نکل آئے، ایک جسم سڑا ہزار کیڑے پیدا ہو گئے۔

نتواں شمار کرد جفائے زمانہ را
لیکن ہزار شکر کہ نبود بیک قرار

اس سے آپ کو معلوم ہو گیا کہ موت میں بھی پیدائش کا بازار گرم ہے، اب دیکھئے ایک کا انجام دوسرے کا آغاز کیا دکھاتا ہے۔ ۲؍ شب کا جانا ۹؍ کا لگا لاتا ہے گویا احرام یار تھا جس نے صبح محشر پیدا کر دی ؎

اے فکر بیاد دیدہ ور شو
دریوزہ گر در سحر شو

لوگ کوٹھوں سے پیر دبائے گردن جھکائے اترے کہ جھٹ پٹے میں نکل چلیں، اہل نشاط نے چادریں تانیں، خرابات کا وہ آخری مہمان جو اب تک در مے کدہ پر گلوئے سبو سے ہم آغوش پڑا تھا، پچھلی رات کی ہوائے سرد سے کلبلایا اور نشے کے خمار میں گرتا پڑتا گھر کو چلا، قمار خانے بند ہوئے، بھٹیوں میں ٹٹیاں لگیں، ہجوم دیریاں جمنا کو چلا، جن میں وہ لعبتان نازک اندام چلے جن کے خرام ناز کے ساتھ وہ شب بھی مانند شوق مضطر چلی۔ حیائے چشم جاناں کی طرح ایسی چھپی کہ دہن یار کی طرح دکھائی نہ دی۔ سپیدۂ سحری نے صاف دلوں کی طرح رہبری کی اور روشنی نے مہ جبینوں کی طرح پردہ دری، کسی نے کروٹ لی ہے تو کسی نے انگڑائی، کسی نازک اندام کے چہرے سے سوتے میں دوپٹا سرکا ہے کسی کی دلائی، نسیم سحر اس لئے آہستہ چل رہی ہے کہ کوئی بے چین نہ ہو۔ ابھی دو چار جاگے ہیں تو دو چار سو رہے ہیں کسی نے تکیے سے گردن اٹھائی کہ دیکھیں کہیں دن تو نہیں نکل آیا، مگر ابھی آسمان پر کچھ کچھ سیاہی دیکھ کر پھر لیٹ گیا۔ کوئی گھبرا کے کسی کے پہلو سے اٹھا کہ روشنی نہ ہو جائے۔ بندگان عیش رات کے جاگے انگڑائیاں لینے لگے، زاہدوں نے مسجد کی راہ لی، مسافر سرائے سے نکلے، صبح کیا ہوئی، گویا زمانے کی آنکھ کھل گئی ؎

دیدم دو جہاں بیک جہاں در
صد عمر ابد بیک زماں در

یہ سننا تھا کہ ۱۹۰۹ء جو ابھی تک گھر سے باہر نہیں نکلا تھا، چل نکلا "گردشِ بخت" امام ضامن کے پیسے کی طرح ساتھ ہو لی۔ "مادرِ گیتی" نے آواز دی کہ بیٹا! زمانے سے ہشیار۔! اس نے تجھ سے بہتیرے آوارہ کر دیئے کہ جن کا پھر پتا نہیں لگا، ایک نہیں، سب کے سب اس طرح گئے کہ پھر نہ ملے، لوگ ان کے نقش پا بھی ڈھونڈتے رہے کسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ ؎

کیں تلخ کشاں چہا کشیدند
وے گرم رواں کُجا رسیدند

خدا خیر کرے! نئے نئے گھر سے نکلے ہو، دیکھئے کیا پیش آتا ہے، پہلا سفر ہے اور راستہ دیکھا نہیں، آرزو کے سوا کوئی ساتھ نہیں اور امید کے سوا کوئی سہارا نہیں۔ اسباب میں سامان ہے تو یہی ۔ مگر دیکھنا ایک عالم کی نگاہ تمہاری طرف ہے، سب دور سے بیٹھے دیکھ رہے ہیں، تمہاری بات بات دنیا میں یاد رہے گی گھبرانا نہیں، ایک دو نہیں، بارہ منزلوں کا سفر ہے اور سفر بھی اس قیامت کا جس میں ۔ ع

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

(صلائے عام جنوری ۱۹۰۹ء)

زبانِ اُردو،

ہر کہ آمد غمِ کم عمریِ گُل کرد بباغ
ہیچ کس رحم بمُرغان گرفتار نکرد

میں دیکھتا ہوں کہ پرانی ونئی زبانوں اور قدیم وجدید لب ولہجہ پر عجیب عجیب رائیں دی جاتی ہیں، قومی ارادوں اور ملکی حوصلوں میں ہر طرح کی طبع آزمائیاں ہو رہی ہیں، نہیں پوچھتا تو کوئی اردو کو۔ کہ خاصی منجھی منجھائی زبان ہے جو بے درد سر خدانے ہمیں دے رکھی ہے، اس کا بھی کچھ حق ہے۔ ہر ملک و ہر صوبہ و ہر فرقہ و ہر مذہب اپنی اپنی زبان علیحدہ مانگ رہا ہے، اس میں بھی دھڑے بازیاں اور پارٹیاں اور اپنے اپنے خیال وقیاس کی ٹولیاں جدا جدا ہیں۔ مجھے یہ ثابت کرنا ہے کہ ہندوستان کی اور زبانوں اور نئی ڈائیلیکٹس یعنی بولیوں میں جو زبان کے مرتبے کو نہیں پہنچتیں، ہمارے لئے اُردو بہت مناسب ہے، اگلی زبانوں میں سنسکرت و عربی اور تھوڑے دنوں سے رواج پائی ہوئی فارسی کو اب کیا کیجئے گا۔ تواریخ کی رو سے قدیم زبانوں میں کوئی زبان ہزار برس سے زیادہ نہیں چلی، عبرانی زبان، جسمیں خدا نے حضرت موسیٰ سے گفتگو کی عیسائی مذہب سے پہلے فنا ہو چکی تھی اور گو اعجاز مسیحائی نے ہزار مردے جلائے مگر عبرانی پھر زندہ نہ ہوئی، سنسکرت اور عربی کا نام ہندوستان میں صرف مذہبی ضرورتوں کی وجہ سے باقی ہے، اگلی فارسی جو سلطنت مغلیہ کے عہد میں چمکی اس میں ابو الفضل کا طرز بہت مشہور ہوا، لیکن آئین اکبری کی عبارت بغیر فرہنگ کے

مشکل سے سمجھ میں آئے گی۔ قاعدہ ہے کہ جو زبان بولنے سے جاتی رہے فنا ہوئے بغیر نہیں رہتی، جہاں دنیا کی ہر شے اسباب و سامان کی محتاج ہے زبان بھی اسباب و حالات سے پیدا ہوئی، جب سامان بگڑ جاتے ہیں زبان بھی نہیں رہتی۔ اب ہندوستان میں اگلی زبانوں کے رواج پر محنت کرنی بیکار ہے، وہ زبانیں تو اب زندہ ہو چکیں یہ جو اس وقت رائج ہے اس کے مٹ جانے کا اندیشہ ہے۔

ہندوستان میں اظہار مطلب کے ذریعوں میں اردو سب سے زیادہ رائج ہے، جو دریا جس قدر زیادہ رواج پائے گی اسی قدر پاکیزہ اور پائیدار ہو جاتی ہے اس کے علاوہ اگر آپ کسی اور ڈائیلیکٹ کسی خاص فرقے کی بولی پر محنت کریں گے تو مدت میں اس مرتبے کو پہنچے گی اور جب بنی بنائی تیار چیز موجود ہو، اسکو مٹا کر دوسری تلاش کرنا ضد کی بات ہے۔ اردو ہندوستان کے لئے یوں بھی بہت موزوں ہے کہ اہل ہند اور اہل اسلام کے اتفاق اور اتحاد سے پیدا ہوئی۔ اور دونوں قوموں میں اسے ٹکسالی ہونے کا مرتبہ حاصل ہو گیا ہے۔

اہل تحقیق کا مسلہ ہے کہ اصلی خون اگر پھر نہ ملے تو چوتھی پشت میں گورے یا کالے کے رنگ و روغن اور خط و خال باقی نہیں رہتے۔ اس حساب سے اردو مسلمانوں کی زبان نہیں، اس ملک کی زبان ہے۔ اس کے خط و خال اور لب و لہجہ اسی ملک کا ہے۔ اس وقت اردو کو چھوڑ کر کسی اور زبان کا خیال کرنا گویا وطن میں غربت کی تکلیف اٹھانی ہے۔ یہ خوب سمجھ لیجئے کہ جس قدر مختلف زبانیں اور چھوٹی موٹی بولیاں ہندوستان میں بڑھتی جائیں گی، یہاں کی تہذیب میں اسی قدر ہرج ہوگا۔ انسان ایک ہی بات میں کمال پیدا کر سکتا ہے اور انسان کی طرح قوم کی بھی عمر ہے۔ ہم کس کس زبان میں ترقی کر سکتے ہیں۔

یہاں توریت کا وہ قصہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ طوفان نوح کے بعد خلقت

کو یہ بات سوجھی کہ مینار بابل بنلیے جس پر طوفان کے وقت چڑھ جائیں۔ اس منصوبے کے بگاڑنے کے لئے خدا نے لوگوں کی زبانوں میں اختلاف پیدا کر دیا کہ تعمیر کے وقت اینٹ مانگی تو گارا لے کر دوڑے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مینار بننے سے رہ گیا۔

انگریزی کی تو میں کہتا نہیں کہ حکام کی زبان ہے۔ باقی روزمرہ کے لئے اردو سے بہتر کوئی زبان اس وقت ہمارے لئے بکار آمد نہیں۔ اسی میں ہم اپنی لٹریچر کو ترقی دیں۔

قوم کی ترقی اپنی لٹریچر پر ہے

قومی تہذیب کے موانع میں سب سے بڑا سبب زبان مادری کی ذلت ہے، پھر اہل علم کا ایک فرقۂ خاص ہونا، علما کا غیر زبانوں کی تحصیل کے ساتھ اپنی زبان میں کمال پیدا کرنے سے باز رہنا خواہ مخواہ ایسی بیگانگی پیدا کرتا ہے کہ ان کا ہونا نہ ہونا اس قوم کے لئے یکساں ہے۔ ہمارے یہاں شروع سے اہل علم ایک عالم سے علیحدہ رہے، جس طرح خاص عوام سے علیحدہ ہیں، یہ دونوں سے جدا رہے۔ اگر مولوی تھے تو عربی میں لکھتے پڑھتے تھے اور منشی تھے تو فارسی میں، قاضی جی نے فیصلہ کیا تو عربی میں اور حکیم جی نے نسخہ لکھا تو فارسی میں، اس میں بھی زور اسی پر رہا کہ جس قدر زیادہ منغلق ہو اتنی مستحق تعریف ہے یہاں تک کہ غیر زبانوں میں بھی مشکل سے مشکل اور غیر مانوس لغات تلاش کر کے لگائے گئے۔ سخت بے گانہ فقرے گھڑے گئے کہ جس قدر لوگ نہ سمجھیں گے اتنا ہی بڑا عالم جانیں گے، خط لکھا تو فارسی میں اور مسئلہ گھڑا تو عربی میں غرض سارا کمال بیگانگی پر رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل علم تو اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا کر بیٹھ گئے اور عوام باخبر نہ ہوئے اس سے قومی تہذیب کیا خاک بڑھتی۔؟ ہر چیز کے کمال کے واسطے ضرورت ہے کہ سب طرف سے زور دیا جائے۔ دنیا میں کسی بات کا کمال کسی سے اکیلے ممکن نہیں۔ عالم آ

ہیں سب ایک دوسرے کے محتاج ہیں - کمال تہذیب کے لئے بھی بہت سامان ضروری ہیں ایک دوسے کچھ نہیں ہوتا - تحقیق کے ساتھ تجربہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ علم کے ساتھ عمل - اور عالموں کی فضیلت اور اہل معاملہ کی قابلیت، خیال کی قوت اور روزمرہ کی کیفیت سب ملیں تب کامیابی ہوسکتی ہے - قوتِ دُخانی صرف دریافت کرنے سے کیا ہوسکتا ہے - ریل بھی چلانی چاہیئے - آسمان اور زمین کے قلابے ملانے سے کچھ نہیں ہوتا جہازرانی بھی چاہیے، ہمارے ہاں کے عالم تحقیق تو بہت عمدہ کر گئے لیکن قول سے فعل میں نہ لائے - برخلاف اس کے، اہل یورپ جو کچھ سوچتے ہیں کر دکھاتے ہیں - سبب یہ کہ اگلوں کو جو کچھ سوجھا غیر زبان میں لکھ گئے، کسی کو خبر نہیں - اب وہ بات سمجھے کیونکر؟ جو بات جس کو سوجھی قیامت تک اتنی ہی رہی - اس ملک کی زبان میں اگر سارے خیالات لکھے جائیں تو اور لوگ بھی سمجھیں اور زور لگائیں - ہمارے عالموں نے لٹریچر اور روزمرہ کو ملنے نہ دیا - دونوں کو اس طرح جدا رکھا کہ کوئی رشتہ قایم نہ ہونے پائے بلکہ ایک دوسرے سے وہ بیگانگی رکھی کہ ان کے دل و دماغ کی خوبیاں جس سے میری مراد لٹریچر ہے قوم اور ملک کے لئے بے کار ہو گئیں - کسی کو خبر نہیں کہ مولوی صاحب فلانے علم میں کیا کیا باریکیاں نکال گئے - فلانے منشی کیا کیا نازک خیالیاں کر گئے - ان کی عظمت صرف اسی میں رہی کہ کوئی آج تک نہ سمجھا -

عالموں کو اگر قوم کا باطن اور عوام کو اس کا ظاہر سمجھیے تو دونوں میں جب تک کوئی اتفاق نہ ہو کوئی کام نہیں نکل سکتا، جب تک دونوں ایک نہ ہوں کوئی فائدہ ممکن نہیں وہ ذریعہ جس سے ظاہر و باطن ایک ہوں، یہی زبان ہے - یعنی جس طرح انسان کے باطن کا حال جو کچھ اس کے دل میں ہے سمجھ میں آنے کے لئے یہی ایک وسیلہ ہے، یعنی زبان سے معلوم ہوتا ہے اسی طرح اس ملک کی زبان جس سے سب سمجھ سکیں علما اور قوم کی شناسائی کا ذریعہ ہے - آپ کو اگر کوئی بات عمدہ سوجھی اور آپ نے غیر زبان میں بیان کی تو

میرے کس کام کی ۔؟ اول تو سوچنا ایک زبان میں یعنی مادری زبان میں کہ انسان کو طبعی، پہلے اسی زبان میں سوجھے گا جس میں کہ پیدا ہوا اور بیان کرنا دوسری میں خود ایک سفر کے برابر ہے کہ کہاں سے کہاں جانا پڑا ۔ دوسرے ہم سمجھے تو خاک نہیں، اچھی ہوئی تو داد کیا خاک دیں گے ۔؟ اور بری ہوئی تو اصلاح قیامت تک ہو چکی، آپ کی تالیف اسی پر رہی کہ کسی کی سمجھ میں نہیں آئی ۔ جب ہم سمجھیں گے ہی نہیں تو اس سے مستفیض کیا ہونگے اسطرح لٹریچر جو بڑا ذریعہ قومی تہذیب و ترقی کا تھا بیکار گیا ۔

لٹریچر سے میری مراد ہر طرح کے اظہار کے ذریعے جس میں تمام علوم و فنون بھی آ گئے کہ ہر علم و فن محض ایک خیال مفید ہے جو کسی کے ذہن میں آیا وہ زبان ہی سے اظہار کیا گیا ۔ زبان نہ ہو تو کوئی نعمت کسی کام کی نہیں ۔ ذہن جو عقلی نعمتوں میں سب سے بڑا کہلاتا ہے اسی کا محتاج ہے ۔ جو بات ذہن میں آئے اور زبان سے نہ کہی جائے، اس کا عدم و وجود برابر ہے دنیا میں عقل و زبان نہ ہوتی تو کوئی کام نہ چلتا ۔ غرض عقل کے بعد دنیا میں سخن بڑی چیز ہے ۔ اس کے کئی حصے ہیں ۔ سب سے پہلے تو قصے روایات و حکایات و تاریخ وغیرہ پھر بحث و کلام اور آخر میں نظم و نثر میں فصاحت و بلاغت ۔ غرض زندگی کی تمام خوبیاں جنھیں انسانیت سے تعلق ہے یہاں تک کہ خدا کی شناخت بھی صرف اس کے کلام سے ہی ہوئی اور انسان و حیوان کا امتیاز اسی پر رہا ۔ پھر اس کا ثبوت کہ خدا نے ہمیں اپنی شکل پر بنایا یہی ہے اور اس کے خلیفہ جو ہوئے تو اسی کے سبب، ورنہ اس کے ہم شکل اور اس کے خلیفہ ہونے کا ثبوت اور کیا تھا ۔؟ تمام حیوانات سے جس بات میں کہ فرق ہے صرف زبان میں ہے ۔ انسان صرف نطق کی وجہ سے انسان ہے لیکن نطق کی ایجاد کے لئے بھی انسان ہی درکار ہے ۔ نیچری ہماری تمام باتیں اسی نیچر کا نتیجہ بتلاتے ہیں کہ ہوتے ہوتے ہو گئیں، کچھ خدا نے آسمان سے گھڑ کر نہیں بھیجیں، ایک سے ایک پیدا ہوتی گئی محض مادے سے جمادات، پھر نباتات اور حیوانات، یہاں تک کہ انسان

بن گئے، چنانچہ ایک ایک عضو و خیال و حرکت ہماری اسی ایوولیوشن (یعنی آپ سے آپ عالم اسباب سے متخرج ہونا) ثابت کرتے ہیں مگر کلام و زبان کا پتا نہیں لگتا کہ یہ کیونکر ہمیں ملے اور قویٰ کی طرح اگر جانوروں کی طرح رفتہ رفتہ ہمیں پہنچے تو کسی جانور میں کچھ تو اس گویائی کا پتا لگتا، حالانکہ کوئی جانور دنیا میں اس کا ثبوت نہیں دیتا، اس سے ثابت ہے کہ یہ نعمت محض عطیۂ پروردگار ہے اور عطیہ بھی وہ جو صلائے عام کی طرح ہر فرد بشر کو آسمان سے پہنچا، جہاں جایئے اور جس کو دیکھئے اسی کا محتاج ہے۔

جاہل سے جاہل قوموں کو اس سے مفر نہیں، اور نہیں تو قصّے کہانیاں ضرور ہونگے. اگلوں کی باتیں کسی نہ کسی طرح ضرور یاد کی جائیں گی۔ اگلی لڑائیوں میں جب کڑکے پڑھے جاتے تھے تو لڑنے والوں کے مزاج میں کیا کیا نہ تعلی آجاتی تھی۔ اب بھی بھاٹ جہاں گنوار سے گنوار کے سامنے اس کے بڑوں کا ذکر کرتے ہیں تو کیا کیا حوصلے پیدا ہوتے ہیں، غریب سے غریب کا بھی جی چاہتا ہے کہ کپڑے اتار کر دے دیجئے۔ غرض قوموں کی عظمت کا پیمانہ اور ہماری کنشیس نس یعنی آگہیٔ باطنی کا ذریعہ یہی ہے۔ بڑھیا جو چکی پیس رہی ہے خواہ مخواہ گنگنا رہی ہے اور چرواہا جو بکریوں کو چرا رہا ہے درخت کے تلے دوپہر کو اکیلا الاپ رہا ہے ایشیاکی لٹریچر کو کبھی وہ نمود ہوئی کہ یورپ کے دل و دماغ کی ترقی کا سبب ہوگئی تمام یورپ میں سارا صدقہ یونان کا تھا کہ جس قوم نے تہذیب سیکھی یونانیوں سے سیکھی یہی اپنے اقرار سے اپنے تئیں ایشیا کا محتاج بتاتے ہیں۔ معتبر محققوں کی زبانی ہے کہ یونانیوں کی نظم و فلاسفی ایشیا سے گئی، پنڈار اور ہسکائیلز کی نظم میں ایشیائی خیالات کا اثر کس خوبصورتی سے پایا جاتا ہے۔ یونانی متھالوجی یعنی دیو پرستی اور مسائل تناسخ یہاں کے عقائد سے کیسے ملتے ہیں۔ پھر ایشیائے کوچک تو گویا تمام تعلیم و تہذیب کا مرکز ہی رہا ہے، پرانی قوموں میں یہودی بہت قدیم لوگ ہیں۔ ان کو ایرانیوں سے بہت تعلق رہا۔ ایران سے میری مراد فارس ہے کہ ان کا بادشاہ خسرو تربیت میں بہت مشتاق تھا

سمجھا جاتا ہے جس کو خدا نے یہودیوں کی خاطر سے مخصوص کیا۔ ایرانیوں اور یہودیوں کے خیال بہت مل گئے، اُن کا خدا وہی اندھیرے و روشنی کو جُدا کرنے والا، وہی برائی بھلائی کا جھگڑا وغیرہ وغیرہ۔ ایرانی جب یونان پر چڑھ کر گئے تو اپنے خیالات وہاں لے آئے اور یونانی جب سکندر کے ساتھ ایران و ہندوستان میں آئے تب بہت سی باتیں یہاں کی ملک گیری میں لے گئے، یوں ایشیائی خیالات یونان میں پہلے پہنچے، ان سے رومیوں کو جو ان کے سجادہ نشیں ہوئے ملے اور کروسیڈ یعنی بیت المقدس کی لڑائی کے سبب تمام یورپ میں پھیلے۔ عیسائی جو یہاں سے لوٹے تو بہت سے ہمارے خیالات یورپ کو لے گئے غرض یونانیوں اور فارسیوں نے بلکہ عموماً تمام ایشیا نے یورپ کے خیالات میں بڑا فرق ڈال دیا۔

لٹریچر کا اثر صرف قوم پر ہی نہیں ہوتا، مذہب بھی اس سے نہیں بچتا۔ عقائد کو اس سے اسی قدر لاچاری ہے جس قدر کہ دینیات سے۔ کیونکہ سارے مذہب صرف اس کلام کی تفسیر ہیں جو الہام کے نام سے مشہور ہے۔ یہ عرب کی پاکیزگیٔ سخن ہے جس کی بدولت ان کی لٹریچر میں متھالاجی یعنی دیوپرستی کا ذکر نہیں۔ برخلاف اور قوموں کے کہ ان کا لٹریچر آدھے سے زیادہ بُت پرستی کا سبب ہوئی۔ بڑھیاں ہمارے کانوں میں رات دن دیو پری، جن بھوت کے قصے بچپنے سے اس طرح پھونکا کرتی ہیں کہ ہم مرتے دم تک بھوت پریت سے ڈرتے رہتے ہیں، یہ نمونہ زبانی لٹریچر کے اثر کا ہے۔ تحریری لٹریچر سے جو مذہبی جھگڑے اور دینی مسئلے بگڑے ان کا ذکر ہر مذہب میں بہت طویل ہے یہاں تک کہ جو شخص کسی بات کی سند دیتا ہے، یہی کہتا ہے کہ کتابوں میں لکھا ہے، اگلے کہہ گئے۔ اب اس کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ کتاب میں بُری یا بھلی جو بات لکھدی جائے وہ مٹ چکی، نیچری جو انسان کو حشرات الارض سے زیادہ نہیں سمجھتے کہ جس طرح برسات کے جانور پیدا ہوتے ہیں آدمی بھی زمین سے پیدا ہوگیا، ثبوت میں کہتے ہیں کہ اہل کتاب نے

انسان کی خلقت مٹی سے لکھی ہے ، ورنہ ہم میں نری مٹی کا کیا ہے جو لکھا ہے کہ مٹی میں مٹی مل جائے گی ۔ یورپ میں سیڈرین بادشاہ کے زمانے سے بادشاہ جسٹینین تک ایشیائی ہونے کے سبب مذہبی خیالات یہاں کی وضع پر رہے ۔ جسٹینین بادشاہ نے تمام علمائے ایران میں بسائے جن کے خیالات یہیں کے سے ہو گئے ۔ غرض خدا پرستی یا بت پرستی جو عوام میں بڑھی صرف کلام یعنی اس قوم اور مذہب کے لٹریچر سے بڑھی ، یہی وجہ ہے کہ جو فحش کلام کے سننے سے ممانعت کی جاتی ہے اور مقدس کلاموں کے دیکھنے کی تاکید ہے کہ جیسی لٹریچر ہو گی ویسا ہی اثر پڑھنے والے کے دل پر ہوگا ، ورنہ کیا بات ہے جو کبھی کوئی چبھتا کلام سنکر پہروں دل ہی دل میں مزے لیا کرتے ہیں اور بڑے بڑے سنگ دلوں کی آنکھوں سے کسی کی تقریر پر آنسو بہا کرتے ہیں لیکن جہاں اس لٹریچر کا اتنا اثر ہے ، ضعف بھی اس میں زیادہ ہے ۔ یہ بگڑی تو وہ قوم بھی ساتھ ہی بگڑی ، یونانی جس وقت بگڑے ان کی لٹریچر اسی وقت ختم ہوئی ، پھر کسی نے نہ لکھا ، نہ پڑھا ، لاطینی مدت سے مردہ زبانوں میں ہے ، سنسکرت کو مفقود ہوئے عرصہ گزرا ، عرب کی سلطنت جاتے ہی اس کی لٹریچر بے قدر ہو گئی ، اسی طرح تمام زبانوں اور قوموں کا حال ہوا ، برخلاف اس کے جو زبانیں چمکیں ان کا اقبال بھی چمکا ، آج کل کی زبانوں میں انگریزی لٹریچر لاجواب ہے ۔ اس کا عروج اور اس کی اقبال مندی ایک ہی وقت کی چیزیں ہیں ۔

لٹریچر کی ترقی کے اسباب میں اول تو گورنمنٹ کی توجہ چاہیے کہ اہل سخن کا پہلا حق حکومت پر ہے ، پھر قوم پر ، اس کے بعد زمانے کے مزاج پر ۔ خاندان تیموریہ میں اکبر کے عہد سے زیادہ کوئی سلطنت اقبال مند نہیں ہوئی ۔ یہی از روئے دل و دماغ سب میں مشہور ہے ۔ اسی سبب سے اس عہد میں وہ نامور اہل کمال ہوئے کہ نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد اتنے اہل سخن اکٹھے ہوئے ۔ ہم اپنے اہل زبان سے کہتے ہیں کہ اردو لٹریچر کا تم پر حق ہے ، جو کچھ تمہیں لکھنا پڑھنا ہے اس میں لکھو ۔ اگلے وقت

کچے بچے ہوئے لوگ اب بھی اردو میں لکھنا پڑھنا عیب سمجھتے ہیں، اسی پرانی فارسی کو پیٹ رہے ہیں جس کے سبب ہماری بچاری زبان جس میں ہم نے اپنی ماں کو گود سے پکارا، جس کی لوریوں نے ہمیں مدتوں سلایا یوں برباد ہو رہی ہے۔ اگر کسی سے کہا جائے کہ آپ اردو کی طرف توجہ کیوں نہیں کرتے؟ تو جواب دیتے ہیں کہ اردو میں دھرا کیا ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اگر نہیں ہے تو آپ اس میں کچھ لائیے۔ یہ ڈھنگ اس کے بنانے کے ہیں یا بگاڑنے کے؟ بہتوں کا یہ ایمان ہے کہ مسائل علمی اور مضامین مشکل، عربی فارسی کے سوا اردو میں ادا نہیں ہو سکتے۔ آپ نے کبھی اردو میں ادا کئے جو نہ ہوئے؟

اس پرچے سے میرا ارادہ یہ ساری دقتیں رفع کرنے کا ہے کہ جس میں سب لاچار رہے وہ کر دکھایا جائے اور اس طرح جہاں تک ہو سکے اس پرچے سے اپنی زبان و لٹریچر کو ترقی بھی دی جائے جس کا حق سارے ملک پر ہے۔

ہیں مضامین پری زاد زکی پیش نگاہ
دل تڑپتا ہے قلم ہاتھ سے گر رکھتے ہیں

(صلائے عام جنوری ۱۹۰۹ء)

عہدِ اسلام، یورپ میں

خلفائے عباسیہ کی سلطنت میں ترقی و تہذیب و علوم و فنون کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں، ہندوستان میں اسلام کے عہد کا حال پچھلے صلائے عام میں عرض کیا گیا، یورپ میں اسلام کا زمانہ سب سے دلکش سمجھئے۔ اس کے دلکش ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس عہد کی تحقیق کا مسالا یورپ کے مورخوں نے بہت محنت سے جمع کیا ہے جسے اسلامی لٹریچر کے لئے مایۂ ناز کہنا چاہیے۔ انگریزی، فرانسیسی و جرمنی اور اسپین کی زبانوں میں عہد اسلام کی بدولت مفصل تاریخیں ہیں، اس سے لاعلمی ہے تو ہندوستان کے مسلمانوں کو جب تک کہ کوئی اور اچھا لکھنے والا اس طرف متوجہ نہ ہو، آج میں خلافت قرطبہ کا ذکر تاریخ اسپین میں سے جابجا سے عرض کرتا ہوں۔

فتح اسپین کے بعد ۷۵۵ء سے ۱۰۳۶ء تک خلافت قرطبہ کا زمانہ سمجھئے جس میں نامور بادشاہ گزرے ہیں۔ ان کے زمانے میں اسپین کو وہ عروج ہوا جو پھر نصیب نہ ہوا۔ پہلے میں شہر قرطبہ کا حال سنا دوں، صرف اسی ایک شہر میں ایک ہزار مسجدیں، اسی ہزار چار سو پچپن دکانیں، دو لاکھ باسٹھ ہزار تین سو مکان تھے اور دس لاکھ آدمیوں کی آبادی تھی۔ شہر کے گلی کوچوں کی مسافت دس میل لکھی ہے جن میں رات کو ہر جگہ روشنی کا انتظام تھا۔ گویا دس میل کی بزم چراغاں پیش نظر رکھئے۔ باشندگان قرطبہ کی نسبت ایک انگریز مورخ کی رائے ہے کہ شائستگی و اخلاق اور ترقی تہذیب و علوم و فنون میں تمام یورپ سے ممتاز سمجھے جاتے تھے۔

اسپین میں مسلمانوں کے اقبال کا سبب یہ سمجھا گیا کہ مسلمان غیروں کے ساتھ بڑی رعایت وسلوک سے پیش آئے، ان کے علوم وفنون کو ترقی دی اور قدیم یونان کی تحقیق وفلاسفی کو جو فنا ہو چکی تھی جِلا دیا اور گو عیسائی ملکوں میں اپنے عقاید کی ترویج پر بہت زور نہیں دیا، یعنی غیر قوموں کی رعایا میں سے بہت مسلمان نہیں کئے لیکن ان کی ذات سے مذہب عیسوی کو بڑا فائدہ ہوا۔

یہ بات ذرا تعجب کی ہے کہ عیسائی مذہب کے عقاید کو اسلام سے فائدہ پہنچے مگر محققین کی رائے ہے کہ اسلام کے خدائے واحد کے عقیدے نے اس وقت کے عیسائیوں کی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سمجھنے کے لئے اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ رومن کلیسا میں اس وقت بت پرستی کے خیال اس قدر شامل ہو چلے تھے جس سے اندیشہ تھا کہ خدا کی وحدانیت کا عقیدہ مفقود ہو جاتا، حضرت مریم کی الوہیت پر بڑا زور ہو رہا تھا، شہدائے عیسوی کی پرستش کا رواج تھا۔ ہر چھوٹے بڑے بزرگ و ولی پر عقیدہ رکھنا عبادت میں سمجھا جاتا تھا۔ تمام گرجا گھر سنگیں بتوں اور تصویروں سے بھرے ہوئے تھے۔ جن سے منتیں مانی جاتی تھیں۔ اور کرامات ومعجزوں کا بڑا چرچا تھا، اندیشہ تھا کہ پھر سرے سے بت پرستی چمک جائے گی۔ اس حال میں (بقول مورخ انگریزی) سمجھدار عیسائی گو مسلمانوں کی سلطنت سے خوش نہ ہوں مگر ان کے ایک خدا کی عبادت کو اچھا سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ عیسائی بادشاہوں میں سے لیوسیوم نے عقائد بت پرستی مذہب عیسوی سے نکالنا چاہے اور اس کے بیٹے قسطنطین پنجم نے ۷۵۴ء میں علمائے عیسائی کی بڑی مجلس جمع کی جن میں تین سو اڑتیس بشپ (پادری) شامل ہوئے اور مراسم بت پرستی کی ممانعت کی گئی۔ اس عقیدے کے لوگ تاریخ کلیسیا میں "بت شکن" کے نام سے مشہور رہیں جن کا زور ایک سو برس رہا۔ اس وقت گو اس عقیدے کو کامیابی نہ ہوئی مگر یونی ٹیرین اور پراسٹنٹ مذہب کی بنیاد اسی وقت سے پڑ چکی

تھی جسے عہد اسلام کا اثر سمجھیے، مسلمانوں کی صحبت سے عقاید عیسوی میں کیسی اچھی اصلاح کا سامان ہو گیا۔

لیکن یہ بحث میرے مضمون سے علیحدہ ہے۔ خلافت قرطبہ کا حال سنیے کہ عبدالرحمٰن اول نے ۷۸۶ء میں قرطبہ میں مسجد جامع کی تعمیر شروع کی جو اس کے بیٹے ہشام کے عہد میں ۸۰۰ء میں ختم ہوئی۔ اس میں سنگ مرمر کے ایک ہزار چار سو نو ستون تھے اور انتیس پھاٹک پیتل کے ابھرے ہوئے کام کے تھے، ان میں صدر دروازہ کے کواڑوں کی جوڑی سونے سے منڈھی ہوئی تھی، گنبد و میناروں پر سونے کا کام دور سے چمکتا تھا، رات کو چار ہزار سات سو قندیلیں روشن ہوتی تھیں جن میں روز ایک سو بیس پونڈ عنبر و عود کا خرچ تھا، یہ مسجد اب گرجا بنالی گئی ہے۔

عبدالرحمٰن سیوم نے (جو ۹۸۹ء میں تخت سلطنت پر بیٹھا) پچاس برس تک سلطنت کی۔ اسکو لڑائیوں سے فرصت نہیں ملی لیکن اس کا مدرسۂ طبیہ تمام یورپ میں لاجواب سمجھا جاتا ہے بلکہ اس وقت تمام یورپ میں یہی ایک مدرسہ تھا۔

زہرہ کے نام سے عبدالرحمٰن نے ایک بڑا مقام آباد کیا جس میں ایک عظیم الشان محل بنوایا گیا۔ اس کے لئے سنگ مرمر کے ایک ہزار چودہ ستون افریقہ و اسپین سے اور انیس ستون اٹلی سے آئے تھے اور ایک سو چالیس ستون شاہ یونان نے بھیجے تھے۔ دیواروں پر سونے میں جواہرات کی پچی کاری تھی، صحن میں سنگ مرمر کا حوض تھا۔ جس میں یونان کے نامور سنگ تراشوں نے جواہرات اور سونے میں پرندوں اور جانوروں کی عجیب عجیب تصویریں بنائی تھیں۔ وابستگان حرم سرا کی تعداد چھ ہزار تین سو لکھی ہے۔

سلطان کے ہمراہ شکار میں بارہ ہزار مصاحب لباس فاخرہ سے ساتھ رہتے تھے جن کے شکار سے واپس آکر آرام کرنے کے لئے محل کے پائیں باغ کے صحن میں ایک فلک رفعت مکان تعمیر ہوا تھا۔ اس میں بھی سب ستون سنگ مرمر کے تھے جن پر سونے و فولاد سے

جواہرات کام تھا۔ فرش سونے وفولاد کے کام کا بنا تھا جسمیں جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ مکان کے صحن میں خالص سیماب کا حوض تھا جس میں آفتاب کی کرنیں خدا کی قدرت کا تماشا دکھاتی تھیں۔

اگر محض عیش دنیا سے زندگانی کا لطف ممکن ہے تو اس وقت کی زندگی سے زیادہ اور کیا نعمت ہو سکتی ہے لیکن مرتے وقت خلیفہ عبدالرحمٰن کے سرہانے اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ کاغذ نکلا جو تمام فلاسفی کا خلاصہ ہے۔

"میں نے پچاس برس خلافت کی جس میں دولت و اقبال وعیش کی کمی نہیں رہی زمانے نے جو نعمتیں دے سکتا تھا مجھے دیں۔ اس ظاہری اسباب عیش میں میں نے حساب لگایا کہ مجھے کے دن آرام ملا۔؟ صرف ۱۴ دن، دیکھ لو، سلطنت و دولت واقبال اور یہ دنیا اور اپنی ہستی کتنی ناپائیدار ہے"

معلوم نہیں کہ وہ چودہ دن کون سے تھے۔؟

الحکم ثانی نے ۹۷۲-۹۶۱ء تک سلطنت کی اس کے کتب خانے میں چار لاکھ جلد کتابوں کی تھی۔ کہتے ہیں کہ یہ ساری کتابیں الحکم کی پڑھی ہوئی تھیں جن پر اس کے ہاتھ کے حاشیے تھے۔

۱۰۳۶ء میں خلافت قرطبہ سولہ مختلف سلطنتوں میں تقسیم ہوگئی جن کی آپس کی تکرار سے اسلام کا زور گھٹنا شروع ہوا۔ ان میں خلافت قرطبہ کے بعد سلطنت غرناطہ کو ۱۲۳۸ء میں بڑا عروج ہوا۔

سلاطین غرناطہ کو اسپین میں اسلام کی سلطنت کی آخیر یادگار سمجھئے۔ شہر غرناطہ کی آبادی ۴ لاکھ لکھی ہے جس میں ساٹھ ہزار جوان نبرد آزما تھے۔ اس سلطنت کے کارناموں میں عمارت الحمرا تمام دنیا میں لاجواب ہے جس کی تعریف میں اس قدر

کتابیں لکھی گئی ہیں کہ ان کا ایک کتب خانہ علیحدہ ہے۔

اہل غرناطہ کو اسپین جیسے باوضع لوگ آدمیت وتمیز میں اپنے برابر سمجھتے تھے کہ پاس وضع میں شرفائے غرناطہ جنٹلمین ہیں مسلمان ہیں تو ہوں۔ یہ نہایت درجہ کے شرفائے مذہب عیسوی کا قول نقل کیا گیا۔

اسپین میں مسلمانوں کے عہد کی نسبت ایک مورخ لکھتا ہے کہ:۔

"ان کے زمانے میں ملک کو جو عظمت واقبال نصیب ہوا پھر نہ ہوا، تمام ملک میں جہاں تک انہیں جگہ ملی عمارتیں بناتے چلے گئے، جہاں دیکھئے مسجدیں، دارالشفا، خانقاہیں، نہریں، پل، باغ، محل اور قلعہ نظر آتے تھے، عجیب عجیب میوے اور پھول ونباتات غیر ملکوں سے منگا کر پیدا کیے گئے۔ نیشکر کی کاشت وتجارت کی ایجاد کی، سونے چاندی، پارے کی کانیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں، ریشم، اون سوت اور مارینہ کے کارخانے بنائے جن کا مال تمام یورپ میں پہنچتا تھا۔"

"کتابیں جو اکسیر سے زیادہ نایاب تھیں مسلمانوں نے عام کر دیں یہاں تک کہ مسلمانوں میں کتابوں کا شوق خبط کے برابر سمجھا جاتا تھا، ہر قصبہ اور شہر میں کتب خانہ تھا اور کاغذ بنانے کا ہنر ترقی پر تھا، جس وقت یورپ کے بزرگان دین بھی بڑے عالموں میں نہ تھے، مسلمانوں کا ہر بچہ تحصیل علم میں مصروف تھا، اکثر عورتیں شعر کہتی تھیں اور فصاحت وخوش بیانی میں مصروف تھیں، مادرزاد اندھے اکثر اچھے اچھے عالم تھے، ہیئت ہندسے اور حساب کی کتابیں ہندوستان سے تلاش کر کے منگوائی جاتی تھیں اور تحقیق علوم پر رات دن بحث ومباحثے رہتے تھے۔"

"غیر مذہب کے علما کی بڑی قدر تھی، دربار میں، کچہریوں میں، فوج

میں عیسائی بڑے بڑے عہدوں پر تھے، خلیفہ کے باڈی گارڈ میں
بارہ ہزار جو چُنے ہوئے جوان تھے ان میں چار ہزار عیسائی تھے، شرفا
اسپین میں جو عیسائی تھے ان کا خلا ملا شرفائے اسلام سے برابر کا تھا
ایک دوسرے کے راہ و رسم میں امتیاز مشکل تھا۔"

یہاں تک انگریز مورخ کے بیان کا خلاصہ ہے۔

عبرت کا مقام ہے کہ ایسی سلطنت ۱۴۹۲ء میں آٹھ سو برس کے بعد تین ہزار سات سو لڑائیاں لڑ کے اس طرح مٹ جائے گویا تھی ہی نہیں۔ اس کا اخیر بادشاہ اسپین سے نکلتے وقت جب قصر الحمرا کو مڑ کر دیکھنے لگا کہ کیسے کیسے شجاعان اسلام کی ہڈیاں سرو کے درختوں کے نیچے دفن پڑی ہیں تو ان کی بے کسی پر آنسو ٹپک پڑے۔ اس پر سلطان کی ماں نے ملامت کی کہ "اے کم بخت۔ اس چیز کے لئے عورت کی طرح کیا روتا ہے جس کو تو مرد کی طرح نہ رکھ سکا۔"

(صلائے عام۔ مئی ۱۹۰۹ء)

بیا کہ با تو بگویم زمدّعا سخنے

صلائے عام کے لئے جہاں اور مشکلیں تھیں ایک مشکل یہ پیدا ہوگئی، کہ اس کی زبان مشکل بتاتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ جیسی صحبت ہو ویسی زبان پیدا کرنی ضرور ہے لیکن میں پہلے ہی عرض کردوں کہ صلائے عام زیادہ تر اہل علم وکمال کے کام کا ہے۔ ان میں بھی خاص کر اہل کرم وصاحبان ذی فہم کے لئے یہ مشغلہ نکالا گیا ہے کہ زمانے کے مکروہات سے بچ کر نازک خیالی وخوش بیانی سے دل ودماغ تازہ کریں۔ ع

چشم جاں ساختہ اند اہل نظر تا نظرے
لائق دیدن نازک بدنے ساختہ اند

میں چاہتا ہوں کہ اردو جو محض بازاری زبان کہلاتی ہے اس کا مرتبہ بڑھایا جائے تاکہ اور زبانوں اور قوموں کے اہل کمال کو جو دعوے ہیں، اس میں نظر آئیں۔

میں کئی دفعہ عرض کرچکا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ اردو کی شاعری کسی زبان سے کم نہیں، مگر بقول میکالے، جو قوم جس قدر تہذیب میں ترقی کرتی ہے اسی قدر اس کی نثر بھی۔ میکالے تو یہ بھی کہہ گئے کہ قومی تہذیب وترقی میں شاعری کو ضرور زوال ہوتا ہے لیکن میں ابھی یہ نہیں کہتا، کیونکہ کبھی کبھی اچھے کلام سے وہ لطف آتا ہے کہ اس فن کے زوال سے رنج ہوگا بلکہ جب تک ہماری نثر ترقی نہ کرے ہماری اردو شاعری بہت غنیمت ہے لیکن قومی ترقی میں نثر کو ترقی دینی ضرور ہے کیونکہ یہ تحقیق کا مسئلہ قرار پاچکا

ہے کہ شائستہ قوموں کی زبانیں زیادہ تر عالمانہ اور فلسفیانہ ہوتی ہیں، برخلاف اس کے شاعری ایام جہالت میں کمال کو پہنچتی ہے، اس لئے نثر کی ترقی قوم کی شائستگی میں سمجھیے۔

یہ رسالہ زیادہ تر نثر کی ترقی کے لئے جاری کیا گیا ہے مگر نثر سے میری غرض محض عوام کی زبان نہیں۔ زبانِ عوام کی ترقی تو جب تک جس زبان میں عوام زیادہ ہیں خود بخود ہوتی رہے گی۔ ہاں مگر خاص کی زبان تکلف و امتیاز کے بغیر ذرا مشکل ہے۔ خاص کی زبان عوام سے ہمیشہ علیحدہ ہوتی ہے جس کے لئے Taste یعنی مذاق صحیح کی ضرورت ہے۔

اہل ہند اپنے ملک سے باہر نکلنے کے ہمیشہ دشمن رہے ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ ہندوستان سے اچھا دوسرا ملک نہیں۔ باہر کی قومیں خود یہاں آتی رہیں، کیونکہ ان کے ملک سے ہندوستان عجیب ملک ہے، تعجب ہے کہ ایسے پاکیزہ ملک کی زبان ایسی ذلیل ہو جیسی کہ اردو ہے کہ تمام دنیا کی زبانیں اس سے بازی لے گئیں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، جی چاہتا ہے کہ اردو عالمانہ زبانوں کے مرتبے کو پہنچ جائے۔ فلاطون و ارسطو کے خیال اس زبان میں ادا ہو سکیں۔ ابن رشد و فارابی کی تحقیق ہماری زبان میں بیان کی جائے۔

بہر داغت کہ شبستان دروں روشن از وست
از جگر سوختہ جاناں لگنے ساختہ اند

یوں تو آپ جو چاہیں کہیں لیکن اردو کی ترقی فارسی کی ترقی کے سوا اور کسی طرح مشکل ہے، اردو اسی گھر سے پیدا ہوئی، اسی میں پلی، اس کے خط و خال فارسی لب و لہجہ سے پیدا ہوئے اور یہی اسے زیب دیتے ہیں، فارسی کی وجہ سے اردو خوب منجھ گئی، اور اب ہر طرح کا مطلب اس میں ادا ہو سکتا ہے۔

بر نہ خیزند اسیرانِ تو عریاں ز لحد
از غبارِ سر کویت کفنے ساختہ اند

میں نے انگریزی زبان کے ترجمے دیکھے اور سنسکرت کے ترجمے بھی کبھی کبھی دیکھنے میں

آئے لیکن اردو کے لئے فارسی ہی سب سے زیادہ موزوں نظر آئی۔

بجز قرابہ فروشاں بداد من نہ رسید
مرا معاملہ با شیشہ گر ہمی بایست

اردو وہ زبان ہے جو اس وقت ہمارے اقبال کی یادگار رہے جس پر ہمارے ولولوں کے اظہار کا مدار ہے۔ سلطنتیں و قومیں و زبانیں اور بھی ہوئیں اور ہیں لیکن مسلمانوں کی سلطنت، قوم اور زبان کو از روئے تہذیب و ترقی کسی سے کم سمجھنے کو جی نہیں چاہتا

دوش خوش شکوہ زانیے کردم
خویش را ترجمانیے کردم

اب رہا سہل و مشکل کا جھگڑا، اسے آپ جانیں اور آپ کی سمجھ۔ میں یہ عرض کر کے علیحدہ ہوا جاتا ہوں ؂

تذبذب میں رہے گا یونہی ان کے وصل کا وعدہ
جہاں میں بحث ہوتی ہی رہے گی سہل و مشکل پر

(صلائے عام۔ دسمبر ۱۹۰۸ء)

مثنوی راسخ

بیا بلبل بہ آہنگے کہ می خواہی بجش ہوئے
کہ از خود رفتنی در پیش دارم تا سر کوئے

رسالہ دکن ریویو میں اس مثنوی کا دیباچہ عالی جناب شاد بالقابہ وزیر دکن کی طرف سے دیکھ کر میں نے بھی ایک جلد منگائی جو رئس آنے کے دیلیو پے ایبل کے ذریعہ پہنچی۔

صلائے عام ہیں جب کہ ہر طرح کے اہل کمال کا خیال رہتا ہے تو خدا وندان دولت و جاہ میں جب کسی طرح کا کمال نظر آتا ہے تو میری عقیدت اس قدر بڑھ جاتی ہے جس کو اہلِ شریعت کفر نہ بتائیں تو گنہگار سمجھے جائیں۔ صاحبان ملک واقبال سے مجھے اپنی عقیدتمندی اس بارے میں اس لئے زیادہ پسند ہے کہ رؤسا اور امرا میں علمی مشغلے ذرا کم سُنے جاتے ہیں جن کو اس طرف متوجہ دیکھتا ہوں ان کی مدح سرائی سے نہ صرف اپنا جی خوش کرتا ہوں بلکہ سارے زمانہ سے چاہتا ہوں کہ سنیں اور داد دیں۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ اس وقت حیدر آباد دکن میں شہریار و وزیر دونوں نامور سخنور اور سخن شناس ہیں۔ یہ اس مضمون کی تمہید ہوئی۔

عالی جناب شاد کی کمال سخن شناسی ہے کہ راسخ کی مثنوی چھپوائی لیکن از روئے ثروت وجاہ یہ ایسے بڑے معرکے کی بات نہیں جس کے لئے کہا جائے کہ " طبع کردن ایما کردم بحمد اللہ کہ مطبوع گردید۔" یہ تو ہم پر احسان ہوا، لیکن ہم سے زیادہ راسخ زیر بار منت کیا گیا کہ " نام راسخ را کہ بگوشہ خمول افتادہ بود برا وج شہرت رسانید۔" ـــــ

اہل مطالع جانتے ہیں کہ مع دیباچہ کے ۱۱۱ صفحہ کی چھوٹی تقطیع کی مثنوی کا چھاپنا ایسی کونسی بات ہے اور اگر میری طرح بلقیمت سب کو اس کی زیارت ہوئی تو پھر اس کا ذکر جانے دیجیے، رہا راسخ کا نام اس مثنوی کے چھپ جانے سے اس قدر مشہور ہونا مشکل ہے جس قدر کہ نام علی کی مثنوی بغیر چھپے مشہور ہے۔ عوام میں تو ایک دفعہ نہیں دس دفعہ مثنوی راسخ چھپے تو بھی مشکل سے کوئی سمجھے گا اور جاننے والوں کی واقف کاری راسخ سے ازروئے شاعری اس سے زیادہ ہے جتنی کہ دیباچہ سے معلوم ہوئی ے

نشانِ آب حیاتم چہ میدہی اے خضر
کجاست سرمۂ از دیدۂ نہاں گشتہ

راسخ کی دوچار باتیں جو ازروئے شاعری مجھے معلوم ہیں عرض کرتا ہوں۔ راسخ کی تاریخ رحلت جس سے نام و تخلص بھی معلوم ہوتا ہے، یہ ہے ے

محمد زماں راسخ خوش خیال ۔۔۔ دریغا بجاں آفریں جاں سپرد
چو تاریخ فوتش دل از عقل خواست ۔۔۔ خرد گفت با دل کہ راسخ بمرد

سرخوش کو اپنے اس مطلع پر بڑا ناز تھا ے

باندک تلخیٔ اندوہ عشر تہائے ارزد
بہ تشویش جہاں ایں نعمتِ دنیائے ارزد

میر معز جیسے اس وقت کے صاحبان سخن نے یہ شعر بہت پسند کیا۔ راسخ نے سن کر کہا لفظ "تلخی" کھٹکتا ہے۔ اسی وقت تلخی کی جگہ "کاوش" بنایا گیا جس سے شعر میں جان آ گئی۔

حضرت شاد نے جو شعر راسخ کے لکھے بہت اچھے ہیں ان کے سوا دو چار میں بھی عرض کرتا ہوں ے

ہر قدم در بے ستون غم دل گم کردہ ام ۔۔۔ باشکستِ شیشہ می جوشد صدائے تیشہ ام

گشت خون از درد عشق آخر دل بے کینہ ام　　از مئے خویش ہست چوں یاقوت رنگیں سینہ ام

جلوہ گاہ آہ گرمم گر شود مے خانہ ہا　　خشک گردد چو خوں در نافۂ پیمانہ ہا

خرمنم در انتظار برق ہستی سوز اوست　　می پرد ہمچو شرار از شوق چشم دانہ ہا

یاد چشم سرمہ آلودش ز خویشم مے برد　　می کند گرد رم آہو ز خود پنہاں مرا

ز گلگشت چمن بیروں چو آں سرو خراماں شد　　کشاد بال بلبل باغ را چاک گریباں شد

خرابیہائے عاشق بر فروزد رنگ رخسارت　　پریدنہائے رنگم آتشش را باد داماں شد

از ظہور عشق عالم یک تجلی بیش نیست　　ریخت رنگے در پریدن طرح ایں کاشانہ بست

بو داز درد وحشت تشنہ در خون طپیدنہا　　شود دامن تہ پا صید از گرد رمیدنہا

جہان دیگرم پرواز را باید کزیں عالم　　چو چشم خفتہ بگذشتم بہ بال آرمیدنہا

اثر بنالۂ عاشق ز اضطراب خود ہست　　چو برق جوہر تیغم ز پیچ و تاب خود است

سرم خوش ہست ز جام شراب تشنہ لبی　　جبین بادہ را صندل از شراب خود است

میر مفاخر حسین ثاقب میر محمد زمان راسخ کے چچا تھے ، سنا ہے کہ راسخ کی قبر سرہند میں ہے ۔ جناب شاد نے راسخ کی مثنوی کو ناصر علی کی مثنوی سے اچھا بتایا ہے ۔ اس کی تائید میں یہ بات سننے کے قابل ہے کہ ناصر علی نے اپنی مثنوی کے آغاز کے شعر کسی کو سنائے ؎

الٰہی ذرۂ دردے بجاں ریز　　شرر در پنبہ زار استخواں ریز

بسوزاں از محبت پیکرم را　　بہ آتش رنگ دہ بال و پرم را

سننے والے نے کہا کہ پہلے شعر میں جس بات کے لئے تم خلاق جہاں کو تکلیف دے رہے ہو گھاس کے ایک پولے سے یہ کام نکل سکتا ہے ۔ اتنے کے لئے پروردگار عالم کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے ۔

یہ تو لطیفے کی بات ہے لیکن از روئے سخن دونوں مثنویوں میں فیصلہ کرنا ہر شخص کا کام نہیں ۔ اس وقت ہندوستان میں بہت کم اس مرتبے کے سخن شناس ہیں جو دونوں

کی خوبیاں سمجھ سکیں اور سمجھ کر سمجھا سکیں ۔ میں نے دونوں مثنویاں دیکھیں اور نہیں کہہ سکتا کہ سمجھنے کا جو حق ہے وہ ادا ہو گیا لیکن جس قدر میں سمجھ سکا عرض کیا چاہتا ہوں ۔

جناب شاد نے مثنوئ راسخ کی نسبت ارشاد فرمایا ہے کہ ناصر علی کے مقابلے میں "کلام راسخ در نزاکت و لطافت علے دارد" یہ کنایہ ذرا دل میں کھٹکتا ہے ۔ میں ثابت کیا چاہتا ہوں کہ ناصر علی کی مثنوی ، راسخ کی مثنوی سے گری ہوئی نہیں ہے ۔ حضرت شاد تو راسخ کی وکالت میں صرف دعوٰی کر کے رہ گئے ہیں میں ناصر علی کی وکالت میں داد سخن دیا چاہتا ہوں ؎

کسے در عاشقی ہم پیشہ را چوں من نمی خواہد
خورم گر آب شیرینی بیادم کوہکن آید

پہلے آپ سمجھ لیں کہ راسخ کی شہرت کی وجہ یہ مثنوی نہیں ہے ، ان کا منصب ان کی نمود کیلئے بس تھا ، ناصر علی بیچارے کے پاس شاعری کے سوا کچھ نہیں اور شاعری میں بھی یہی ایک مثنوی مشہور ہے ، دیوان میں کوئی خاص بات نہیں ، جس کی شہرت کا مدار ایک چیز پر آرہے ، اس کو فن میں یکتا سمجھنا چاہیے جسے انگریزی میں اسپیشلسٹ کہتے ہیں ، ناصر علی کی مثنوی اہل سخن کی زبان پر ہے ، بزرگان دین اور مشائخ کبار نے اس کے حوالے دیے ہیں ۔ میں نے دیکھا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ناصر علی کی مثنوی کے شعر اپنی تصانیف میں جابجا لکھے ہیں ، کلام کے لئے مقبول ہو جانا عجیب نعمت ہے ۔

غرض الم بود از زخم ورنہ فرقے نیست
میان چاک دلے در شگاف دیوارے

میرا ارادہ تھا کہ دونوں مثنویوں کی خوبیاں ایک دوسرے کے مقابلے میں دکھاؤں لیکن مثنوئ راسخ کے چھپ جانے سے اس کی خوبی سے سب واقف ہو گئے ، جو واقف نہیں ان کو سمجھانا حضرت شاد کا کام ہے ۔ ناصر علی کی مثنوی چھپی ہوئی ، میں نے اب تک

نہیں دیکھی، اس کی نازک خیالیوں کے دو چار نمونے جابجا سے عرض کرتا ہوں۔

نمی دانم چہ کردم مست بودم ــــ سرِ خُم رفتہ از مستی کشودم
عنانِ اختیارم رفت از دست ــــ ز دستم جام مے افتاد و بشکست
ولے ایں مے فروغ آفتاب است ــــ بیامرزد اگر با خاک و آب است
اگر بر خاک ریزد در بہ آذر،
تواں برچیدن و کردن بہ ساغر

تجلی کرد او در سینۂ ریش ــــ سجودِ خویشتن را مے کنم خویش
وگرنہ بے نشان آمد نشانش ــــ منزّہ از سجود است آستانش
ادب کے مے سِزد اذن خمیدن
نخستیں سجدہ است از سر بریدن

چو شمع بعد کشتن زندہ کردند ــــ پس از آزادگیہا بندہ کردند
نگنجد ہیچ در پیراہن رنگ ــــ قبا پوشد ولیکن از دل تنگ
ہماں آتش کہ زد در سینۂ طور ــــ تراوش کرد باز از خونِ منصور
ہماں وحشی کہ مجنوں را جگر سوخت ــــ بہ لیلیٰ سر بصحرا دادن آموخت
بہ نطق اوست عالم جملہ گویا ــــ خروشِ خم بود از جوشِ صہبا
تحیر کرد تعلیم جمادات ــــ برقص آورد اعضائے نباتات
بہ بلبل گفت راہِ نالہ برگیر ــــ بہ گل گفت از شگافِ دل خبر گیر

مصور کی تعریف میں ہے

رگِ جاں نہا بموئے خامہ اش بند ــــ بہ تصویرش نزاکت خوردہ سوگند
برنگ شاخ گل را نقش بستے ــــ کہ از لرزیدنِ کاغذ شکستے

کشیدے چوں شبیہ نیم بسمل ۔ نئے آسود از بیتابئ دل
اگر تمثال ابرے نقش مے بست ۔ ز تیغ مے نمود و برق میجست
غزالے را اگر تصویر مے کرد ۔ ز بیم رم بپا زنجیر مے کرد
بنوعے می کشیدے چشمۂ آب ۔ کہ مستسقی از و میگشت سیراب
ز صورت می کشیدے جان معنیٰ ۔ ز مجنوں می نمودے حسن لیلیٰ

ایک شوخ کم سن کا ذکر ہے ؎

ہنوز آں غنچہ خندیدن نداند ۔ نظر دزدیدن و دیدن نداند
سخن در مغز مجنوں بوئے گل شد ۔ عبیر بے خودی شد جام مل شد
نگہ را با مژہ پرواز دادے ۔ رگ سنبل ز صد جا می کشادے

کلہ کج کردہ نرگس سر کشودہ
چراغاں از نسیم رم نمودہ

انسان کیسا ہی بے خبر کیوں نہ ہو ؎

مے بیہوش را ہم جوششے ہست ۔ تواں دیدن ولیکن در سر مست
اثر شد آشکارا و فغاں گم ۔ خلش پیدا و نشتر از میاں گم

باپ نے بیٹے کو رخصت کیا ؎

جدا کرد از خود آں مژگاں سیہ را ۔ حیات دیدہ و عمر نگہ را !

گھوڑے کی تعریف میں ہے ؎

سبک جولاں سمند برق مہمیز ۔ چو مژگان بتاں ہم شوخ و ہم تیز
چو تصویرش مصور بر کشیدے ۔ عنانش پیشتر از سر کشیدے

ازیں رعنا قدر داں داد بیداد ۔ کہ می شویند بال از خون صیاد

خرامش برق را پرواز می داد   نگاہش فتنہ را آواز می داد

لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اس مثنوی کی خوبیاں بیان کرتے کرتے ساری مثنوی نقل کرنی پڑے گی۔ کوئی شعر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا ؎

شکستِ رنگ ہوش از دل خریدم   کہ این نیرنگ صورتہا کشیدم
نوائے بےخودی ہائے من است این   صدائے پاے از خود رفتن است این
جراحت زار عشق است این رقم نیست   صدائے تیغ می آید قلم نیست
ورق نخچیر گاہ چشم یار است   سخن رم کردہ صید زخمدار است
زبانے نیست آہنگ دل است این
ورق گردانیِ رنگ دل است این

راقم

ندانم چیست این شائستہ تنزیل
سخن یا نسخہ اوراق جبریل

(صلائے عام مارچ ۱۹۰۹ء)

فلاسفی اور عقائد مذہبی

دنیا کے ہر مسئلہ کی تحقیق میں ترقی ہے۔ مگر کُنہ پروردگار حقیقی میں وہی لاچاری ہے جو آغاز عالم سے تھی، ابتدائے آفرینش سے جس خدا پر حضرت آدم و حضرت ابراہیمؑ و حضرت موسیٰؑ ایمان لائے وہی خدا عیسائیوں اور مسلمانوں کا ہے اور یہی رہے گا۔ تمام جہان کی تحقیق و فلاسفی اس سے زیادہ نہ بتا سکی، اور گو انسان کی پیدائش میں از روئے تحقیق اختلاف ہے لیکن عام طور پر یہ مسلّمہ ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی شکل پر پیدا کیا۔ کیوں کہ انسان کو اپنے محدود علم کی وجہ سے نامتناہی قدرت کا قیاس اور کسی طرح ممکن نہ تھا، اپنے خالق کو اپنے قیاس کی موافق نہ سمجھتا تو اور کیا کرتا۔ اس میں فرق اتنا رکھا کہ اپنی ذات و صفات ناقص و محدود دیکھ کر خالق کو ہر طرح کامل دیکھتا ہے۔ اپنے کمال رحمت سے خالق نے ہماری ہدایت کے واسطے نبی بھیجے جن سے معلوم ہوا کہ دنیا چند روزہ ہے اس میں ہم امتحاناً بھیجے گئے ہیں۔ جو احکام الٰہی کی فرمانبرداری کرے گا اُس سے خُدا خوش ہوگا جو نافرمانی کرے گا سزا پائے گا اس کی نظر میں شاہ و گدا ایک ہیں۔ مرنے کے بعد ہر شخص کو اپنے اعمال کی جزا و سزا ملے گی۔

یہ ذکر میں جلدی جلدی مجملاً کر گیا کہ کم و بیش تمام عقائد مذہبی عموماً اسی سے

ملتے جلتے ہیں۔ اس میں کسی خاص مذہب سے غرض نہیں۔ آپ نے دیکھا کہ یہ باتیں کتنی صاف ہیں جو کسی کو ناگوار نہیں ہو سکتیں یا جن کی مزید تحقیق کی ضرورت ہو جب مسلمانوں کو غیر ملکوں کے علوم سے واقف کاری ہوئی تو عقائد مذہبی کی بڑی چھان بین کی گئی اور یورپ میں ایک نیا علم "فلاسفر عرب" یعنی Arabian Philosophy کے نام سے پیدا ہو گیا اس فلاسفے کے عالم اسلامی سلطنتوں کا فخر ہوئے ہیں۔ عجم میں فارآبی، ابن سینا، امام غزالی اور الکندی بہت نامور ہوئے اور اسپین میں ابن باجہ، ابن طفیل اور ابن رشد جیسے پھر دنیا میں پیدا نہ ہوئے۔ یہ انھی کا صدقہ تھا کہ یونانی فلاسفی جو یونان سے نکلی پیچھے پھر یونان کیا دنیا کی سمجھ سے باہر سمجھی جاتی تھی مسلمانوں نے اسے اچھی طرح سمجھ لیا اور تمام یورپ کو سمجھا یا۔ علم کلام جس کا وجود پہلے نہ تھا اسلام نے ایجاد کیا۔ ان کی فلسفیانہ تحقیق بڑے مرتبے کی ہے انھوں نے ثابت کیا کہ تمام عالم اسباب محض ایک فعل ہے جس کا فاعل خدا ہے۔ تمام وسعت زمین و آسمان و مافیہا ذرّوں سے معمور ہے جن میں خود کوئی صفت یا کسی قسم کی حرکت نہیں اور زمانے کے بیشمار جزو ہیں۔

یہ سب فاعل بغیر معطل ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ خدا کیا ہے۔ صرف اس قدر جانتے ہیں کہ وہ کیا نہیں ہے۔ امام غزالی کے مقاصد الفلاسفہ و تہافتہ والفلاسفہ دیکھنے کے لائق ہیں۔ پچھلے کا جواب جو ابن رشد نے لکھا لاجواب سمجھا جاتا ہے۔ یورپ کے فلاسفر ابن رشد کا نام بڑے ادب سے لیتے ہیں کہ یہی شخص تھا جس نے ارسطو کو جلا دیا۔ اہل کلام کے دونوں رُخ کی بحث تحقیق میں جا بجا سے عرض کرتا ہوں۔ جو گفتگو کے طور پر ہے، ایک کہہ رہا ہے کہ جب تم جزا و سزا کا عقیدہ دُور کرتے ہو تو جرائم کا انسداد کس طرح ہو سکتا ہے۔ دوسرا جواب دیتا ہے کہ جرم

کی سزا میں اگر سفارش کا سہارا ہے تو جرائم میں کمی مشکل ہے مثلاً قاتل کو اس بات کا سہارا ہے کہ بادشاہ سے سفارش پہنچ گئی تو چھٹ جاؤں گا تو پھر جرائم میں ترقی سمجھ لیجئے۔ پہلے نے کہا کہ انسان کا کیا حرج ہے اگر وہ جزا و سزا کا تعین کرے۔ بمقابلہ بالکل فنا ہو جانے کے سزا و جزا میں زیادہ فائدے کی امید ہے۔ دنیا کو یتیم کرنے سے کیا ملے گا۔ لاوارث مال کی حفاظت زیادہ نہیں ہوتی، دنیا کو ننگا کرنے میں کون سا آرام ہے۔ دوسرے نے جواب دیا کہ عقائد مذہبی ایسے ہونے چاہیئں جن کے لئے سمجھانے کی ضرورت نہ ہو اور تحقیق کرنے سے اُس میں شبہ نہ ہو سکے۔ خدا ایسا نہ ہو جو ایک قسم کے عقائد کو ایک دفعہ اچھا سمجھے پھر وہ بدلے جائیں۔ دنیا اگر ہمارے لئے بنی تو ہم سے اس بات کا کیوں تقاضا ہے کہ اسے چھوڑو اور جلدی چھوڑو۔ اگر ہم دنیا میں مصیبت اٹھانے کے لئے پیدا ہوئے تو ہمیں تکلیف دینے کے لئے کیوں پیدا کیا گیا۔ یہاں کی برائیوں کی سزا ہے کہ انسان دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ جرم محدود اور سزا نامحدود اور پھر وہاں کی سزا کا مآل کیا۔ سزا سے یہ غرض ہوتی ہے کہ انسان پھر ایسی حرکت نہ کرے لیکن دوزخ میں جا کر یہ امید بھی نہیں ایسے مسئلوں پر اہل کلام نے بڑی بحثیں کی ہیں۔ جن کا ذکر علمائے متقدمین کی تصانیف میں بڑے لطف کا ہے اور گو اہل یورپ ہمارے مذہب و عقائد کے مخالف ہوں تو ہوا کریں۔ اسلام کی تحقیق کے قائل ہیں کہ اُن کے متقدمین میں سے کوئی علمائے اسلام کے دل و دماغ کو نہیں پہنچتا

(صلائے عام۔ مئی ۱۹۰۹ء)

عالمِ خیال

ایک دن میں اس خیال میں زانو پر سر رکھے سوچ رہا تھا کہ کارخانۂ عالم کس طرح چل رہا ہے کہ اتنے میں میری آنکھ لگ گئی۔ کہتے ہیں کہ جس طرح یہاں کا حال دیکھنے کے لئے آنکھیں کھولنی ضرور ہیں۔ عالم خیال آنکھیں بند کرنے سے نظر آتا ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک وسیع میدان سامنے ہے جو قضائے ہستی کے نام سے مشہور ہے، اس میں ایک عالی شان عمارت دکھائی دی جو ہر طرح کی مخلوقات سے اس طرح ٹھونس کر بھری ہوئی ہے جیسے گولر میں بھُنگے۔ یہ بھُنگے اپنی دانست میں اپنے اپنے دھندے میں ایسے مصروف ہو رہے ہیں کہ انہیں اپنے سوا کسی کی خبر نہیں، ساری مخلوق ایک ہی دھن میں تھی۔ کسی طرح اپنا پیٹ بھرے۔ روئیدگی زمین کی رطوبت چوس رہی تھی اور کیڑے روئیدگی کو چاٹے جاتے تھے۔ پرندے کیڑوں کی فکر میں تھے اور شکاری جانور پرندوں کی تلاش میں تھے حیوانات میں چھوٹا بڑے کی خوراک تھا اور حضرت انسان ان سب کے جانی دشمن بنے ہوئے تھے۔ انسانوں میں ایک طرف سے ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں اور دوسری طرف سے رونے کی، اور اکثر دونوں آوازیں ساتھ ہی میں سننے میں آئیں کہ دونوں میں امتیاز مشکل ہو گیا

لیکن رونے کی آوازیں ہنسنے کی آواز سے نکلی ہوئی تھیں۔

میں یہ تماشا دیکھ کر حیرت میں کھڑا تھا کہ مکان کے دربانوں میں سے ایک نے مجھے اجنبی سمجھ کر پوچھا کہ تم یہاں کیسے آگئے؟ میں نے جواب دیا کہ مجھے خود معلوم نہیں کہ میں یہاں کیسے آگیا۔ مجھے یہاں کا خیال بھی نہ تھا۔ نہ مجھے کسی نے بتایا کہ کہاں جاتا ہوں۔ اب آگیا تو جی چاہتا ہے کہ اس مکان کی سیر کرلوں۔

یہ دربان اگلے وقت کا کوئی فلسفی تھا جس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ سارے کارخانوں کو ہیچ سمجھتا ہے مگر اجنبی سمجھ کر میری خاطر سے میرے ساتھ ہولیا۔ اس مکان میں گھستے ہی میں نے دیکھا کہ جسے دیکھئے اپنے نصیبوں کو رو رہا ہے جن کے چہرے پر ہنسی کے آثار تھے۔ دراصل زخم خنداں کی صورت تھے۔ کوئی اپنے حال سے خوش نہ تھا۔ مکان کے اندر مجھے ایک آنکھ کی بڑھیا نظر آئی جو باریک بینی سے ایک لوتھڑا سی گول مول چیز دیکھ رہی ہے جس کے نہ ہاتھ نہ پیر نہ سر۔ یہ بڑی بی ماں کے پیٹ سے ایک آنکھ کی پیدا ہوئیں۔ جن کی بڑی تعریف یہ ہے کہ سب کو ایک نظر سے دیکھتی ہیں۔ ان کی نگاہ میں سارے عالمِ اسباب کا حال ایک سا ہے حیوان ہو یا انسان توانا ہو یا ناتوان کافر ہو یا مسلمان۔ گناہ گار ہو یا بے گناہ۔ نباتات ہو یا جمادات سب کو پیدا کر دینا اور سب کو فنا کر دینا۔ فنا کرنا اور پھر پیدا کرنا۔ میں نے نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ بڑی بی کا نام نیچر ہے اس گول مول لوتھڑے پر جس کی نہ کچھ شکل تھی نہ صورت، مادّہ لکھا ہوا تھا۔ جس سے بڑی بی کمھار کے آوے کی طرح اتنی مٹی کی مورتیں نکال رہی تھیں۔ میں نے اپنے ساتھی سے (جو فلسفی تھا) پوچھا کہ محض اس بے شکل لوتھڑے کے نمونے پر اتنی بے شمار شکلیں کس طرح پیدا ہو رہی ہیں۔ فلسفی نے اپنی سمجھ کے موافق علم و حکمت کے بڑے مشکل مشکل مسئلے بیان کرنے شروع کر دیے جن میں بڑا زور اس بات پر دیا کہ دنیا عالمِ اسباب ہے اسمیں

ساری کاروائی سبب ونتیجہ کی ہے۔ فعل وفاعل کا جھگڑا مدت سے چلا آرہا ہے۔
جواب ملا کہ اندھوں کی ایک قطار سمجھ لو کہ آخیر کے اندھے نے اپنے آگے کے اندھے کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے نمبر ۲ کے اندھے نے نمبر ۳ کے اندھے کا ہاتھ، اسی طرح بے گنتی اندھوں کا سلسلہ چلا جاتا ہے یہاں تک کہ پھر کچھ نظر نہیں آتا کہ آگے کیا ہے اس کا سرا اندھیرے میں غائب ہو جاتا ہے مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سارے اندھوں کا قدم ایسا سیدھا پڑتا ہے کہ راستے سے نہیں چُوکتے۔ اس حیرت سے مجھے ہمت پیدا ہوئی اور میں نے پوچھا کہ سرے پر کوئی نہ کوئی راہ بتانے والا ہوگا جس نے انہیں شروع میں راستے پر ڈال دیا ہوگا۔

فلسفی (دربان) نے ذلت کی نگاہ سے میری طرف دیکھا کہ میں کیسا احمق ہوں جس کی سمجھ میں ایسی موٹی بات نہیں آتی اور خفا ہو کر کہنے لگا کہ سرے پر کوئی نہیں ہے۔ یہ اندھوں کا سلسلہ ازل سے چلا آتا ہے اس کا آغاز کسی نے آج تک نہیں دیکھا اور گو کوئی اندھا ایسا نہیں جو بغیر ٹھوکر کھائے یا بغیر راہ بتائے راستے پر چلا جائے۔ مگر کمالِ ظلمت، بے صبری کا علاج ہو گئی جس طرح تصوف میں توحید کا مسئلہ ہے کہ کثرت سے وحدت کا ثبوت ہے یہ سن کر مجھے ہنسی آئی اور میں آگے بڑھا کہ اتنے میں دوسرے دروازے کے دربان نے مجھے آواز دی کہ میاں فلسفی کے بہکانے میں نہ آجانا۔

یہ دوسرے دربان مجھے بڑے متقی پرہیزگار دکھائی دیے جن کے ماتھے پر نماز کا گٹا تھا۔ اور معمولی عُمر سے زیادہ عُمر کے آدمی تھے گٹے کے نشان سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ حضرت مذہب ہیں اب دونوں دربانوں یعنی فلسفی اور مذہب میں گفتگو ہونے لگی۔ جو میں چپکا کھڑا ہو کر سننے لگا۔

حضرتِ مذہب! دنیا میں کوئی بھی فعل بغیر فاعل کے نظر آتا ہے؟

فلسفی! اسی مسئلہ نے تو اس قدر تکلیف دے رکھی ہے کہ آخر میں جس کو آپ فاعل یا مسبّب قرار دیں گے آپ کے مسئلہ کے رُو سے اُس کا فاعل یا مسبب پھر پوچھنے کی ضرورت ہوگی۔

حضرتِ مذہب! آخر یہ دور و تسلسل کہیں ختم بھی تو ہونا چاہیے۔

فلسفی! یہ دور و تسلسل مٹانے کی ترکیب اچھی نہیں جو بات کہ آپ نے اتنی دور جا کر مانی کہ آپ کے اَخیر فاعل کا کوئی فاعل نہیں۔ دہریے کہتے ہیں کہ یہ سلسلہ شروع ہی کیوں کیا گیا۔ یہیں شروع میں وہی بات کیوں نہ مان لی جائے۔ جو اس قدر دردسر کے بعد ماننے کو مجبور کئے جائیں۔

اس بحث پر بہت لوگ جمع ہو گئے۔ جو میری طرح بیگانہ تھے اور ناواقفی میں کوئی یہ جھگڑے سمجھا کوئی نہ سمجھا۔ فلسفی نے چاہا کہ پہلے اس فن کو تحقیق کیا جائے مگر سب اکبارگی بولنے لگے اور شور زیادہ ہو گیا۔ اس شور سے میری آنکھ کھل گئی اور گردن اٹھا کر جو دیکھا تو کچھ نہ تھا۔

راقم پابندِ عقائد

صلائے عام جون ۱۹۰۹ء

لٹریچر کی خوبیاں

دنیا میں علمی مشاغل کے تین حصے سمجھے جاتے ہیں۔ سائنس، آرٹس اور لٹریچر۔ سائنس کے معنے اُردو میں ضرور نہیں، کہ ترجمہ سے اصل زیادہ زباں زد ہے۔ آرٹس سے مراد سارے فنون جن سے انسان کا دل خوش ہو اور زندگی آرام سے بسر ہو سکے۔ لٹریچر کا ترجمہ بیکار ہے کہ تھوڑی بہت لیاقت والے بھی اس سے واقف ہو گئے ہیں۔ ان تینوں مشغلوں میں لٹریچر کا مرتبہ بڑا ہے۔

سائنس سے نیچر (عالم ایجاد و اسباب) اور نیچر کی طاقت کا حال معلوم ہوتا ہے، آرٹس سے اس عالم کی وضع اور رنگ کی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ مگر لٹریچر سے انسان کے دل و دماغ کے راز معلوم ہوتے ہیں اور جو کچھ جس کے دل و دماغ میں ہے اسی کے ذریعہ سے دوسرے کے دل میں آتا ہے۔ سائنس اور آرٹس کو بھی لٹریچر کی ضرورت ہے کہ زبان اور حرف کے بغیر ان کا ادا کرنا مشکل ہے۔ دنیا سے اگر سائنس اور آرٹس جاتے رہیں تو انسان کی زندگی بسر کرنے کے لئے لٹریچر کافی ہے۔ وحشی سے وحشی قوم بھی سائنس اور آرٹس کے بغیر جی سکتی ہے لیکن لٹریچر کے بغیر زندگی مشکل ہے۔

سائنس اور آرٹس کے لئے خاص وقت و طبیعت اور موقع و محل و وضع

درکار ہے۔ مثلاً کیمسٹری (علم کیمیا) کو لیجئے کہ کیمیکل اپیریٹس یعنی کیمیائی سامان کے بغیر سمجھنا مشکل ہے۔ ہیئت نجوم کے لئے دوربین، کُرہ، نقشہ چاہیے۔ رات ہو، تارے ہوں، آسمان صاف ہو۔ میدان ہو، برخلاف اس کے لٹریچر کے لئے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے گھر اور باہر برابر ہے۔ دن ہو یا رات، جوانی ہو یا بڑھاپا، سب یکساں ہے۔ مصیبت میں اس سے غم غلط ہونے کا سہارا اور خوشی میں زیادہ خوش ہونے کا اثر ہے۔ اس کے لئے آپ ہوں اور آپ کا دل، اور کچھ نہیں چاہیے۔ گھر بیٹھے دنیا کی سیر کیجئے۔ اگلوں، پچھلوں میں جس کو جی چاہے بلا لیجئے۔ ذرا ٹھہریے۔ یہ لیجئے الف لیلہ میں ہارون رشید و مسرور و جعفر سامنے آ گئے۔ بغداد و بصرہ، دمشق گھر بیٹھے دیکھ لیجئے۔ تاریخ میں تیمور و نادر دلی میں نظر آ رہے ہیں۔ اکبر و شاہجہان و عالمگیر جن کے دربار میں اوّل تو مجھ جیسے آدمی کو باریابی کی تمنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے اور اگر یہ مرتبہ حاصل بھی ہو تو اب ناممکن ہے۔ مگر تاریخوں میں یہ آپ کے سامنے کھڑے نظر آتے ہیں شاہ نامے میں فردوسی کے ایک اشارے سے رستم و زال و افراسیاب کٹ پتلی کے تماشے کی طرح دوڑے آ رہے ہیں۔ دنیا کی نامور لڑائیاں، ہنگامے اور قتل کے بغیر دیکھ لیجئے آج چیتوڑ فتح ہوا اور کل رن تمبھور، بزم نشاط کے لطف بے خمار اور دردِ سر آپ ہی کو نصیب ہیں۔ زلیخا کو جامی نے خواب میں بھی نہ دیکھا ہو گا آپ ان کی مثنوی میں جب جی چاہے دیکھ لیجئے۔ حضرت یوسفؑ کی زیارت کے لئے مصر و کنعان جانے کی ضرورت نہیں۔ لیلیٰ و مجنوں جن کو جیتے جی ملنا مشکل رہا آپ کو ہر مثنوی میں مل جائیں گے، شیریں و فرہاد کو نظامی سے جب کہہ دیجئے بلا لائیں۔

ارسطو، افلاطون، اور بوعلی سینا زانو سے لگے بیٹھے ہیں۔ عرفی و فیضی و ابوالفضل حاضر ہیں۔ آواز دینی تو درکنار جس کا نام ذہن میں آئے، موجود۔ پھر کیسے باادب کہ جب تک آپ مخاطب نہ ہوں کیا مجال کہ کوئی زبان سے ایک حرف نکالے۔

حضرت امام غزالی ابن رشد، حکیم ثنائی، مولانا روم، فرید الدین عطار، شیخ سعدی جامی جن کی صحبتیں، ہزار مراقبے اور لاکھ چلہ کشی سے بھی مشکل ہیں۔ ان کی ایک ایک جلد سے آپ ان کو بلا بھیجئے۔ ہر صحبت میں تکلیف و رنج ہے۔ اس صحبت میں رنج اور غصے کا ذکر نہیں۔

ایسی صحبت میں خدا کا خوف کیسے نہ آئے گا۔ بے ثباتی عالم نگاہ میں پھر جائیگی معلوم ہو جائے گا کہ دنیا گزشتنی اور گزاشتنی ہے۔

انسان کی زندگی بہت مختصر سمجھی جاتی ہے۔ اس کو خیال کا آلہ اس لئے دیا گیا ہے کہ ازل سے ابد تک اپنے قابو میں لایا چاہے تو لے آئے۔ اور خیال کے اظہار کا ذریعہ لٹریچر ہے۔ لٹریچر سے عیش کا لطف بڑھ جاتا ہے اور غم اگر جاتا نہیں تو کم ضرور ہو جاتا ہے۔

لیکن دنیا کی ہر چیز کی طرح اہل علم کے لحاظ سے لٹریچر کی حد نہیں، اس لئے ضرور ہے کہ ہم دیکھیں کہ ہزاروں برس اور بے شمار قوموں کے لٹریچر میں کس کس کی طرف متوجہ ہوں۔ بہت سیدھی بات ہے کہ سب سے پہلے ہم اپنی زبان کی لٹریچر دیکھیں — اتفاق سے ہماری زبان کی لٹریچر بہت محدود ہے۔ اس میں صرف چند کتابیں لکھی گئیں جو ہماری پچھلی عظمت کی طرح طاق نسیاں پر دھری کی دھری رہ گئیں۔ اس وقت اُردو لٹریچر کا مدار اخباروں اور رسالوں پر ہے۔ ہماری زبان کی حمایت پر نہ کوئی حکومت ہے، نہ کوئی ریاست، نہ کوئی رئیس۔ نہ کوئی جلسہ نہ کوئی سوسائٹی، نہ کوئی لیڈر نہ کوئی رفارمر اس کے لئے کچھ کر رہا ہے۔ اُردو کے لئے جو کچھ ہو رہا ہے بے چارے اخبار و رسالے کر رہے ہیں ان کے لئے نہ کوئی چندہ دیتا ہے نہ ان کو کوئی امداد ملتی ہے بلکہ زیادہ تر تو اخبار کی قیمت کے بھی لالے پڑے ہوئے ہیں۔

میرے پاس اکثر جلسہ و انجمن کے بزرگ چندہ کے لئے تشریف لاتے ہیں۔ ان

میں بہت ہی کم ایسے ہوتے ہیں جنھوں نے خود کچھ دیا ہو۔ مگر اوروں سے تقاضا کرنا قومی خیر خواہی سمجھتے ہیں۔ بلکہ کوئی اخبار یا رسالہ کسی قومی خیر خواہ صاحب کے پاس بھیجا گیا تو انکار ہی آیا۔

لیکن یہ شکایت پھر کیجائے گی، اس وقت دیکھئے کہ کوئی قوم اخبارات کے بغیر ترقی نہیں کرسکتی۔ ریل، تار، جہازوں کی وجہ سے دنیا کی تمام قوموں کو ایک دوسرے سے واقف کاری کی ضرورت ہے۔ انسان کو اپنے ابنائے زماں کا حال از روئے فطرت سننے کو جی چاہتا ہے۔ کہیں زلزلہ، کہیں قحط، کہیں انقلاب ہو، اس کی خبر دنیا میں فوراً پہنچتی ہے۔ ہمارے پاس ان چیزوں کے پہنچنے کا ذریعہ اخبار ہیں۔

لیکن اخباروں سے زیادہ ضرورت رسالوں کی ہے۔ مختلف اور متفرق خبروں اور حال سے لٹریچر کو بہت فائدہ نہیں۔ اس خبر سے لٹریچر کو کیا فائدہ کہ فلانے رئیس کی شادی بڑی دھوم سے ہوئی اور خوب ناچ گانا ہوا، کسی کی بسم اللہ میں اس قدر مٹھائی تقسیم ہوئی فلاں ابن فلاں اتنی جائداد چھوڑ کر مرے اور ان کی اولاد اڑا رہی ہے۔ فلانے کی فلانے سے تکرار ہے، مقدمہ عدالت میں دائر ہے۔ ایسی خبروں کے لئے جسکو بہت شوق ہو گھنٹہ دو گھنٹہ سے زیادہ لگانا تضیع اوقات ہے، زیادہ ضرورت مضامین کے دیکھنے کی ہے جس سے دل و دماغ خوش ہو اور معلومات کو ترقی ہو۔ اس کو آپ فرصت میں لیکر بیٹھئے پھر دیکھئے کیسا جی خوش ہوتا ہے۔ جس قدر زیادہ دیکھئے گا اسی قدر معصیت اور صحبت بد سے نفرت ہوگی۔

اس لئے میں رسالوں کو لٹریچر کی جان سمجھتا ہوں۔ قومی خیر خواہی میں ان کی قدردانی سب سے زیادہ مقدم ہے۔

(صلائے عام۔ نومبر ۱۹۰۹ء)

ستم ہائے روزگار

اس انجمن میں کوئی دلِ شادماں نہیں
بے اجڑے گھر کی رات سوادِ جہاں نہیں

انسان کے لئے یہ مسئلہ ہمیشہ پریشانی کا سبب رہا ہے کہ دنیا میں کسی کو رنج سے مفر نہیں اور جس قدر خوشی کی زیادہ تلاش کیجئے اسی قدر خوشی کا پتا نہیں لگتا آبادی سے ویرانیاں زیادہ ہیں۔ جمعیت سے پریشانیاں بڑھی ہوئی ہیں شمیم سے بوئے کاکل مشکیں ہے، پریشانیٔ زلفِ یار بلا کا غضب ڈھاتی ہے ؎

پریشانیوں پر ہے جوبن نیا
مگر زلف اس نے سنواری ابھی

دنیا میں خندۂ گل سے زخم خنداں زیادہ دیکھ لیجئے اور قہقہہ سے نوحہ کی آواز زیادہ سن لیجئے۔ جب دیکھئے یار کی چمپئی رنگت سے زردیٔ رخِ عاشقاں بڑھی رہیگی، بزمِ طرب سے مجلس ماتم کا اثر زیادہ دیکھا کہ لاش کے سامنے ہنسنا بولنا، کھانا، پینا سب حرام ہو جاتا ہے، وہ رات جو رقص و سرود میں کٹتی ہے صبح کو دردِ سر پیدا

زنی ہے اور رقصِ بتاں سے گردشِ ایام زیادہ ستاتی ہے۔ دنیا کے نشیب و فراز دونوں تکلیف سے خالی نہیں۔ منصور کا دار پہ چڑھنا اس کا فراز سمجھئے تو مہِ کنعاں کا کنوئیں میں گرنا اس کا نشیب۔ اس کی شامِ وصال، سایۂ چترِ حباب کے برابر ہے۔ تو صبحِ خنداں چاک گریباں کے برابر غرض دنیا میں ہر طرح مصیبت کا سامنا ہے اور بڑی مصیبت یہ ہے کہ بُرے اور بھلے سب اس میں گرفتار ہیں۔ اگر بدی کے عوض میں مصیبت آئے تو اتنا افسوس نہیں۔ مگر نیکی کا نتیجہ بھی جب رنج ہی دکھائی دے تو پھر آپ ہی فرمائیں کہ انسان کیا کرے سلطنت عباسیہ میں خاندان برامکہ کے اقبال و بربادی کی یہ ادنیٰ مثال ہے۔ جو عراقی نامی مورّخ نے لکھی ہے کہ ــــ

"ایک دن میں خلیفہ ہارون رشید کے دفتر کا حساب کتاب دیکھ رہا تھا جس میں دو عجیب رقمیں نظر آئیں۔

۱۔ یحییٰ کے بیٹے وزیر جعفر کو عطایات شاہی کی بابت =
چار لاکھ دینار

۲۔ جعفر کی لاش جلانے کے لئے نفت اور لکڑی کی قیمت =
دس قیراط

پہلی رقم اس وقت کے پندرہ لاکھ روپیہ کے برابر ہے جو جعفر کو ایک دن کے عطیات شاہی میں دیے گئے۔ اور اُسی کی لاش کے جلانے میں دس قیراط یعنی تین روپے ۱۲ ار لاوارث مُردوں کی مد میں سے خرچ ہوئے۔

یہ خیال مجھ کو خود بخود فلسفیانہ تحقیق کی طرف لے چلا کہ ستم ہائے روزگار کا علاج اگر ہے تو فلسفہ میں ہے مصیبت میں اگر کسی چیز سے تسلّی ہو سکتی ہے تو فلاسفی

پر نہیں اب تک تو تیری گرہ سے کچھ نہیں گیا۔ جس پر یہ قسمت کے شکوے ہیں تو ننگا بیکس ولاچار پیدا ہوا۔ مادر گیتی نے بغیر مانگے تجھے بہت کچھ دیا۔ بلکہ ضرورت سے زیادہ تیرے ساتھ سلوک کیا۔ جس کا عوض یہ ہے کہ تو آج شکایت کر رہا ہے۔ دولت و اقبال محض خوش نصیبی کا نتیجہ تھا جب وہ گئی اپنے ساتھ لے گئی۔ یہ چیزیں شروع سے تیری نہ تھیں۔ تیری ہوتیں تو کیوں جاتیں۔ جس طرح تجھے اپنی چیز کا اختیار ہے۔ قسمت کو بھی اپنی چیز کا اختیار ہے کہ چاہے دے یا نہ دے اور جب چاہے لے لے۔ جس طرح انسان کو نیند میں کروٹ لینے کی ضرورت ہوتی ہے قسمت نے بھی کروٹ بدلی تو کیا غضب کیا۔ گردشِ روزگار کے یہی معنے ہیں کہ ایک اوپر چڑھے اور دوسرا نیچے اُترے۔ سب ایک ہی جگہ کھڑے رہیں تو راستہ بند ہو جائے۔ کوئی کسی کے چڑھنے کو منع نہیں کرتا مگر جب اُترنا پڑے تو شکایت کی ممانعت ہے۔ دوسرے یہ تو دیکھ کہ بالفرض اگر تیری قسمت نے یاری دی تو زندگی کو کیا کریگا اس کی بے ثباتی کا کیا علاج ہے پھر اس میں فرق کیا رہا کہ تیرے نصیب نے تجھے چھوڑا یا تو نے اپنے نصیب کو چھوڑا۔ جب ہر طرح چھوٹنا ہی ٹھہرا تو پس وپیش کی شکایت بے وقوفی ہے۔"

بے ثباتی عالم کے ذکر میں اسمٰعیل منیر کا قطعہ خوش بیانی کا نمونہ ہے، جو نذرِ ناظرین ہے ؎

قطعہ

جس بزم جاں فزا میں ابھی کل کی بات ہے
خالی سرور سے دل پیر و جواں نہ تھا

فرشِ نفیس دامنِ نظارہ سے لطیف
ذی رُتبہ میر فرش سے تاجِ شہاں نہ تھا
فانوسیں تھیں گلوئے پری زاد سے سوا
روشن تھیں صاف نور کی شمعیں دھواں نہ تھا
ہر روشنی تھی برقِ تجلّیٰ سے آشنا
بیگانہ شمعِ طور سے اک شمعداں نہ تھا
پھولوں کی ہر طرف تھیں ہزاروں مسہریاں
بیدار بخت خواب مسرت کہاں نہ تھا
میوہ کی ڈالیاں کہیں پھولوں کی ڈالیاں
سرسبز جنکے سامنے باغِ جناں نہ تھا
آبِ گہر کی موج تھی ہر نہر سے بلند
فوارہ وہ نہ تھا کہ جو گوہر فشاں نہ تھا
نمگیرے تھے اساوری کے بادلے کے جال
جھالر سے موتیوں کے جُدا سائباں نہ تھا
اربابِ عیش کی کہوں کیا خوش سلیقگی
وہ کون تھا کہ ہمسرِ شائستہ خاں نہ تھا
صُحبت برنگِ خاطرِ اطفال روزِ عید
کمتر جوانِ تازہ سے پیرِ مغاں نہ تھا
پریوں کے جھنڈ تھے کہیں جھرمٹ حسینوں کے
محبوب جن کے آگے مہِ آسماں نہ تھا
فتنہ کے عطر کو سرِ مُو بھی نہ تھی جگہ
آشفتہ کوئی گیسوئے عنبر فشاں نہ تھا

چھائے ہوئے تھے چمپئی رنگوں کے قہقہے
جن سے شگفتہ تر چمنِ زعفراں نہ تھا
چٹکی بجابجا کے بلاتے تھے عیش کو
گانے کی دھوم تھی کہیں نامِ فغاں نہ تھا
شورے کے پیٹے شاہ سدا رنگ کے خیال
بلبل کے بھی ترانے کو رتبہ وہاں نہ تھا
مستانہ غزلیں تھیں طرب انگیز ٹھمریاں
وہ کون تھا جو عاشقِ رقصِ بُتاں نہ تھا
وہ ناچ سحر کا وہ بتانا طلسم کا
وہ بھاؤ تھے کہ نرخِ مسرت گراں نہ تھا
طنبوروں سے ملے ہوئے سارنگیوں کے سُر
بین اور سُر سنگار میں خُلطہ کہاں نہ تھا
باہیں گلے میں تھیں کہیں طوقِ کمر تھے ہاتھ
ایسا پری معانقۂ جسم و جاں نہ تھا
مسکی ہوئی مسالے کی باریک کُرتیاں
لاہی کے محرموں میں جو کچھ تھا نہاں نہ تھا
وہ دلفریب بزم تھی ایسی کہ رات بھر
رنج و ملال کے لئے رستہ جہاں نہ تھا
دیکھا اسی طلسمِ خوشی کو جو صبحدم
جُز چُغد اور کوئی وہاں نوحہ خواں نہ تھا

(صلائے عام۔ جولائی سنہ ۱۹۰۹ء)

حُسنِ تحسینِ مضمون

(جناب مہدی حسن صاحب کی "کھُلی چِٹھی" کی داد جو دائرۂ ادبیہ کے سلسلے میں میرے نام اخبار مشرق میں شائع ہوئی)

اس مضمون کی خوبی کا کیا کہنا۔ اس کو میں نے علیحدہ اس پرچہ میں نقل کیا ہے اور اس کے ساتھ جناب مرزا عرفان علی بیگ صاحب ڈپٹی کلکٹر کا مضمون بھی اُردو لٹریچر کے نام سے شائع ہوتا ہے جس کا واسطہ مہدی حسن صاحب کی تحریر سے ہے۔ جی تو یہ چاہتا ہے کہ صاحبِ تحریر کی داد انھی کی زبان میں دی جائے۔ لیکن اُن کا رنگ مجھ سے نبھتا نظر نہیں آتا ؎

کہتے ہو آج تو سُرخی ترے اشکوں میں نہیں
یہ تو پوچھو کہ لہو کا بھی ہے قطرہ دل میں

دوسرے نورجہاں کا قصہ مرزا صاحب نے اس خوبی سے لکھ دیا کہ اس قدر میرے ذہن میں بھی نہ تھا۔ ایسے زبردست لکھنے والوں کے سامنے میرا لکھنا گویا — ع

سورج کو چراغ ہے دکھانا

خاص کر "کھلی چھٹی" میں وہ خوش بیانی ہے کہ میرا کچھ بھی لکھنا "باسی کڑھی میں اُبال کے برابر سمجھا جائے گا۔ ے

لیکن نہیں مناسب بالکل ہی چپکے رہنا
اب رازِ دل چھپاؤں اور ایسے رازداں سے

اکیلے مے نوشی عیش میں داخل نہیں۔ کسی غارت گر دین آفت ہوش کے ساتھ اگر یہ لطف میسر ہو تو ایسے میں رحمت الٰہی پر ایمان نہ رکھنا ضعفِ عقائد میں داخل ہے خاص کر جب کہ مہر النسا کا ذکر آئے اور ایسی حالت میں جبکہ جہانگیر نے اس حور وش کو سادے باریک لباس میں دیکھا کہ سینے سے گردن تک کی باریک رگیں اور اس کے ہلکے ہلکے ڈورے جو خیال یار کی طرح دوڑ رہے تھے نگاہ میں پھر گئے لباس کی سادگی اس خوبصورتی سے رنگ لا رہی تھی کہ شیشے کی طرح صاف شفاف جسم جھلک رہا تھا۔ جس سے معلوم ہوا کہ خوبصورتی چھپانے کے لئے نہیں ہے — چھپانے کے لئے عیب ہوتا ہے حسینوں کے لباس میں تکلف سے حُسن خداداد کھویا جاتا ہے ے

بے تکلف کئے دیتی ہے جوانی کی امنگ
سر پہ اُن کے نہ کسی روز دوپٹا ٹھہرا

وہ آنکھیں جو کبھی کبوتر چھوڑ دینے پر نہیں جھنپیں اس وقت کیوں جھنپیں کہ اب تو جوشِ شباب سے ناآشنا نہیں رہیں۔ ہونٹ جو اس وقت جہانگیر کو صاف جواب دینے میں بے تامل ہلے تھے اب آہستہ سے جنبش میں آئے کہ مجھ میں اور میری لونڈیوں کے لباس میں امتیاز ضرور ہے۔ کچھ فرق چاہیے ہے ارمان اور ہوس میں ے

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

لیکن آپ کہیں گے کہ اس عمر میں یہ باتیں تجھے زیب نہیں دیتیں۔ میری عمر تو آپ کو معلوم ہی ہے، نورجہاں اس وقت زندہ ہوتیں تو میری دادی پردادی کی عمر سے بھی زیادہ بڑی ہوتیں اس صورت میں معصیت کا خیال کسی طرف سے ممکن نہیں۔ پھر بھی اگر یہ میری خطاؤں میں سمجھا جاتا ہے تو یہ خطا آپ جلدی معاف نہ فرمائیں کہ ابھی مجھے اپنی گنہگاری میں لطف آرہا ہے ؎

نہ کھینچو جگر سے کٹاری ابھی
مزہ لیتی ہے بے قراری ابھی

جس طرح محل میں یار سب سے گرم سخن ہو اور نظر اٹھا کر آپ کی طرف دیکھ لے تو لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ آپ کے ساتھ کوئی خاص بات ہے۔ میں خوش ہوں کہ نورجہاں کی باتوں میں صاحب مضمون کی نگاہ ناصر علی کی طرف ہے ؎

قفس میں بھی ہے اسیروں تمہیں وہی سودا
لگائے باد بہاری کی آس بیٹھے ہیں

مجھے اقرار ہے کہ میری عمر کے ساتھ میری طبیعت کا رنگ بدل گیا۔ یعنی کچا رنگ پختہ ہو گیا ؎

کہہ دیا بس کہ تری آہ میں تاثیر نہیں
یہ نہ دیکھا کہ یہ سینے میں ہے روزن کیسا

مگر بات اتنی ہے کہ مجھے معلوم نہ تھا کہ میری زبان کے قدردان میرے گمان سے زیادہ ہیں۔ انسان کی حوصلہ افزائی کے لئے یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی اسے اپنی قدر معلوم

ہو جائے۔ اب مَیں بھی اپنے چاہنے والوں کے چاہنے میں دریغ نہیں کروں گا۔ قاعدہ ہے کہ انسان جب کسی کو چاہتا ہے تو اُسے اپنی شکل وصورت کا بھی خیال ہو جاتا ہے۔ یوں بال پریشان رہیں تو پروا نہیں ہوتی یار کے لئے بالوں میں تیل ضرور چاہیے۔ یوں کُرتے میں بٹن نہ ہوں نہ سہی یار سے ملنا ہے تو چاندی سونے کے بٹن ڈھونڈ کر لگائے جاتے ہیں۔ یوں بند قبا کھُلے رہیں مگر باہر نکلے تو باندھ لیتے ہیں۔ ؎

تھمے نہ گھر میں وہ دم بھر جہاں گُندھی چوٹی

میرا ارادہ ہے کہ میں اپنی زبان کے لئے مشاطۂ خیال پیدا کروں تاکہ جس طرح میں اپنی قدر سے خوش ہوا، اپنے خوش کرنے والوں کو بھی خوش کرسکوں ؎

کہدے کوئی یہ بات زلیخا کے کان میں
یوسف کو خوب آتی ہے تعبیر خواب کی

جب آپ کسی کو چاہیں اور اس سے پوچھیں کہ تم کہو تو میں چلا جاؤں اس سے مطلب یہ کہ اگر اس نے چلے جانے کو کہہ دیا تو یہیں کوٹھے سے گر کر جان دیدینے کو جی چاہے گا وجہ یہ کہ جفا سے زیادہ تغافل کا رنج ہوتا ہے۔ لکھنے پڑھنے کا مشغلہ میں کب کا چھوڑ بیٹھا ہوتا مگر مہدی حسن کی تحریر نے ایسا گُدگُدایا کہ زخمِ کہن ہنسنے لگے ؎

چھُڑا لینے کی اب تو پوچھتے پھرتے ہیں تدبیریں
کبھی یہ فکر تھی ہم کو کہ دل کیوں کر لگاتے ہیں

صاحبِ تحریر سے میری عرض ہے کہ مدت سے میں یہ سُن رہا تھا ؎

رسم است کہ مالکانِ تحریر
آزاد کنند بندۂ پیر

آپ جوان ہو کر بوڑھے کو ستاتے ہیں۔ جو بات آپ مجھ سے چاہتے ہیں آپ خود مجھ سے بہتر کر سکتے ہیں ؎

جس کی ہو بات مناسب ہے اُسی سے کہنا
تیرہ بختی سے گلہ ہو شب تنہائی کا

"دائرہ ادبیہ"

پیارے برہم۔ میں دیکھتا ہوں "مشرق" وضع اخباری کے لحاظ سے نسبتاً اور پرچوں کے مقابلے میں اس قدر سطح فائقہ پر ہے کہ میں نہیں جانتا غور کرنے پر بھی کوئی نئی بات کہہ سکوں گا جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ آپ اس کے قوام میں بہتر سے بہتر اجزاء سے مدد لیتے ہیں جو لایق حصول ہو سکتے ہیں۔

لیکن اس وقت مجھے اس کی ایک حیثیت اضافی یعنی انشا پردازی پر مختصراً کچھ عرض کرنا ہے کچھ دنوں سے آپ نے لٹریچر کے بعض نازک مسائل چھیڑ دیئے ہیں آپ کی دلچسپ عالمانہ تنقیدات کے سوا اشہری کا پچھلا مضمون نہایت قابلیت سے لکھا گیا تھا اس لئے ضرورت ہے کہ مشرق میں ایک مستقل عنوان یعنی "دائرہ ادبیہ" قائم کیا جائے جس کے تحت شائقین قلم کی نکتہ سنجیاں جگہ پاتی رہیں آپ کے ساتھ اگر اور صاحبوں نے بھی توجہ کی تو اس سلسلے کا جاری رکھنا بڑی بات نہیں۔

میں اس لحاظ سے کہ آپ میری تحریک کو محض زبانی جمع خرچ نہ سمجھیں اپنے خیالات کی پہلی قسط بھیجتا ہوں جس کا موضوع سخن ناصر علی کا اردو لٹریچر ہے جن کی پاکیزہ خیالی اور خوش بیانی کی نسبت مجھے اصرار ہے کہ ملک کی انشا پردازی میں امتیاز خاص رکھتی ہے اور ظلم ہے اگر اُردو کے آشنائے ازلی کے کمالات کی داد نہ دی جائے جس کا فیاضانہ اعتراف خود لٹریچر کے فرائض میں سے ہے۔

آپ نے میری ایک سرسری تحریر کو پچھلی دفعہ اس قدر چمکایا کہ میں دیکھتا ہوں مجھے بے تکلف بننا پڑا! جس کے آثار آپ کو ان اوراق پریشاں میں ملیں گے جو بھیج رہا ہوں۔

(آپ کا فدائی مہدی الہ آباد ۲۷ ستمبر ۱۹۰۹ء)

کھُلی چٹھی

بخدمت جناب خان بہادر سید ناصر علی صاحب بالقابہ ایڈیٹر "صلائے عام" دہلی

جناب من! یاد فرمائی کا شکریہ! پرچے دیکھے۔ مدت کی چوٹ جو دل کا چور بنی ہوئی تھی اُبھر آئی میں آپ کے لٹریچر کا اُس وقت سے دلدادہ ہوں جب لٹریچر کا صحیح مفہوم بھی میرے ذہن میں نہیں تھا۔ کم و بیش بیس برس ہوئے جب آپ نے ایک وضع خاص پر لکھنے پڑھنے کا مشغلہ جاری کیا یعنی "تیرھویں صدی" میں داد سخن دی "تہذیب الاخلاق" کے ساتھ ساتھ آپ نے جس ٹھاٹھ سے دھواں دھار مضامین لکھے اور سرسید کے لٹریچر پر جس سلیقے اور سخن گسترانہ شوخیوں سے آپ نے انتقادات کی ٹھہرائی سچ یہ ہے کہ وہ اُردو لٹریچر کی جان ہیں آج سنجیدگی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ میں نہیں جانتا ملک کے نامور اہل قلم آپ کے گذشتہ کمالات کی داد دیں گے لیکن میں کھُل کر کہتا ہوں کہ آپ نے اُس وقت

انشاپردازی کو چمکایا جب بہتوں نے قلم بھی ہاتھ میں نہیں لئے تھے آپ کا شُستہ مذاق اور ایک خاص طرح کا مادّہ اختراعی (اریجنیلٹی) دراصل آپ کے اولیات میں داخل ہونے کے لایق ہے۔

موجودہ نسل بتمامتر "تہذیب الاخلاق" کے ادبی دور کی پیدا کردہ ہے جب آپ کے لٹریچر کا شباب تھا اور یہیں سے اپنا مرتبہ دیکھ لیجئے۔ "تیرھویں صدی" میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں آپ کا عنصر غیر فانی ہے لیکن افسوس ہے آپ کو یہ خیال نہ آیا کہ جس سے پچھلے دلوں اتنے دماغی سلابقے رہے وہ بہیئت مجموعی کتابی صورت میں جلوہ گری کا حق رکھتی اس پاکیزہ مجموعے کی ترتیب سے اردو ادب العالیہ (کلاسیکس) میں آپ کی طرف سے مستقلاً ایک قیمتی اضافہ ہوتا جو یادگار زمانہ رہتا آپ معاف فرمائینگے یہ بدترین حق تلفی تھی جو آپ اپنی کر سکتے تھے' یہ خیال قطعاً صحیح نہیں ہے کہ ملک میں اچھے لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں' نئی نسل کو آپ کی اُردو سے کچھ واسطہ نہیں ہے نہ بہیئت موجودہ کسی میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ آیندہ کچھ کر سکے۔ صاف بات یہ ہے کہ جس لٹریچر پر آپ مٹے ہوئے ہیں سرے سے اس کی جان ہی کے لالے ہیں جس زبان کی حیات طبعی بوڑھے نذیر احمد اور حالی اور شبلی کے دم تک ہو وہ سسک سسک کر کب تک چل سکتی ہے؟ آپ سے کچھ امیدیں تھیں مگر اس وقت تک آپ کا صحیح مصرف کچھ معلوم نہ ہو سکا سنتا تھا لٹریچر بڑھاپے میں جوان ہوتا ہے لیکن میں دیکھتا ہوں آپ کے ساتھ آپ کی طبیعت کا رنگ بھی کچھ بدل سا گیا ہے یعنی خیالات میں ایک طرح کی بے رنگی پائی جاتی ہے اور وہ بات نہیں رہی جو کچھ پہلے تھی شاید اس لئے کہ "تہذیب الاخلاق" کی طرح کوئی چیز الجھاؤ پیدا کرنے والی نہیں رہی یعنی جذبات کے اکسانے کا سامان نہیں رہا۔

ملک میں اچھے لکھنے والے کم ہیں' ان میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں جو آپ کے رنگ میں دو سطریں بھی لکھ سکیں۔ مرحوم ریاض (خدا اسے مدتوں زندہ رکھے) اور برہم داشہری کے دل سے پوچھئے۔ ناصر علی پھر کہاں؟ صلائے عام کی ترکیب باوصف حسن ظن کے جو

آپ کی طرف سے ہے کچھ پسندیدہ نہ آئی۔ اس سے تو نامِ ہی اچھا تھا "خاصے کی چیز" اور "وقف عام" ایک طرح کا بے تکاپن ہے اس سے آپ کے مذاق انشا پردازی پر نکتہ چینی منظور نہیں بلکہ آپ کو اپنے ڈھب پر لانا ہے۔ بیسویں صدی میں جو پرچہ آپ سے باکمال کے قلم کے سائے میں اور وہ بھی "عروس سخن" کے میکے یعنی دلّی سے نکل رہا ہو اس کا نام۔ میں آپ کی جگہ ہوتا تو بے سوچ سمجھے۔ "ارتقا" رکھ دیتا۔ نام اتنا باکیف تو ہو جس سے پرچے کی علت غائی یعنی آپ کے ادبی تخیّل (لٹریری آئیڈیل) کا پتا چل سکے تقطیع بھی مجھے پسند نہیں ولایت کے نامی رسالے تو آپ کے پیش نظر ہوں گے دُور کیوں جایئے "الندوہ" کی نصابی تقطیع اختیار کیجئے جو نہایت موزوں ہے۔ بکنیوں کا بھی کھاتہ ٹھیک نہیں! یہ دیکھ رہا ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا آپ کے قدردان کہاں سے آئیں گے۔ موجودہ نسل آپ کو نہیں جانتی اور یہ آپ ہی کا قصور ہے لیکن "ہر فعل خود اپنی مکافات ہے" دنیا میں رہنے اور اچھی طرح رہنے کا اس قدر حق ہے کہ جس طرح ہو اپنی مستقل یادگار چھوڑے اس کی چلتی ہوئی ترکیب یہ ہے کہ تیرھویں صدی اور متفرق پرچوں میں آپ نے جو کچھ لکھا لکھایا ہے اہتمام کے ساتھ ایک دم سے شائع کر دیجئے لیکن مضامین غیر نہ ہوں آب رواں میں گاڑھے کا پیوند بے جوڑ رہے گا اگر یہ نہ ہوا تو میں سمجھوں گا میرے منہ میں خاک! آپ جیتے جی مر لئے اور لٹریچر کے خون ناحق کا بار گراں جو گردن پر رہا وہ علیحدہ یہ اصرار آپ کے خاص مرتبۂ انشاپردازی کے لحاظ سے ہے آپ کی زبان اپنے مختص النوع صفات کے ساتھ کسی اور کے بس کی چیز نہیں اور سچ یہ ہے کہ آپ اپنے فن کے اختصاصی (اسپیشلسٹ) ہیں۔

میں آپ میں یونانیوں کی سی لطافت خیال پاتا ہوں۔ آپ کی چشم سخن۔ جہاں "جنس لطیف" اور اس کے متعلقات کی طرف اشارے کرتی ہے وہ نزاکت خیال کی آخری حد ہے "تیرھویں صدی" میں بہتیرے نشتر ہیں جو آج تک دل میں چبھ رہے ہیں۔ ابھی ابھی ایک فقرہ نظر سے گزرا۔ "یہ پان اُن کے لئے ہے"۔

بے اختیار جی بھر آیا۔ اگلے پچھلے قصے پیش نظر ہو گئے۔ پوچھئے تو بتا نہیں سکتا۔ لیکن کچھ تو ہے جو دل پر چوٹ لگی۔ رکھ رکھاؤ۔ اتنا تو ہو۔ ایک چھوٹا سا فقرہ اور عطر زندگی۔

بوڑھے حالی جو شاعرانہ جذبات کے ساتھ بھی عورت تو خیر "چھوٹے کپڑے" سے گھبراتے ہیں اس قسم کی نزاکت خیال کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن انشا پردازی ان سے کبھی قطع نظر نہیں کر سکتی۔ شوق کی مثنویوں میں سے اگر زواید کو نکال ڈالئے تو جو کچھ بچ رہے گا فلسفہ اخلاق کی جان ہوگا ؎

یاد اتنی تمہیں دلاتے جائیں
پان کل کے لئے بناتے جائیں

ان سیدھے سادھے مصرعوں میں جو کچھ رکھ رکھاؤ ہے کسی راز دار فطرت سے پوچھئے کیا دنیا کی شاعری اس کی نظیر پیش کر سکتی ہے؟ یورپ میں جو آج بڑے پائے کے لکھنے والے ہیں ان میں مذاق حسن پرستی اس قدر رچ گیا ہے کہ قریب قریب ان کی ہستی کا ایک جزو ہو رہا ہے عورت" جسے خواب طفلی اور آرزوئے شباب" کہیے

"ہر بات تری فسانہ حسن"

ہیئت اجتماعی (یعنی سوسائٹی) کی روح رواں ہو رہی ہے جس سے کوئی شائستہ لٹریچر دست بردار نہیں ہو سکتا۔ آپ ان نزاکتوں سے خوب واقف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ

"عکس رخ موتیوں کے دانوں میں"

صنف نازک آپ کے دائرہ تحریر میں کسی نہ کسی حیثیت سے آہی جاتی ہے۔ مہرالنسا کا وہ واقعہ کس قدر دلچسپ ہے جب اس نے باغ کی ایک روش پر جہانگیر کے ہاتھ سے کبوتر لے کر چھوڑ دیے تھے پروفیسر آزاد نے جس خوبصورتی سے اس کو دکھایا ہے انشاپردازی کو آج تک اس سے بہتر الفاظ نہ مل سکے۔ آپ وہ سماں دکھاتے جب مہرالنسا جوان "بیوہ" کی حیثیت سے شاہی محل میں رہنے سہنے لگی ہے لیکن ہائے

وہ حسن افسردہ جو خود اپنی قوتوں سے واقف ہو۔ خوب جانتی تھی بجلی کدھر گرے گی ؎

شب امید بہ از روز عید میگزرد

کہ آشنا بتمنائے آشنا خفتہ

جہانگیر ایک روز اس کے کمرے میں جانکلا۔ جو ضیائے حُسن سے "شیش محل" ہو رہا تھا۔ حور وش کنیزوں کے حلقے میں زرق برق لباس آنکھوں کو خیرہ کئے دیتے تھے۔ "فطرت کی لاڈلی"۔ "ہمہ غمزہ ہمہ عشوہ ہمہ ناز" نہایت سادے باریک سفید لباس میں تھی۔ لیکن شیشے کی طرح صاف شفاف جسم جھلک رہا تھا۔

کلائی وہ نازک سی ہیرا تراش

وہ محرم میں سربستہ اک راز فاش"

"مقیاس الشباب" کی سرکشی بتا رہی تھی کہ وہ دستانے کی طرح چھپی ہوئی محرم سے زیادہ اودی اودی رگوں کے پیچ و خم اور اعصاب کی قدرتی کھینچ تان کی ممنون ہے۔ اس پر وہ کافوری برہنہ حصہ افقی! خیال کے لئے کیا باقی رہا؟ غرض مہر النسا عالم تصویر بنی ہوئی تھی۔ شاہی نگاہیں جم کر حسن عریانی کا جائزہ بھی نہ لینے پائی تھیں کہ ایک کہربائی قوت نے بجلی کے تاروں میں نہیں، زلف عنبریں کے پیچوں میں "جہاں پناہ" کو جکڑنا شروع کیا۔ شاہانہ تمکنت نے دیکھتے دیکھتے حسن گلو سوز سے شکست کھائی۔ جہانگیر سے ضبط نہ ہو سکا۔ دل کا چور زبان پر یوں آیا۔

تمہارے اور تمہاری لونڈیوں کے لباس میں کیوں فرق ہے؟ اس کا جواب جو کچھ ملا اسی کا حصہ تھا جو آگے چل کر نور جہاں ہونے والی تھی۔

"جی میرا لباس لازماً اوروں سے مختلف ہوگا۔ کیوں کہ اُسے شاہی خواہشات کے زیر اثر ہونا چاہیے۔" ذرا دیکھئے گا۔ کیا کہہ گئی۔ جتنا کہا نہیں۔ اس سے زیادہ تخیل کے لئے گنجایش چھوڑی۔

ایک فلسفی نے کیا چبھتی ہوئی بات کہی کہ "دنیا میں جہاں کہیں حسین عورت ہے۔ میری رشتہ دار ازلی ہے۔ یہ تعلق فردانی ہیں ہمیشہ سے ہے اور وراثت طبعی کے قاعدے سے ہمیشہ رہے گا۔ ہماری تمہاری خاک سے اور اٹھیں گے اور یہ سلسلہ قائم رہے گا۔" وہ کہتا ہے "مجھ کو صرف ایک تخیل کی ضرورت ہے جو فانی زندگی کا ایک چنالی سہارا ہو اور اسی پر نہایت خوشی سے قانع رہوں گا۔ کیوں کہ معلوم ہے دنیا دیکھنے کے لیے ہے برتنے کے لئے نہیں ہے۔

اس قسم کے بہتیرے نکتے ہیں مگر دکھائے کون؟ آزاد جیتے جی مر گئے آپ باتوں باتوں میں ٹالنا چاہتے ہیں۔ کیا اچھا تھا اگر آپ "بیسویں صدی کا مناظرہ" لکھتے "اخوان الصفا" کے رنگ میں ایک خیالی مجمع الفصحا (لٹریری اکیڈمی) ترتیب دیجئے پورا دائرہ ہو اراکین بحث یعنی۔ اخلاقی، مذہبی، افادی، اقتصادی اور فلسفی وغیرہ مختلف الموضوع عناصر اگر جمع ہو گئے اور ان سبھوں میں آپس میں دماغی ٹکر ہوئی تو لطف آجائے گا۔ کچھ نہ سہی خیام کے فلسفے پر ریویو کر ڈالئے اور جو پتے پتے کی کہہ گیا ہے ناآشنایان حقیقت کو سمجھا دیجئے۔ بیچارہ یورپ کے ہاتھوں جی رہا ہے۔ ایشیا میں بے طرح اس کی مٹی خراب ہے ثقہ لوگ اُسے ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔ نہ جاننا بھی مزے کی بات ہے اس قسم کی سرد مہریاں لٹریچر پر ایک بدنما داغ ہے۔

آج کل سرمایہ دار وہی سمجھا جاتا ہے جو پچھلوں کے جمع کردہ مواد میں تصرف بیجا یا بجا کر سکے۔ آپ میں مادہ اختراعی کی کمی نہیں مواد موجود ہے یورپ سے لیجئے اور خیالات کو پھیلا کر سمیٹئے اور لکھئے۔ غزالی اور ابن رشد کا محاکمہ بہت دلچسپ تھا۔ لیکن ضرورت تھی کہ زیادہ پھیلاؤ ہوتا اور لگے لپٹے مسائل میں سے کچھ رہ نہ جاتا مختصر یہ کہ جس پیمانے پر آپ لکھ رہے ہیں میرے توقعات اس سے کہیں بڑھے ہوئے ہیں اور یہ امر آپ کی عظمت کے ثبوت میں ہے۔ نری باتوں سے خواہ وہ کتنی ہی پیاری ہوں اگر

بار بار دہرا لیے تو جی اُکتا جاتا ہے متعدد، ادھورے مضامین کی جگہ ایک آدھ لکھئے لیکن ذرا دل لگا کر۔ کم سے کم ایک مضمون خالص فلسفیانہ رنگ میں ہو۔ جسے جامعیت اور رکھ رکھاؤ کی حیثیت سے آپ اختراع فایقہ (ماسٹر پیس) کہہ سکیں۔

نئے گروہ سے کچھ اُمید نہ کیجیے۔ ان کے ہاں اس وقت تک صحیح علمی مذاق کا پتا نہیں۔ نہ پڑھنا لکھنا ضروریات زندگی میں داخل ہے۔ قومی لٹریچر سے بیگانگی جیسا اس سے پہلے کسی موقع پر لکھ چکا ہوں۔ ایک طرح کی نمود سمجھی جاتی ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ انگریزی شاید کچھ آتی بھی ہو۔ اردو لٹریچر سے قطعاً نہیں آتی۔ انگریزی کی غیر ضروری آمیزش نے روزمرہ کا جس طرح خون کر رکھا ہے آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس پر ستم ظریفی یہ ہے کہ کسی کو احساس نہیں۔ مغربی تمدن اور شائستگی کے دلدادہ جہاں یورپ کی تقلید پر مٹے ہوئے ہیں۔ ایک خاص مسئلہ میں اجتہاد سے نہیں چوکتے۔ یعنی تکلفات زندگی کے اصرار کے ساتھ بھی قومی لٹریچر پر کچھ صرف کرنا جرم ہی نہیں بلکہ ایسا گناہ ہے جس کی بازپرس ہو کر رہے گی۔ ایسے افراد کہاں تک آپ کے توقعات پورے کر سکیں گے۔

بہر حال آپ سے جو کچھ ہو سکے کئے جایئے اور یہ تو میں تفصیل سے عرض کر چکا کہ آپ سے کیا چاہتا ہوں مغربیت کے اثر سے نئے نئے عنوان زندگی پیدا ہو گئے ہیں۔ ان میں سے کسی بحث کو چھیڑیے آج کل کے عوائد رسمیہ (ایٹی کیٹ) اور ارتقا لباس پر جو نہایت اہم مسائل ہیں کچھ لکھیے لکھایئے تو سب سے پہلے آپ کے دل و دماغ کے نتائج کی داد جس سے ملے گی وہ میں ہوں۔

(مہدی حسن صاحب کا خط اگلے صفحے پر ہے۔)

جناب مہدی حسن صاحب کے خط کا مختصر خلاصہ (خلاصہ اس پر مختصر یعنی بہت ہی اختصار) سن لیجئے

اکتوبر کا صلائے عام "عروسِ جمیل ولباسِ حریر" لاجواب نکلا۔ پاکیزگی لٹریچر کے ساتھ صنعت گری یعنی آرٹ کا اچھا خاصا مُرقع ہے جو یہاں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ اکثر جگہ آپ کی نزاکت خیال میری آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپکی لیکن دل کا درد نہ گیا۔ خُدا جانے کیا بات ہے؟ آپ کی تحریر سے دل کو چوٹ لگتی ہے۔ جیسے مجھ پر گزری ہوئی کوئی پتے پتے کی کہہ رہا ہو۔ آپ لکھتے نہیں۔ دونوں ہاتھوں سے کلیجہ نکال لیتے ہیں۔

جتنے مضامین خاص تھے ایک ایک کو یاد نہیں گے دفعہ پڑھا اور ابھی یہ وظیفہ جاری رہے گا۔ عید پر فلسفیانہ دادِ سخن بہت اچھی رہی۔ آپ نے جن ٹکڑوں کی طرف بالتخصیص مجھے متوجہ کیا تھا۔ وہ دل پر نقش ہو گئے ہیں۔ جس طرح چُھری گلے مل کر تڑپ کو بڑھاتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں آپ کی تحریر آشناؤں کو مِل کر مارتی ہے۔ آپ کے قلم میں زبان کی جگہ چاقو، خنجر، تلوار، کٹار سبھی کچھ تو ہے۔ خدا ہی ہے جو جان بچے!

ایک فقرہ میرے لئے عنوان زندگی کے لحاظ سے خاص میرے ڈھب کا تھا جس پر لوٹ گیا۔

"عورت جب مُنہ پھیر کر چلنے کے لئے کھڑی ہو تو اُس کے یہ معنے ہیں کہ یہ چاہتی ہے کہ کوئی دوڑ کر دامن پکڑ لے"

کتنا اچھوتا خیال ہے۔

دائرہ ادبیہ آپ کی نظر سے گزرا اور پسند آیا۔ یہ میری طفلانہ اپچ کا بہترین صلہ

تھا جو آپ سے زبردست انشا پرداز کے ہاتھوں مِل سکتا تھا۔ آپ لکھتے ہیں۔

"کُھلی چِٹھی نے مار ڈالا۔ جس کام کے لئے نیچر جلدی کر رہی ہے تم اپنے ذمے اُس کا عذاب نہ لو۔ میں تم سے جیت نہیں سکتا۔ تم نے اپنے مضمون میں جوانی کا زور دکھایا ہے۔"

کیا بتاؤں اِن فقروں نے مجھ پر کیا ستم ڈھایا۔

آپ کا ہر فقرہ ریویو کے لئے مستقل عنوان چاہتا ہے اور میں لطف کو قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ اس لئے جستہ جستہ داد دیتا رہوں گا۔

(اصلاحِ عام۔ نومبر ۱۹۰۹ء)

نہیں دنیا مقامِ عشرت آباد

دنیا کو سب دارِ محن کہتے آئے ہیں۔ اصغر علی خاں نسیم نے بزمِ عیش کے پراگندہ ہونے کے ذکر میں اس طرح دادِ خوش بیانی دی ہے کہ ؎

یہ صحبت قابلِ صد حیف ہو گی — مئے چشمِ بُتاں بے کیف ہو گی
یہ ساغر سرنگوں ہوں گے حیا سے — ندامت عفو چاہے گی خدا سے
دکھائیں گے گلوئے خشک مینا — نہ ہو گا جائے مے ان میں پسینہ
دکھائے گی نہ منہ پھر دل کی حسرت — قسم کھائے گی اس محفل کی حسرت
بدل جائے گا لطفِ حسنِ دیدار — کھنچیں گی آرزوئیں صورتِ یار
مزے بے قدر ہوں گے مثلِ دشمن — اُٹھائے گا ہر اشک احسانِ دامن
وہ آنکھیں ہیں جو محوِ چشم و ابرو — انھیں فرصت نہ دے گی دیدِ زانو

گریباں چاک ہوں گے صورتِ گل
حذر مانیں گے فصدِ بے تامل

اسی میں ایک پری وش کے دمِ واپسیں کی تصویر کھینچی ہے۔ جو عینِ شباب میں

دُنیا سے رخصت ہو رہی ہے ؎

اُداسی آئی جوبن پر یہ سُن کر | ڈھلا سُرمہ بھر آئے دیدۂ تر
نگاہیں رُک گئیں چالاکیوں سے | ارادے تھک گئے بیباکیوں سے
حیا چھپنے لگی آنکھوں میں آکر | ندامت نے کیا چُپ سر جھکا کر
مزوں نے چاہی رخصت آرزو سے | زباں شرمائی طرزِ گفتگو سے
بھر آیا حسرتوں سے دل جو اکبار | کہا جوبن سے اے پیارے خبردار
لحد تک ساتھ رہنا تم ہمارے | کہ تا کرلیں فرشتے بھی نظارے

اسی صورت سے کچھ کچھ بک رہی تھی
کہ غفلت آگئی خوابِ اجل کی

اندازِ بیان کا کیا کہنا جو ہماری زبان (اُردو) پر ختم ہے۔ لیکن از روئے تحقیق وفلاسفی ہمیں دیکھنا ہے کہ عالمِ اسباب میں عیش وآرام کیوں نہیں ؟

دنیا میں نیک بختی سے آرام وخوشی میں بسر کرنے کے ظاہرا تین طریقے نظر آتے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ انسان مذہب کی پابندی کرے۔ دینی عقائد پر ایمان رکھے۔ عاقبت کا فکر کرے اور دوزخ وبہشت کے خوف ورجا میں رہے چھوٹے بڑے عقیدوں کو دل سے مانے اور عمل کرے۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔

دوسرے اپنے دل ودماغ سے کام لے۔ تحصیل علم وفن میں محنت کرے کارخانۂ عالم کی حقیقت دیکھے، اگلی اور پچھلی تحقیق وفلاسفی کو سمجھے اور سمجھائے۔ سائنس ولٹریچر میں کمال دکھائے۔ وقس علیٰ ہٰذا۔

تیسرے اپنی قوم اور ملک کی فکر کرے۔ سوسائٹی کی اصلاح کی تدبیریں سوچے، صنعت وحرفت وتجارت کی طرف متوجہ ہو۔ جس سے اپنے ملک کو فائدہ پہنچے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ تینوں طریقے نہایت نیک بختی کے ہیں۔ از روئے شرافت ان سے بہتر دنیا میں کوئی طریقہ انسان کے لئے اپنی زندگی آرام سے بسر کرنے کا میرے ذہن میں نہیں آتا۔ ان میں بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں سے کسی میں معصیت کا نام نہیں۔

معصیت کا ذکر میں ضد کر کے چھوڑتا ہوں کہ گناہ وجرائم کے بُرے نتیجے میں کسے کلام ہو سکتا ہے؟ لیکن ہم دیکھیں کہ نیک بختی میں آرام وخوشی کی نسبت یورپ کے فلاسفر اور محقق کیا کہتے ہیں۔

پہلا طریقہ سب سے اچھا سمجھنا چاہیے۔ مگر آغازِ عالم سے دینی عقائد میں اس قدر اختلاف چلا آتا ہے کہ ثواب ونیکی کی شکلیں کہیں کچھ ہیں اور کہیں کچھ ——— ایک مذہب میں جو عقیدہ نیک قرار دیا گیا ہے دوسرے میں بُرا سمجھا جاتا ہے۔ قربانی ایک مذہب میں ثواب ہے تو دوسرے میں اس سے انکار ہے۔ اہل اسلام اور عیسائی غیر قوموں کو اپنے مذہب میں لانا فرائضِ مذہبی سمجھتے ہیں۔ بنی اسرائیل اور اہلِ ہنود اسے بے کار جانتے ہیں۔ تکرار مٹانے کی اور بات ہے مگر ہر مذہب میں آپس کے اختلافِ عقائد سے اس قدر نفرت ہے کہ کلمہ گو کلمہ گو کا جانی دشمن ہو گیا۔ جس سے لفظِ نیکی کی اصطلاحی تعریف مشکل ہو گئی۔ قادرِ مطلق کی معرفت تو انسان کی سمجھ سے باہر سمجھی گئی مگر اس کی خوشنودی اور خفگی کی تفصیل ادنیٰ ادنیٰ باتوں پر ہر شخص کی زبان سے سُن لیجئے۔ دنیا میں رحم ورعایت اور غصہ وغضب کے لئے جسم کی ضرورت سمجھی گئی اور خالق کے لئے ان صفتوں کے ساتھ جسم کا خیال قطعی کفر ہے۔ عاقبت اور جزا وسزا کے مسائل جو علما اور فلسفی بھی مشکل سے سمجھ سکتے ہیں۔ جاہل عوام کو اس طرح سمجھائے جاتے ہیں کہ مرنے مارنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ جسم کی پوری حقیقت ابھی انسان کو معلوم نہیں ہوئی لیکن روح کا حال پتہ وار معلوم ہے

زندگی کی ماہیت سے لاعلمی ہے مگر مرنے کے بعد کی پوری تحقیق ہے۔ جو چیزیں کہ آنکھوں کے سامنے ہیں اُن کا پُورا علم نہیں مگر جن و پری بھوت پلید سے اچھی رسم و راہ ہے۔

اس حال میں اطمینان کی صورت کتنی مشکل ہے۔

دوسرا مشغلہ جس میں عقل ذہانت اور علم وفضل سے سروکار ہے۔ اس میں بھی کب کسی کو آرام نصیب ہوا؟ سارے اہلِ کمال دُنیا سے روتے چلے گئے۔ ہزار خونِ جگر کھا کر کوئی بات پیدا کی مگر داد نہ ملی۔ بلکہ اکثر صاحبِ کمال مطعونِ خلائق رہے۔ اور معمولی آدمی جو ہُنر سے عاری تھے ان سے بہت اچھے سمجھے گئے۔ یہ حال ہمیشہ سے چلا آتا ہے۔ آج کل بھی اگر کوئی سائنس یا لٹریچر میں کمال رکھتا ہے تو روٹیوں کی طرف سے شاکی نظر آئے گا۔ حالاں کہ آج کل کی معلومات اور تحقیق نیوٹن و جالینوس کی معلومات سے کم نہیں۔ میر و مرزا سے بڑھ کر شعر کہیے تو کوئی سُنے گا بھی نہیں۔ اور نثر میں ابوالفضل و طاہر وحید کی غلطیاں نکالیے تو کوئی نہیں پوچھتا۔

تیسرے قومی وملکی خیرخواہی اور سوسائٹی کی اصلاح و بہبودی جس میں پولیٹکل خیالات بھی سمجھ لیجیے۔ اوّل تو اس میں نیک نیتی بہت مشکل ہے۔ اس کے مدعی زیادہ تر اپنی نمود اور اخذِ زر کے لئے یہ ڈھنگ اختیار کرتے ہیں لیکن جو سچے خیرخواہ ہوئے ہیں اپنے جیتے جی اپنی قوم اور ملک کے ہاتھوں نالاں رہے۔ بعضوں کے ساتھ ابنائے زماں نے وہ بدسلوکیاں کیں جس سے ان کی زندگی تلخ ہوگئی۔ سبب یہ کہ جمہور کی ترقی کا فکر دراصل ترقی میں داخل نہیں۔ عوام کبھی اصل جوہر کے قدردان نہیں ہوتے جس طرح "کوہِ نور" ہیرے کے پرکھنے والے ہر گلی کوچے میں نہیں مل سکتے عوام کو قومی خیرخواہی کی قدر اُس وقت نہیں ہوتی۔ پیچھے سے کسی کا خیال آئے تو آئے۔

آغازِ عالم سے دنیا کو سب مصیبت کا گھر کہتے آئے ہیں۔ توریت میں صحیفۂ حضرت ایوبؑ اسی کے ثبوت میں دیکھ لیجئے اور انجیل کی تعلیم کا سارا مدار ترکِ دُنیا پر سمجھیے۔ اسلام میں بھی اس عالم سے نفرت کی بڑی تاکید ہے۔

یہ حال تو عموماً عرض کیا گیا۔ اب ولایت کے ایک نامور فلاسفر اور شاعر کی اپنی بیتی سنئے جو کہتا ہے کہ:

"مجھے ابنائے زماں سے ہرگز رشک نہیں۔ یہ اپنی چیخ چخ اور توتو میں میں مبتلا رہیں۔ رشک ہے تو مجھے مُردوں پر۔ جن کے ساتھ میں اپنی زندگی بدلنے کو راضی ہوں کہ چین سے سو رہے ہیں۔"

چروا ہے سے بکریاں آرام میں ہیں کہ ان کو کچھ فکر نہیں۔ انسان کو ہر حال میں مصیبت ہے کہ اسے اپنی مصیبت کا علم ہے اور مصیبت سے بچنے کی قدرت نہیں۔ انسان کی مصیبت میں کوئی خبر گیر نہیں ہوتا۔ نہ زمین نہ آسمان نہ درخت نہ پہاڑ۔ نہ سبزہ نہ نباتات ہماری جاں کنی سے ایک ذرے پر بھی اثر نہیں ہوتا۔ نہ مکھی، نہ مچھر، کوئی نہیں پوچھتا کہ کیا گزر رہی ہے۔ انسان جس قدر نازک خیال اور نازک مزاج ہوگا، اس قدر اس کو دنیا میں رنج ہوگا۔

آپ نے دیکھا کہ آغاز عمر میں بچے نئے لباس سے ایسے خوش ہوتے ہیں کہ پھر تمام دنیا کے اقبال و دولت میں ویسی خوشی میسر نہیں ہوتی اور عروس کا جوڑا شادی میں تمام کنبہ کی عورتوں کو دکھایا جاتا ہے۔ جن کی نگاہ میں اکبر و شاہجہاں کا لباس اور سواری کا جلوس ہیچ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں خوشی ضرور ہے اور اگر نہیں ہے تو بھی اُس کی تلاش خوش کن مشغلوں میں سمجھئے۔ جس طرح بہت سی باریک چیزیں باریک بین کے بغیر دکھائی نہیں دیتیں۔ خوشی بھی بغیر تلاش نظر نہیں آتی۔ تھک جایئے تو آرام کا لطف آتا ہے۔ بھوک میں کھانے کا اور پیاس میں پانی کا۔

لیکن پہلے آپ اپنے دل کو خوش کرنے کا ارادہ کرلیں اور جھگڑوں کو پاس نہ پھٹکنے دیں تو خوشی کہیں نہیں گئی۔ آسمان کو ہاتھ سے ٹٹولنے کا ارادہ نہ کیجئے۔ دُور سے دیکھئے تو کیسا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ آفتاب کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھئے، جاڑے میں دھوپ میں بیٹھ جایئے تو کیسا لُطف آتا ہے۔ درخت کے پتے نہ گنئے، دھوپ کے وقت اس کے سائے میں آرام کیجئے۔ یہ نہ سمجھئے کہ خدا نے دریا ڈوبنے کے لئے بنائے ہیں ان میں تیراکی کا تماشا دیکھئے۔ جہاں خدا نے انسان کے ساتھ روٹی کا جھگڑا لگا دیا ہے دل و دماغ بھی دیا ہے کہ اپنی جان کو خوش رکھئے اور پھر بھی اگر جی خوش نہ ہو تو رونے ہی کی کیا ضرورت ہے؟ انسان اپنے جی میں سمجھ لے کہ مجھے پیدا کرتے وقت مجھ سے عہد کب کیا گیا تھا کہ تجھے گلچھرے اڑانے کے واسطے پیدا کرتے ہیں ---؟ اوّل تو اکیلا انسان ہی اس عالم ایجاد میں پیدا نہیں ہوا۔ دوسرے جس بات میں اس کی خوشی دیکھی اس میں دوسرے دل کا نقصان ضرور دیکھا گیا۔ یہ حق اسے کہاں سے ملا کہ نفسِ واحد کے لئے اوروں کو تکلیف ہو ---؟ پھر بھی جو تھوڑی بہت خوشی مل جاتی ہے یہ اس کی عنایت ہے جس نے پیدا کیا۔ اپنی پیدائش سے پہلے اسے یہ حق بھی نہ تھا کہ دُنیا میں آجاتا --- اس پر یہ دعوے کہاں کے؟ انسان جس بات کا دعوے کرے اور اس کے نباہنے کی طاقت نہ ہو تو ہنسی ہوتی ہے۔ کسی سے سوال کیجئے اور جواب نہ ملے تو ایسے سوال سے فائدہ ---؟

دنیا میں خوشی ہو یا انسان اس کی تلاش میں رہے، خوشی ہوئی تو کیا کہنا؟ نہ ہوئی تو اس کی تلاش میں اگر خلقِ خدا میں کسی کا کام نکل گیا تو یہ کیا کم ہے ---؟ اس کے لئے سب سے مقدم یہ سمجھنا ضرور ہے کہ انسان اپنی جان کے خوش کرنے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ مخلوقاتِ عالم میں انسان محض ایک جزو ہے۔ اس کے ہر فعل کا ایسا نتیجہ ہونا چاہیئے جو کُل کے لئے مفید ہو یعنی اس کی ذات سے کائنات کو فائدہ پہنچے۔ یہ نہیں کہ محض اپنی،

اپنی اولاد کی اور اپنے رشتہ داروں کی بھلائی کی فکر میں رہے بلکہ جس قدر اپنے سے دور اور وسیع فائدہ کی صورت ہو اچھا ہے۔

لختہائے دل بیکجا جمع شد گل ساختند ‏ نالۂ ما صورتے بگرفت بلبل ساختند
خط او شد سبزۂ کز بختِ، بر داشتند ‏ دودِ دل آمد بروئے کار کاکل ساختند

انچہ کم از طاقتِ ما گشت تمکینش فزود
صبرِ ما بروند در چشمش تغافل ساختند

(صلائے عام۔ اکتوبر ۱۹۰۹ء)

مُسکرانا

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مُسکرا کے ہاتھ

جی چاہتا ہے کہ اس مسکرانے پر کچھ لکھیے۔ ساری ادا ہیں اسی بات نے ستم کر دیا۔ یوں ہاتھ چھوڑ دینا معمولی بات ہے۔ مسکرا کر ہاتھ چھوڑ دینے سے اس ادا میں جان پڑ گئی۔ جو لوگ حسنِ بیاں کی خوبیوں سے بیگانہ نہیں، اُن سے پوچھیے کہ اس مسکرانے نے کیا غضب کر دکھایا۔ زبان سے کچھ نہ نکلا، اور اظہارِ محبت اس طرح ادا ہو گیا کہ بڑے سے بڑے افسانہ و داستان میں اس خوبصورتی سے ادا کرنا مشکل تھا۔

مسکرانا تین طرح کا ہے، ننھے بچوں کا، دیوانوں کا، حسینوں کا۔

بچوں کا مسکرانا کھانا پینے کا نتیجہ سمجھ لیجئے کہ پیٹ بھرے پر مسکراتے ہیں۔ دیوانوں کا مسکرانا دیوانہ پن میں داخل ہے۔ غضب ڈھاتا ہے تو حسینوں کا مسکرانا، محبت میں مسکرانا بلا کا سامنا ہے۔ اس کے سامنے تمام دنیا کی فصاحت بے کار ہے۔ جن لبوں کو بات کرنے سے انکار ہو اُن کا مسکرانا کیا کچھ نہیں بتاتا۔ مسکرانا ترجمانِ محبت

ہے جس میں زبان کی ضرورت نہیں۔ حیا کی جان ہے کہ اس میں زبان سے کچھ نہیں کہنا پڑتا۔ اس کا اثر زبان سے زیادہ ہوتا ہے کہ زبان میں تو یہ عیب ہے کہ دل میں کچھ اور زبان پر کچھ۔ مسکرانا دل کا حال کہہ دیتا ہے جس میں غلطی کا گمان نہیں۔ اس میں ایک بڑی نازک بات ہے کہ جس طرح زبان سے خیال کا اظہار ہوتا ہے مسکرانے سے خیال کے اثر کا پتا لگتا ہے کہ پہلی صورت کو اگر گلاب کے عرق سے تشبیہہ دی جائے تو دوسری کو گلاب کے عطر سے۔

مسکرانا ہنسی سے کہیں اچھا ہے کہ ہنسی میں ذرا بھدّا پن ہے اور چپ رہنے سے بھی بہتر ہے کہ خموشی سے دل کا حال نہیں معلوم ہوتا۔ مسکرانے سے دل کا حال بغیر بھدّے پن کے معلوم ہو جاتا ہے۔ بلکہ صرف یہی نہیں۔ یار کی ساری جفائیں اک ذرا سے مسکرانے سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتی ہیں۔ جس قدر عمر کم ہو اور مکروہاتِ زمانہ سے علیحدگی ہو مسکرانا اُسی قدر زیادہ دل کش معلوم ہوتا ہے۔ مسکرانا پاکیزہ طبعی کا ثبوت ہے۔ بگڑی طبیعتیں مسکرانا نہیں جانتیں۔ مصوری میں چہرہ بنانا آسان ہے مگر مسکراہٹ دکھانا ذرا مشکل ہے۔ سارا بدن زخمی ہونا اور چیز ہے اور خدنگِ نظر کا زخم اور ہے۔ پیر میں ضرب آنی اور بات ہے اور دل کی چوٹ اور چیز ہے۔ زبان اور کلام میں وہ بات کہاں جو کسی کے ذرا مسکرا دینے میں ہے۔ مسکرانے میں چہرے کی ساری خوبیاں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ مسکرانا چہرے کا زیور ہے۔ چہرے کی شکنیں جو رنج میں پیدا ہو جاتی ہیں مسکرانے سے مٹ جاتی ہیں۔ شقاوت و سختی جاتی رہتی ہے۔ اس لئے پریوں فرشتوں اور اولیاء اللہ کی تصویریں اکثر مسکراتی ہوئی دیکھنے میں آئیں کہ مسکرانا اطمینانِ باطن کی علامت ہے۔ جلّاد خونی اور قصاب کے چہرے کبھی مسکراتے نہیں دیکھے۔ مسکرانے سے بدشکل بھی اچھا معلوم ہوتا ہے اور خوبصورت تو پری زاد بن جاتا ہے۔

مسکرانا تعلیم وتلقین کے بغیر جاہل سے جاہل آدمی کی بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے آنکھ سے دل میں اُتر جاتا ہے ؎

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اُتر جائے
نگاہِ یار کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

مسکرانا نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ وصالِ یار کی طرح انسان اس کی تاک میں رہے کہ تازہ شکار کی طرح ہاتھ آئے یا نہ آئے۔ کسی کے بے ساختہ مسکرانے کا کیا کہنا۔

کسی مصوّر سے پوچھئے کہ تبسّمِ زیرِ لبی کسے کہتے ہیں اور لبِ لعلیں کیا چیز ہیں؟۔ محبت کا اظہار بھی مُسکرانے سے ہوتا ہے۔ ماں بچے کی تصویر میں دونوں کا واسطہ اسی مسکرانے سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ محبت چوں کہ دل کا مشغلہ ہے اس کا اظہار صرف مسکرانے سے ہوتا ہے۔ محبت میں سب سے زیادہ شاق یار کی جدائی ہے۔ مسکرانے میں ہونٹ جو ہلتے ہیں تو گویا یہ کہتے ہیں کہ "جانا نہیں" تبسّم زا لبوں کو جھوٹ بولنا نہیں آتا۔ مسکرانے کا مطلب دونوں کی سمجھ میں اس قدر جلد آتا ہے کہ اس کے سامنے تار و بجلی بیکار ہے۔ اک نگاہ میں دل کے پار ہے۔

دُنیا میں جب تک مشغلہ محبت ہے یار کا مسکرانا محبت کی جان سمجھا جائے گا اور جب تک انسان کو شائستگی اور پاکیزہ خیالی کا دعویٰ ہے یہ مشغلہ مٹ نہیں سکتا۔ حسین کو دنیا میں سب چاہیں گے۔ جو انکار کرے گا۔ جھوٹا یا بے تمیز سمجھا جائے گا۔ محبت ایسی چیز ہے کہ وہ لوگ جو اپنے تئیں ہر طرح کے تعلقات سے آزاد سمجھتے ہیں وہ بھی اور نہیں تو عشقِ حقیقی کے نام سے اپنے جی کو خوش کر لیتے ہیں۔ کسی کے خیال میں اپنی جان کو خوش رکھنا بُرا نہیں۔ خاص کر ایسی محبت جس میں یار کا مسکرانا یہ بتائے کہ ؏ نہ دیکھ اس وقت میں ہوتی ہوں بدنام

مقتضائے شرافت یہ ہے کہ جب یہ صورت ہو تو انسان وہاں سے ہٹ جائے مگر کسی ماہ وش کا قول ہے کہ جب یہ صورت ہو تو اس کا جواب سوایا نہ دیا یعنے گلے نہ لگالیا تو کچھ نہ کیا۔ میری صلاح اس معاملے میں یہ رائے ہے کہ جو جس حالت میں ہو اسی طرح چھوڑ دیا جائے۔ ؎

جو کھڑا تھا کھڑا رہا وہ وہیں
جو پڑا تھا پڑا رہا وہ وہیں

(اصلاحِ عام۔ دسمبر ۱۹۱۰ء)

حُسنِ مقال

جس طرح اوروں نے سال گزشتہ و سال حال پر مضمون لکھے ہیں۔ مجھ سے بھی فرمائش ہوئی ہے۔ میں کئی دفعہ اس تقریب پر لکھ چکا ہوں، اوروں نے بھی اس پر بہت کچھ لکھا ہے۔ ایسے پامال مضمون پر انسان کہاں تک لکھے؟ جو کچھ میرے ذہن میں تھا۔ لکھتے لکھتے ختم ہو گیا۔ جو میرے ذہن میں نہ تھا وہ اوروں نے ادا کر دیا لیکن دستور ہے کہ جس قدر عذر کیجئے کہنے والے اسی قدر زیادہ اصرار کرتے ہیں۔ اس سے پیچھا چھڑانے کی تدبیر یہی ہے کہ بُرا بھلا جو کچھ خیال میں آئے۔ لکھ دیا جائے ؎

بت بنایا ہے نازنینوں کو　　داغ بخشے ہیں مہ جبینوں کو
دی ہیں خاموشیاں حسینوں کو　　تنکے چنوائے نکتہ چینوں کو
جب وہ حُسنِ مقال پر آیا

زمانے کو شروع سے انقلاب پسند کہتے آئے ہیں لیکن کسی نے آج تک یہ نہ بتایا کہ انقلاب اس کی کس بات میں ہے؟ اس کا حال ہمیشہ ایک سا چلا آتا ہے، آج تک کسی نے اس کی حالت میں انقلاب نہ دیکھا۔ پہاڑوں سے پوچھئے جن کے سر

پیرانِ کہن سال کی طرح برف سے سفید ہو گئے کہ زمانے کو اسی طرح دیکھتے آئے۔ آفتاب نے آنکھ کھول کر اس کو اسی طرح دیکھا۔ چرخِ پیر اس کے سامنے کا بچہ ہے۔ زمانے کے نہ آغاز کا پتا ہے نہ انجام کا بلکہ جب کچھ نہ رہے گا تب بھی یہ ایسا ہی بنا رہے گا اس کی وضع میں نہ فرق آیا ہے نہ آئے گا۔ ہزار برس پہلے جو بات تھی اب بھی وہی بات ہے وہی دن وہی رات ہے۔

انسان کی طبیعت جو انقلاب دوست واقع ہوئی ہے تو اس نے اپنے مزاج کے موافق گزشتہ و آیندہ، قدیم و جدید، نئے پرانے کا جھگڑا لگا لیا ہے ورنہ دنیا میں کوئی چیز نئی ہے نہ پُرانی ہر نئی چیز پرانی ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ جسے ہم آج نئی سمجھتے ہیں کل پُرانی کہلائے گی۔ لیکن دردمندانِ محبت سے پوچھئے کہ ہماری آج اور ہے اور یار کا وعدۂ فردا اور ؎

وعدے پہ مرے اُن کے قیامت کی ہے تکرار
اور بات ہے اتنی کہ اُدھر کل ہے اِدھر آج

نہ جھوٹ بول کہ ہم شام سے کل آئیں گے
قسم نہ کھا ارے جھُوٹے کبھی جو تو آئے

ماہرانِ فن جانتے ہیں کہ ایک ہی رنگ میں ذرا سی کمی بیشی سے کتنا فرق ہو جاتا ہے۔ سُرخ اور گیروا اور گلابی، لال رنگ ہیں مگر سب میں فرق ہے۔ چمپئی و زعفرانی گو زرد رنگ سہی مگر اس رنگ کے دوپٹے والے جانتے ہیں کہ دونوں ایک رنگ نہیں۔ خونِ جگر اور ہے اور حنائے دستِ یار کی سُرخی اور ہے، اشکِ خوں آلود کی سرخی اور ہے اور رنگِ شفق کی سُرخی اور، غصّے میں چہرے کی سُرخی اور ہے اور نشۂ مے میں آنکھوں کے ڈوروں کی سُرخی اور، رنگِ شہاب اور ہے

اور سُرخی لبِ لعلیں اور، یار کے چمپئی دوپٹے کی رنگت اور ہے اور زردئ رُخِ عاشقاں اور ہے۔

مُرغ بسمل کا تڑپنا اور ہے۔ اور دل کا تڑپنا اور، نصیب کا بگڑنا اور ہے مزاجِ یار کا بگڑنا اور۔ آگ میں جلنا اور ہے اور سوزِ ہجراں اور ہے۔ شمع کا جلنا اور ہے اور پروانے کا جلنا اور، خلعتِ شادی اور ہے اور شالِ عزا اور ہے۔ ع

صبح محشر اور ہے چاک گریباں اور ہے

مجرمانِ زلف آئے جس گھڑی دیوانہ وار
صبح محشر چھپ گئی چاک گریباں دیکھ کر

یہ مثالیں میں نے اس لئے عرض کیں کہ زمانے کا انقلاب کمرِ یار کی طرح محض خیال کا نام ہے۔ ورنہ اس سے زیادہ کیا کسی سے پابندئ وضع ہوسکتی ہے۔ کہ جو سال فنا ہوتا ہے کوئے یار میں فنا ہوتا ہے۔ یعنی مادرِ گیتی کے آگے زالِ دنیا کے سامنے دَم توڑتا ہے۔ وفا اس کا نام ہے کہ جتنے سال وماہ ہوئے۔ اسی عالم میں پیدا ہوئے اور یہیں جان دی۔ نہ آسمان دیکھا نہ زمین دیکھی ؎

ہم گرے اُس کے در ہی پر مر کر
اور کوئی وفا کرے کیا خاک

لیکن وفا ہو یا بے وفائی، گزری باتوں کا ذکر اس وقت تقویم پارینہ کی طرح بے کار ہے ؎

دل جوانی میں دیا رنج نہ کر پیری میں
برسوں کے مُردے کو روتے نہیں رونے والے

آغازِ سال میں آج سب سے بڑے خاندان کی تقریب کا ذکر ہے جس کی کیفیت سننے کے لائق ہے۔ اس کیفیت کا ذکر مجھ سے بن نہ پڑے یہ دوسری بات ہے مگر تقریب کے دل کش ہونے میں شک نہیں پہلے آپ اس گھر کا حال سُن لیں کہ عالمِ اسباب میں آج نیچر سے بڑا اور قدیم گھر دنیا میں نہیں۔ آسمان اس کی چھت اور سورج، چاند، ستارے اس کی قندیلیں ہیں۔ سبزہ و باغ غنچہ گل فروش اور فرش کے بیل بوٹے سمجھئے۔ اس بزم نشاط کے لئے لوُنی فلک کو سائی دی گئی ہے اور نغمہ پردازی مرغانِ چمن کے حوالے ہے عزیز یگانوں میں جو جمع ہوئے ہیں۔ مشاہیرِ عالم ہیں۔ پیرِ فلک، مادرِ گیتی، زمانہ، لوُا نیچر اور ان کا سارا گھر، جس میں ساری دنیا آگئی۔

ان کی آپس کی رشتہ داری کا حال یوں ہے کہ پیرِ فلک کی شادی گیتی نامی ایک بڑے گھر کی لڑکی سے ہوئی جس سے زمانہ پیدا ہوا۔ زمانے کی رعنائی کی بڑی دھوم مچی۔ یہاں تک کہ قحبہ ہائے روزگار میں سے ایک آفت کی پرکالہ زالِ دنیا کی زمانے سے رسم و راہ ہوگئی۔ زمانے کا اُن دنوں شباب تھا، اس کا مزاج اس عمر میں بھی کہ جوانی نہیں رہی ایک حالت پر نہیں سنا اس وقت تو ایک حالت پر رہنا ناممکن تھا اور دھر زالِ دنیا کو پابندی کے نام سے ضد، زمانے کی آوارگی دیکھ کر مادرِ گیتی نے لوُا نیچر کے مشورے سے پہلی صدی پھر دوسری صدی اس کے بعد تیسری صدی اور یکے بعد دیگرے انیسویں صدی تک سے شادی کردی یہ بیچاریاں سب گردشِ روزگار نامی ایک، مہلک عارضے میں گرفتار ہو کر مرتی چلی گئیں۔ اس کا سبب پیچھے سے معلوم ہوا کہ یونان کے مصوّر جو زمانے کے سر پہ بال نہیں بناتے تھے انہیں خبر نہ تھی کہ اس کم بخت کے بدن میں کوئی منحوس پھوڑی ہے جنوری کی پہلی کو آدھی رات پر ایک سیکنڈ کے بعد پچھلی شادی (یعنی بیسویں صدی) کے ہاں بچہ ۱۹۱۰ء پیدا

اس تقریب کی خبر زال دنیا کو بھی ہوئی جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے کہ پہلے اس کی رسم و راہ زمانے سے تھی، اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے اپنے جی میں کہا کہ گو زمانہ مجھے زال کہتا ہے (یہ تو زمانے کی عادت ہے کہ عیب لگائے بغیر چین نہیں) مگر دوسرا میری عمر کا اس قدر دلفریب کسی نے دیکھا نہ سنا کم سن حسینوں کا جمال کچھ ناز کی بات نہیں کہ مفت کی نعمت ہے۔ تعریف میری چاہیے کہ اب بھی میں جدھر دیکھ لیتی ہوں ایک عالم تڑپتا نظر آتا ہے، یہ بات مجھی کو نصیب ہے کہ جوان تو جوان بوڑھے مجھ پر زیادہ مرتے ہیں۔ مجھے بھی بوڑھوں کی محبت زیادہ پسند ہے کہ اُن سے رسوائی عشق کا اندیشہ کم ہے۔ کسی کو شبہ نہیں ہوتا کہ میری ان کی کیا رسم ہے۔ مگر کم بخت بُری طرح چاہتے ہیں کوئی مجھ سے پوچھے کہ عشق ہے اور بڑھاپے کا ؏

پیرے کہ دم زعشق زند بس غنیمت است

اس میں بڑا لطف یہ ہے کہ بوڑھوں کی محبت سے کوئی مطعون نہیں ہوتا۔ جوان جو مجھ سے محبت کرتے ہیں، میرے غم خوار بن کر نہیں۔ بلکہ غلام بن کر مرتے ہیں۔ اور غلام سے میں غلام کے موافق پیش آتی ہوں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب قیدِ غلامی سے نکلا چاہتے ہیں تو زنجیر قید سے ہاتھ پیر نکالنا نہیں جانتے۔ زنجیریں کٹواتے نہیں۔ اپنی طاقت سے توڑتے ہیں۔ جس سے چوٹ لگ جاتی ہے اور شور زیادہ ہوتا ہے۔ میں کسی پر مرا نہیں چاہتی۔ میں نے دل سی چیز کو نکال کر پھینک دیا تو اب کسی کی محبت کو کیوں پاس رکھنے لگی۔

لیکن یہ تو بڑی بی نمود کی لے رہی ہیں۔ بات یہ ہے کہ عورت کیسی ہی آوارہ مزاج کیوں نہ ہو۔ جوں جوں عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے اولاد کا ارمان بڑھتا جاتا ہے کچھ تو بیسویں صدی کے زچہ خانہ کا رشک اور کچھ اپنے قدیم آشنا زمانے سے

رسم و راہ کو یاد کر کے زالِ دنیا بھی اس تقریب میں پہنچی

زمانے کو دیکھے ہوئے مدت ہوئی تھی۔ اہل یونان کی خیالی تصویر کی طرح اس کے سر کے بال اُڑے اور پیٹھ موڑے دیکھ کر اس نے اسے نہ پہچانا۔

سامنے کھڑے ہو کر حال پوچھا تو بچے کی طرف اشارہ کیا اور پچھلی اولاد کی جدائی میں کچھ بڑبڑانے لگا کہ گردش فلکی نے ایک بچہ بھی جوان نہ ہونے دیا۔ جو ساتھ دیتا زالِ دُنیا نے اس کی یہ حالت دیکھ کر اپنے جی میں کہا کہ تعلقات دُنیوی انسان کو کیسا مبہوت بنا دیتے ہیں۔ پیدائش و موت کے جھگڑے انسان کو کسی کام کا نہیں رکھتے زمانے کی عمر تو بہت سہی لیکن ایسا بھی کیا ہے کہ آدمیت ہی سے گزر گیا کہ میرے دل دُکھانے کی جو بات تھی اُس کا ذکر کیا جس سے مجھے اپنی اولاد نہ ہونے کا رنج ہوا عورت کے لئے اولاد کا ہو کر مرجانا اس سے اچھا ہے کہ بانجھ رہے۔ عورت کے لئے زچہ خانہ سے زیادہ دل کش کوئی چیز نہیں۔ اس خیال میں یہ بیسویں صدی سے بھی ملنے گئی دیکھا کہ زچہ ابھی کم سن ہے۔ بیسواں سال شروع ہے (دَور گردوں میں ایک صدی ایک سال کے برابر سمجھئے) بیسویں صدی نے بھی زمانے سے زالِ دنیا کا نام سُن رکھا تھا دونوں بہت شوق سے ملیں۔ اس وقت ہم بچّے کا ذکر نہیں کیا چاہتے کہ کے دن کا ہے نہیں معلوم کیسا نکلے کیسا نہ نکلے اور زچہ نے ابھی دنیا اچھی طرح نہیں دیکھی اس کو تو یہ غم مارے دیتا ہے کہ جس طرح ۱۹ مجھ سے پہلے زمانے کی نذر ہو گئیں میں بھی وہیں جانے والی ہوں جہاں وہ گئیں۔ اس پر زالِ دنیا نے سمجھایا کہ موت و زندگی کچھ چیز نہیں۔ جوانی میں انسان موت کو یار کی طرح ڈھونڈتا ہے مگر موت جب تک اُس کا جی نہ چاہے مزاج یار کی طرح اٹھکھیلیاں کرتی ہے۔ یہاں تک کہ جوان اس کو بھول جاتے ہیں اور جب بھول جاتے ہیں تو پھر اس طرح گلے کا ہار ہو جاتی ہے کہ پیچھا نہیں چھوڑتی۔ بچوں کو موت کی خبر نہیں ہوتی اور جوانوں نے موت کو ایسا آسان سمجھ رکھا

ہے کہ محبت کا نام مرنا رکھ چھوڑا ہے لیکن جوں جوں عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ موت کے نام سے کانپتے ہیں۔

بوڑھوں کا عقیدہ ہے (گو منہ سے نہ کہیں) کہ دنیا کیسی بری کیوں نہ ہو۔ اس کے بعد اگر اچھی بھی ہے تو یہ لاچاری قبول ہے۔ ورنہ بہ تمنا اور اپنا بس چلے تو یہی بری بھلی ہے۔ اسی لئے جب تک کہ میاں کے پاس سے تقاضے کا بلاوا نہ آئے یہاں سے جلنے کا نام لینا حرام ہے۔

جنہوں نے دنیا کو اچھی طرح نہیں دیکھا وہ میرے (ازآل دنیا کے) مزاج میں تلوّن بتلاتے ہیں۔ میں اپنی وضع کو تلوّن نہیں سمجھتی۔ اپنی زندگی کی غایت میں نے تحصیلِ کمال سمجھ رکھی ہے' اپنی ہر وضع سے وہ بات پیدا کرنا چاہتی ہوں جس کی تلاش سنگ تراش کو سنگ مرمر کی تصویر بنانے میں ہوتی ہے کہ تیشے کی ہر ضرب گویا خط و خال کی خوبی کا سامان ہے۔ زمانے کو شکایت ہے کہ میں کسی کو چاہتی نہیں لیکن کسی کو نہ چاہنے سے یہ کیسے ثابت ہوا کہ میں اپنے تئیں بھی نہیں چاہتی۔ مجھ میں یہ عیب البتہ ہے کہ کسی آشنا کو یاد نہیں رکھتی۔ آشنا کیا مجھے اپنی بھی یاد نہیں رہتی۔ بوڑھا ہو یا جوان کوئی میری طرف ہاتھ بڑھائے۔ مجھے محبت سے انکار نہیں میں کسی کو بلانے نہیں جاتی بلکہ علانیہ کہہ دیتی ہوں کہ جو جس کو روک سکے روکے۔

آغازِ شباب میں زمانے نے فرطِ محبت سے مجھ سے کوئی نشانی یادگار کے لئے مانگی — میں نے اپنے ہاتھ کی انگوٹھی اتار کر دی۔ زمانے نے پوچھا کہ کس انگلی میں پہنوں۔ اس سوال سے یہ غرض تھی کہ رسمِ شادی کے موافق چڑھاوے کی انگلی میں پہن لے۔ میں نے جواب دیا کہ جس انگلی میں آئے پہن لو مگر اس انگلی میں نہ پہننا جس میں چڑھاوے کی انگلی کی وجہ سے پھر اتارنے کی ضرورت پڑے میرا مطلب یہ تھا کہ جس بات میں کھٹکا رہے وہ مجھے پسند نہیں۔ اس بیان پر سننے والی بیسویں صدی

نامی زچہ) نے گھبرا کر پوچھا کہ تمہاری نگاہ میں وفا و محبت کوئی چیز نہیں۔

نزاکِ دنیا نے جواب دیا کہ وفا و محبت جس سے ہو سکے کرے مگر خیالِ حسن کو عیش کی زیادہ ضرورت ہے کھلم کھلا عیش بدگمانی کا گھر ہے اور چھپ کر عیش کرنا نہ کرنے کے برابر ہے۔ مرد کو خدا نے نگاہ و زبان و دماغ اور اسباب ایسے دیے ہیں جن سے زندگی کا لطف حاصل ہو سکتا ہے علوم و فنون و لٹریچر کی خوبیاں اُس کے جی بہلانے کو بہت ہیں۔ مگر عورت کو صرف ایک نازک سی چیز دی گئی ہے، جسے دل کہتے ہیں۔ یہ کہیں زخمی ہو گیا تو چوٹ کھائے سانپ کی طرح اس کی زندگی مشکل ہو جاتی ہے، عورت کا کاسۂ دل ایسے نازک مسالے سے بنایا گیا ہے کہ خالی رہ جائے تو ذرا سی ٹھیس سے ٹکڑے ٹکڑے سمجھئے۔

محبت کے لئے وفا کیا، کسی تدبیر و فکر کی ضرورت نہیں کیڑا بے دست و بازو پھول کی پتیوں میں گھر کر لیتا ہے۔ قمری بے بتائے سرو کو پہچان لیتی ہے اور باغبان سے پہلے بلبل کو موسم بہار کی خبر ہو جاتی ہے کویل کو بغیر علم نباتات اور بے جنتری معلوم ہو جاتا ہے کہ آم کا درخت کب مورلاتا ہے، محبت وہ چیز ہے جو سامان و اسباب کی محتاج نہیں، بادشاہ کو بادشاہی کے لئے ملک درکار ہے سپاہی کو میدان جنگ، فلاسفر کو علم و تحقیق کی ضرورت ہے۔ مگر محبت کے لئے ایک اکیلا دل چاہیے۔ اسی لئے جب تک دنیا میں دل سی چیز ہے۔ محبت کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ محبت کا داغ بڑا داغ سمجھا جاتا ہے ماں باپ کا داغ بڑا داغ ہے مگر نیچر نے سب کو اس کا عادی کر دیا۔ عورت کا پہلوٹھا چھیج جائے اگر خاوند زندہ ہے عورت کو تسلی ہو جاتی ہے کہ خدا پھر اولاد دے گا ہاتھ پیر کی چوٹ ہو اور کوئی درد کسی قسم کا کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ اُس کا صدمہ روح کو نہیں ہوتا۔ روح کو صدمہ ہو تو رخصت ہو جائے اور درد اس سے پہلے عمر

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

لیکن کسی کا داغِ محبت لطفِ زندگی کو کھو دیتا ہے مگر کوئی چیز کیسی دلکش کیوں نہ ہو، تازگی بغیر لطف نہیں، رات دن یہی سننا کہ کسی پر مرتے ہیں عیش کو اجیرن کر دیتا ہے۔

خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ عالمِ اسباب کا مدار عیش پر نہیں۔ اس عالم کہن اساس کی بنیاد ہوا و ہوس پر نہیں رکھی گئی۔ اس کے سارے قصوں میں غمِ دنیا سب سے زیادہ ہیچ ہے۔ دنیا کا غم انھی لوگوں کی نگاہ میں قابلِ اعتبار ہو تو ہو جن کو ترکِ دنیا کا دعویٰ ہے۔

(صلائے عام۔ جنوری ۱۹۱۰ء)

نوائے ریزم از آہنگِ دیگر

فلسفیانہ نشتر

اس مضمون کے پڑھنے والو! دل و دماغ میں مَیں آپ کو اپنے سے کم نہیں سمجھتا۔ انصاف و حق پرستی میں آپ مجھ سے کسی طرح کم نہیں۔ مجھے آپ کا نام نہیں معلوم، عُمر نہیں معلوم۔ آپ کی جائیداد، دولت، اولاد کی مجھے خبر نہیں۔ نہ ان باتوں سے واقفیت کی ضرورت ہے، بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ جو اُمید مجھے آپ سے ہے وہ غلط نہ نکلے۔ خدا کرے آپ کی نیت بھی یہی ہو کہ کارخانہ عالم کو از روئے انصاف و تحقیق دیکھیں۔ اس میں میرا اور آپ کا حال ایک سا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میری طرح آپ کو نیکی پسند ہے۔ مگر میں اور آپ دونوں دیکھ رہے ہیں کہ بدی سے بھی کبھی کبھی کام نکل جاتا ہے ایسا نہ ہوتا تو دنیا فنا ہو جاتی اور اگر نری نیکی سے بھر دی جاتی تو خلقِ خدا میں سے بہت ہی تھوڑے اس میں رہنے کی ہوس کرتے۔

میری طرح آپ بھی اس دنیا کو بُرا جانتے ہیں اور یہاں سے جانا بھی شاق

ہے میری طرح آپ بھی اپنا مطلب نکالنے میں کسی تدبیر سے نہیں چوکتے۔ اور جب کسی طرح بس نہیں چلتا تو تقدیر پر چھوڑ دینا ایمان کا بڑا جزو سمجھتے ہیں۔

میری طرح آپ کو بھی ہر وقت اپنے مطلب کی تلاش رہتی ہے اور میری طرح آپ بھی اس بات میں اُستاد ہیں، کہ جس طرح بھی اپنا مطلب نکل جائے اچھا ہے پھر بھی ہمیشہ نہ آپ کا مطلب پورا ہوتا ہے نہ میرا۔ اور کبھی بے سعی و تدبیر آپ سے آپ کام بن جاتے ہیں۔ جن لوگوں سے میرا یا آپ کا مطلب نکلے۔ اُن کو ہم دونوں اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ جن سے ہرج ہوتا ہے اُن کو اپنا دشمن جانتے ہیں۔ دنیا کا حال ہم نے اور آپ نے کیسی کیسی محنت و جانفشانی اور پروردگار کے افضال و اکرام یعنی وحی و الہام اور کتب آسمانی سے عرش و کرسی تک دریافت کرلیا۔

اور تحصیلِ علوم اور تعلیم و تلقین اور اپنی عقل و تجربہ سے بہت کچھ دیکھا بھالا مگر جس قدر ہم نے جانا، نہ جاننے کے مقابلہ میں کچھ نہیں۔ ہمارے ظاہری و باطنی علوم کی مقدار ہماری لاعلمی کے مقابلے میں رائی اور پہاڑ کی نسبت سمجھئے۔

لیکن جس قدر ہم اپنے سے غیر کی تلاش و تحقیق میں مارے مارے پھرے۔ اُسی قدر اپنے سے غافل رہے میری طرح آپ کو خیال نہ ہوا کہ ہم کہاں سے آئے اور کہاں جائیں گے۔ آئے کیوں؟۔ اور جائیں گے کیوں؟ ہماری زندگی سے غرض کیا ہے اور اُس کا انجام کیا ہوگا ہماری بڑی سے بڑی زندگی سے غرض اگر محض جینا ہے تو چھ مہینے اور اس سے بھی کم عمر بچے کے پیدا ہونے کا جو جینے نہ پایا۔ کیا نتیجہ ہوا۔؟ کہ ابھی دن نکلنے نہ پایا تھا کہ شام ہوگئی۔

اگر زندگی کا انجام موت ہے تو موت سے پھر زندگی کی اتنی شکلیں کیوں پیدا ہوتی ہیں۔ تین دن میں نعش سے ہزاروں کیڑے پیدا ہوئے۔ نیچر کو اپنے کاموں میں

اس طرح مصروف دیکھ لیجئے کہ ابنائے زماں کو اپنے دھندوں میں اس قدر مصروف ہونا مشکل ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے جانکاہ انقلابوں کا اثر اس سے زیادہ نہیں ہوتا۔ جتنا کہ تالاب میں کنکر پھینکنے سے تالاب کے مینڈکوں پر ہوتا ہے کہ گھڑی بھر کے لئے کونوں میں دبک گئے۔ پھر وہی "ٹرٹر"۔ آتش فشاں پہاڑوں کے بھڑک اٹھنے سے ہزاروں شہر شہر خموشاں بن گئے۔ مگر نیچر کے کان پر جوں نہ رینگی۔ کوئی دریا میں ڈوبے۔ لڑائی میں مارا جائے چارپائی پر مرے۔ نیچر کے لئے سب یکساں ہے مردے کو آپ گاڑیں یا جلائیں یا دریا میں بہائیں یا یوں ہی چھوڑ دیں۔ اس کا ہر جزو نیچر سنبھال لے گی۔ فاقے سے مرے یا بدہضمی سے ہمایوں کی طرح زینے سے گر کر مرے، یا نادر کی طرح خیمے میں مارا جائے، نیچر کی نگاہ سے کوئی اوجھل نہیں ہو سکتا۔ کسی محفل میں بادہ کہن کی تلاش ہوئی۔ کہیں سے سو برس والی مئے پرتگال منگائی گئی مگر پینے والوں میں سے کوئی بھی سو برس کی عمر کو نہ پہنچا انسان کی زندگی آب انگور کے مرتبے کو بھی نہیں پہنچتی۔ عقل جو ہم کو دی گئی ہے اگر اپنا آغاز و انجام سمجھنے میں عاری ہے تو ہمارے کس کام کی۔ ہماری عقل نے آسمان و زمین کے قلابے ملائے۔ اور ہمیں ہمارا ہی حال نہ بتایا تو اس عقل سے کیا فائدہ؟ عدالت میں مقدمات جتوائے۔ جعلی کاغذ جعلی سکے بنوائے۔ الف لیلہ و داستان امیر حمزہ اور ہزاروں جن و پری کے قصے گھڑ ڈالے۔ مگر ہمارا آغاز و انجام ہمیں نہ بتایا، دنیا میں رنج و مصیبت، نیکی و بدی کا جھگڑا نہ سمجھایا۔ ہم نے فلکِ بے ثبات کو سر پر اٹھا لیا۔ تو کیا۔ مگر مصیبت برداشت کرنی مشکل ہو گئی۔ بے ثباتی عالم کے وہ نازک مضمون رقم کئے۔ گویا عروسِ فکر کو حباب کا جوڑا پہنا دیا مگر یہ نہ جانا کہ ہم کیوں آئے اور آئے تو چلے کیوں۔

کسی نے پوچھا کہ دنیا میں کفر و دیں میں سے کونسی چیز رہے گی۔ جواب ملا کہ دونوں

کی گنجائش ہے بلکہ ایک اور تیسری چیز کی بھی۔ وہ یہ ہے کہ انسان نہ زاہد خشک بنے نہ رندِ بے حیا۔

دونوں کے درمیان سے بھی راستہ جاتا ہے۔ شیخ احمد جامی فرماتے ہیں:

درِ میخانہ و مسجد کدام است	کہ ہر دو بر منِ مسکیں حرام است
نہ در مسجد گزارندم کہ رندی	نہ در میخانہ کایں خمار خام است
میانِ مسجد و مے خانہ راہیست	غریبم عاجزم آں رہ کدام است

جب تک دنیا قائم ہے۔ نیکی و بدی کے قصے ختم نہیں ہو سکتے۔ انسان زہد و تقویٰ اگر بھول بھی جائے تو بھی چھوڑے نہیں۔ بحرِ جہاں میں اگر کسی کی ہوا بندھی بھی تو حباب سے زیادہ نہیں ہے ؎

مستغرقانِ نشۂ ہستی کو کیا ثبات
کچے گھڑے حباب ہیں شراب فنا کے ہیں
اسباب فقر ملک عدم کا ہے زادِ راہ
کملی میں رو ئیں مخمل خواب فنا کے ہیں

(اصلاحِ عام۔ جنوری ۱۹۱۰ء)

عقل و عقیدہ

یہ مسئلہ مدت سے تحقیق طلب ہے کہ مذہب کے معاملے میں انسان محض عقل سے کام لے یا محض عقیدے سے۔ عقیدے سے میری مراد ایسی باتوں پر ایمان لانا جو انسان کی سمجھ سے باہر ہیں۔ میری دانست میں انسان کو دونوں کی ضرورت ہے اور اس طرح کہ ایک دوسرے سے تکرار کی فکر نہ کی جائے، نہ آپس میں در پئے آزار رہیں اس کی تمثیل یوں سمجھئے کہ عالم اسباب میں دونوں توام پیدا ہوئے۔ ایک مردانہ خوبصورتی کا نمونہ ہے جسے عقیدہ اور عرفاً ایمان کہیے کہ دنیا میں یہ اپنے تئیں کسی چیز کا محتاج نہیں سمجھتا اور جیسا کہ مقتضائے مردانگی ہے اس کو دعویٰ ہے کہ میں اکیلا سب کے مقابلے کے لئے بس ہوں۔ دوسرے کو اپنے ظاہری خط و خال و حسن و جمال کا خیال ہے (کہ اردو میں عقل صیغۂ تانیث ہے)۔

عقل کو خدا نے بلا کی آنکھ دی ہے کہ نگاہ یار کی طرح سیدھی دل میں اتر جاتی ہے۔ مگر عالم اسباب میں نیچر نے ہر ہنر کے ساتھ ایک عیب لگا دیا ہے کہ عقل کانوں کی بہری پیدا ہوئی۔ یہ سُنی سنائی بات پر نہیں چلتی، آنکھوں سے دیکھے بغیر اس کی تسلی نہیں ہوتی۔

عقیدے کو قوتِ سامعہ عجیب وغریب دی گئی کہ کوئی کہیں گاتا ہو اس کے کان اسی کی طرف لگے رہتے ہیں کوئی کچھ الاپے اسے مزہ آتا ہے اچھی آواز پر غش ہے لیکن جیسا کہ نیچر کی عادت ہے کہ ایک غیر معمولی خوبی کا عوض دوسرے سے لیتی ہے عقیدے کی نگاہ کام کی نہیں مگر جس طرح ساری مخلوق کو ؎

شاد باید زیستن نا شاد باید زیستن

ضرور ان دونوں بہن بھائی نے یہ ترکیب نکالی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے سفرِ ہستی اس عالم اسباب میں طے کر رہے ہیں۔ جس میں کبھی دن ہے اور کبھی رات ہے، دن کو تو عقل کی نگاہ کام دیتی ہے اور رات کو عقیدے کی قوتِ سامعہ کہ اندھیرے میں عقل کو نہیں سوجھتا۔

اور جیسا کہ خلقی عیب والوں کا حال ہے کہ اکثر بد مزاج ہوتے ہیں ۔ عقل جو کانوں سے اونچا سنتی ہے رات کو اُلجھنے لگتی ہے کہ اس وقت نگاہ سے کام نہیں چلتا دن تو ہنستے کھیلتے کٹ جاتا ہے ۔ رات کو جب نگاہ بیکار ہو جاتی ہے ۔ تو عقیدے کے سوا کوئی سہارا نہیں۔ جس کے کان میں ہر کھٹکے کی آواز پہنچتی ہے جہاں عقل کے پاؤں ڈگمگاتے ہیں اور سفر ہستی میں بُری بھلی آوازیں سُنائی دیتی ہیں تو عقیدہ ہی بتاتا جاتا ہے کہ کس بات میں خطرہ ہے اور کس میں نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ انسان کی زیادہ تعلیم دوسروں سے حاصل کی ہوئی ہے ۔اس کا کام اپنے جاننے پر کم اور دوسروں کے بتائے سے زیادہ نکلتا ہے دنیا میں آتے ہی اس کی زندگی کا مدار ماں باپ کی پرورش پر رہا کہ یہ مضغۂ گوشت لپنے لئے ہر طرح بیکار تھا۔ سن بلوغ تک جو کچھ اس نے جانا۔ دوسروں کا بتایا ہوا تھا۔ اس کی عقل اس کے لئے بے کار رہی۔ جو کچھ غیروں سے سُنا، وہی اس نے جانا یہ عمر وہ ہے کہ اس وقت کا اثر تمام عمر رہتا ہے اسی لئے ثابت ہے کہ ہماری عقل کے حصے

تک بے کار گئی۔ جب بڑے ہوئے تو بھی عقل میں بچے ہی رہے کہ جس طرح بلّی کے بچے کو پہلے پہل آئینہ دکھایئے تو اُسے یقین ہو جاتا ہے کہ اپنا عکس دوسرا بلّی کا بچّہ ہے۔ اس پر غرّاتا ہے پنجے مارتا ہے آئینے کو ٹٹولتا ہے۔ آخر تھک کر چھوڑ دیتا ہے کہ جانے کیا معاملہ ہے جس طرح بچپن میں ہماری یہ وضع ہمارے کام آئی کہ ہم اپنے سے بڑوں کی بات مانتے رہے۔ اسی طرح عقیدے میں احکام الٰہی کے موافق اگر بسر کریں گے تو دوسرے عالم میں کام آئے گا کہ آپ اس عالم کو اپنا بچپن سمجھئے اور دوسرے عالم کو اپنی جوانی اور غیر فانی جانیے۔ ماں باپ کی بتائی ہوئی بات اگر اس وقت بچّے کی سمجھ میں نہ آئے اور اس بنا پر کہ اس وقت سمجھ میں نہیں آتی، یہ نہ مانے تو سعادت مندی کے خلاف ہے جس میں تمام عمر کا نقصان ہے اس وقت بے بحث و دلیل مان لینا اطاعت میں داخل ہے۔ اسی طرح اسرارِ ازل جو اس وقت ہماری سمجھ میں نہ آئیں۔ مان لینا چاہیے کہ مرنے کے بعد یہی تعلیم و تربیت کام آئے گی۔ یہ نہیں کہ آج کل کے محقّقوں نے سرائرازلی کی تحقیق چھوڑ دی۔ نہیں بلکہ بہت تحقیق کی۔ اور جو بات سمجھ میں نہیں آئی اس سے انکار نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ ان کا حل کرنا مشکل ہے۔

انسان کو شُبہ ہوتا ہے کہ پروردگار نے ہمارے فہم سے باہر جو باتیں پیدا کیں اس کی اس میں کیا مصلحت ہے عالم اسباب میں ہمیں کوئی چیز بے سبب نظر نہیں آتی۔ مادّے کا یقین ہے۔ مگر مادّے میں حِس نہیں۔ اتنا بڑا کارخانہ بے حِس چیز سے پیدا ہونا مشکل بات ہے، جو چیز مسالے میں نہ ہو مسالے سے بنی ہوئی شے میں کہاں سے آگئی۔ اگر ہم محض اتفاق سے دنیا میں آگئے تو قرینِ قیاس ہے کہ اتفاق سے دوسرے عالم میں چلے جائیں، ایک جگہ اتفاق کو اختیار دیا گیا تو دوسری جگہ چھیننے کی کوئی وجہ نہیں۔

بڑی الجھن کی دلیل جو اب تک سننے میں آئی یہ ہے کہ اگر عقائد کے موافق خدا کو اپنے پہچانوانے کی ضرورت ہوتی تو بھوک پیاس کی طرح انسان کو خود بخود اس کی ضرورت ہوتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ضرورت محسوس ہونے میں تو شک نہیں کہ اگر عقائد مذہبی فضول ہوتے تو ہزاروں برس سے اُن کا وجود انسان کے دل سے کب کا مٹ چکا ہوتا۔ عقائد کے خلاف شروع عالم سے اب تک جانے کتنی تدبیریں ہوئیں اور پھر بھی یہ مٹ نہ سکے۔ مگر اس قوت کے محسوس ہونے کے مراتب ہیں۔ مثلاً گانا ہے کہ گنگنانے سے لے کر تان سین تک سب گانے میں داخل ہے لیکن پھر بھی کسی قدر باریکیاں طے کر کے انسان موسیقی کے کمال تک پہنچتا ہے باجوں میں بچوں کا پپیا ایک طرف اور دوسری طرف پیانو دیکھئے۔ لکیریں بنانی کس کو نہیں آتیں جو مصوری کا آغاز ہے۔ اس کا کمال مانی و بہزاد سے پوچھئے۔ پیٹ تو جانور بھی بھر لیتے ہیں۔ مگر انسان نے کھانے میں کیا کیا تکلف اور نفاستیں پیدا کیں۔ یہی حال مذہبی عقائد کا ہے کہ کسی نہ کسی قسم کے عقیدے سے کوئی خالی نہیں اس کا کمال وحی و الہام اور کتب آسمانی میں نظر آتا ہے۔ اس پر آپ یہ کہیں گے کہ کتب آسمانی کے بعد بھی انسان کے دلوں میں سے شکوک رفع نہ ہوئے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح محدود کو غیر محدود کا سمجھنا مشکل ہے غیر محدود کی شرح بھی جو ہم تک پہنچی اُس کی ذات کی طرح سمجھنی مشکل ہے کہ متن کا حاشیہ گو کتنا ہی مفصل لکھئے متن ہی سے ملتا ہوا لکھا جائے گا۔

اس فن کی تحقیق کے لئے اسلام نے علم کلام ایجاد کیا۔ یہ سو ڈیڑھ سو برس سے آگے نہ چلا۔ اور دس پندرہ عالموں سے زیادہ اس فن کے لکھنے والے پیدا نہ ہوئے مجھے اندیشہ ہے کہ یہ علم بھی اور علموں کی طرح اب ہم سے نکل گیا۔ ہر علم تعلیم و تعلّم سے بڑھتا ہے۔ اور علم کلام کے لئے غایت درجے کی معلومات کی ضرورت ہے

یہاں معمولی لیاقتوں کا بھی رونا ہے۔ خاص کر آج کل کی تعلیم سے تو مجھے بہت کم اُمید ہے کہ تنکوں کے جلانے سے روشنی یا گرمی اگر پیدا بھی ہوئی تو اعتبار کے لائق نہیں۔ جو بات کہ انسان خود نہ سمجھے اس کا دوسرے کو سمجھانے کا ارادہ کرنا غلطی ہے۔

لیکن ہومر نے مردانِ نبرد آزما میں سے ایک کا قول کس فصاحت سے لکھا ہے کہ اندھیرے اور کونے میں مرنے سے دن کو سب کے ساتھ لڑائی میں مارا جانا بہتر ہے۔

عقاید مذہبی میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ عقیدہ کیسا ہی کیوں نہ ہو جس قدر عقل سے ملتا جلتا رہے دنیا کے لئے زیادہ بکار آمد ہے۔

ضیائے عقل سے عقیدے کا چہرہ زیادہ دل کش ہو جاتا ہے۔

(اصلاحِ عام۔ جنوری ۱۹۱۰ء)

ذِکرِ خُوباں

(عورت کی خلقت۔ از روئے تمثیل)

بلائے صُحبتِ لیلےٰ و فرقتِ لیلےٰ

ہندی شاعروں نے عورت کی خلقت کا قصّہ اس طرح لکھا ہے کہ آغازِ آفرینش میں خلّاقِ دو عالم نے جب عورت کے پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو معلوم ہوا کہ سارا مسالہ انسان کے پیدا کرنے میں کام آگیا۔ (انسان سے مراد یہاں آدم یعنی مرد سے ہے) عورت کے بنانے کے لئے عالم ایجاد میں کوئی چیز اعتبار کے لائق نہ رہی۔ بڑے غور و تامل کے بعد یہ تدبیر کارپردازانِ ازل کے ذہن میں آئی کہ چہرے کی شکل تو چاند سے لی جائے۔ اور خمِ ابروِ ہلال سے غنچۂ ناشگفتہ سے دہن اور برگِ گُل سے ہونٹ، نرگسِ شہلا سے آنکھ، سَرو سے قد، نسرین سے بدن، کبک سے رفتار لے لیجئے۔ شب تار سے بالوں کی سیاہی اور درازئ شبِ ہجراں سے بالوں کی درازی لے لیجائے۔ یاقوت سے ہونٹوں کی سُرخی، پتھر سے سنگدلی۔ طوطے کی آنکھ سے بے مروّتی، مانگ لیں ماتھے کی چمک کُندن سے اور دانتوں کی دمک موتیوں سے لے لیں۔ قلقلِ مینا سے

آواز کی کھنک اور شمع سوزاں سے آنسوؤں کی لڑی ضرورت کے وقت عاریتاً لے لو گردش روزگار سے مزاج کا تلون لے لیا جائے۔ گلے میں باہیں ڈال دینے کی ادا سرو دست عشق پیچاں سے لیلو۔ اور دیکھتے رہو کہ برگ گل تر پر جب قطرۂ شبنم نسیم سحر سے جنبش میں آئے۔ اُس وقت اُس کے دل کے دھڑکنے کی تصویر کھینچ لینا۔

خوئے جفا چرخ ستمگار سے اور کبھی بھولے بھٹکے کی رسم وفا چکوہ چکوی سے مانگ لو۔ کمر کی ضرورت نہیں کہ دہن یار کی طرح نظر نہیں آتی۔ زلف کو پریشاں اور آئینۂ رخسار کو درخشاں بنا دینا۔ زبان کے لئے سوسن کی قلم قینچی سے کاٹ کر لگا دینا لڑکپن کی اٹھکھیلیاں بلّی کے بچوں سے جو پنجوں میں ناخن چھپانا نکالنا خوب سیکھ گئے ہوں۔ لے لینا اور خود اپنے بچوں کی حفاظت میں جان پر کھیلنے کے تیور شیرنی سے لے لو۔ اداؤں میں بلانے سے بھاگنا اور نہ ملئے تو خود ملنے کے بہانے ڈھونڈنا نگاہ سے بلانا اور زبان سے کوسنا، منہ نہ لگانے پر گلے کا ہار بن جانا اور ناز برداری کی جائے تو لاپرواہی کی شکایتیں کرنا اور ایسی ہی ہزار ناز و انداز کی باتیں کوٹ کوٹ کر بھر دینا۔

غرض ایسے ہی اجتماع ضدین سے عالم ایجاد کے نسخہ نویسوں نے یہ معجون مرکب یعنی عورت کو بنا کر مرد کے حوالے کر دیا کہتے ہیں کہ اس واقعے کے چند روز کے بعد انسان نے خدا سے شکایت کی کہ:۔

یہ تحفہ جو مجھے عطا ہوا۔ میرے لئے بلائے جاں ہے۔ اس کو واپس لے لیا جائے اس نے میری زندگی اجیرن کر دی اس کی زبان خدنگ نظر سے زیادہ تیز ہے۔ یہ بلا کی طرح پیچھے پڑ رہی ہے۔ مجھے کسی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے نہیں دیتی۔ اس کے مارے مجھ سے کوئی کام نہیں ہوتا۔ بے سبب خفا رہتی ہے۔ اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ میری اس کی نہیں بنتی۔

جواب ملا کہ اگر تمھاری اس کی نہیں بنتی۔ تو تم اسے چھوڑ جاؤ۔

دو چار ہی دن گزرے ہوں گے کہ حضرتِ انسان پھر خالق کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی۔ کردگار جب سے عورت چھٹی۔ مجھے بڑی تکلیف ہے۔ رات دن اُسی کا خیال رہتا ہے۔ گھر اُجڑ گیا۔ زندگی کا لطف جاتا رہا۔ شبِ تار میں وہ چاند سا چہرہ رہ رہ کے یاد آتا ہے۔ پریشانیوں میں زلفِ پریشاں کا خیال جو بندھ جاتا ہے تو پہروں نیند اُچٹ جاتی ہے۔ ارشاد ہوا کہ عورت کو تمہیں خود چھوڑ گئے تھے تمہارا جی چاہے تو پھر لے جاؤ۔

کیا دیکھتے ہیں کہ دوسرے تیسرے دن حضرتِ انسان پھر خُدا کے پاس یہ عرض لے کر پہنچے کہ بندۂ درگاہ کچھ عرض نہیں کرسکتا۔ بُور کے لڈو کا سا حال ہے کہ کھائے تو پچتائے نہ کھائے تو پچتائے۔ لیکن میں نے بڑے غور کے بعد دیکھا کہ عورت سے اس قدر آرام نہیں جس قدر کہ تکلیف ہے۔ حضور اسے رکھ لیں۔

فرشتوں کو حکم ہوا کہ اس احمق کو نکال دو۔ اور اس سے کہدو کہ جس طرح مناسب جانے کرے۔

اِس پر انسان نے کہا کہ "حضور اس کے ساتھ تمام عمر کاٹنی مشکل ہے"۔

جواب ملا کہ اس کے بغیر بھی تمہیں جینا مشکل ہو گیا تھا۔

فرشتوں کو حکم ہوا۔ کہ اِسے بکنے دو۔ کارخانۂ عالم میں اس سے بہت ضروری اور کام ہیں۔ یہاں اتنی فرصت نہیں کہ کوئی ایسے بے کار جھگڑوں میں پڑے۔

انسان ایسا عجیب شخص ہے کہ نہ اسے یُوں چین ہے نہ ووُں۔ لیکن عورت کی خوبیوں کا کیا کہنا، اس دل کش صنعتِ الٰہی کا حال پھر عرض کرنے کو جی چاہتا ہے۔

دھج حسینوں کی زمانے سے نرالی دیکھی
پھول کا حُسن بنا چاک گریباں ہونا

اے عشق! جو رہنمائے حسن ہے۔ اے خیالِ یار! جس پر تمام عالم کے عیش کا مدار ہے۔ اے وقتِ خوش جو زمانے کی خوشی کا سبب ہے۔ اے آرزوئے دلِ دردمند! اے نگاہِ شوق! تم سب جمع ہو۔ چاندنی رات ہو، دریا کا کنارہ ہو۔ آوازِ غنا ہو۔

دنیا میں غم غلط کرنے اور عیش کے دوچند کرنے کا یہی مشغلہ ہے کہ حسینانِ جہاں ہوں اُن کا ذکر ہو یا ان کا خیال ہو۔

سِوا اِن کے ہے کس کا غل جہاں میں ثنا جز ان کے کس کی ہو بیاں میں
کسے حاصل ہے یہ کافر ادائی میسّر کس کو ہے یہ دلربائی

تمام عالم میں حسینوں کی کم سنی سے زیادہ کوئی چیز دل فریب نہیں جن کی کھلی یا بندھی چوٹیاں درازئی عمر کا جواب ہیں۔ اس عمر میں انہیں لوگ کسی نظر سے دیکھا کریں مگر انہیں اپنی معصومیت کے سامنے گناہ و بیگناہی میں امتیاز کی تمیز نہیں۔ کم سِن ہو کر جو حسین کہے کہ "دیکھنا کوئی دیکھتا نہو" وہ مجھ سے اور آپ سے زیادہ مکروہاتِ زمانہ سے واقف ہے۔ کم سنی میں مکروہاتِ زمانہ کی فکر طبیعت کو معصوم نہیں رہنے دیتی۔ حسین کے لئے افکار کا خیال نامساعدتِ زمانہ کی دلیل ہے۔ سبب یہ کہ زمانے میں رنج و آلام کی حد نہیں۔ زمانے سے واقفیت سخت دلی کا ثبوت ہے نہ کہ نرمی کا۔ جب تک دل نرم ہے سختی معصیت ممکن نہیں ؎

لعابِ شوق سے رہتے ہیں لب تر
خفا بھی ہوتے ہیں تو مسکرا کر

خُدا نے عورت کو بالطبع عیش پسند پیدا کیا ہے یہ اور بات ہے کہ مکروہات

زمانہ اس کو بدمزاج کردیں۔ عورت کے لئے عیش سلطنت کا جلوس ہے۔ اس کے پاؤں فرش مخملیں چاہتے ہیں۔ مرد کے پیر کانٹوں کے لئے بنے ہیں۔ مصائب میں عورت کا حال شاخِ گل کا سا ہے جو آندھی میں جھک جاتی ہے اور جہاں ہوا تھمی پھر سیدھی ہو گئی۔ برخلاف اس کے مرد کی تمثیل اس تن آور درخت کی سی ہے جو آندھی میں جڑ سے اکھڑ جاتا ہے۔ اور اپنے ساتھ سب کو لے بیٹھتا ہے۔

عورت کا دماغ ہمیشہ بہار کا نمونہ سمجھئے جس میں خزاں کو دخل نہیں۔ اس کو یقین ہی نہیں کہ خدا نے دنیا میں کوئی مصیبت پیدا کی ہے۔ دیکھنے میں تو عورت بہت نازک بنائی گئی ہے مگر دنیا کی مصیبتیں جس طرح یہ جھیل لیتی ہے اسی کا کام ہے۔ بچے کے پیدا ہونے میں جو تکلیف اٹھاتی ہے اور پھر خوش ہوتی ہے مرد کا حوصلہ نہیں۔ استغنا اتنا کہ بچوں کے پالنے کی مصیبت آپ اٹھائے اور پھر عدالت میں مرد کے حوالے کر دے۔ عورت جس بات کا ارادہ کر لے کر گزرتی ہے۔ اس لئے محبت میں زیادہ لطف اس محبت کا ہے جو عورت کی طرف سے ہو کہ اگر عورت چاہے تو سو بہانے سے ملے گی،

وہی نہ چاہے تو ملنا معلوم ؎

یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے؟

کہتے ہیں کہ محبت میں ہوش نہیں رہتا۔ میری رائے میں مرد کو ہوش نہیں رہتا۔ عورت کو ہوش رہتا ہے۔ اس کو خیال رہتا ہے کہ حسن و جمال کے ساتھ بدنامیوں سے بچنا بھی ضرور ہے۔ خوبصورتی کے پیچھے بدنامی ضرور نہیں، اسے معلوم ہے کہ میں اکیلی بیکار ہوں۔ میری زندگی کا مدار دوسرے پر ہے جو غیر جنس (مرد) ہے عورت جس کی عملداری میں رہتی ہے اسی پر حکومت کرتی ہے۔

عورت کو ہم ناقص العقل ناحق کہتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ عورت سے اپنی سوت چھپی نہیں رہتی اور مرد کو عورت کا آشنا دیر میں معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ذہن کی تیزی

کس کی زیادہ نکلی۔ اسے اپنی بیقراری سے دوسرے کی تپشِ دل کا حال بے کہے معلوم ہو جاتا ہے جنبشِ مژگاں سے کاوشِ دل پہچان لیتی ہے۔ یہ بات اس کی عادت میں داخل ہے کہ منہ چھپائے اور حسنِ التفات کا دعوا کرے ؎

بلائیں ہیں اشاروں میں ادھر سے
ادھر ہے کوسنا ترچھی نظر سے

عورت اگر مرد کے کاموں میں دخل دے تو گمان ہے کہ مرد کے برابر کر دکھائے مگر مرد سے عورت کے کام ہونے مشکل ہیں۔

یورپ میں عورت نے ڈاکٹری، وکالت، ملازمت، جج کرکے دکھا دی، مگر مردوں سے عورتوں کے کام نہ ہو سکے۔ کوئی فلاسفر روتے بچے کو فلاطون وارسطو کے دلائل سے چپکا نہیں کر سکتا جس طرح کہ عورت کندھے سے لگاتے ہی بچّے کو چپکا کرلے گی۔ دس مرد ایک بچے کو نہ پال سکیں گے اور دودھ پلانے والیاں نہ صرف اپنا اور دوسرے کا بچّہ بھی پال لیتی ہیں، اور بچے کو بہلانے میں اپنا جی بہلا لیتی ہیں۔ جس خوبصورتی سے عورت بچّے کو گود میں لیتی ہے بہزاد و مانی کی تصویروں میں یہ بات نصیب نہیں کہ جہاں بچے کی ماں نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ملا کر سامنے کیا اور بچّہ بے اختیار گود میں آپڑا۔

کتابوں میں عشق کو ہزار رنگ کا لکھا ہے کہ کہیں قیسؔ ہے اور کہیں فرہاؔد۔ کہیں نلؔ ہے اور کہیں رانجھا۔ کوئی جنگل کو نکل گیا تو کوئی پہاڑ کو۔ کسی نے ملک چھوڑا اور کسی نے وطن، مگر عورت کو چپکے ہی چپکے گھر میں جان دیتے سنا۔

یہ گھر بیٹھے جانبازیاں کرتی ہیں۔ مرد عشق کرتے ہیں مگر عورت عشقِ مجسم ہے۔ مردوں میں جہاں اور قابلیتیں ہیں عشق و محبت کی قابلیت بھی سہی مگر عورت میں محبت کے سوا کسی چیز کی قابلیت ہی نہیں۔ اور دستور ہے کہ جس کو ایک ہی چیز آتی ہو اس کو اس میں کمال ہو جاتا ہے محبت بغیر عورت جی نہیں سکتی۔ مرد اور طرح بھی جی سکتا ہے محبت کے

معاملے میں تمام دنیا کی عورتوں میں جو جو باتیں ہیں وہ سب ہندوستان کی عورتوں میں جمع ہیں۔ ہندوستان کی عورتوں میں لیلےٰ کا جواب دیکھ لیجئے۔ شیریں سے ملا لیجئے۔ عذرا سے مقابلہ کر لیجئے۔ سب کی خوبیاں موجود اور پھر اپنی خوبی علیحدہ کہ بے دیکھے جان دیتی ہیں اور ملکوں کے مرد عورت سے اپنی جان عزیز نہیں رکھتے۔ یہاں کی عورت نے مرد سے اپنی جان کو عزیز نہیں سمجھا۔ ان کے دل میں محبت جس قدر جلد اثر کرتی ہے۔ اسی قدر دیرپا بھی ہے جس طرح سارے رنگوں میں سپیدی سیاہی میں اور سیاہی سپیدی میں زیادہ کھلتی ہے، ہندوستان میں محبت کا اثر گھروں میں سب سے زیادہ عجیب ہے کہ سسرال اور میکے کا معاملہ بعد المشرقین سے زیادہ جدا اور نئی دلہن کس خوبصورتی سے دونوں کو نباہتی ہے ایک طرف محبت وفا کا ارادہ دوسری طرف بیگانوں سے سابقہ، ادھر ہجوم شوق، ادھر بات بات میں طعن۔ آئی تو خانہ آبادی کے لئے کہ شمع محفل کی طرح گھر کی رونق ہے مگر خموش کہ ساس نندوں کے سامنے منہ کھولنا مشکل۔ گویا دہن یار ہے جس کا پتا نہیں — بڑوں کے سامنے بات نہیں کر سکتی۔ ماں ہو کر بچے کو گود میں نہیں لے سکتی۔ ساس کو بہو میں عیب کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ مگر بہو کو عذر تقصیر کی بھی مجال نہیں کہ شایانِ رسم حیا نہیں۔ بڑی بوڑھیوں کو طعنے کے سوا کوئی کام نہیں کہ "ہم نے دلہن بن کر چھ مہینے گھٹنے سے سر نہیں اٹھایا تھا۔ سال بھر دولہا سے بات نہ کی۔ اسے ابھی کے دن اور کے مہینے ہوئے" یہ نئی دلہن کا جگر ہے جو اس طرح کی زندگی کس خوبصورتی سے گزار دیتی ہیں کہ سارا گھر عیب نکالنے میں مصروف اور انہیں محبت و وفا سے کام۔ ان کی کم سخنی اور کم نگاہی سوطعنوں کا جواب ہے ؎

کبھی ایما نہ کنایہ، نہ اشارہ ہم کو\
کم نگاہی نے تری جان سے مارا ہم کو

(صلائے عام۔ اپریل ۱۹۱۰ء)

غمِ زندگانی

آدھی سے زیادہ رات ڈھل چکی ہے۔ تمام شہر شہرِ خموشاں ہو رہا ہے۔ دروازے کی کنڈی لگا کر میں اکیلا تھکا ماندہ پڑا ہوا ہوں ؎

کانیست رواقِ سربلندم　　　طاقِ دگر از نظر فگندم
تنہا بخیالِ خود نشستم　　　وز حاجب و بارگاہ رستم

میری آنکھ ابھی نہیں لگی تھی کہ اتنے میں دستک کی آواز آئی میں نے پوچھا کہ:
"اتنی رات گئے آنے والا کون ہے کوئی اس وقت کسی کے ہاں جاتا آتا نہیں، یہ وقت دروازہ کھولنے کا نہیں ہے۔"

جواب ملا کہ "دنیا میں مجھے سب جانتے ہیں۔ میرا نام شہرت ہے میری تلاش میں ایک جہان سرگرداں ہے تو بھی میری جستجو میں تمام عمر مارا مارا پھرا۔ اب تھک کر بیٹھ رہا تو تجھے اس طرح مایوس دیکھ کر میں تیرے پاس خود چلی آئی۔ میرا مزاج بچوں کا سا ہے کہ کبھی بُلانے سے نہیں آتی۔ اور کبھی خود دوڑ کر گلے میں باہیں ڈال دیتی ہوں میرے چاہنے والے اسے چُلبلا پن کہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں، اب ہم تھکے ہوئے پڑے ہیں۔ اس وقت تمہارے لئے کون اٹھے ؎

وعدۂ وصل صبح اُس سے کرو

کٹ سکے جس سے رات فُرقت کی

پھر آواز بدل کر کوئی پکارا کہ میرا نام جوانی ہے جس کو مرض عشق میں دیوانی کہتے ہیں۔ میرا اپنا حضرت شیخ سعدی سے پوچھ لو کہ گلستان کا باب پنجم "در عشق جوانی" میری خاطر سے لکھا۔ حضرت یوسف کی گرمیٔ بازار میری بدولت ہوگئی جس کے لئے خدا نے زلیخا کو پھر جوانی دی ؎

یہ خوبیاں تھیں ذوقِ وصالِ دوام کی

ورنہ کبھی دُعا سے زلیخا جواں نہ ہو

میں نے کہا کہ وہ باتیں گئیں۔ عشق و محبت میں ہجر و بے وفائی کے سوا کوئی بات نہیں اگلے وقتوں کا ذکر جانے دو اب تو جس سے پوچھئے یہی کہے گا ؏

چاہنے والا کس کو ملتا ہے

ہم جس کو چاہیں وہ ضد کر کے دوسرے کو چاہتا ہے ؎

یوسف بھی ہو تو اب نہیں پھرتے دن اے فلک

وہ دن گئے کہ بختِ زلیخا جواں ہوا

پھر آواز آئی کہ میرا نام شعر و سخن ہے میں باتیں کرنے آئی ہوں۔ میں تیری دمساز ہوں۔ مجھے آنے دے ؏

ابھی ساقی چھڑا دامن نہ ہم سے

میں نے کہا شعر و سخن کے لئے دل و دماغ چاہیے۔ مدت ہوئی کہ دونوں رخصت ہوگئے۔

تاب وطاقت تو کبھی کی کوچ یاں سے کر گئی

اب وداع ننگ ہے اور رخصتِ ناموس ہے

زلف وسنبل کے ذکر سے دماغ پریشان ہوتا ہے۔ شبِ ہجراں کے نام سے جی گھبراتا ہے خیالِ یار خواب میں بھی نہیں آتا۔ آواز آئی کہ میرا نام دولتِ دنیا ہے میں دروازے پر کھڑی پکار رہی ہوں۔ مجھے آنے دو کہ خیالِ یار بھی میرے ساتھ ہے جواب ملا کہ دیر کر کے آئی— بہرے کے لئے آوازِ غنا بے کار اور لنگڑے کے لئے ناچنا ہنسی میں داخل ہے ۔

گئے دن ٹکٹکی کے باندھنے کے

اب آنکھیں رہتی ہیں دو دو پہر بند

پھر وہی آواز جواب تک بدل بدل کر آرہی تھی۔ بولی کہ

”جب تو کسی کو نہیں آنے دیتا تو سُن میرا نام موت ہے اتنی آوازیں جو تیرے کان میں آئیں ان سے یہی غرض تھی کہ آخر فنا، دنیا کے تمام عیش و رنج کا مآل یہی ہے۔ مصیبت میں میرا ہی ساتھ اچھا ہے اور جبکہ ہر عیش کا انجام مصیبت ہے تو کسی کو مجھ سے مفر نہیں۔ تو نے دروازہ نہیں کھولا نہ کھول میں نگاہِ یار کی طرح دل میں کام کر جاتی ہوں اور ریحانِ شمیم کاکل مشکیں دماغ میں پہنچتی ہوں۔“

میں نے کہا کہ تجھے کون روک سکتا ہے دلِ دردمند کو تیرا ہی سہارا ہے

دنیا کو میں نے خوب دیکھ لیا پھرتے پھرتے تھک گیا ع

جو تھک کے رہ گیا وہی ثابت قدم رہا

جہاں جایئے یہی آسمان ہے یہی زمین ہے کوئی چیز نئی نہیں ہے یہ آفتاب جو صبح کو نکلتا ہے ازل سے اسی طرح نکل رہا ہے پہلے دن میں اسے عجیب چیز سمجھا۔

دوسرے اور تیسرے دن روز اسی طرح نکلتے اور غروب ہوتے دیکھ کر جی اُکتا گیا۔ اب میں اٹھ کر اسے نہیں دیکھتا۔ صبح کو آنکھ دیر میں کھُلے تو جگانے والا کہہ دیتا ہے کہ آفتاب نکل آیا مگر کوئی دیکھنے نہیں نکلتا ؎

گر آفتاب بعزمِ صبوحی آید اسیر
کسے ز گوشۂ مے خانہ بر نمے خیزد

ہر سال وہی گرمی۔ جاڑا برسات دیکھ لیجئے۔ آفتاب کے ساتھ دن اور چاند کے ساتھ رات سمجھ لیجئے۔ دنیا مُنہ پھیر کر دیکھنے کی چیز نہیں کہ تقویم پارینہ کو کیا دیکھئے۔ انسان کے لئے جو دنیا میں چالیس پچاس برس رہ لیا۔ کوئی نئی چیز دیکھنے کو نہیں رہی۔ نئی چیز اگر ہے تو صرف موت ہے کہ اس کا مزہ ابھی نہیں چکھا ہے ؎

ہم کو تو وقتِ نزع بھی ہے تیرا انتظار
کیوں ورنہ ایسے حال میں ہر سُو نگاہ ہے

کہتے ہیں کہ اس کا مزہ بہت تلخ ہے لیکن تلخی ایسا بڑا عیب نہیں۔ شراب کی خوبی بھی تلخی سے ہے اور علاج میں دوائے تلخ ہی مفید سمجھی جاتی ہے۔ اس کی تلخی بہت ناگوار نہیں ہو سکتی، ہماری حرکتیں اسے ناگوار کر دیتی ہیں کہ بسمل جس قدر تڑپے اسی قدر تکلیف ہوگی اور ذبح کے وقت جانور جس قدر ہاتھ پیر مارے اُسی قدر جانکنی بڑھے گی۔

موت میں رنج کرنا اگر انسان کی نیچر میں ہے تو ہم نے بہت سی باتوں میں نیچر کو قابو میں کر رکھا ہے بجلی جو انسان کے لئے بلائے جاں تھی، گرمیوں میں ہمارے سر پر پنکھا ہلاتی ہے اور رات کو مشعلچی کا کام دیتی ہے پیام رسانی کے لئے قاصدی کرتی ہے اور معالجے میں رگ وپے میں در آتی ہے۔ موت میں نا اُمیدی عذرِ گناہ بدتر از گناہ سمجھئے کہ اِدھر تو زندگی میں رنج و آلام کا ساتھ رہا۔ اُدھر کون ہے

جو رنج و آلام سے بچا) ادھر مرنے کے بعد اگر رونا نصیبوں میں ہے تو "لا تقنطو من رحمت اللہ" کس دن کام آئے گا؟

دنیا میں انسان مصیبت کو روک نہیں سکتا۔ مگر ہر افتاد کی شامت کو اپنی بیقراری و اضطراب سے بڑھا لیتا ہے ؎

چتر و افسر کی توقع میں جوانی تو چلی
سر نہ ملنے لگے اے حرص چنور سے پہلے

(صلائے عام۔ مارچ ۱۹۱۰ء)

مضمون پریشاں

اکثر میرے کرم فرما مجھے صلاح دیتے ہیں کہ 'صلائے عام' نکالنے کے عوض تو کوئی کتاب کیوں نہیں لکھ ڈالتا۔ کتاب سے نام زیادہ ہوگا رسالہ و اخبار کی قدر بہت نہیں، اول تو مجھے نام کی ضرورت نہیں۔ چالیس برس میں جو مضمون میں نے لکھے ان کی پہچان یہی ہے کہ اُن میں لکھنے والے کا نام نہ نکلے گا۔ میں نے خدمت اسی کا نام قرار دیا ہے جس میں شہرت کا نام نہ ہو۔ دوسرے رسالہ و اخبار کی بے قدری کا علاج یہ نہیں ہے کہ ان کی طرف سے اور بھی غفلت کی جائے۔ چھوٹی بستی کی آبادی بڑھانے کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ دو چار بھلے آدمی جو اُس میں ہوں وہ بھی اُس بستی کو چھوڑ دیں۔ علاوہ اس کے کتابیں لکھنے میں شائبۂ غرض زیادہ ہوتا ہے کہ اس فن والے اور خاص گروہ کے لوگ جن کی وضع کے موافق کتاب لکھی جاتی ہے اُس کی ہوا باندھتے ہیں جس سے آمدنی کا ڈھنگ ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے رسلے یا اخبار سے آمدنی کی اُمید رکھنی دعدۂ یار کا اعتبار کرنا ہے۔ اس کے سوا کتاب لکھنی اس قدر مشکل نہیں جس قدر کہ ہر طرح کے مضامین کا لکھنا کہ کتاب میں تو بُرا بھلا جو کچھ ہو سکا ایک دفعہ لکھ لکھا کر الگ ہو گئے۔ برخلاف اس کے رسالے میں انقلاب روزگار کی طرح نت نیا مضمون چاہیے۔ انسان اگر بھوکا ہو تو جو کچھ مل جائے

غنیمت سمجھتا ہے، بھوکا نہ ہو تو ذائقہ زبان کے لئے خدا جانے کیا کیا چاہتا ہے۔ ایک چیز پسند نہ آئی تو دوسری کو ڈھونڈتا ہے اور دوسری نہیں تو تیسری، اس کے بعد اور، پھر اور۔ دال روٹی تو گھر میں بھی پک جاتی ہے مگر مختلف اور تکلف کے کھانوں کے لئے رکاب دار چاہیئے۔ صلائے عام کا نکالنا گویا چرخ دوار کا جواب دینا ہے کہ "کہن گشتیٔ وچناں تازہ" کی طرح ہمیشہ تازہ مضمون چاہیئے۔ یہ بات آسان نہیں۔ آپ انگریزوں سے پوچھ دیکھئے کہ ایک رنگ کا کپڑا رنگنے میں اس قدر دردِ سر نہیں بتاتے جس قدر کہ ایک کپڑے میں کئی رنگ دکھانے کو مشکل کہتے ہیں۔ کسی کا جوڑا اس قدر غضب نہیں ڈھاتا جس قدر کہ بکھرے ہوئے بالوں کا سامنا۔ لگاتار باتوں میں اس قدر میرا جی نہیں لگتا جس قدر کہ کہیں کہیں سے کسی کا ذکر سننے سے جی بہلتا ہے ؎

زلف کی دُھن میں ہے شوریدہ سری سے سرکار
طرہ یہ اُس پہ مزہ دل کی پریشانی کا

اچھے مضمون لکھنے والے اگر چاہیں تو کسی خاص مضمون پر کتاب لکھ لیں، مگر "ایک فنے" کتاب والے ہر مضمون پر مشکل سے لکھ سکیں گے۔ پھول کتنا ہی اچھا ہو۔ جب کِھلتا ہے تو وہ بات نہیں رہتی جو غنچے میں ہے کہ ہر غنچے میں ایک نئی بات چُھپی سمجھ لیجئے۔ گویا کسی کے دہن لاجواب کا جواب ہے۔

لکھنے پڑھنے کے مشغلے میں کسی طرح کیوں نہ ہو، آرام نہیں جس کو اس کی عادت پڑ جائے اُس سے یہ مشغلہ چھوٹنا مشکل ہے، جس طرح افیون کا نشہ کہ افیون کھانے والے نہ کھانے والوں سے کچھ زیادہ آرام میں نہیں۔ مگر جو کھاتے ہیں اُن کو افیون چھوڑنے میں موت کا مزہ آجاتا ہے۔ یہی حال عالم اسباب کے تعلقات

کا ہے، کہ دنیا کے جھگڑوں میں آرام نہیں، مگر چھوڑنے میں اور بھی زیادہ پریشانی سمجھے۔

میں نے دیکھا کہ ایک بدشکل کوزہ پشت سیاہ فام آدمی شکنتلا کی تصویریں جو راوی کے ہاتھ کی کھینچی ہوئی تھی، عیب نکالنے لگا۔ دوسرے نے کہا کہ اس تصویر میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں، تجھ سے پھر بھی کم ہی ہوں گے۔ یہ حال اُن لوگوں کا ہے جو 'صلائے عام' میں عیب نکالتے ہیں۔ اور اس سے اچھا لکھ کر نہیں دکھاتے بعضوں کو گمان تھا کہ اور رسالوں کی طرح جو نکل کر بند ہو گئے 'صلائے عام' بھی زیادہ نہیں چلے گا۔ انہیں خبر نہیں کہ آندھیاں کتنے ہی زور سے چلیں۔ کوہ ہمالیہ کو خبر نہیں ہوتی۔ گو ٹمٹماتے ہوئے چراغ بجھیں، یا رہیں۔ شروع میں اکثر چھوٹی اور معمولی چیزوں کی زیادہ قدر ہوتی ہے کہ معمولی عبارت معمولی طبائع کی سمجھ میں جلدی آجاتی ہے اور معمولی علم و لیاقت کے آدمی اہلِ کمال سے زیادہ ہوتے ہیں۔ ہومر کا ترجمہ اگر اردو میں کیا جائے تو کوئی پڑھنے والا بھی نہ ملے گا اور ٹھمریوں کی کتابیں جب چھپیں ہاتھوں ہاتھ بک گئیں کہ ان کے سمجھنے والے بہت ہیں۔

ولایت میں ایک حور وش نہایت تکلف کا لباس اور بہت بیش بہا زیور پہن کر پاکیزہ بگھی کی سواری میں جس میں دو ہزار کی جوڑی جُتی تھی، نکلی۔ تمام شہر دیکھنے کو جمع ہو گیا۔ کسی نے بگھی کی تعریف کی کسی نے جوڑی کی، کسی نے زیور لاجواب بتایا، کسی نے لباس بے مثل کہا۔ اُس حور طلعت نے اتنا بھی خیال نہ کیا کہ کیا بک رہے ہیں۔

ہر کس بہ خیال این و آں گُفت
صاحب نظرے از اثمیاں گُفت۔

جب سارے تماشائی اپنی اپنی راہ لگا چکے، کسی صاحب نظر نے اس پری وش سے مخاطب ہو کر کہا کہ —

"خدا شکل دے تو ایسی!"

اس پر وہ مہ پارہ بہت خوش ہوئی کہ میں اسی تمنا میں گھر سے نکلی تھی کہ کوئی میری تعریف کرے۔ بگھی اچھی ہے تو سواری کی تعریف ہوئی۔ جوڑی لاجواب ہے تو گھوڑوں کی تعریف ہوئی۔ زیور گراں بہا ہے تو اس کی تعریف ہے جس نے دیا لباس اچھا ہے تو درزی کا کمال ہے ان چیزوں کی تعریف سے مجھے کیا۔ یہ پاکیزہ خیالی اس شخص کا حق ہے جس نے میری صورت کی تعریف کی کہ اس میں کسی کا حصہ نہیں اور یہی میں چاہتی تھی۔ حسن کسی چیز کا ہو 'رقابت پسند نہیں کرتا۔ 'صلائے عام' کی تعریف ہے تو اس کی خوش بیانی کی، اور باتیں تو اور کہیں بھی مل جائیں گی۔

خزاں رسیدہ پتوں کی آواز جب وہ درخت سے گرتے وقت آہ کرتے ہیں کہ معلوم نہیں قسمت میں کہاں کہاں مارے مارے پھرنا ہے' سننے کے لائق ہے۔ مگر کسی نے آج تک نہ سنی۔

سارس کی جوڑی سے جب ایک صید ابن ہو گیا' دوسرا وہاں سے اڑتے ہوئے جس درد سے چیختا ہے اس کا سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں۔

مچھلی جو تڑپ کر پانی سے باہر خشکی میں آ پڑی ہے تمام دنیا کے بچھڑے ہوؤں سے زیادہ بیکس ہے اس کی ایک ایک تڑپ ایک کیا ہزار کشتگانِ محبت کی بیقراری سے زیادہ بے چین کرنے والی سمجھئے' کہ انسان کو تو خدا نے نالہ و فغاں کے لئے زبان دی ہے اور یہاں زبان بے زبانی سے کام ہے۔

حضرت ابُوہریرہؓ کی طرح ایک بزرگ کو بلّیوں سے محبت تھی۔ اُن کا بیان ہے کہ رات اندھیری تھی میں کشتی میں سوار جا رہا تھا، کشتی میں مسافر سب کے سب غافل سو رہے تھے کہ ایک بلّی کونے سے نکل کر دبے پاؤں اس طرح میری طرف آئی، گویا کوئی حسین پارسا، شرمایا ہوا، پہلے پہل کسی سے ملنے کو گھر سے نکلے۔ پہلے تو اُس نے ایک انگڑائی لی کہ دیکھوں یہ کیا کہتے ہیں۔ پھر اگلا پاؤں بڑھایا، اور دوسرا اٹھانے سے پہلے کچھ تامّل کیا، گویا سوچتی ہے کہ قدم آگے بڑھانا مناسب ہے یا نہیں۔ صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ کھانے کی تلاش میں نہیں نکلی ہے۔ کشتی میں کھانے کی کمی نہ تھی۔ مسافروں کے دسترخوانوں سے اس کے لئے ضرورت سے زیادہ کھانا بچ جاتا تھا۔ ایک رات کی دلھن کی طرح یہ بلّی شرمائی سی میرے پاس آئی۔ جب بہت پاس آگئی تو نہایت نرم آواز سے کہا کہ "میں آؤں" اور آنکھ اٹھا کر میری طرف اس طرح دیکھا جس سے معلوم ہوا کہ کسی بے حس و حرکت چیز کو نہیں دیکھ رہی ہے بلکہ ایسے کے پاس آئی ہے جس کو اُسے یقین ہے کہ خُدا نے صاحب درد بنایا ہے۔ یہ شناخت خدا نے سارے جانوروں کو دی ہے کہ سخت دل اور نرم دل کو دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں۔

شرمگیں بچوں کی طرح میرے پاس آتے ہی اس نے میرے آگے اپنا سر جُھکا دیا، میں نے اُس کے نرم بالوں پر ہاتھ پھیرا تو تار کی خبر کی طرح مجھے معلوم ہوگیا کہ اس کو میرے ہاتھ پھیرنے سے خوشی ہوئی، اور نہ صرف خوشی بلکہ ایسا معلوم ہوا کہ اپنی تنہائی سے گھبرا رہی ہے۔ خدا جانے کس طرح کشتی میں آگئی تھی اور اپنا دکھ درد کہنے کو آدھی رات کو نکلی کہ دیکھوں کوئی خدا کا بندہ میری تنہائی کا ساتھ بھی دیتا ہے یا نہیں۔ اس کو کھانے پینے کی تلاش نہ تھی کہ اس تنہائی میں کوئی ساتھ دینے والا

مل جائے مصیبت میں تنہائی بُری بلا ہے۔

بلّی نے جب دیکھا کہ میں نے اُس کے بدن پر ہاتھ پھیرا تو اُس نے ناخن چھپا کر اپنا اگلا پنجہ میرے ہاتھ میں دے دیا گویا بیگانگی مٹانے کے لئے ہاتھ ملایا۔ اور اس نرمی سے کہ ناخنوں کا چبھنا تو کجا اُس کا پنجہ مخمل سے بھی زیادہ نرم معلوم ہوا اور زبانِ حال سے یہ کہتی ہوئی میرے پہلو میں اپنا بدن رگڑنے لگی کہ دنیا میں یونہی بہت بیگانگی اور ناآشنائی ہے تم اس الجھن کو چھوڑو۔ انسان جب دنیا میں آتا ہے تو بیگانہ ہوتا ہے اور جاتا ہے تو بیگانوں سے زیادہ تنہائی سے سابقہ پڑتا ہے یہ تھوڑے دلوں ندی ناؤ کا سنجوگ ہے۔ اس وقت تم بھی اکیلے ہو اور میں بھی اکیلی، کونے میں بیٹھی بیٹھی گھبرا گئی!

ایک بوڑھے قیدی کو جو فرانس میں عرصے تک کئی قید خانوں میں رہا تھا۔ (وہاں قیدیوں کو ایک قید خانے سے دوسرے میں بدلتے رہتے ہیں) آخر کو عبورِ دریائے شور کا حکم ہوا۔ داروغہ محبس نے جب کالے پانی کا حکم سنایا تو آنسو نکل آئے لوگوں نے پوچھا کہ قید میں تو تو مدت سے تھا۔ قید جیسی یہاں ویسی وہاں۔ کالے پانی کا صدمہ کیوں زیادہ ہوا جواب دیا کہ اس عمر میں مجھ پر ظلم ہوا ہے، میری عمر بہت ہو گئی ہے، مرنے کے دن نزدیک ہیں۔ مرنا یہاں بھی ہے اور وہاں بھی۔ مجھے فرانس سے دُور لے جا کر مارنے میں کیا فائدہ ہے، یہیں مرنے دیا ہوتا۔ قیدی نے داروغہ کو پنجرے میں ایک چڑیا دکھائی کہ اس پر رحم کرو۔ یہ عرصے سے میرے ساتھ ہے اس کا چھوڑنا شاق ہے، تمام دنیا سے زیادہ اس نے میرا ساتھ دیا ہے، میرے آگے کے بچے سوکھے ٹکڑے پر قناعت ہے اور میری طرح یہ بھی قید میں زندگی بسر کر رہی ہے۔

ہم گرفتار ہیں بے بال و پری کے پابند
ہے نصیبوں کا گلہ شکوۂ صیاد نہیں

جس محبت اور جانفشانی سے قیدی نے اس چڑیا کا پنجرا اپنے ہاتھ سے بنایا تھا، اتنا دردِ سر روضۂ تاج محل کی تعمیر میں نہ ہوا ہوگا۔ کہ خدا جانے کس طرح ٹوٹے تار کے ٹکڑے ایک ایک کر کے جمع کئے اور ٹوٹے بانس کی کھپچیاں تیلیوں کے لئے خدا جانے کتنی مدت میں بہم پہنچائیں۔ جب ڈھانچا تیار ہو گیا تو اُس کو گھاس اور پتیاں کچل کچل کر سبز رنگ رنگا کہ چڑیا کا جی بہلے، کہتے ہیں کہ جب قیدی کو چڑیا ساتھ لے جانے کی اجازت مل گئی تو اتنا خوش ہوا کہ غم اسیری اور غمِ جلاوطنی دونوں بھول گیا۔

چھوڑ کر جائیں کہاں کنج قفس کے خانہ زاد
ہم کو اے شوق چمن بے بال و پر پیدا کیا

آپ کہیں گے کہ شاعروں کی اصطلاح میں جس طرح دیوانے جنگل میں نکل جائیں تو جابجا کانٹوں میں اُن کے دامن کی دھجیاں الجھی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح یہ مضمون پریشاں چاک دامن کی طرح پھیلا جاتا ہے۔ گویا کسی کے گلے کے موتیوں کا ہار ٹوٹ پڑا ہے جس کے دانے سمیٹنے مشکل پڑ گئے۔ ان کو دامن یار کی طرح سمیٹنا ضرور ہے کہ یہ مختصر اور مختلف خیال معمولی مضمون سے بڑھ گئے ۔

اللہ رے بیخودی کہ خبر ہی نہیں ہمیں
سو بار شورِ حشر برابر نکل گیا۔

اس میں میرا قصور نہیں۔ یہ خوبی اپنی زبان کی ہے کہ جو بات ذہن میں آئی دامان خیال یار کی طرح اُس کا چھوڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔

صاف ہوتا ہے غبارِ پس محمل کا گماں
اب بھی اٹھتے ہیں بگولے جو بیابانوں میں

یہ بات آپ اور کسی زبان میں نہ دیکھئے گا کہ جو بات منہ سے نکلتی ہے جی چاہتا ہے کہ شب وصل کی طرح ختم نہ ہو ؎

رہا تھا کچھ دنوں دل میں کسی کی زلف کا سودا
فسانہ ہے پری خانوں میں اس خوابِ پریشاں کا

اس مضمون میں، میں نے زبان فرنچ کے خوش بیانوں کی طرز اختیار کی، جو روزمرہ کی معمولی باتیں بڑی نزاکت سے بیان کرتے ہیں۔ میں نے چاہا کہ دیکھوں اردو میں یہ انداز بیان کیسا رہتا ہے۔ آپ ملاحظہ فرمالیں کہ ہر زبان کی خوبیاں ہماری زبان میں کس خوبصورتی سے نظر آتی ہیں ؎

پھاڑ کر دامن مرا وہ ناز سے کہنے لگے
دستِ یوسف دیکھئے دستِ زلیخا ہو گیا

اصلاحِ عام۔ اپریل ۱۹۱۱ء

ہم اور ہماری ہستی

دنیا میں ہم نے سب سے زیادہ اپنی ہستی کو بے ثبات سمجھ رکھا ہے کہ ہم کیا اور ہماری ہستی کیا۔ صوفیائے کرام میں سے کسی بزرگ نے اپنے ملفوظات میں اس دارِ فانی کی مثال یوں لکھی ہے کہ اہلِ دُنیا قصاب کے گلے کی طرح ہیں جو ایک جگہ باڑے میں بند ہوں اور دو چار بھیڑیں روز سب کے سامنے ذبح ہوں، باقی دیکھا کریں ؎

تا دریں گلّہ گوسپندے ہست
نہ نشیند اجل ز قصابی

لیکن میری دانست میں یہ ضرور نہیں کہ ہم اپنی ہستی کو اس قدر ہیچ سمجھیں کہ موت کے خیال میں زندگی سے غافل ہو جائیں۔ عالم اسباب کے بڑے بڑے کارخانے اور دُنیا میں سارے نام و نمود کے سامان سب اسی ہستیٔ بے ثبات کے کارنامے ہیں کسبِ کمال، علوم و فنون کی ترقی عالی حوصلگی، حصولِ دولت جاہ و منزلت یہ فکر کہ ہم آئے ہیں تو کچھ کر کے جائیں۔ قصرِ عالی شان دلفزا باغ و نہریں اور ہزار عیش آرام کے سامان یہ سب اسی زندگیٔ بے اعتبار کے مہیا کئے ہوئے ہیں۔ اپنی ہستی کی بے ثباتی سے ہمیں اپنی زندگی کا شوق اور بھی زیادہ ہونا چاہیے کہ دمِ رخصتِ یار کا

خیال زیادہ ہوتا ہے۔ جب یہ معلوم ہو کہ صبح کو وداع جاناں ہے تو جوں جوں صبح کے آثار نظر آتے ہیں۔ وفورِ محبت میں بے تابی بڑھتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس تھوڑی سی فرصت میں جانے کیا کیا کر لینا چاہیے ؎

نہ سوئیں کہہ رہا ہے شوق جی کا　　زمانہ کم رہا اب زندگی کا
سحر کو وہ کہاں اور پھر کہاں ہم　　غنیمت ہے یہ اتنی عمر باہم

کسی حسین کے قابو میں لانے کا لطف اس وقت زیادہ ہوتا ہے جبکہ معلوم ہو کہ قابو سے نکلی جاتی ہے جو عورت قابو میں ہو اس کا خیال کم ہوتا ہے۔ خدا نے جو ہمیں پیدا کیا ہے تو اس کی مرضی خود بخود ہمارے ذہن میں یہ آنی چاہیئے کہ عدم سے نکال کر جو ہمیں ہستی میں لایا ہے تو اب ہم اپنی ہستی کے خلاف کوئی بات نہ ہونے دیں۔ آئیں تو ہم دنیا میں اور فکر میں رہیں یہاں سے جانے کی! اپنے خالق کی مرضی پر چلنے کی تدبیروں میں داخل نہیں۔ اہلِ باطن کی روزمرہ میں جو اپنی ہستی کا مٹانا اچھا سمجھا جاتا ہے اس سے دراصل زندگی بڑھتی ہے کہ نفس کے مارنے سے انسان کی ہستی کو نقصان نہیں ہوتا۔ ثبوت کے لئے دیکھ لیجئے کہ درویشوں اور فقیروں کی عمر زیادہ ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے موت سے پہلے جان دینی ہر مذہب میں ناجائز ہے کہ جو اپنی ہی جان پر کھیل جائے اس کمبخت سے کسی کو نیکی کی کیا اُمید ہو؟

لیکن اِس وقت مجھے عقائدِ مذہبی سے بحث نہیں، یہ دکھانا منظور ہے کہ ہماری ہستی کیسی ہی بے ثبات کیوں نہ ہو اس کی بے قدری اچھی نہیں۔ ہم اپنی زندگی خوردبین (مائی کروسکوپ) سے نہ دیکھیں۔ نگاہِ شوق سے دیکھیں۔ گلاب کے پھول کو آپ خوردبین سے دیکھنے بیٹھئے تو جو پتی حسن و خوبی میں لبِ یار سے زیادہ نازک نظر آتی تھی۔ خوردبین سے ہاتھی کے کان اور ٹوٹے چھاج کے برابر دکھائی دے گی۔ وہ ہلکی سُرخی گندے پانی سے زیادہ کریہہ معلوم ہوگی، پتیوں کی نرمی پُرانے کمبخت کے

چمڑے سے بدتر نظر آئے گی کسی پری وش کے خط وخال آپ آتشی شیشے سے دیکھئے تو ساری خوبی کا خون ہو جائے گا۔ اسی طرح زندگی کو بھی آپ ذلت کی نگاہ سے دیکھئے تو بری معلوم ہوگی۔ اگر در اصل ہماری ہستی اچھی نہیں تو کوئی چیز برا سمجھنے سے اچھی نہیں ہو جائے گی۔ آپ نے دیکھا کہ بے وقوف کو بے وقوف کہنے سے عقل نہیں آجاتی۔ بلکہ کسی بے وقوف کو سمجھانا ہو تو میں نے دیکھا ہے کہ پہلے اس کی عقل کی تعریف کرتے ہیں کہ "آپ تو خود سمجھدار ہیں۔ آپ کو سمجھانا لقمان کو حکمت سکھانی ہے"۔ دستور ہے کہ جس چیز کو آپ جیسا سمجھیں گے، ویسی ہی اُمید آپ اس سے اپنے واسطے رکھئے اپنی ہستی کے فنا ہونے کا خیال انسان کو کتنا ہی سمجھایئے، ناگوار معلوم ہوتا ہے اور گو عقل لاکھ دلیلیں پیش کرے سب بے کار جاتی ہیں۔ سبب یہ کہ عقل کو خواہش سے ضد ہے۔ خواہش کا گھر دل میں ہے۔ جہاں عقل کو دخل نہیں۔ انسان جب اپنے دل کے کہنے پر چلتا ہے تو قدم جلدی اُٹھتے ہیں عقل کے سہارے سے قدم اُٹھاتے میں پاؤں لڑکھڑاتے ہیں۔ انسان عقل سے اُسی بات میں خوش ہوتا ہے جبکہ عقل ہمیں ہمارے مطلب کی سمجھائے۔ ورنہ عقل کی بہت نہیں چلنے پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے مُفید مطلب مہمل سے مہمل بات بھی ہم جلدی مان لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ عقائد میں بعید از قیاس باتیں ماننے کے لئے صرف ارادہ چاہیئے، عقل کی ضرورت نہیں کسی عقیدے کے ماننے والے اس عقیدے سے انکار کرنے والوں سے عقل میں کم نہیں ہوتے۔ ہماری آرزوؤں کے پورے کرنے میں اگر عقل کام آئے تو عقل کا لُطف ہے ورنہ بیکار ہے۔ یہ ضرور نہیں کہ انسان کی عام خواہشیں بُری ہی ہوں عقل میں تمام خوبیاں ہی خوبیاں ہوں اور دل میں بُرائیاں ہی بُرائیاں بھری ہوں۔ میری سمجھ سے باہر ہے۔ انسان کو جہاں خط وخال وحسن صورت کی خوبیاں عطا ہوئی ہیں، وہاں دل ودماغ کی خوبیاں بھی ملی ہیں۔ جس خدا نے ہمیں عقل دی۔ ہمارے دل میں نیکی کی خواہش بھی دی ہے۔

خدا نے ہمارے دلوں میں نرم دلی، محبت، رحم، انصاف، آدمیت کی صفتیں پیدا کر دی ہیں، ان سے زیادہ نیکیاں اور کیا ہوں گی۔ انسان کو خدا نے جیسا پیدا کر دیا اگر اُسی طرح زندگی بسر کرے تو کسی طرح کا کھٹکا نہیں ہو سکتا۔ اس کے خلاف تکلیف ہے۔ کھانے سے نفرت تندرستی کے خلاف ہے اور بھوک کا لگنا بیماری نہیں۔ تھک جائے تو سستا لینا اچھا ہے اور نیند آئے تو سو جانا مناسب ہے، جو جسم کا حال ہے وہی رُوح کا سمجھئے تو دردِ سر نہ ہو کر دونوں کا ساتھ اچھا ہے۔ اکیلے نہ اُسے چین ہے نہ اسے۔ یہ ضرور نہیں کہ جسم کی تکلیف سے رُوح کو آرام ملے، دل میں درد ہو اور دماغ کو چین۔

یہ تو ممکن ہی نہیں دل جلے اور جان بچے
صاحبِ خانہ پہ ہو آفت و مہمان بچے

ہم اپنے تئیں بُرا سمجھنے سے بھلے نہیں ہو سکتے، اپنے تئیں ڈراتے ڈراتے ہم نے نیکی کو ہوا بنا لیا کہ اس کے نام سے طبیعت اُلجھنے لگی۔ کوئی فعل کیسا ہی اچھا کیوں نہ ہو۔ اگر ناممکن ہے تو اُسے نیک سمجھنا نہ سمجھنا برابر ہے اور ایسی نیکی جو انسان کی طاقت سے باہر ہو۔ اس کا نہ کرنے والا خداوند عالم کی نگاہ میں گنہگار نہیں ہو سکتا۔ انسان کے لئے جس طرح شب و روز کا عیش اچھا نہیں۔ رات دن کا رونا بھی بُرا ہے۔

دنیا میں جسے کچھ کر کے جانا ہے۔ مرنے کا نام نہ لے۔ انسان اپنے پاؤں سے قبرستان نہیں جا سکتا، اور لوگ مرنے کے بعد لے جاتے ہیں، اہلِ یونان و روم میں موت کا خیال بہت کم تھا۔ توریت میں مرنے کے بعد کا ذکر ہی نہیں کہ کیا ہوگا، انجیل میں بھی بہت مفصل نہیں — قدیم زمانے میں اہلِ مصر اپنے بزرگوں کی لاشوں کی بہت احتیاط کرتے تھے کہ ہزاروں برس باقی رہیں۔ دُنیا میں یادگاروں کے بنانے سے یہی

غرض ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہمیں ہماری ہستی سے واسطہ رہے۔

حکمائے یونان کا قول ہے کہ رات دن موت کا کھٹکا انسان کو کسی کام کا نہیں رکھتا انسان جب تک دنیا میں ہے۔ دُنیا کی بہتری میں رہے۔ اس کے بعد جو مرضی خدا کی! انسان کو اپنی موت کی فکر بے کار ہے کہ ایک ہچکی میں کام تمام ہوتا ہے ایک پشے سے نمرود کا دم ناک میں آگیا تھا۔ شداد کا ایک پاؤں دہلیز کے باہر ایک اندر تھا کہ جان نکل گئی۔ چیل کچھوے کو پنجے میں پکڑے لئے آسمان پر اڑی جاتی تھی کہ فرمانروایان قدیم میں سے ایک کا ذکر ہے جو گھوڑے پر سوار جا رہا تھا۔ کچھوے کو بھی اسی وقت چیل کے پنجے سے چھوٹنا تھا کہ عین بادشاہ کے سر پر گرا۔ اور پاش پاش کر دیا۔

ہلاکو کی عادت تھی کہ سامنے کھڑے ہو کر صفیں کی صفیں قتل کرواتا تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ تین چار صفیں اسیران گردن زدنی کی جمع تھیں اور جلاد صفِ اول میں سرے سے گردن مارتا چلا آتا تھا۔ گرفتارانِ بلا کے صفِ اول میں سے ایک بوڑھا نکل کر دوسری صف میں جا چھپا۔ ہلاکو گھوڑے پر سوار مقتل کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لیموں تھا، جس کو کھیل کے طور پر اوپر اُچھالتا اور ہاتھ میں لپکتا تھا۔ ہلاکو اس بوڑھے کو دیکھتا رہا کہ پہلی صف سے دوسری صف میں جا کر چھپا ہے۔ جلاد جب دوسری صف کے سرے پر پہنچا، صف تھی بڑی، بوڑھا صف کے آخر میں جا چھپا۔ اس پر ہلاکو کو ہنسی آئی کہ اس بوڑھے کو اپنی زندگی کیسی عزیز ہو رہی ہے۔ کہ گھنٹے دو گھنٹے کے وقفے کے لئے جان چھپاتا پھرتا ہے حالاں کہ اس کے سامنے کتنے مارے جا چکے۔ بوڑھا جب آخری صف میں پہنچا تو ہلاکو نے ہنس کر پوچھا کہ احمق اب کہاں تک بھاگے گا۔ بوڑھے نے جواب دیا جب تک لیموں اوپر سے نیچے آئے زمانہ جانے کتنی کروٹیں بدلے، یہ کہہ کر بوڑھا صف کے آخر میں جا کھڑا ہوا۔ اس پر ہلاکو بہت ہنسا اور ہنسی میں دھیان جو بٹا تو لیموں

ہاتھ سے اچھل گیا اُسے لینے کیلئے ہاتھ بڑھایا تو ایک پاؤں رکاب سے نکل گیا۔ ہلاکو زمین پر گرا۔ مگر دوسرا پاؤں رکاب میں اٹکا رہ گیا۔ گھوڑا لے کر بھاگا۔ ہلاکو کا سر پھٹ گیا۔ قتل گاہ میں بھاگڑ پڑ گئی۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ بڑے میاں کو کسی نے نہ پوچھا کہ کہاں ہیں۔ یہ بھاگ کر اپنے گھر سلامت آ گئے۔

جب لاکھ سر گردنوں سے جدا ہو جاتے تو چنگیز خاں کا دستور تھا کہ سروں کا مینار بنوا تا اور شاہان مفتوح میں سے سب سے نامور کا سر چوٹی پر رکھا جاتا۔ میر جلاد نے جو بڑے مرتبے کا آدمی تھا ایک دن اطلاع کی کہ سرِ مینار پر کس کے سر کا حکم ہے۔ چنگیز خاں نہ جانے کس خیال میں تھا۔ جواب دیا۔ "سرِ تو" جس نے لاکھوں کے سر کاٹے تھے، دم بھر میں اُسی کا سر کاٹ کر رکھ دیا گیا۔

انسان کو اپنی ہستی کا جبکہ اعتبار نہیں تو اور بھی اپنی زندگی کو عزیز سمجھے اور اسے بیکار نہ جانے دے۔ دنیا میں جو کچھ علم و کمال و ترقی و اقبال کے سامان نظر آرہے ہیں اپنی زندگی کو ہیچ نہ سمجھنے سے میسّر ہوئے۔

انسان کے لئے زندگی عجیب نعمت ہے۔

(صلائے عام۔ اپریل ۱۹۱۰ء)

شاہان اسلام، ازروئے علم وفضل

دم از سیر ایں دیرِ دیرینہ زن

صلائے بہ شاہانِ پیشینہ زن

میں نے دیکھا ہے کہ دنیا کی تاریخ سویلیزیشن یعنی ترقی تہذیب و علوم وفنون میں اکثر قوموں کی رعایا اور متوسط الحال لوگ زیادہ تعلیم یافتہ ہوئے۔ لیکن ہر قوم کے امرا اور سلاطین نے کثرت عیش اور دولت وجاہ کی وجہ سے تحصیل علم وکمال کی طرف بہت کم توجہ کی۔ قدیم مصریوں، یونانیوں اور رومیوں میں جو علوم وفنون کی ترقی تھی ان میں بادشاہ اور امرا بہت کم عالم فاضل تھے برخلاف اسکے سلاطین اسلام میں بادشاہ اور امرا علم وفضل میں بھی بڑے بڑے ذی کمال ہوئے ہیں، خلافت قرطبہ اور بنی عباسیہ میں اکثر خلفاء اسلام علم وفضل میں ایسے نامور ہوئے جن کے کمالات علمی تمام عالم میں مانے جاتے ہیں۔ ان کی تفصیل میں جان بوجھ کر نہیں لکھتا۔ ان کا حال مفصل لکھا جائے تو ایک کتب خانہ علیحدہ تیار ہو جائے گا۔ علاوہ اس کے دور کا حال لکھنا منظور بھی نہیں ہے۔ اخیر عہد مغلیہ میں دیکھئے کہ تیمور اور بابر سے لے کر بہادر شاہ تک کوئی علم وفضل سے عاری نہ تھا۔ تزک تیموری اور بابر نامہ کو جو بجائے خود اچھے کارنامے ہیں جانے دیجئے۔ ہمایوں بادشاہ کو دیکھئے کہ باوجود انقلاب ملک و

سلطنت سے کہ سلطنت تو شیر شاہ کی ہوگئی اور ہندوستان سے جلاوطنی نصیب ہوئی، بادشاہ کو علم ریاضی کا بڑا شوق رہا اور علم ہیئت و نجوم میں اس قدر توغل رہا کہ اخیر کام جس کی وجہ سے جان گئی اسی علم کے متعلق سمجھا جاتا ہے یعنی زہرہ ستارے کا نکلنا دیکھنے کے لئے کتب خانے کی چھت پر چڑھے اور وہاں سے زینے پر سے اترتے تھے کہ پیر کو لغزش ہوئی گویا علم کے لئے جان گئی۔ ہمایوں شعر بھی اچھا کہتے تھے، ان کے کلام میں سے یہ رباعیاں یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

اے دل مکن اضطراب در پیش رقیب — حالِ دل خود مگوئے باہیچ طبیب
کارے کہ ترا بہ آں جفا کار افتاد — پس قصہ مشکل است بس امیر غریب

اے آنکہ جفائے تو بعالم علم است — روزے کہ ستم نہ بینم از تو ستم است
ہر غم کہ رسید از ستم چرخِ بدل — مارا چو غم عشق تو باشد چہ غم است

اکبر گو خود لکھا پڑھا نہ تھا لیکن بڑے بڑے عالموں اور فاضلوں کو اپنے قبضے میں رکھتا۔ ایک طرف عقائد مذہبی کی بحث تھی تو دوسری طرف شعر و سخن کی آج دینی مسائل کا ذکر تو کل دنیوی۔ اس میں شک نہیں کہ حکام انگریزی نے اصول حکمرانی کو اس قدر کمال کو پہنچا دیا ہے کہ اس وقت رموز مملکت کو ایک بڑا پاکیزہ فن کہنا چاہیے جو کسی سلطنت کو نصیب نہ ہوا۔ ہر صیغے اور ہر محکمے کی علیحدہ علیحدہ لٹریچر اور ہر سال بڑی بڑی معلومات کی کتابیں نکلتی ہیں۔ اس سلطنت کے کمالِ حکمرانی سے اگر کوئی چیز لگا کھا سکتی ہے تو وہ آئین اکبری ہے جس میں ہر صیغے کے آئین بڑی خوبی سے قلم بند ہیں۔

جہانگیر گو عیش دوست تھا مگر علم کی طرف سے غافل نہیں رہا۔ فرہنگ جہانگیری

اس بات کی گواہ ہے کہ جہانگیر کو ترکی زبان میں بڑی مہارت تھی، یورپ کی تعلیم میں ڈائری یا روزنامچہ لکھنا علمی شغلوں میں بہت پاکیزہ سمجھا جاتا ہے، تزک جہانگیری کے سامنے کسی ڈائری یا روزنامچے کا ذکر بیکار ہے۔

جہانگیر کو فائن آرٹس یعنی فنون لطیفہ میں بہت بڑا دخل تھا اور شطرنج میں بھی کمال رکھتا تھا اپنے عہد میں اس نے بڑے بڑے صاحب کمال جمع کئے۔ مسیح پانی پتی نے فارسی میں رامائن جہانگیر کے عہد میں لکھی جس کا جواب نہیں کہتا ہے ؎

به پیش ما چه گیری عشق را نام
پیمبر را مده تعلیم اسلام
باب پاک گنگ اوّل زباں شو
پس انگه سرگزشتِ رام بر گو
به صندل جبه سالم ہمچو مرداں
کنم زنّار خود از رشتۂ جاں
دمے خالی کنی خاطر گر از غیر
دو صد کعبه به بینی اندریں دیر

شاہجہاں کے علم و فضل کا کیا کہنا؟ مصیبت کے دنوں میں عالمگیر کو غصہ و رنج میں لکھتے ہیں۔

کلیدِ فتح اقالیم در خزائن اوست — کسے بقوّت بازوئے خویش نکشاد است
گر اہلِ معرفتی دل بآخرت بندی — نہ در خزائن دنیا کہ محنت آباد است
جہاں بر آب نہاد است و عاقلاں دانند — کہ روئے آب نہ جائے قرار بنیاد است

اعلیٰ حضرت کا خط اورنگ زیب کے نام ہے کہ

بابائے من بہادر من سے

من چرا گریہ کنم از سبب سستی بخت | کہ بجز امر خدا برگ نہ جنبد ز درخت

سبحان اللہ دیروز مالک نہ لک سوار بودم امروز بیک کوزہ آب محتاجی ہے

آفریں بر ہنود در ہر باب | مردہ را امید منہد ہر دم آب

اے پسر تو عجب مسلمانی | زندہ جاں را باب ترسانی

اے خلف از راہ مخالف بتاب | تیغ بیفگن کہ منم آفتاب

گر ز خود ایں نقش گرفتی بدست | سوئے خدا بیں ومشو خود پرست

ور ز بد آموز شد ایں رہ پدید | گفتۂ بد آموز نباید شنید

گرچہ کنی دعوی دانش ولیک | نیک بدانم کہ ندانی تو نیک

چوں تو شب و روز ادب افزوں کنی | بی ادبی با چو منی چوں کنی

گرچہ جوانی ہمہ فرزانگی است | ایں نہ جوانی است کہ دیوانگی است

اے پسر ار چہ بسری درخوری | لیک مکن باید راں سر دری

بر سرِ خواں آئی کہ ہم توشۂ | باد نمک کن کہ جگر گوشۂ

خونِ منی و دل من مہر جوست | جوششِ بسیار کن زیر پوست

پیش کہ گویم زخودت شرم باد | گرد پئے خُونِ خودم اندر فساد

بندہ کہ پاشاہ بود کنیہ جُو | خلق چہ گویند تو ہم خود بگو

ور ز تو در قلبِ من آمد غبار | ہم تو شوی در رخِ خوشتر بہار

باش بکامم کہ بکامِ تو ام | زندہ و نا زندہ بنامِ توام

مہر خدا صورت خویشم نما | روئی مگردان و بترس از خدا

یہاں اس سے گفتگو نہیں کہ بھائیوں سے لڑائی میں اورنگ زیب کا قصور تھا یا بھائیوں کا۔ مگر دارا کی لیاقت علمی اور فلاسفی میں کلام نہیں، دنیا میں جب تک

اچھے شعر کہتے تھے۔ ان کے اخیر وقت کے شعر ہیں ؎

کر رحم غریبی پہ مری گردشِ ایام — بد عہدیٔ دوراں نہ کر اتنا مجھے بدنام
برگشتگیٔ بخت نہ رکھ اتنا تو ناکام — اے شومیٔ طالع نہ کر اتنا مجھے بدنام
بے مہریٔ جاناں تو مرے ساتھ وفا کر — اے نالۂ شبگیر مرے حق میں دعا کر
اے رنج تو ہی دل کی مسرت کا سبب ہو — حرماں تو ہی دافع اقسام لقب ہو
اے گردِ رہِ یار تو آنکھوں کو ضیا دے — طوفاں مری کشتی کو کنارے سے لگا دے
اے دستِ جنوں میرے گریباں سے خبردار — اے خارِ مغیلاں مرے داماں سے خبردار
رنجیدگیٔ یار عنایت کی یہ جا ہے — کر عفو گناہوں کو مرا حال برا ہے

ان بادشاہوں کے کلام سے میری غرض یہ ہے کہ ان کی علمی لیاقت کا حال معلوم ہو۔ اس وقت کے نوّاب اور امرا و روسا بھی بڑی لیاقت کے ہوئے ہیں جن کا حال کوئی صاحب لکھیں تو از روئے علم و فضل مسلمانوں کی عزت کا اچھا سامان جمع ہو جائے۔

(صلائے عام۔ نومبر ۱۹۱۰ء)

حکایت ہستی و عدم

خواہاں ہوں بوئے باغ تنزّہ شمیم کا
یارب ادھر بھی بھیج دے جھونکا نسیم کا

کہتے ہیں کہ ارواح عالم ابھی خواب عدم میں تھیں کہ گلشن ہستی میں پہلے نسیم سحر کو جنبش ہوئی۔ گویا یار کی خرامِ ناز تھی۔ جس نے خفتگانِ عدم کو جگا دیا۔ سر اٹھا کر دیکھا تو اک عالم محوِ تماشا نظر آیا۔ جس کے دیکھنے کو آفتاب ننگے سر نکل آیا۔ اِدھر برگِ درختانِ سبز تالیاں بجانے لگے اُدھر مرغانِ خوش الحان نغمہ سرائیاں کرنے لگے۔ آواز آئی کہ خلقِ خدا نخلِ ہستی کے سائے میں جمع ہو قسامِ ازل کو نعمہائے الٰہی تقسیم کرنے ہیں۔ یہ سن کر سب دوڑے۔ مرغانِ ہوا میں "ھُما" اتفاق سے اُس وقت اُدھر سے گزرا۔ جس کا سایہ جس خوش نصیب پر پڑ گیا وہ اُسی دن سے ملک و مال کا مالک سمجھا گیا، یہ عطائے دولت تھی۔

کوئی مستِ خرامِ ناز لب جُو نکلا اور اپنی ج[illegible] حُسن و جمال کو دیکھ کر آئینہ ساں حیران رہ گیا۔ اس کو "غرورِ حسن" ملا۔ مردانِ جنگ آزما [illegible] ار ملی۔ اہل علم کو لوحِ محفوظ کی نقل! محتاج سے کہا گیا کہ کاسۂ گدائی لے لے۔

تیرے گدا کو سلطنت جم سے کیا کہ ذوق
ہے کاسۂ شکستہ میں جامِ دو نیم کا

اتنے میں گردشِ روزگار کی طرف سے ایک ناوکِ بلا تمام جم غفیر کو چیرتا ہوا اس طرح سَن سے نکل گیا کہ سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ کسی نے یہ نہ جانا کہ کس نے چلایا اور کہاں سے چلا اور کیوں چلا، خداوندانِ دولت وجاہ جو ظلِ ہُما کے نیچے آ چکے تھے سمجھے کہ ہم اس فکر میں کیوں پڑیں۔ حسینانِ جہاں کو جو لب جُو اپنا حسنِ جمال دیکھنے میں محو تھے، خبر نہ ہوئی "غرورِ حسن" نے اُن کے کان میں کہدیا کہ جب تک حسنِ جوانی ہے، ستم ہائے روزگار کا خوف کسے دولت نے کہا کہ جب تک میری جان میں جان ہے قربان حسن وجمال ہے۔ اہل علم چُپ ہو رہے کہ اُن کی سمجھ سے باہر بات تھی، مردانِ نبرد آزمائے کہا کہ ہم اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں۔ ہم ناوک بلا سے کیا ڈریں۔ بلاکشانِ محبت بولے کہ ع

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

ان چہ میگوئیوں پر مشیت ایزدی نے کہا کہ

"غافلو ستمہائے روزگار سے کوئی بچ نہیں سکتا"

کہتے ہیں کہ یہ سن کر ارواح عالم نے اجسام سے تعلق پیدا کرنے میں تامّل کیا مگر ہوائے نفسانی نے دونوں کو غافل کر دیا۔ اس غفلت میں روح کو معصیت نے اور جسم کو موت نے گھیر لیا۔ اس تعلق کا نام زندگانی ہے۔ جس کو بُری سمجھئے یا بھلی! آپ کہیں گے کہ یہ اچھی کہانی گھڑ رہا ہے۔ واقعی جو بات انسان کے علم سے باہر ہو، وہ گھڑنی ہی پڑتی ہے ؎

روداد میں ہیں شیفتہ کے مختلف اقوال
پوچھیں گے وہاں سے جو کوئی معتبر آیا

انسان کو اپنی زندگی سے پہلے کا حال معلوم نہیں۔ زندگی کے بعد کا حال اس شدّ و مدّ سے ہزار طور سے جو بیان ہو رہا ہے تو اپنی اپنی وضع کے لوگوں کو ایمان لانے کے سوا چارہ نظر نہیں آتا۔ اس میں حضرتِ شیفتہ نے خوب کہا ہے ؎

اب جستجو ہے اُن کو ہماری تو کیا حصول
باقی نہیں اثر بھی عظامِ رمیم کا

لیکن ان دونوں یعنی زندگی سے پہلے اور زندگی کے بعد کی باتوں کو جانے دیجئے۔ زندگی کا حال جا بجا سے سُن لیجئے۔

میں نے کتابوں میں پڑھا ہے (میری اُپ کی گھڑی ہوئی نہیں۔ الہامی ہیں) کہ شروع میں باغِ جہاں میں سے انسان کو ہر چیز مفت ملتی رہی کہ جس چیز کو جی چاہے لے لے۔ یہ حال تھا کہ اُدھر آرزو دل میں پیدا ہوئی نہیں اُدھر پوری ہوئی نہیں۔ پھر سُنا کہ انسان وہاں سے نکالا گیا اور نکال دینا ہی بس نہ سمجھا گیا۔ باہر نکال کر حکم ہوا کہ کوئی چیز اسے بے دردِ سر نہ ملے۔ ہر چیز کی قیمت اور ہر کام کے لئے محنت شرط ہوئی درختوں سے پھل مانگا تو انکار ہو گیا۔ پانی کے لئے رسّی ڈور کی ضرورت ہوئی۔ جلانے کے لئے لکڑی مول لینی پڑی۔ اور اسی پر قناعت نہیں کی گئی ہزار دردِ سر کے بعد بھی ساری آرزوئیں پوری نہ ہونے پائیں اور جنہیں ہم پوری سمجھے وہ بھی بیکار نکلیں ؎

کس طرح مان لیں ہم تنگیٔ دل کا شکوہ
آرزو۔ تو دلِ ویراں میں کبھی آئی بھی

ہماری زندگی "زالِ دنیا" نامی ایک عیارِ جفاکار کے سُپرد کی گئی جو محبت و وفا کے نام سے واقف نہیں دنیا بُری بھلی جیسی تھی ماسی سے ہم نے جی لگا رکھا تھا۔ یہ بھی چُھٹنے والی ہے ؎

اب کہتے ہیں کہ باغِ جہاں بے ثبات ہے
اپنی جو اس چمن میں طبیعت ذرا لگی

ایک دن میں نے زالِ دنیا سے پوچھا کہ تو کسی سے وفا نہیں کرتی تیرے وعدے سب جھوٹے نکلتے ہیں۔ جواب دیا کہ تم میری باتوں کا یقین ہی کیوں کرتے ہو، مجھے جھوٹا جانتے ہو اور پھر میری باتیں مانتے ہو۔ یہ تمہاری عقل کی خوبی ہے ؎

وعدہ کس شخص کا اور وہ بھی نہایت کچّا
تم بھی کیا خوب ہو سچ مچ تمہیں باور آیا

تمہاری بے وقوفی ہے کہ دینے اور دے ڈالنے میں فرق نہیں سمجھتے۔ دینا۔ اُدھار دینا۔ مانگے کو دینا عاریتاً دینا یہ سب دینا نہیں اور کیا ہے، دے ڈالنا اور بات ہے۔ اس میں وفا اور بیوفائی کا کیا ذکر؎

معشوقہ بے ہنر ہے جو بیداد گر نہ ہو

یہ کیا تھوڑا ہے کہ بغیر مانگے دو گز کفن تجھ کو دلوا دیتی ہوں۔ سو بھی دُزدِ کفن کی خاطر سے "

میں نے کہا کہ کم بخت رونا تو یہی ہے کہ تو اپنے چاہنے والوں کو جیتا نہیں چھوڑتی۔

دنیا نے جواب دیا کہ پھر غلطی کی۔ میں کسی کو نہیں مارتی مارنا موت کا کام ہے میں انسان کو برباد کر دیتی ہوں۔

مر ہی جاتا دل پہ درد تو رونا کیا تھا
چوٹ ظالم نے قرینے کی کبھی کھائی بھی

اس پر موت نے کہا کہ ایسی میں اگر نہ ہوتی تو انسان کی حماقتوں کا علاج کون کرتا۔ بُرے وقت میں میں ہی آڑے ہوتی ہوں "قاضی کے پیادے" کی طرح عدالت کے لئے

جلّاد بھی ضرور ہے سائے کی طرح میں ہر چیز کے ساتھ ہوں ہستی سے پہلے میرا وجود تھا اور ہستی کے بعد رہے گا۔

النوم اَخ الموت

میری بہن کو تو تم جانتے ہو نیند کے نام سے مشہور ہے رات کو غافل ہو کر پڑ رہنا اور صبح کو جاگ اٹھنا رات دن کا مرنا جینا ہے۔ یہی ہستی اور عدم کا نمونہ ہے آپ نے دیکھا ہو گا کہ بچوں کو کہانیوں سے نیند آجاتی ہے۔ دنیا کے افسانے سنتے سنتے آخر کو انسان کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں جس کو نیند سمجھئے۔ یہ نیچر کی طرف سے دارو ئے بیہوشی ہے ؎

جو رہِ اجل کو شوخیٔ بیجا کہا کیا
تھا محو شیفتہ جو کسی منّتِ ناز کا

موت کو ہم اس حال میں برا سمجھیں جبکہ موت سے آگے کی اُمید نہ ہو ؎

ضربِ دیوار، جنوں سر کو رکھے گا کب تک
تجھکو کرنی ہے ابھی بادیہ پیمائی بھی

نیند میں سو جانے کے بعد جو صبح کو آنکھ کھُلی تو اس میں کیا تکلیف۔ ہم نہیں جانتے کہ عدم سے آگے ہم اور کہاں جا سکتے ہیں۔ ؎

عدم سے آگے جانے کا کہاں تیرا ارادہ ہے
کہاں تک ہو گا اے گیسو ترا زیرِ کمر جانا

ہمارا فنا ہونا محفلِ بقا کے لئے مشعل سمجھئے۔ باغ سے بہار کا قیاس کر لیجئے کہ جب اسبابِ فنا کا یہ حال ہے تو عالمِ بقا کی کچھ نہ پوچھئے ؎

ہم نے کئے قواعدِ وحشت جو منضبط　　اہلِ جنوں میں ہم کو لقب ہے حکیم کا

مضمون پریشاں

حسین عورتیں جب نیکی پسند کرتی ہیں تو پھر انہیں کوئی چیز پسند نہیں آتی۔ نہ کالا دیکھتی ہیں نہ گورا نہ جوان دیکھتی ہیں نہ بوڑھا۔ مگر تب تک اُن کی عمر زیادہ ہو جاتی ہے۔

شاہدانِ بازاری کی معراج یہ ہے کہ کسی سے نکاح پڑھالیں۔ اور جب نکاح پڑھالیا تو پھر تقویٰ و پرہیزگاری کی اس قدر پابندی کرتی ہیں کہ اس سے زیادہ بہو بیٹیوں سے بھی نہ ہو سکے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ از روئے فطرت بدی سے زیادہ نیکی کا اثر انسان کی طبیعت میں پروردگار کی طرف سے ودیعت ہے۔ آپ کو اختیار ہے اس سے کام لیں یا نہ لیں۔

عورت جب کسی سے بیزار ہوتی ہے تو اس کا خیال لوحِ دل سے اس طرح مٹا دیتی ہے جس طرح مکتب کے لڑکے پہلی لکھی ہوئی تختی کو دوبارہ لکھنے سے پہلے دھو ڈالتے ہیں کہ

ع ان تلوں تیل ہی نہ تھا گویا

برخلاف اس کے مرد کی بیزاری ایسی ہے جس طرح آج کل کے سرکاری حساب کتاب کے اعداد جن کے چھیلنے کا حکم نہیں ہے صرف سُرخی سے قلمزد کر دیے جاتے ہیں کہ پچھلی غلطیاں نظر سے اوجھل نہیں ہوتیں۔

دنیا میں نیکی سے غرض خوشی ہرگز نہیں۔ نیکی کا نتیجہ اگر خوشی نکل آئے تو امرِ اتفاقیہ ہے۔ مگر یہ بات اُس وقت ذہن میں آتی ہے جبکہ اس کا آنا نہ آنا یکساں ہو جاتا ہے۔ یعنی جبکہ انسان کا دل زمانے سے اکتا جاتا ہے اور دُنیا کے جھگڑوں سے طبیعت بیزار ہو جاتی ہے اُس وقت دنیا کو اچھا جانا تو کیا بُرا جانا تو کیا — ؟ دنیا سے بیزاری کے دو ہی سبب ہوتے ہیں یا تو میں نے دنیا کو ستایا ہو یا دنیا نے مجھ کو ستایا ہو۔

کہتے ہیں کہ نمرود، فرعون اور شدّاد خُدا کے قائل نہ تھے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ جس قدر اقبال و دولت زیادہ ہو اُسی قدر آرزوئیں بھی زیادہ ہوں گی اور آرزوؤں کے پورا ہونے کے لئے اپنے سے بڑے کا ماننا ضرور ہے کہ کسی طرح آرزوئیں پورا ہونے کا سہارا ملے۔ دہریے ہمیشہ محتاج دیکھے، خداوندانِ دولت وجاہ تو درکنار کسی معمولی خوشحال آدمی کو بھی دہریہ نہیں سُنا۔ سبب یہ کہ جس طرح تندرستی میں انسان کی طبیعت فاسد مادے کو جسم میں ٹھہرنے نہیں دیتی، سوسائٹی بھی دہریہ پن کے عقاید پسند نہیں کرتی۔ دُنیا میں جتنے جرائم پیشہ ہیں ازروئے فلاسفی کسی نہ کسی وضع کے دہریے ہیں۔ گو وہ اپنے تئیں دہریہ نہ جانیں۔ سبب یہ کہ معصیّت اور مصیبت دونوں میں انسان کی طبیعت قابو سے نکل جاتی ہے۔ معصیّت میں خدا کو بھول جاتا ہے۔ اور مصیبت جب نیکی کی وجہ سے آئے عالم اسباب کے نیک ہونے میں شبہ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ گو آپ منہ سے کہیں یا نہ کہیں۔

اگر تمام جہان دہریہ ہو جائے تو بھی عالمِ اسباب کی ضرورتیں انسان کو خدا پرستی

پر مجبور رکھیں گی۔ جس طرح میاں جی لڑکوں پر تاکید رکھتے ہیں کہ سبق سنائے بغیر چھٹی نہیں ملے گی۔

انسان کو دنیا میں نیک نامی کا بہت خیال ہوتا ہے۔ حالانکہ دُنیا تو درکنار، محلے کے آدمیوں میں سے آدھے سے زیادہ کے ناموں سے میں واقف نہیں اور جن سے واقف ہوں ان کی پُشت دو پُشت کی صورت نہیں دیکھی کہ مجھ سے پہلے چل بسے۔ ان نامعلوم لوگوں کے لئے اس قدر دردِ سر کون لے؟

اتنی دو چار گھر کے آدمیوں میں محبت سے رہنا کہ ان کے دلوں میں بیگانگی نہ پیدا ہو، تمام دنیا کو اپنا بنانے کی کوشش کرنے سے اچھا ہے۔ اپنے عزیزوں یگانوں کے دلوں میں جگہ پیدا کرنی امریکہ و جاپان کے لوگوں میں روشناس ہونے سے بہتر ہے۔ انسان سے اپنے ہی گھر کے آدمی اگر خوش رہیں تو غنیمت ہے اور وہ بھی اپنی زندگی تک — باقی اللہ مالک ہے۔

زبان کی تعریف یہ ہے کہ اتنی پاکیزہ ہو کہ سننے والے کو پاکیزہ بننے کا خیال پیدا ہو — یعنی زبان سے مشابہ ہو جائے۔ زُلف کو مشکبو اس لئے کہتے ہیں کہ مشامِ دماغ معطر ہو جائے۔ قدِ یار کو سروِ رواں اس لئے کہتے ہیں کہ اگر ممکن ہوتا تو خرامِ یار کی طرح سرو بھی چلنے لگیں۔

سخاوت کی تعریف میں اس قدر لکھا جائے کہ دولت تو میسر نہ ہوئی مگر دل میں حاتم طائی کا سا حوصلہ پیدا ہو جائے۔ نیکی کی اس قدر تعریف ہو کہ عاقبت کی خبر تو خدا کو ہے مگر ہمارے بہشت نصیب ہونے میں یقین نہیں تو شُبہ بھی نہ رہے۔

دین و دنیا دونوں کی فکر کی نسبت معتبر قول یہ ہے کہ ؏

کہ "نتواں ہر دو دست خویش در یک آستیں کردن" پھر بازی گر کی تمثیل سُنی کہ ایک ہی ہاتھ میں "سندان باختن" مگر سب سے اچھی تمثیل یہ ہے کہ دو ہی بیاں کرنی اور اگر دونوں میں ظاہراگالی گفتار کی نوبت نہ آئے تو عوام میں کوئی عیب نہیں نکالتا۔

بڑھاپے میں خدا دولت دے تو انسان کے نیک ہونے میں بہت کم شُبہ سمجھئے کہ اس عمر میں قوائے نفسانی کمزور ہو جانے سے اپنے نفس پر خرچ کرنے کی بہت ضرورت نہیں رہتی۔ اور دولت سے مراد خرچ ہی ہے۔ لاچار اوروں پر خرچ کی جائے گی جو نیکی میں داخل ہے۔ خیرات میں خرچ ہوئی تو بندگانِ خدا کے ساتھ اور کنبے پر خرچ کی تو گھر والوں کے ساتھ نیکی ہے۔

ہر بات میں آیت وحدیث کی مثال دینی بات بات پر قسم کھانے کی سی عادت سمجھئے۔ بات اگر سچی ہے تو یوں بھی دل میں اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی اور جھوٹی لاکھ دلیلوں سے بھی مشکل سے سمجھ میں آئے گی۔ دوسرے کہنے والا جب قرآن وحدیث کے علم کا بہت اظہار کرتا ہے تو سننے والے کو گویا اپنے علم سے کم علم سمجھتا ہے یا قائل اپنے تئیں سامع سے زیادہ دین دار جانتا ہے۔ یہ افتخارِ بے جا خلافِ اخلاق وآداب ہے۔ آپ مکان پر تخلیہ میں ایک نہیں ہزار آیتیں حفظ پڑھئے یا تلاوت فرمایے میں خوش اور میرا خدا خوش۔ مگر معمولی دنیوی باتوں میں آپ ہر بات پر اگر اپنی دینی علمیّت پر ناز کرتے ہیں تو مجھے نہیں تو مجھ جیسے کم علم لوگوں کو خجالت ہوتی ہے کہ دیکھئے مولوی صاحب نے کس دھڑلے سے قائل کیا۔ حالانکہ میں اس لئے آپ کی برابری نہ کرسکا کہ مجھے قرآن وحدیث کا زیادہ ادب منظور ہے اور میں آپ کی طرح کسی کو اپنے سے کم علم نہیں جانتا، اس کے سوا توریت میں خدائے پاک کا نام بار بار بلالحاظ ادب و تمیز زبان پر لانا بہت منع فرمایا گیا ہے۔ اس کی تعمیل گناہ نہیں۔

صبر و غصّہ و رنج و نا اُمیدی مصیبت کی داد و لوازمات میں سے ہیں۔ وقت پر ان میں امتیاز بہت مشکل ہے۔ صبر کی جگہ غصّہ اور رنج کے ساتھ نا امیدی آجاتی ہے۔

صبر گویا ایک پاکیزہ مزاج آدمی ہے جس کو شور و غل سے نفرت ہے، یہ جس طرف سے نکل جائے کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ غصّہ شکار کے کپڑے پہنے بندوق ہاتھ میں لئے جنگل کی طرف جانے کے عوض گویا گھر میں ٹہل رہا ہے۔ نا اُمیدی دنیا کی طرف سے مُنہ پھیرے چپکی بیٹھی ہے گویا زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ جو کچھ ہوا ہونے دو۔
انسان اگر خدا کو عقل سے سمجھنے لگے تو اس کی تعریف و خوبی بیان کرنے میں شاید کسر نہ کرے جس طرح نیچر کی اکثر قوتوں سے واقف ہو کر ان کی خُوبیاں بیان کرتا ہے مگر اس کے لئے اپنی جان تک عزیز نہ رکھے، یہ عقیدے کے سوا کوئی نہیں سکھا سکتا۔

(صلائے عام ۱۹۱۳ء)

عُمرِ رواں اور عُمرِ جاوِداں

قیامت کا اگر ڈر ہے تو یہ ہے
کہ مَے ہے ہم کو پھر جینا پڑے گا

انسان کی بڑی شکایت یہ ہے کہ عُمرِ جاوداں نصیب نہیں، اس کی تمام عُمر اسی رونے میں کٹتی ہے کہ اس عُمرِ رواں میں کیا کیجئے اور کیا نہ کیجئے۔ عمر کی طرف سے اطمینان ہو تو کیا کچھ نہ کیا جائے۔ دولت جو آج آتی اور کل چلی جاتی ہے۔ فرصت ملے تو اس کو مضبوط پکڑ کر رکھیں۔ کمال جس کی حد نہیں حاصل کریں، اکسیر و کیمیا کے نسخوں کی تلاش کریں کہ جو لوگ تلاش کر گئے، عُمر کے وفا نہ کرنے سے ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ تقدیر و تدبیر کے جھگڑے مٹائیں۔ قیامت کے منکر و معتقد قیامت کا ہونا نہ ہونا قامتِ یار کی طرح اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ دجّال پیدا ہو تو پہچان لیں۔ امام آخرالزماں کا ساتھ دیں مگر کیا کریں۔ عمر وفا نہیں کرتی۔ عاقبت کے بوریے سمیٹنے نصیب نہیں ہوتے۔ خاص کر بڑھاپے کی عمر تو بالکل چلتی پھرتی چھاؤں سمجھی جاتی ہے کہ کسی گنتی و شمار میں نہیں۔ بالوں میں سفیدی نظر آئی اور زندگی بے کار سمجھی گئی چہرے پر جھریاں دکھائی دیں اور لطف زندگی رخصت ہو کر پڑے بالوں میں کسی سے محبت کیجئے یقین نہیں ہونا چاہیے

آپ فرہاد و مجنوں سے زیادہ جان دینے پر آمادہ ہو جائیں۔ نظیر اکبر آبادی نے بڑھاپے میں کسی سے محبت کی تصویر بلا کی کھینچی ہے ؎

سنتا ہوں کہ کہتی ہوئی پنہاری گئی ہے

لو دیکھو بڑھاپے میں یہ مت ماری گئی ہے

قیس کو بیابان میں اور فرہاد کو بستیوں پر وہ تنہائی نہ تھی جو بوڑھے کو بھرے گھر میں ہوتی ہے کہ وہاں ہر وقت خیال یار ساتھ تھا اور یہاں ہر شخص کو بڑھاپے کے خیال سے بیگانگی ہے۔ جوانی میں خود بخود آپ کی طرف نگاہیں اٹھ جاتی تھیں۔ اب کہے سے بھی کوئی مڑ کر نہیں دیکھتا۔ آگے نیم نگاہی جو کام کر جاتی تھی۔ اب عینک لگانے سے بھی وہ بات میسر نہیں۔ جوانی سے جس عورت کا ساتھ رہا اب مجھے گلے کا ہار دکھائی دیتی ہے لڑکا جسے عصائے پیری سمجھ رکھا تھا کبھی دیکھنے نہیں آتا۔

بڑھاپے کی مت کا عجیب حال ہے جو باتیں ہم نے جوانی میں خود کیں وہی باتیں جوانوں کو کرتے دیکھ کر بڑا غصہ آتا ہے۔ پہلے دنیا ہی دنیا پکارتے رہے اب اس کی ہستی میں بھی شبہ ہو رہا ہے۔ گو مزاج میں پارسائی پہلے بھی تھی مگر کبھی کبھی نماز قضا ہو گئی تو خدا کو غفور و رحیم سمجھ کر چپ ہو رہے۔ اب قضائے عمری کی سو رکعتوں سے ایک رکعت بھی قضا ہو جائے تو گو اس کی طرف سے آمرزش کا وعدہ سہی۔ لیکن عذاب قیامت سے دل کانپتا ہے۔ حالانکہ جوانی سے بڑھاپا زیادہ مستحق رعایت سمجھنا چاہیے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ فقرا میں جن کو جس قدر پہلے مشاغل دنیوی میں مصروفیت رہی۔ اسی قدر ترک دنیا میں ناموری حاصل ہوئی شیخ صنعاں نے جس طرح دنیا سے نفرت پیدا کی تصوف کی کتابوں میں دیکھیے۔

حضرت پلوس نے پہلے مذہب عیسوی کو بہت ستایا مگر آخر میں اس کی حمایت میں جان دیدی۔

دقت یہ ہے کہ انسان کی آرزوئیں اوّل تو بے گنتی جن کے پورا ہونے کے لئے ایک کیا ہزار عالم اسباب بھی کم سمجھئے دوسرے اس کی آرزوئیں بے تکی ہیں۔ بہت اونچی یا بہت نیچی۔ اس کا جامہ اس کے قد پر کبھی راست نہیں آتا یا تو بہت ہی ڈھیلا ہے یا بہت تنگ۔ اُونچی آرزوئیں تو ایسی اونچی کہ خالق سے وصال، نفس سے دشمنی، دنیا سے بیزاری یہ نیکیوں میں سمجھئے۔ نیچی آرزوئیں تمام دنیا کی دولت میرے پاس آجائے، دنیا مرا کرے میں جیوں۔ دنیا کے حسین مجھی کو چاہیں میری جوانی میں فرق نہ آئے، اس کی آرزوئیں قرینے کی کبھی نہ دیکھیں ؎

گہے بر طارم اعلےٰ ... الخ

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ آپ تکلیف پاتا ہے اور اوروں کو تکلیف دیتا ہے۔ اس کی آرزوئیں اگر اندازے کی ہوں تو تکلیف کی کوئی وجہ نہیں۔ عمر طبیعی کی جگہ عمر جاوداں کی ہوس۔ اور بڑھاپے میں جوانی کا خیال۔ یہ بے تکا پن خراب کر رہا ہے میں نہیں جانتا کہ بڑھاپے کو آپ بُرا کیوں سمجھیں نیچر کی ہر چیز دل کش ہے اور بڑھاپا بھی نیچر کی ایک صورت ہے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ پُرانی عمارتیں زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں۔ قطب مینار، تغلق آباد، فتحپور سیکری کو لوگ دُور دُور سے دیکھنے آتے ہیں۔ پُرانا درخت اچھا لگتا ہے اور زیادہ سایہ دار رہتا ہے پھر پرانے قلعے کو بہت دیکھنے جاتے ہیں۔ پرانی کتابوں، پرانی تصویروں، پرانے سکوں کی تلاش ہوتی ہے۔ کیا انسان اپنی بنائی ہوئی چیزوں سے بھی گیا گزرا ہے۔ شام کا وقت کیسا سہانا ہوتا ہے بڑھاپا نیچر کی شام سمجھئے۔

لڑکوں سے پوچھئے تو کم سنی کو اچھا نہیں سمجھتے۔ جس لڑکے کی عمر آٹھ سال کی بتاتے ہیں کہے گا نہیں بارہ برس کی ہے۔ جب تک خط نہیں آتا، خط نکلنے کی جلدی ہوتی ہے مگر بڑھاپا کیسی ہی بے وقوفی کا زمانہ ہو۔ مگر عقل میں جوانی سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔

بڑھاپا زمانے کی یادگار ہے اور فسانۂ گردش روزگار ہے۔ بوڑھے جانتے ہیں کہ گرگٹ تو وہی ہے۔ گو دھوپ میں رنگ بدلے تو بدلا کرے۔ چادر وہی ہے گو بیل بوٹے کچے پکے رنگ کے ہوں تو ہوا کریں۔ صفحۂ ہستی وہی ہے جو دیکھ چکے۔ حرفوں کا الٹ پھیر جس طرح چاہے کیا کیجئے ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ ..... الخ

جوانوں کے لئے موت مصیبت ہو تو ہو، بوڑھوں کے واسطے دنیا سے جدائی ایسی ہے، جیسے پھل کی درخت سے کہ پھل جہاں پکا اُس کا درخت سے جُدا ہونا ضرور ہے بڑھاپے میں دنیا سے جُدائی بڑی نعمت ہے کہ اس وقت انسان دیکھنے اور دکھانے کے لایق نہیں رہتا۔ اس کا دل مرجھانے سے پہلے چہرہ مرجھا جاتا ہے اس کے لئے موت سے بہتر چارہ نہیں۔

میں ابھی اسی خیال میں تھا کہ ہوائے ہستی مجھے اُس بستی میں لے گئی۔ جہاں کے چند باشندوں کو سُنا کہ عمر جاوداں سے حصہ ملا ہوا تھا۔ ان کا حال سننے کے لائق ہے۔ اس بستی کے بزرگوں کی زندگی بیس پچیس برس تک تو اسی طرح گزرتی ہے جس طرح کہ اور معمولی عمر کے لوگوں کی۔ تیس ۳۰ کے بعد الجھن اور ہوس بڑھنی شروع ہوتی ہے جو پچاس ساٹھ برس کی عمر تک رہتی ہے اس عمر میں ہاضمہ میں فتور ہوجاتا ہے کوئی غذا مزاج کے موافق نہیں ملتی۔ ہاتھ پیروں میں پھرتی نہیں رہتی۔ یار کو دوڑ کر گلے لگانے میں جو بجلی سے زیادہ تیزی تھی جاتی رہی۔ اب کمر پر ہاتھ رکھ کر اُٹھنے میں بھی تکلیف ہوتی ہے اور گھٹنے پکڑ کر بھی کوٹھے پر چڑھنا مشکل ہوتا ہے اس میں صرف یہی شکایتیں اور عیوب جو پیری کے لئے لابُد ہیں۔ لاحق حال نہیں ہوتے بلکہ جوں جوں عمر بڑھتی ہے۔ شکایتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ اور زندگی کے لطف کم ہوتے چلتے ہیں۔ اپنے سوا کسی کی کوئی بات سننے کو جی نہیں چاہتا تمنائیں ایسی کہ جن کے پورا ہونے

میں کوئی خوشی نہیں، بالوں میں خضاب لگایا تو سب سے پہلے اُسی نیک بخت نے جان لیا جس کی نگاہ میں جوان ہونا منظور تھا۔ ہونٹ کیا چبائیں کہ دانت رخصت ہو چکے۔ لکھنے پڑھنے کا مشغلہ اس وقت بُرا نہ تھا۔ مگر حافظے کا یہ حال ہے کہ فقرے کے آغاز سے انجام تک ساتھ دینا مشکل ہے کہ شروع کچھ کیا تھا اور کہہ کچھ گئے۔ اس کے سوا زمانے میں جو انقلاب ہمیشہ رہتا ہے کہ آج کی رسم کل بدلی جاتی ہے اور کل کی پرسوں۔ اسی لئے زمانے کی راہ و رسم سے اتفاق نہیں رہا۔ نتیجہ یہ کہ اپنے گھر اور اپنے مُلک اور اپنے عزیزوں میں بھی بیگانوں سے بدتر سمجھے جاتے ہیں۔ زیادہ عمر ہو جانے سے اکثر عزیز یگانوں، دوست آشناؤں کی موت سے زندگی تلخ ہو گئی۔ جہاں ستر اسّی برس کی عمر میں یہ مصیبتیں ہیں خدا جانے آگے کیا ہوتا ہے وہاں کے بزرگوں سے معلوم ہوا کہ بڑھاپے کی تکلیفیں ایسی ناگوار نہیں جسقدر کہ یہ مصیبت کہ موت کا سہارا نہیں جس سے اُمید ہو کہ خُدا ایک دن بُڑھاپے کی تکلیفوں سے چھڑائیگا ؎

دلِ مایوس راتسکیں بُود دن میتواں دادن
چہ امید است آخر خضر و ادریس و مسیحا را

یہ حال دیکھ کر میں نے خدا کا شکر کیا کہ واقعی خدا کی بڑی مصلحت ہے جو دنیا میں عمر جاوداں کا جھگڑا نہیں، ورنہ اس میں جینا مشکل ہو جاتا۔ اور یہ عمرِ رواں بیکار ہو جاتی۔

پھر ہے جینے کی تمنا دمِ محشر افسوس
گور میں بیٹھ عمرِ رواں بھول گیا

(صلائے عام۔ جولائی سنہ ۱۹۱۰ء)

مآلِ زندگی

آغازِ عالم سے اب تک یہ بات طے نہیں ہوئی کہ زندگی کی اصل کیا ہے. لیکن جب تک سائنس اس کی اصل تحقیق کرے، تب تک بیکار بیٹھنے سے یہ بہتر ہے کہ مآلِ زندگی پر طبع آزمائی کی جائے۔

مآلِ زندگی دریافت کرنے کی ضرورت اس وجہ سے زیادہ ہے کہ انسان کو جس کام کا مآل نظر نہیں آتا اُس میں دل لگانے کو جی نہیں چاہتا اور مجھے زندگی سے جی لگانا ہے، زندگی اگر محض کھانے پینے کی کل ہے تو مجھے اپنے تئیں ایسی کل سمجھنے سے انکار نہیں، بشرطیکہ یہ کل بگڑے نہیں مگر یہ بگڑتی ایسی جلدی ہے کہ اعتبار کے لائق نہیں رہی۔ شعر و سخن والے کہتے ہیں کہ زندگی سے غرض عشق و محبت ہے مگر روٹی کی تکلیف اور معاش کی تلاش کے سامنے یہ خیال بیکار ہے۔ کسی نے کہا کہ زندگی عجیب راز ہے۔

جواب ملا کہ جب چوہے، بلی، کیڑے مکوڑوں کو نصیب ہے تو راز کہاں رہا۔ شدّاد، فرعون اور نمرود بھی جب زندگی سے محروم نہیں رہے تو معلوم ہوا کہ زندگی ایسی کتاب کا دیباچہ ہے جو نااہل کے نام معنون کی گئی ہے۔ نہ یہ میری سمجھ میں آتا ہے

کہ مسئلہ تناسخ کی طرح روح اجڑی اجڑی پھر رہی تھی اور کوئی گھر (جسم) بنا بنایا مل گیا تو فوراً اُس میں دخل مع قبضے کے حاصل کر لیا۔ زندگی کی نسبت یہ میں اوروں کی رائیں بیان کر رہا ہوں۔ اپنی رائے لگانے سے ڈرتا ہوں کہ جس طرح بچے کو اکیلا چھوڑ دیے تو ڈرتا ہے۔ اوروں کے ساتھ چپکا ہو جاتا ہے مگر اصل یہ ہے کہ جس طرح زمانے کو جس وقت خلاقِ ازل نے پیدا کیا۔ اس سے یہ غرض نہیں تھی کہ اس کے لمحے، پل گھڑی، گھنٹے، دن، رات، ہفتے، ماہ و سال صدیاں ازل اور ابد بے گنتی حصوں میں تقسیم کرنے کے لئے بنایا جائے۔ انسان نے اپنی ضرورتوں کے موافق زمانے کی یہ تقسیم آپ کر لی۔ اسی طرح انسان کو پیدا ہوتے ہی اپنی زندگی سے غرض معلوم ہونی مشکل ہے۔ دنیا کی ضرورتوں کے موافق اس نے اپنی زندگی کا مآل سمجھ لیا۔ فردوسی کے لئے مآل زندگی شاہنامہ ہو گیا، محمود غزنوی کے لئے ہندوستان کی فتح۔ حضرت امام غزالیؒ کے لئے علم کلام، ابن رشد و بو علی سینا کے لئے فلاسفی، محمد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے لئے عیش، سعدی کے لئے گلستان و بوستان اور حضرت مولانا روم کے لئے مثنوی، جامی کے لئے یوسف زلیخا اور نظامی کے لئے سکندر نامہ، قارون کے لئے دولت اور حضرت خضر کے لئے رہبری، علیٰ ہذا القیاس!

غرض جس سے جو بن پڑا وہی اس کی زندگی کا مآل سمجھئے مصیبت زدوں کو زندگی اُس یار کی طرح نظر آتی ہے جو چھٹتا نہیں۔ مرا نہیں، بلکہ دلیوانہ ہو گیا ہے کہ ہمیں پہچانتا بھی نہیں یا جو صدمہ ہائے فراق سے بچ گیا مگر شکل بدل گئی۔

ہزار ضبط و نفس کشی کے بعد بھی انسان اپنی طبیعت سے لاچار ہے۔ لاکھ سمجھائیے۔ اس کی طبیعت ویسی ہی رہے گی جیسی کہ خالق نے بنا دی ہے۔ آپ اپنے لڑکے کو کسی جرم میں (حضرت عمرؓ کی طرح) قتل کا فتویٰ دینے کو دیدیں مگر اس کے مارے جانے سے خوش ہوں؟ یہ ممکن نہیں۔ آپ کو لاکھ دو لاکھ روپیہ کسی تدبیر سے

مل جائے اور معلوم ہو کہ حق سے نہیں ملا۔ اور پھر آپ کو چھوڑنا پڑے اور چھوڑنے میں آپ کو ویسی ہی خوشی ہو جیسے ملنے میں ہوئی تھی تو آپ کی ولایت میں شک نہیں مگر طبیعت انسانی میں مجھے شک ہو جائے گا۔

عالمِ اسباب میں ہر چیز کے قواعد مقرر ہیں۔ ہوا اوپر رہتی ہے۔ پانی نیچے کو جاتا ہے۔ زبردست کمزور کو دبا لیتا ہے۔ جس چیز کو جس قدر زور سے پھینکئے اتنی ہی دُور جائیگی۔ آم جب شاخ سے گرا اوپر کو جاتے نہیں دیکھا۔ اسی طرح انسان جیسا بنایا گیا ویسا ہی رہے گا انسان کا مآل زندگی اس کی خوشی نہیں ہے۔ اس کا خوش ہونا انبیا علیہم السلام کی پیشین گوئیاں سمجھے۔ جو اُن کے بعد پوری ہوئیں۔ یا معجزات الٰہی جو پہلے ہو چکے۔ انسان کی ہر تمنا بر آئی تو اُس کی زندگی اکارت سمجھئے اس کی خوشی پوری نہ ہونے ہی میں اُس کی زندگی کا لطف ہے کہ کسی نہ کسی آرزو کی تلاش میں بسر ہو۔

سب سے مقدم تلاش تو اپنے پروردگار کی ہے لیکن جب وہی نہ چلا ہے تو اُس کا ملنا معلوم۔!

بڑے ٹھکانے دیر و حرم سنے تھے لیکن وہاں کے رہنے والے بھی اسی قدر بیگانہ نکلے جس قدر کہ باہر والے اور ان میں بھی اس قدر اختلاف دیکھنے میں آیا کہ دہریے اُس کے قائل نہیں رہے۔ اگلے وقتوں میں خدا شناسی کے یہ معنی تھے کہ جو کچھ میں نے سمجھ رکھا ہے یہی درست ہے، دوسرا غلطی پر ہے ع

باطل است آنچہ مدعی گوید

اس میں بڑی دقت یہ دیکھی کہ کوئی مذہب ہر وقت اور ہر مُلک اور ہر قوم کے لئے راس نہیں آیا۔ بنی اسرائیل صرف اپنے مذہب کی ضد سے تمام دنیا میں پریشان پھر رہے ہیں۔

حضرت موسیٰ کی شریعت میں چوری و زنا و خون کا اختصار کے طور پر امتناع دس احکام کے آخر میں ہے پہلے اور سب سے مقدم کاموں میں پروردگار کی صورت بنانے کی سخت ممانعت ہے۔ اس کے بعد یوم السبت کی نہایت تاکید ہے۔

دس احکام الٰہی میں سے پہلے تین احکام کی تعمیل دنیا کی اور قوموں نے بہت کم کی اور کہیں کچھ شکایت بھی نہ سنی۔ بلکہ بت پرستی کا رواج بڑی بڑی عقل و اقبال والی قوموں میں (مثلاً مصر، یونان، روم، چین، بابل، نینوا، اسیریا، کلدیہ دنیا کی زیادہ آبادیوں میں) جاری رہا۔ اور ہندوستان میں موجود ہے بلکہ مردم شماری میں خدا پرستوں سے غیروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ تمام دنیا کے فلاسفر جو اپنے تئیں عقل کا پتلا سمجھتے رہے بت پرستی انھوں نے اچھی سمجھی یا بری مگر اپنے اپنے بُتِ پندار کے سامنے کسی کے قائل نہ ہوئے یہ کیسی بڑی ہٹ دھرمی ہے۔ والٹیر جو بڑا دہریہ تھا ایک دن کسی امیر کے ہاں دعوت میں مہمانوں کے سامنے کہہ بیٹھا کہ دنیا میں کوئی سچا دہریہ نہ دیکھا مہمانوں میں سے سترہ آدمیوں نے جواب دیا کہ اتنے تو اس وقت موجود ہیں۔ فلاسفر کینٹ کا قول تھا کہ

"مادہ میرے حوالے کرو۔ میں دنیا بنا دیتا ہوں"

دنیا میں خدا پرستی سے بہتر کوئی نعمت نہیں۔ لیکن اس کی ہزاروں شقوں نے الجھن میں ڈال دیا۔ اسلام ہی میں دیکھیے پہلے تو اس سوال کا

"کہ آپ کون ہیں"

ایک ہی جواب دینا پڑتا تھا کہ الحمدللہ! مسلمان! زیادہ بحث مباحثے کی ضرورت نہ تھی، پھر شیعہ سنی پھر ان میں بھی سینکڑوں فرقے اور اب میرے دیکھتے دیکھتے

بدعتی — وہابی، نیچری، قادیانی، اہلِ حدیث، اہلِ قرآن وغیرہ پیدا ہو گئے اور خدا جانے ابھی کتنے پیدا ہوں گے مذہب کا یہ حال ہے کہ جس طرح گھر کا بڈھا کہ جو کچھ گھر والے کہیں اُسے ہاں ہاں کرنا پڑتا ہے۔ یا مجلس شوریٰ کا میر مجلس کہ جو کچھ پنچایت والے فیصلہ کر دیں منظور — یا ایسا حاکمِ عدالت کہ جو کچھ اہلِ کار لکھ کر سامنے رکھ دیں۔ اُس پر دستخط کرنے کے سوا اور کچھ نہ کرے۔

عقائدِ مذہبی گو ابھی الحمد اللہ زندہ ہیں۔ (اور خدا زندہ ہی رکھے) مگر اُن کی شکل ایسی بدل رہی ہے کہ اُن کا پہچاننا مجھ سے موٹی عقل کے آدمی کو مشکل ہو رہا ہے۔ نئی تہذیب اور نئی روشنی نے اور بھی غضب ڈھایا کہ ہمارا پرانا اگوا جو مدت سے ہمیں جنگل بیابانوں میں پرانی پگڈنڈی پر لئے جاتا تھا، اُسی پر ہنس رہے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ رہبر کا پاؤں ڈگمگائے اور ٹھوکر بھی کھائے تو اس پر ہنسنا کسی تہذیب میں زیب نہیں دیتا، لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ میل کے پتھر جو رہروانِ ملکِ عدم ہماری ہدایت کے لئے ہستی کے شارعِ عام پر لگا گئے تھے اُن میں سے گو اکثر ٹیڑھے ہو گئے بعضوں کے حرف پڑھے نہیں جاتے کچھ گر بھی گئے۔ مگر بہت سے باقی ہیں۔

اور اس قدر اختلاف میں بھی سب کا اتفاق اس بات پر ہے کہ نیک اعمال سے بہتر کوئی چیز نہیں سبب یہ کہ خدا کو دنیا کا مٹانا منظور نہیں ہے اس کے لئے ہماری ہستی سے غرض یہی ہو سکتی ہے کہ ہم دنیا کو مٹنے نہ دیں۔ مآل زندگی یہی ہے کہ عالم اسباب میں ایسے کام کئے جائیں جن سے یہ نقشِ موہوم جسے ہستی کہتے ہیں، قیامت تک بنا رہے اور قیامت کے بعد بھی ؎

پیراہن اگر گشی ز فانوس — از شمع مرا مساز مایوس

(صلائے عام۔ اگست ۱۹۱۰ء)

حضرت امام غزالیؒ اور ابن رشدؒ

گو جیتے جی ان دونوں بزرگوں کا ملنا جو عقل و نقل میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے ناممکن تھا مگر پچھلے سال خیال میں یہ دونوں صلائے عام کی بدولت اتفاق سے مل گئے اس وقت سے کئی دفعہ ان کی گفتگو سننے کو جی چاہا مگر جس طرح میر حسن کو چرخ کج رفتار کی طرف سے بڑی شکایت یہ ہے کہ دو آدمیوں کو یکجا بیٹھنے نہیں دیتا زمانے کے مکروہات سے وہ لطف صحبت نصیب نہ ہوا لیکن ع

گر مینے ہنگامۂ چند

آج اس صحبت کا بقیہ کچھ کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

ابھی شیشے کی کچھ کچھ مے ہے باقی
ابھی مہمان ہے کچھ دیر ساقی

حضرت امام غزالیؒ جانے کو تھے کہ ابن رشدؒ نے کہا کہ ذرا اور کرم فرمایئے مجھے جناب سے چند مسائل میں کچھ عرض کرنی ہے۔

ابھی ساقی چھڑا دامن نہ ہم سے
ترشح کچھ تو ہو ابر کرم سے

حضرت: میں جانتا ہوں کہ تم اسرار ازلی اپنی عقل سے حل کیا چاہتے ہو۔ تم ان جانوروں کی طرح جن کی قوت شامہ زیادہ ہے زمین میں ناک لگا کر ہر چیز کا پتا لگانا چاہتے ہو۔ برخلاف اس کے میرے خیال کی پرواز مرغانِ اولی اجنحہ کی طرح آسمان کی طرف ہے۔

ابن رشد۔ انسان جب اس عالم فانی کی ماہیت اشیا سے جو وجود خالق کے مقابلے میں محض متناہی ہیں اب تک قاصر رہا تو نامتناہی کو کس طرح سمجھ سکا۔ جسے زمین کا حال معلوم نہیں وہ آسمان کا حال کیا جانے۔ تو کارِ زمین۔۔۔۔۔ الخ

حضرت: متناہی سے نامتناہی اور مخلوق سے خالق کا پتا لگانا مشکل نہیں۔ جب خالق کے وجود میں شبہ ہو تو مخلوق کے وجود کا یقین کرنا بیکار ہے۔

ابن رشد۔ بہت خوب فرمایا۔ آپ کا مطلب یہ کہ مخلوق ہے تو خالق کا ہونا ضرور ہے یعنی ہم ہیں تو وہ ضرور ہے اور ہم نہیں تو وہ نہیں۔ برخلاف اس کے میں دیکھتا ہوں کہ مخلوق کا ہونا خالق کی شناخت پر پردہ ڈالتا ہے۔

زشیخِ حرم تا برہمانِ دہر ۔ در اسرار ایں پردہ غیر اند غیر
ازیں پردہ رہ انبیا کردہ اند ۔ ولے نقش بیرونی پردہ اند

اگر ہم خدا کو عالم اسباب سے ملا کر دیکھیں تو خالق و مخلوق کا تعلق دو حالتوں سے خالی نہیں۔ یعنی خدا اور خدا کے سوا ایک اور چیز سے (جسے مادہ یا جو چاہیے کہیے) کائنات کی ایجاد ہوئی۔ دونوں کو ہم عصر کہیے تو دوسری چیز بھی ازلی سمجھنی پڑی۔ تیسری اور ذہن میں آئی جس سے موجودہ مسالے سے کام لینے کا ارادہ پیدا ہوا۔ کیوں کہ عالم ایجاد سے پہلے اس ارادے کا وجود نہ تھا۔ اس حال میں خالق کائنات محض صناع رہ گیا اور حساب سے مسالے اور کاریگر اور ارادے (جسے صاحب تعمیر سمجھئے) تین کی ضرورت ہوئی اور تینوں برابر۔ یہ بات نہ آپ کو پسند ہے نہ مجھے۔ دوسرے خالق کو مخلوق سے

بالکل علیحدہ نہ رکھئے تو وہ خدا خدا نہیں ہو سکتا۔ جو اپنے تئیں مخلوق سے جدا نہ کرسکے۔ خالق اگر مخلوق میں ہے تو خالق کا مرتبہ ہمارے ذہن میں ایسا بڑا نہیں رہا جیساکہ نیک بندوں کو اپنے خالق کی طرف ہونا چاہیے۔ یعنی جرائم میں اسی کا وجود، گناہ میں اس کا ساتھ، برائیں میں اس کی موجودگی اس خیال سے دل کانپتا ہے۔ مخلوق میں اگر خالق کا ظہور ہے جیساکہ اہل تصوف کا عقیدہ ہے تو مخلوق کا فنا ہونا خالق کی ہستی کے منافی ہو جائے گا۔ دنیا فنا ہو یا نہ ہو یہ دوسری بات ہے مگر اس کو فانی سمجھنا خدائے لایزال کی شان کے خلاف ہے۔ کیوں کہ اگر یہ عالم فانی محض امتحان کے لئے بنایا گیا اور اس کا فنا کرنا مصلحت ایزدی میں داخل ہے تو اس میں ایک تو علم کی کمی کہ کیا خدا اس عالم کے مزاج سے آگاہ نہ تھا۔ دوسرے جب غیر فانی پیدا کرنے کی طاقت تھی تو فانی پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر یہ دنیا ہر طرح اچھی ہے جیساکہ اس کا خالق ہے تو اس کا فنا کرنا اچھا نہیں، اسے آپ اگر آغاز سے ازلی نہ مانئے تو بھی آخر کو اس کا ابدی ہونا لابد ہے کہ اس کی ابتدا نہ سہی مگر جب تک اس کا بنانے والا موجود ہے دنیا کے مٹنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ع

ازل با اوّلش پایان کارے
ابد با آخرش اول شمارے

پھر اگر یہ دنیا فنا کی گئی تو دوسری اس سے اچھی پیدا ہونے کا کیا ثبوت ہے۔ یعنی جب تک سانچہ وہی ہے اسی سانچے میں سے غیر چیز پیدا ہونی مشکل ہے۔ علاوہ اس کے اگر دنیا میں نیکی و بدی کا وجود ہے، تو دو برابر کی قوتیں ازروئے اصول جرثقیل ایک دوسرے کو بے کار کر دیتی ہیں اگر آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ عالم اس کی ذات کا ظہور ہے تو اس کے ہوتے برائی کا وجود کیسا مشکل مسئلہ ہے۔ یعنی محض نیکی کا کوئی جزو نیکی کے منافی ہو سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر اگر وہ ہر چیز میں موجود ہے جیساکہ اہل تصوف سمجھتے ہیں تو وہ پورا کہیں نہیں رہا۔ یعنی جزو ہو کر جانے کہاں کہاں تقسیم ہو گیا بلکہ اجتماع ضدین کی نوبت آگئی کہ خالق بنا اور مخلوق بنا اور مخلوق بن کر پھر خالق بنا۔ یہ صورت

باپ بیٹے اور پوتے میں نظر آتی ہے۔ میری رائے میں جیسا کہ میں عرض کر چکا ہر چیز جو دنیا میں پیدا ہوئی اس کے چھپانے کا سبب ہوئی کہ پردے پر پردے پڑتے گئے۔

حضرت: تم کو عقل کی زیادتی نے خراب کیا۔ تم یہ نہیں سمجھتے کہ انسان جب راہ میں نالی دیکھے جس میں پانی بھرا ہوا ہو اور پاؤں ڈالنے سے جوتیاں بھیگیں تو اس نالی کو پھاندجانا مناسب ہے۔ پھاندنا ثقاہت اور سلامت روی کے خلاف سہی مگر جوتیاں بگاڑنے سے اچھا ہے جو بات انسان کی سمجھ سے باہر ہو اُسکے پیچھے نہ پڑے۔ اینٹیں اگر معمار کو نہ پہچانیں تو معمار کے وجود میں فرق نہیں آسکتا۔ مرنے کے بعد سارا حال کھُل جائے گا اور جب تک وہ وقت آئے انسان اپنی خواہشات نفسانی کو مارے۔

ابن رشد۔ انسان اپنے خالق کو اگر اپنی زندگی میں نہ سمجھ سکا تو مرنے کے بعد سمجھنا اور مشکل ہے۔ آنکھیں ہوتے جو چیز نظر نہ آئے۔ آنکھیں پھوٹنے کے بعد کیا خاک نظر آئے گی۔ رہا خواہشات نفسانی کا مارنا اگر نیکی میں ہے تو یہ بات عجیب ہے کہ انسان کو ایسی خواہشیں دی جائیں جن کے مٹانے میں ثواب ہو۔ اس کی مثال یوں ہوئی کہ خلعت شاہی اس غرض سے ملی کہ اس کو پھاڑ کر پھینک دیجئے۔ رہا خدا کا پہچاننا اس میں مشکل یہ ہے کہ جب ساری اینٹیں معمار کی ہستی کے سمجھنے سے عاری ہیں تو ایک دو اینٹیں معمار کے سمجھنے کا دعویٰ کریں تو تعجب ہوگا۔

حضرت۔ اب تم راہ پر آچلے۔ تم نے نباتات کو جمادات سے بہتر اور حیوانات کو نباتات سے بہتر مانا ہے اور حیوانوں میں انسان اور جانداروں سے افضل سمجھا جاتا ہے اسی طرح انسانوں میں بعض انسان اوروں سے افضل ہوں جنھیں اس کا علم زیادہ ہو تو کیا تعجب ہے۔

ابن رشد۔ یہ غلطی استدلال کی ہے کہ لاعلمی اور علم اکٹھا کیا جاتا ہے۔ جس طرح خالق کی صفات میں دقتیں پیدا کر دیں کہ رحیم ہے اور قہار بھی لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی اور ساتھ

ہی جو کچھ جس کی تقدیر میں لکھ دیا وہ ہو کر رہے گا مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَلَا هَادِیَ لَہٗ دنیا میں دو اور دو چار کا بھی ہر طرح اور ہر حال میں درست ثابت کرنا مشکل ہے کہ کوئی چیز دوسرے سے بہمہ وجوہ مطابق نہیں ہو سکتی۔ درخت کی پتیاں گو ہزاروں سہی مگر ایک پتی دوسرے سے نہیں ملتی، ایک روپیا حضرت سلیمانؑ کے خزانے کا جو خدا کی راہ میں دیا جائے اور ایک وہ جو پانچ روپے کا ملازم دے۔ دونوں کی قدر دینے والوں کی نظر میں ایک سی نہیں، حضرت سلیمان کو خبر بھی نہ ہوگی کہ ایک روپیا خیرات میں دیا گیا۔ اور تھوڑی معاش والے کے ایک روپے کا اثر تمام گھر پر ہوگا پپیہے کے لئے بارش کے پہلے قطرے میں جو لطف ہے وہ دریا کے ہزار سیلاب میں نہیں۔ علم مساحت میں حرکت کے لئے سب سے سیدھا راستہ خط مستقیم ہے مگر خالق نے سارے سیاروں اور کُروں کی حرکتیں مُدوّر رکھیں، سیدھی پسند نہ آئیں، پتھر سخت چیز ہے اور پانی نرم مگر سیلاب پہاڑوں کو بہا لیجاتے ہیں۔

حضرت۔ یہ تم بہت ٹھیک کہہ رہے ہو کہ اسرار ازل نہ تمھیں معلوم ہوئے نہ مجھے۔ کسی نے آج تک یہ نہ بتایا کہ نافے میں مشک کیوں کر بن جاتا ہے۔ اور یاقوت میں سرخی کہاں سے آئی۔ طوطی کی گردن میں سرخ کنٹھے کی کیا وجہ ہے۔ چاند کا اثر مدّ و جزر میں کیوں ہوتا ہے اور زخمی کو چاندنی سے کیوں بچاتے ہیں۔

دریں طوفاں چہ باشد نوح را جہد ۔۔۔ بود طفلے کہ باشد کشتیش مہد

سلیماں در پیش کمتر ز مورے ۔۔۔ چو ایوبش بہر سو نا صبورے

تم نہیں سمجھتے کہ عقائد کا مدار عقل و دماغ پر ہوتا تو نیکی کے لئے نیت کی شرط نہ ہوتی جس کا مدار دل پر ہے۔ عقائد کے ماننے کے لئے نیت کی ضرورت ہے کہ خدا دلوں کو دیکھتا ہے تم دماغ سے کام لیتے ہو، میں دل سے، تمھاری طبیعت تیز ہے تو میری نیت نیک ہے۔ ہم تم ایک ہی زبان کے جاننے والے اور ایک

ہی زبان کے سمجھنے والے ہیں۔ باتیں بھی ایک ہی زبان میں کر رہے ہیں۔ لیکن میں تمھارے عقائد نہیں سمجھتا نہ تم میرے سبب یہ کہ ہمارے دل ایک سے نہیں۔ ع

نہ رنگے داری از مرداں نہ بوئے ۔۔۔ قناعت کردہ با گفتگوئے

بگفتن بہ نکردہ ہیچ کردار ۔۔۔ عمل میبایدت نیکو نہ گفتار

(صلائے عام۔ ستمبر ۱۹۱۰ء)

مضمونِ پریشاں

جمع میکردم چو از دیوانِ حسنش انتخاب
مصرعِ کامل بہ مضمونِ پریشاں یافتم

آج مجھے صلائے عام کے لئے مضمون کی تلاش تھی۔ خیال ہوا کہ مضمونِ پریشاں لکھ ڈالیے جس کی تمہید میں عرض ہے ؎

حرفم از فکرِ سرِ زلفِ پریشان است باز
در میانِ معنی و لفظم بیابان است باز

اس طرز کے مضمون میں آشفتہ مزاجوں کی طرح گو سلسلۂ و ربط مشکل سمجھا تا ہے لیکن ایک وضع کا سامان کتنا ہی جُدا جُدا کیوں نہ ہو یکجا کر دینے سے بسانِ دلقِ گدایاں خاصی دلکش صورت پیدا کر دیتا ہے جس سے بوئے الفس آنے لگتی ہے۔ کشتی میں گو مختلف طبایع کے لوگ ہوں مگر ایک جا ہونے سے طوفان ابر و باد میں سب کا خیال ایک ہی طرف کو رجوع ہو جاتا ہے اور ریل میں آپ کہیں سے آتے ہوں یا کہیں کو جاتے ہوں ایک دوسرے کا حال پوچھنے کو جی چاہتا ہے اس سے راستہ کٹ جاتا ہے ؎

ہجومِ بلبلان دیدم بہ گردِ گل یقینم شد
کہ باہم الفتے می بود دلہائے پریشاں را

خود دل جمعی جس کی تلاش انسان کو آغازِ عالم سے ہے اکثر پریشانی کا سبب ہوتی ہے کہ ایک ہی چیز کو جب سب تلاش کریں گے اور ہاتھ نہ آئیگی تو پریشان ہونے کے سوا کوئی نتیجہ نہیں ہو سکتا ؎

دل چو شد جمع بخود زود پریشاں گردد
برگ چوں غنچہ شود میل بریدن دارد

دنیا میں انسان کے لیے دل جمعی اگر بڑی نعمت ہے تو پریشانی بھی لطف سے خالی نہیں آپ نے دیکھا نہیں کہ رسمِ محبت میں لطفِ یار کا کیا کہنا۔ مگر جفائے یار سے بھاگنا نامردی میں داخل ہے ؎

نہ شیریں بود خسرو خوشدل و فرہاد ازاں خوشتر
کہ دادِ دلبراں خوش باشد و بیداد ازاں خوشتر

یہ کس سے کہیے کہ ؎

ایں باکہ تواں گفت کہ در خلوتِ خسرو
شمع است کہ دود از دل فرہاد برآرد
ترا تا گل نباشد شورِ بلبل خوش نمی آید
مرا بے شورِ بلبل خندۂ گل خوش نمی آید

غالبؔ کا یہ شعر بہت مشہور ہے کہ بزمِ یار کی جتنی چیزیں ہیں پریشانی کا گھر ہیں ؎

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

مصائب عالم کی تعریف میں نہایت پاکیزہ تمثیل یہ ہے ؎

چُوں گوشۂ ورق شکند کس بانتخاب
گردوں ز روئے لطف نبد گوشمالِ ما

غم دنیا کی نسبت کتنی اچھی بات کہی ہے ؎

با نوشخند عیش دو عالم برابر است
در گوشۂ نشستن و تنہا گریستن

دلجمعی کی تلاش آپ کریں یا نہ کریں ۔ یہ آپ کی خوشی، نہ کریں تو زیادہ دلجمعی سمجھئے کہ اس کی تلاش کرنے والوں کو پریشانی کے سوا اور کیا ہاتھ آسکتا ہے مگر یہ بات پریشانی کے حق بجانب ہے کہ بے منّت ہر شخص کو ہر حال میں حاصل ہے۔ لیکن سب سے بڑی خوبی اس میں یہ دیکھی کہ اگر زندگی سلامت ہے تو پریشانی کیسی ہی سخت کیوں نہ ہو بے گزرے نہیں رہتی ؎

زدی صد زخم و حالا میل بسمل کردنم داری
اگر باشد حیات از عہدہ آں ہم بروُں آیم

پریشانی میں بڑی مردانگی کی بات یہ ہے کہ انسان اگر خود پریشان ہے تو ہوا کرے، دوسرے کی پریشانی کا روادار نہ ہو دوسرے کو پریشان دیکھنے سے اپنی پریشانی کہیں اچھی ہے ؎

غم ایام چہ بودے ہمہ بامن بودے
کہ پریشان بود بہ ز پریشاں دیدن

آپ مانیں یا نہ مانیں بلکہ نہ مانئے تو خیالی خوشی کے لئے اچھا ہے کہ دلجمعی کا وجود نہیں اور پریشانی ہر شخص کی آنکھوں کے سامنے ہر وقت موجود ہے، پریشانی کے اثر سے کسی کو مفر نہیں۔ اور دلجمعی کا ڈھونڈنے سے بھی پتا نہیں لگتا۔ جمعیت نقص کی علامت

ہے اور پریشانی آثار کمال میں داخل ہے، اس کی تمثیل غنچۂ گل کی سمجھئے کہ کلیوں کا کمال پھول ہیں۔ کلیاں جب تک کھلیں نہیں خوشبو نہیں دیتیں۔ نافے میں بوئے مشک اتنی نہیں ہوتی جتنی باہر نکل کر ہوتی ہے۔ زیادہ قدر اُن پھولوں کی سمجھئے جو شاخ سے لوٹ کر بازار میں پہنچیں کہ یار کے گلے کے ہار بنتے ہیں۔ خوشبو جب تک ہوا میں پریشان نہ ہو دماغ کو معطر نہیں کرسکتی۔ بند مکان سے آواز کم سنائی دیتی ہے میدان میں پکاریے تو دور تک پہنچتی ہے، اندھیرا چیزوں کے اکٹھا کرنے کا سبب ہوتا ہے اور روشنی اشیائے عالم کو پھیلا کر دکھا دیتی ہے۔ افکار رات کو اکٹھا ہو کر طبیعت پر ہجوم کرتے ہیں اور صبح کو روشنی میں بکھر جاتے ہیں۔

سلطنت میں سونے چاندی کے سکوں سے یہ غرض نہیں کہ بنا کر ٹکسال میں جمع کئے جائیں بلکہ تمام مُلک میں چلیں اور ہاتھوں ہاتھ پھریں، وہ دل جس نے پریشانی نہیں دیکھی، میرے اور آپ کے لئے بیکار ہے اس سے اپنی پریشانی کا ذکر غلطی ہے ع

بیدلو کسیکہ درد نہ نہفت جس طرح کتاب کا شیرازہ کھل جانا اوراق کتاب کی پریشانی کا سبب ہوتا ہے اسی طرح زندگی کی پریشانی موت سمجھئے کہ اجزائے ہستی کا بکھر جانا از روئے فلاسفی موت کا نام ہے اور اجزائے شکر کا پانی کو میٹھا کر دینے کا نام شربت ہے۔ مذہبوں کی ترقی ان کے بانیوں کے دلوں میں خیالات نیک کے جمع ہو جانے سے نہیں ہوئی بلکہ اُن خیالوں کو دُور دور ملکوں اور قوموں میں پھیلانے سے عقاید مذہبی کی ترقی ہوئی اسلام نے محض عرب میں رہ کر اتنی ترقی نہیں کی جتنی کہ باہر نکل کر ہاتھ پاؤں پھیلائے اور مذہب عیسائی اگر صرف بیت المقدس میں محدود رہتا تو اس وقت تمام دنیا میں کس طرح پھیلتا۔

لیکن عالم اسباب کی مجھے یہ خوبی نظر آتی ہے کہ اس میں ایک قسم کے اسباب جمع نہیں، ہر طرح کے اسباب ہر وقت اور ہر جگہ پھولوں کی چادر کی طرح (پھول تانئے

ہوں یا باسی) پھیلے دکھائی دیتے ہیں یا زلف یار کی طرح بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جس سے عجیب سماں بندھا ہوا ہے ؎

بسکہ رخسار تو از شرم بود رنگ برنگ

بالِ طاؤس کند زلف پریشانِ ترا

مردانہ مزاج لوگوں میں پریشانی کا علاج صرف ایک ہی ہے کہ پریشانی میں زندگی سے زیادہ نیکی کی ضرورت سمجھیں۔

قدیم رومیوں کے نامور لوگوں میں سے کسی کا ذکر ہے کہ طوفان میں جہاز کے سفر سے لوگوں کو پریشانی ہوئی اور امیر البحر کو سمجھایا کہ اس میں آپ کی جان کا اندیشہ ہے تو امیر البحر نے جواب دیا کہ اس وقت امیر البحر کی جان بچانے کی ضرورت نہیں، ضرورت ہے اس کام کے پورا کرنے کی جس کے لئے ہم مقرر ہوئے ہیں۔ پریشانی میں دلجمعی کی ایک اچھی نقل میں نے ایک بہادر جرنیل کی سنی کہ لڑائی میں جرنیل کے جب زخم کاری لگا۔ تو غش آنے لگا۔ غشی میں کسی کی آواز آئی کہ

"دیکھنا کس پریشانی میں بھاگ رہے ہیں"

جرنیل نے آنکھیں کھول کر پوچھا۔ کون پریشانی میں بھاگ رہا ہے جواب ملا کہ غنیم۔ جرنیل نے مرتے مرتے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ دشمن کی پریشانی میری دلجمعی کا سبب ہے۔

نپولین بوناپارٹ کی نقل ہے کہ میدان میں کسی لڑائی میں شکست کی خبر آئی پوچھا کیا بجا ہے جواب ملا ابھی دوپہر ڈھلی ہے۔

نپولین نے کہا کہ ابھی تو اتنا وقت ہے کہ اب کی دفعہ ہم فتح پائیں، ابھی پریشانی کی ضرورت نہیں۔ لیکن پریشانی کی طرح یہ مضمون میرے ارادے سے آگے بڑھا جاتا ہے اور گو پریشانی ختم ہوتے نہیں دیکھی مگر مجھے یہ مضمون کسی طرح ختم کرنا ہے کہ

جس طرح وادیٔ پرخار میں دامن بچا کر نکلنا مشکل ہے یا یوں کہیے کہ زلفِ پریشاں دیکھ کر آشفتہ مزاجوں کا نہ اُلجھنا مشکل ہے اسی طرح عالمِ اسباب میں پریشانی کے خیال سے پریشانی اور بھی بڑھتی ہے ؎

کیا سلسلۂ دہر بھی ہے طُرّۂ گیسو
جو دل نظر آیا سو پریشاں نظر آیا

دنیا میں انسان دلجمعی کی اُمید نہ رکھے کہ دلجمعی کی تمثیل دلِ ممسک سمجھئے جس کے پاس دینے کو کیا رکھا ہے برخلاف اس کے پریشانی ابرِ کرم سے مشابہ ہے جو گھٹا کی طرح انسان کے دل پر چھائی ہوئی ہے گویا دامنِ جاناں ہے جس کے ہزار تار چھوٹنے پر بھی اسی کا سہارا ہے ؎

پریشاں طبع ہوں سودائے زلفِ یار سے لیکن
مری آنکھوں کے سر سہرا رہا خوابِ پریشاں کا

(اصلاحِ عام - مارچ ۱۹۱۳ء)

حُسنِ عالمِ اسباب

حسن عالم اسباب کی تشبیہہ میرے ذہن میں اس طرح آتی ہے کہ جس طرح کسی حسین بچے کو ماں گود میں لیے بیٹھی ہو۔ مادرِ گیتی اسے گود میں لئے ہوئے ہے اور پیرِ فلک جھکا ہوا بچے کا مسکرانا دیکھ رہا ہے' یا کوئی حسین عورت نشۂ شباب میں غافل سو رہی ہے جس کا دوپٹا نیند میں سینے سے ذرا ہٹ گیا ہے اور دل کے دھڑکنے کی آواز گو کانوں میں نہیں آتی مگر ہاتھ رکھنے سے صاف پتا چلتا ہے' یہی حال بعینہٖ عالم اسباب کے حسن کا ہے جس کے اندازِ تبسم سے ظاہر ہے کہ جہاں میں یہی ایک آرامِ جاں ہے۔

اس کے حسن کو اگر بہارِ باغ سے تشبیہہ دیجئے تو جی چاہتا ہے کہ رُخِ یار کی طرح قیامت تک اسی کو دیکھا کیجئے۔ اس باغ کے سبزۂ خوابیدہ پر پاؤں رکھنے سے دل دُکھتا ہے کہ کہیں جاگ نہ اٹھے' دامنِ یار کی طرح ہماری گرد کُلفت سے بچا رہے یا عروس کے نئے جوڑے کی طرح ہمارے اَلھڑپن سے ملا دلا نہ جائے کہ کہیں کی شکن کہیں ڈال دیں۔ یہ وہ باغ ہے جس کے درخت کہنے کو تو بے حس وحرکت (بے جان) ہیں۔ مگر تحریکِ صبا نے اُن میں وہ بلا کی جان ڈال رکھی ہے کہ مستوں کی طرح بے اختیار جھوم رہے ہیں۔ لالہ بے غمِ عشق داغدار ہے اور ابر بے فراقِ یار اشکبار ہے۔ برق بے ہنسائے ہنس رہی ہے

اور شبنم بے رلائے رو رہی ہے، صبا بے نچائے ناچ رہی ہے اور مرغانِ خوش الحان بے بلائے بول رہے ہیں۔ اس چمن کے پھول بغیر جنون کے کپڑے پھاڑ رہے ہیں۔ جن کی اس حرکت پر غنچوں کو ہنسی آرہی ہے۔ نرگس کو دعویٰ ہے کہ یار کی آنکھ کتنی ہی اچھی سہی مگر بیمار کہلاتی ہے اور سنبل کو خیال ہے کہ زلفِ یار کو کوئی پریشاں کہا کرے مگر مجھے جمعیتِ باطن کا دعویٰ ہے۔ تمام دنیا کے حسن سے عالمِ اسباب کا حسن نرالا ہے کہ حسینانِ جہاں میں کوئی ملیح ہے تو کوئی صبیح کسی میں صباحت ہے تو ملاحت نہیں، ملاحت ہے تو صباحت نہیں۔ مگر جس طرح ساغرِ ہیں آب و آتش یکجا دیکھ لیجئے اور لبِ لعلِ یار سے بوسے کی حلاوت اور دشنام کی تلخی دونوں کا لطف اٹھائیے۔ عالمِ اسباب کے حسن میں اجتماعِ ضدین کی کیفیت حاصل ہے کہ صدمۂ فراق اور شوقِ وصال کی طرح عالمِ اسباب میں رنج و خوشی، راحت و تکلیف دونوں صورتیں موجود ہیں ایک طرف زہدِ خشک تو دوسری طرف دامانِ تر دیکھ لیجئے۔

پیرِ فلک کے ہاتھ میں رات کو شب بیداری کے لئے تسبیحِ کہکشاں تو صبح کو صبوحی کے لئے ساغرِ آفتاب نظر آتا ہے۔ شیخ کے ہاتھ میں عصا تو رند کے پاس قدح دکھائی دیتا ہے۔ عالمِ اسباب میں ایک طرف آوازِ غنا تو دوسری طرف شورِ الاماں سن لیجئے۔ رات کے بعد دن اور بہار کے ساتھ خزاں دیکھ لیجئے۔ ؎

تلخیٔ کام بود لازمِ شیرینیٔ عیش
شہد با زہر صفا با کدر آمیختہ اند

اور جس طرح مشغلۂ حسن و عشق میں رنج زیادہ اور خوشی کہنے کو ہے۔ عالمِ اسباب میں آلام کی گنتی نہیں خوشی برائے نام ہے۔ رمضان کے روزے تیس دن کے اور عید صرف دوپہر کی ہمیں بھی نماز سے پہلے عید گاہ جانے کی تیاری میں جو وقت صرف ہو عید کا حصہ سمجھئے باقی وہی معمولی باتیں ہیں جو

رات دن ہوتی تھیں کہ دوست آشناؤں سے ملنا جلنا یہ اجیرن ہو جاتا ہے۔ دنیا کے رنج و راحت کا راز کسی پر نہ کھلا۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ انسان کی ہستی کا مدار زیادہ تر رنج پر کیوں رکھا گیا۔ اور راحت کا پتا کیوں نہیں لگتا۔ ہماری ہستی کی بنیاد رنج پر کیوں ڈالی گئی کہ پیدا ہوئے تو ماں کو کس قدر مصیبت ہوئی۔ ہم روئے زیادہ اور ہنسے کم۔ ہم اگر کسی چیز سے خوش بھی ہوئے تو بچوں کی طرح بہت ہی تھوڑی دیر کے لئے۔ کوئی انسان اپنی نگاہ میں خوش نصیب نہیں دیکھا۔ جس سے پوچھئے یہی سننے میں آتا ہے کہ مجھ سے زیادہ کوئی مبتلائے مصیبت نہیں۔

مجھے شبہ ہے کہ مصیبت میں انسان کا دل نرم ہو جاتا ہے یا سخت۔ زیادہ تر تو نرم ہونا چاہیے۔ مگر اکثر سخت ہو جاتا ہے جس کو آپ نرمی سمجھیں وہ بے اختیاری و مجبوری ہے۔ سبب یہ کہ جب تک اوروں کو مصیبت میں دیکھتا ہے۔ اُسے ہزار تدبیریں سوجھتی ہیں کہ یوں کرنا چاہیے ووں کرنا چاہیے۔ اپنی مصیبت میں اُسے کچھ نہیں سوجھتا غیر کے ہاں کوئی حادثہ ہو تو سمجھانے کو موجود کہ خدا کی مرضی میں چارہ نہیں زمانے کا یہی حال ہے دنیا میں یونہی ہوتی آئی ہے۔ صبر کرنا چاہیے۔ اپنی مصیبت میں ان باتوں کا خیال نہیں آتا۔ وجہ یہ کہ اپنی مصیبت سے مقابلہ کرنے میں ہوش پہلے چل دیتے ہیں اور اگر دو ایک داؤ پیچ یاد آئے۔ وہ پرانے وقت کے ہتھیاروں کی طرح جو زنگ آلودہ ہو رہے ہوں وقت پر کام نہیں دیتے۔ دوسرے مصیبت ہمیشہ نئے نئے سامانوں سے آتی ہے۔ مزاج یار کی طرح ایک حال پر نہیں رہتی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی ہے اور وصل جاناں کی طرح کسی کے بس کی نہیں۔ اس کا علاج آج تک کسی کو معلوم نہ ہوا۔ علاوہ ازیں انسان کے خمیر میں مصیبت کچھ اس طرح سمائی ہوئی ہے کہ واقعی نہ ہو تو خیال میں اس سے پیچھا نہیں چھوٹتا۔ مصیبت اگر ہمیں چھوڑ بھی دے تو ہم خود اُس کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اگر اپنی مصیبت سے رہائی ہو

تو حریفانِ عشق کی طرح غیر کی مصیبت میں لطف آتا ہے۔ اپنا نقصان نہیں تو دشمن کے نقصان سے جی خوش ہوتا ہے نالش کی ہے تو خدا کرے طرفِ ثانی ہارے۔

ڈربی سوئیپ میں اگر اپنے نام کا ٹکٹ نہ نکلے تو خدا کرے دشمن کے نام کا بھی نہ نکلے —

انسان اگرچہ اپنے عیش و آرام سے کبھی تھک جاتا ہے مگر دشمن کی مصیبتوں میں کمی کا خیال نہیں ہوتا۔ آخر کو مصیبت سے کچھ ایسا اُنس سا ہو جاتا ہے کہ خواہ مخواہ جھینکا ہی کرتا ہے۔ اور یہ نوبت ہو جاتی ہے کہ قاضی جی کی طرح شہر کے اندیشے سے دُبلا رہتا ہے، اپنی گزر اوقات کے لائق اگر اثاثہ ہے تو یہ غم مارے ڈالتا ہے کہ اولاد کے لئے چھوڑنے کو کچھ نہیں، اگر کچھ چھوڑنے کو ہے بھی تو دو بیٹوں اور تین بیٹیوں میں تقسیم ہوتے میں کیا پہنچے گا اور خدا کے فضل سے بیٹے اور بیٹیاں صاحبِ اولاد ہیں۔ پوتے پوتیاں، نواسے، نواسیاں کیسے جئیں گی۔ تپ ہے تو موت کا خیال بندھ گیا سوءِ ہضمی ہے تو ہیضے کا۔

غرض جھینکنے سے کوئی نہیں تھکتا۔ گویا کچھ کیوں نہ ہو رونا نصیبوں میں آپ دیکھتے ہیں کہ یہ عالم ایسا دسترخوان ہے جس پر گو بہت خوش ذائقہ کھانے چُنے ہوئے ہیں۔ مگر زیادہ زہر آلودہ ہیں اور مشکل یہ ہے کہ پہلے سے کسی کو معلوم نہیں کہ کس میں زہر ہے اور کس میں نہیں اس دھوکے میں اچھی چیز کا مزہ بھی کرکرا ہو رہا ہے لیکن جس طرح اچھی صورت دیکھ کر اچھا خیال پیدا ہوتا ہے۔ جی نہیں مانتا کہ جس کی شکل اچھی ہے اس کی طبیعت بُری ہوگی، انسان خوبصورتی کا قائل ہو اور عیب کی تلاش میں رہے حُسنِ عالمِ اسباب مسبب الاسباب کے اچھا ہونے کی دلیل ہے کہ عقائدِ صوفیہ کے لحاظ سے عشق مجازی، عشقِ حقیقی کو پہنچا دیتا ہے عالمِ اسباب کی صورت اچھی نظر آتی ہے تو اس کا دل بھی اچھا ہوگا اور دماغ کا تو کیا پوچھنا اس کے دماغ کی خوبی ہے کہ دنیا میں

کوئی بُرائی نظر نہیں آتی۔ جسے ہم بُرائی سمجھے ہوئے ہیں، محض سمجھ کا پھیر ہے۔ کوئی برائی تمام دنیا کی نگاہ میں بُری نہیں۔ جھوٹ بولنا بُرا ہے مگر شاعری کی جان ہے۔ دینداری اچھی چیز ہے مگر رندی کو اس سے نفرت ہے۔ زندگی اچھی چیز ہے مگر موت کو اس سے ضد ہے، موت کی عملداری زیادہ ہے اور زندگی کی کم۔ جس کو آپ موت کہتے ہیں۔ یہ نقاب چہرۂ یار ہے جو حسن روئے جاناں کو بڑھا رہی ہے بتانِ شوخ کی طرح یہ گھونگھٹ راہ پر لگانے والی چیز ہے، دنیا کی بُرائیاں عالمِ اسباب کی خفیہ پولس سمجھیے۔ جس سے عالم کون و فساد کا انتظام ہو رہا ہے۔ ؎

گُلے را بایں رنگ و بوئے کہ دید

بعالم چنین تلخ و شیریں کہ دید

اور اگر یہ مان لیا جائے کہ دنیا میں بُرائی زیادہ ہے تو اور بھی ہمیں نیکی کی طرف متوجہ ہونا چاہیے کہ حکیم عضوِ ضعیف کا خیال زیادہ رکھتے ہیں۔

گلزارِ نسیم میں مجھے تاج الملوک کا بکاؤلی سے یہ کہنا بہت بھلا معلوم ہوا کہ مجھ سے قصور ہوا سو ہوا

ع تُو نیک تھی بے ملے گئی کیوں

انسان نیک سمجھے جانے کا دعویٰ کرے اور تلاش میں رہے بُرائی کی یہ درست نہیں۔

علاوہ اس کے دنیا میں اگر رنج و آلام زیادہ ہیں تو اور بھی ضرور ہوا کہ خیال میں بیابان میں جو کچھ تھوڑی بہت خوشی کا بہانہ ہاتھ لگے اسے غنیمت سمجھئے۔

یہ تقریب اس بات کی ہے کہ رمضان کے بعد عید نصیب ہوئی تو بہت خوش ہونا چاہیے کہ تیس دن کا عوض ایک دن سے لینا ہے۔

خونِ جگر کا عوضِ شراب سے، وَرَعِ خشک کا تر دامنی سے، چشمِ اشکبار

کا ساغر سرشار سے جس طرح بچے پانی کو دیکھ کر پانی اچھالنے سے خوش ہوتے ہیں ذکرِ عیش ہیں دَورِ مے ضرور ہے کہ سودائے ہوشیار بے ہوشی لاتا ہے، رندانِ مے آشام کو شراب سے ہوش آتا ہے اور نہیں تو نشۂ مے میں رنج وخوشی کا خیال یکساں گزر جاتا ہے، کیونکہ ع

جان کر بھولتے ہیں خوابِ پریشاں اپنا

(صلائے عام۔ اکتوبر ۱۹۱۰ء)

شہرِ خموشاں

دنیا کے تمام شہروں میں پرانی دلّی سے زیادہ کہیں قبریں نہ ہوں گی جو یادگارِ روزگار ہوں۔ دلّی کی برکتوں میں یہاں کی قبریں سمجھی جاتی ہیں کہ بڑے بڑے اولیا اللہ کے مزاروں اور بادشاہوں و وزیروں و امیروں کی قبروں کی گنتی نہیں۔ جنھوں نے ہزاروں لڑائیاں فتح کیں مرے پڑے ہیں، جنھوں نے تمام عمر عیش کیا گڑے پڑے ہیں۔

ایک صاحب کی فرمایش سے مجھے قطب الملک سید عبداللہ خاں کی قبر کی تلاش تھی۔ سنا ہے کہ کسی شاہد بازاری کے پہلو میں جس سے انہیں محبت تھی دفن ہوئے تھے۔ یہ وہ شخص ہے جو فرخ سیر کا وزیر تھا یہ اور ان کے بھائی بادشاہی تو کیا چیز ہے بادشاہ گر تھے کہ جس کو چاہا بادشاہ بنا دیا۔ ان کی قبر کا نشان تو ان کی تقدیر کی طرح شاید مٹ گیا مگر اس خیال میں انسان کی ہستی ناپائدار کا نقشہ میری آنکھوں میں پھر گیا۔ اس لعبت نازکی تصور جس کے پہلو میں وزیر فرخ سیر سو رہا ہے۔ قطب الملک کی لوحِ دل پر اس صورت سے کھینچی نظر آئی کہ عمر خیام کی طرح ایک ہاتھ میں ساغرِ مے ہے مگر اوندھا اور دوسرے میں وزارت کا نقشہ لوحِ نسیاں پر ایسے دھندلے خطوں میں کھنچا ہوا ہے کہ پڑھا نہیں جاتا۔

اس ہستیِ بے ثبات کی طرح دنیا میں قبروں کی ناپائداری بھی افسوس کے قابل ہے

قبروں سے پس ماندوں کے لئے نشان بنا رہنے کا فائدہ ہو تو ہو مرنے والے کے واسطے بیکار ہے۔ ہماری خاک سے سبزہ وگھاس اگر اُگے تو نیچر کے لئے زیادہ بکار آمد ہے اجزا ر لطیف ہوا میں اور کثیف مٹی میں مل کر لالہ وگل پیدا کریں تو کیا کہنا۔ جزو لطیف کا عالم بالا کو پہنچنا ہماری ہستی کی معراج اور خاک سے سبزہ وگیاہ کا اُگنا عجیب لطف ہے کہ ہر بہار وخزاں میں عالم ہستی وفنا کی تصویر پیش نظر رہے گی نئی کونپلیں عالم ایجاد کا نمونہ سمجھے کہ چند روز بہار دکھا گئیں اور برگ خزاں رسیدہ ہماری خزاں کا ثبوت کہ خدا جانے کہاں گئے اور کہاں نہیں۔

انسان کے لئے اپنی مصیبت کا بھولنا بڑی نعمت ہے۔ مر کر فنا ہو جانے میں گویا اپنی مصیبت کو بھول جانا ہے۔ ابنائے زماں کے ہاتھوں انسان ایسا نالاں جاتا ہے کہ ہم اسے یاد کریں تو کریں۔ مرنے والا ہمیں کیا خاک یاد کرے گا۔ سبب یہ کہ جب کسی کو دنیا میں آرام نہیں تو اس سے چھٹ کر دُنیا کا خیال رکھنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ انسان کو جب اپنی ہستی کا مآل معلوم نہیں تو یہاں آکر بہت سے گورکھ دھندے سوچتا ہے اور جب دل کو تسلی نہیں ہوتی تو رات دن الغرض کے بنانے اور بگاڑنے کی فکر میں لگا رہتا ہے رنج ومصیبت سے بچنے کی فکر میں عیش وآرام کی تلاش کرتا ہے۔ نیکی پر قابو نہیں تو برائیاں کرتا ہے اور زندگی سے عاری ہو کر چلا جاتا ہے۔ جانے کے بعد پھر اس دار محن کی طرف منہ پھیر کر نہیں دیکھتا۔ مرے ہوؤں میں اقبال ونحوست، خوش حالی ومحتاجی، عیش ومصیبت پیری وجوانی کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔ جس طرح مرغان چمن جو صبح کو چہچہا رہے تھے، غروب آفتاب کے بعد چپ ہو جاتے ہیں، مرنے کے بعد انسان نہ اپنی کہتا ہے نہ ہماری سنتا ہے اور جس طرح بوئے گل باغ سے نکل کر پھر باغ میں نہیں آتی۔ انسان کو پھر دنیا کی طرف منہ کرتے نہیں دیکھا۔ اسی لئے قیامت کی ضرورت ہوئی کہ ایسے روٹھے قیامت ہی کو منیں تو منیں، دولت مندوں کے لئے قیامت ہو یا نہ ہو مگر مصیبت زدوں کے لئے جو دنیا سے بیزار گئے

قیامت کا نہ ہونا قیامت ہے۔

مجھے گمان تھا کہ کتبے کے بغیر مرد و عورت کی قبر کا امتیاز کرنا مشکل ہے مگر پرانی قبروں میں یہ امتیاز دیکھنے میں آیا کہ عورت کی قبر پر تختی بنی ہوتی ہے اور مرد کی قبر پر قلمدان کی شکل۔ اس امتیاز کی وجہ مجھے معلوم نہ ہوئی جن صاحبوں کو اس کی تحقیق ہو از راہِ کرم صلائے عام میں لکھیں۔

ایک بات اور عرض کرنے کے لائق یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کے ساتھ سلوک کرنے کے طریقوں میں قبرستان کا رواج سب سے زیادہ بکار آمد ہے کہ قبر سے اچھی یادگار بنی رہتی ہے اور تاریخ کے طور پر جو کتبے نظم یا نثر میں اہل اسلام کی قبروں پر دیکھے گئے عبرت کے لئے ان سے بہتر سامان نظر نہیں آیا۔ یہ وہ نطق خموشان ہے جو عمر بھر جینے اور مرنے کا حال آیندہ روندگاں سے دیکھتے ہی کہہ دیتا ہے۔ ؎

ترا جویم زہر نقشے کہ دانم
توئی مقصود ہر حرفے کہ خوانم

ابجد کے قاعدے سے تاریخ نکالنی مسلمانوں کی ذہانت کا بڑا ثبوت ہے کہ کسی اور زبان میں یہ کمال اور خوبی دیکھنے میں نہ آئی۔ یہ فن اہل اسلام کا خاص حصہ ہے۔ اس فن میں مسلمان تمام دنیا سے بازی لے گئے۔

اس کے سوا موت اور موت کے بعد کے متعلق سب سے زیادہ لٹریچر مسلمانوں میں ہے۔ یہ مضمون ایسے ایسے پاکیزہ ہیں کہ کسی زبان میں اگر ہوں گے تو اسی قدر ہوں گے مگر اس سے زیادہ اور ایسے دلکش نہ ہوں گے۔ تمثیلاً یہ روایت سننے کے لائق ہے کہ حضرت بایزید بسطامیؒ نے بڑی عمر میں وفات پائی قبر میں منکر نکیر نے ان سے سوال کیا۔

"بڑے میاں۔ اللہ میاں کے لئے کیا لائے ہو"؟

حضرت نے جواب دیا "گدائے چشم بر در جب بارگاہ سلطانی پر پہنچے تو اس

سے نہیں پوچھتے کہ کیا لایا ہے۔ بلکہ یہ پوچھنا چاہیے کہ کیا مانگتا ہے۔ مجھے تو اپنا حق خدمت درکار ہے کہ سگِ نفس جو میرے دل میں بٹھا دیا گیا تھا اس کی نگہبانی میں ایک عمر بسر ہو گئی اس خدمت کا حق ملنا چاہیے۔

چشم رحمت برکشا موئے سپید من نگر
زانکہ از شرمندگی روئے سیاہ آوردہ ام

آپ ماریں اور مردہ سے باز پرس ع

ساقیا گرد سر ناز تو گردم کہ اگر — بشکند جام بدست تو زمینا رنجی
وعدۂ وصل درست است ولے می ترسم — کہ چو فردا شود از وعدۂ فردا رنجی

تمام عمر تو ہم نے جو کچھ چاہا ہمیں کرنے دیا۔ مرنے کے بعد اک ذرا عفو کی امید سے منہ پھیر لینا نئی بات ہے۔

تو بصد جرم ز مشتاق نمی رنجیدی — چیست اکنوں کہ بیک عرض تمنا رنجی
جاں نثار تو نکردن چہ گناہ است عظیم — نیست بیجا اگر از خضر و مسیحا رنجی

یار کے سامنے ادھر اُدھر دیکھنا کمال بے ادبی سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے مردے آنکھیں بند رکھتے ہیں اور کسی سے نہیں بولتے۔

تو کہ ضبط نگہ خود نہ توانی کردن — منع رسوائی احباب چرا باید کرد
باعتبار جہاں اعتبار نیست مرا — دمائے دشمنیٔ روزگار نیست مرا

آپ ہم سے اپنا حساب مانگتے ہیں۔ ہمارا حال نہیں پوچھتے کہ ہم پر خدا جانے کیا کیا گزر گئی۔

بسے نفس امارہ آوارہ گشت — نہ پرسی ز من آنچہ بر من گزشت

حضرت مولوی حکیم نظامیؒ فرماتے ہیں۔

منہ بیش از کشش تیمار بر من — بقدر زور من نہ بار بر من
ہدایت رابمن دہ بار نستان — چو اول دادی آخر بار مستان

چناں خسپاں کہ آید وقت خوابم — کہ گریزد گلم مانند گلابم
چناں دارم کہ درنا بود در بود — چناں باشم گواں باشی توخوشنود
اگر بودی زمشت خاک خوشنود — ترا بنود زیاں مارا بود سود

اسی طرز پر آہلی شیرازی نے خوب کہا ہے ؎

اجل گر کند چاک پیراہنم — نگیرد غبار جہاں دامنم
چو در تنگنائے لحد جا کنم — در آں محنت آباد ماوا کنم
نویدے وہ از لطف وبخشائیشم — کہ باشد در د خواب آسائیشم

آخر میں حضرت مولانا جامیؒ کا شعر لکھنے کو جی چاہتا ہے کہ ؎

جامی بروئے خاک چو یک زندہ یافت نیست
خوش وقت مردگاں کہ تہِ خاک خفتہ اند

(رصلائے عام ۔ ستمبر ۱۹۱۰ء)

دعوتِ ایّام

سرکاری عملداری سے پہلے کی باتیں ہیں کہ اگلے نوابوں اور رئیسوں کے ہاں جب کسی کو سزائے قید ہوتی تو آدابِ اسیری میں تھا کہ پہلے نیا اسیر پرانے قیدیوں کی دعوت کرے تب یہ اسے برادری میں ملاتے تھے اور چونکہ بقولِ مرزا غالب جس طرح اس عالم کے گنہگار عالمِ آیندہ میں سزا پائیں گے، کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ وہاں کے گنہگار یہاں اس مظلمہ میں بھیجے جاتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ جب گردشِ دوراں سے زمانے کو قیدِ ہستی نصیب ہوئی تو اس کو بھی دعوتِ ایام کرنی ضرور ہوئی۔ سالانہ تقریبوں کے ذمہ دعوت کا اہتمام سپرد ہوا ساری تقریبوں نے بڑی خوشی سے یہ کام اپنے ذمّے لیا کہ اوروں کی رنج و خوشی کی تقریبوں میں شریک ہوتے ہوتے تھک گئے تھے آج اپنی تقریب میں ذرا دھوم مچالیں ؎

برگیر جنگ و جام در دہ صلائے عام
بہتر ازیں چہ کار خوشتر ازاں کدام

پہلے تو یہ بحث ہوئی کہ روزوں (صیام) کو بھی بلایا جائے یا نہیں؟ بعضوں کی رائے ہوئی کہ کھانے پینے میں مخل ہوں گے انھیں جانے دو۔ مگر عید نے ان کی سفارش کی اور

کہا کہ ان کے بغیر میں نہیں آسکتی اور چونکہ عید کی خاطر سب کو منظور تھی کہ برس کے برس آتی ہے اس کا روٹھنا اچھا نہیں، روزوں کو بھی بلانا پڑا۔ کل ۳۶۵ مہمانوں کی دعوت ہوئی اور سال کبیسہ کے خیال سے شب برات کی نیاز کی طرح حقدار امیدوار کی جگہ آخر میں چھوڑنی پڑی۔ غرض ۳۶۵ جگہیں پختہ اور ایک آئے گئے کی رہی۔

بدعتیوں کی "شب برات" لکھنؤ کے "محرم" اور پیرزادوں کے "عرسوں" سے کہا گیا کہ مہمانوں کے لئے روشنی اور سامان آرائش تمہارے ذمّے ہے۔ عید الاضحےٰ کو گوشت کا ٹھیکہ ملا کہ جس قدر دعوت میں ضرورت ہو وہ تم دینا اور حلوہ شب برات کے ذمے رہا۔ چار پہر اس کام پر مقرر ہوئے کہ دعوت کے رقعے پہنچائیں۔ انہیں اختیار دیا گیا کہ ۲۴ گھنٹے اور اپنے ماتحت اسی کام پر رکھ لیں کہ سب کو وقت پر اطلاع پہنچ جائے تاکہ کوئی مہمان آگے پیچھے نہ آئے۔ آج کل کی تہذیب کے خیال سے وقت کا اچھا انتظام کیا گیا لیکن مسلمانوں کی قسمت کہ "رویت ہلال" عجیب آشفتہ طبیعت نکلی کہ نہ آپ وقت پر صورت دکھائی نہ عید، بقرعید، محرم، شب برات میں سے کسی کو وقت پر آنے دیا۔ اس سے از روئے تہذیب جدید ذرا بے لطفی رہی کہ امسال دہلی کی عید کی طرح ایک دن روزے توڑے دوسرے دن نماز پڑھی، لیکن اور سب طرح خیریت گزری کہ کوئی تقریب ناغہ نہیں ہوئی اور آخر کو آگے پیچھے سب شریکِ دعوت ہو گئے۔

آپ نے دیکھا ہے کہ ہندوستان میں ادنیٰ سی تقریب میں کس قدر شور مچتا ہے۔ جہاں ساری تقریبیں اکٹھی ہوں اس دن کے شور کا حال نہ پوچھئے۔

کوئی کہہ رہا تھا کہ خوب آئے! کہیں غل تھا کہ کہاں رہے! عید سے ہر شخص پوچھتا تھا کہ تم نے مدت میں شکل دکھائی۔ چاند کدھر نکلا! روزوں کو لوگ دیکھ کر کہنے لگے کہ یہ تو پہلے ہی آموجود ہوئے۔ گرمی ہو، جاڑا ہو، برسات ہو۔ یہ بغیر آئے نہیں رہتے روزِ فراق اور شبِ ہجر کا کالا منہ۔ یہ سب سے پہلے آن موجود ہوئی۔ شبِ وصل کو عاشقوں

نے بہت ڈھونڈا مگر خیال کے سوا کہیں پتا نہ لگا۔ یومِ فردا نے کہلا بھیجا کہ میں بھی آنے والا ہوں اس کا نیچریوں کو تعجب ہوا مگر روزِ قیامت کی زبانی معتبر خبر لگی کہ یہ دن بھی ضرور آنے والا ہے بلکہ رقعہ پر دستخطی جواب تھا کہ میرا انتظار رہے۔ غرض یہ جلسہ خوب تھا۔ وہ ہجوم ہوا کہ ایک دوسرے کا پہچاننا مشکل ہو گیا۔ یہاں تک کہ نجومیوں کے بغیر یہ معلوم ہونا بھی مشکل ہوا کہ اچھی ساعت کونسی ہے اور کھوٹی گھڑی کون سی۔ برسی، چھ ماہی، سہ ماہی، چالیسواں اور سوئم تو وہابیوں کے مارے ایسے کہیں چھپے کہ ڈھونڈھے سے بھی بمشکل ملے۔ شامِ غریبی کہیں دور کونے میں اکیلی بیٹھی رہی۔ صبحِ وطن پر مگر سب کی نگاہ جاتی تھی۔

اس وقت اپنے بھلے دنوں کو ہم نے بہت ڈھونڈا کہ یہ کہاں ہیں؟ معلوم ہوا کہ گردشِ زمانہ کے ساتھ مدت ہوئی کہ نکل گئے۔ میں نے پوچھا کہ ان کی کوئی یادگار بھی ہے۔ کہا کہ کوئی نہیں رہا صرف دو چار بڑھیاں تواریخ نامی باقی رہ گئی تھیں وہ بھی جب سے ہماری زبان پر آفت آئی معلوم نہیں کہاں ماری پھر رہی ہیں لیکن معلوم نہیں یہ بربادی کس لئے؟

تمنا وصل کی چھوڑی غمِ ہجرِ بتاں کیوں ہو
بہار آئے نہ جس گلشن میں واں دخلِ خزاں کیوں ہو

(صلائے عام۔ اکتوبر ۱۹۱۰ء)

مضمون پریشاں

صلائے عام کے اور مضمون تو جیسے ہیں ویسے ہیں مگر "مضمون پریشاں" لوگوں کو زیادہ پسند ہے کہ یہ ایک طرزِ خاص ہے اور مضامین تو ایک ہی سُرخی کے پابند رہتے ہیں۔ اس میں نیرنگِ زمانہ کی طرح کسی خاص وضع کی شرط نہیں ؎

تو نے دیکھے نہیں بکھرے ہوئے گیسو بُلبُل
جس میں اُلجھے ہوں ہزاروں دلِ مضطر بُلبُل
سو دِل سے پسند آؤ گے جس حال میں نکلو
آشفتگیٔ گیسوئے پُرتاب میں آؤ

....

مرا اوّل کُند کافر نگاہش
کہ تا در کشتنم بنود گناہش

اللہ میاں نے بندے کو اختیار اُسی قدر دیا ہے جس قدر کہ انسان کو گناہگار ثابت کرنے کے لئے کام آئے۔

تعزیرات ہند اسی لئے حفظ کرائی گئی کہ فردِ جرم لگانے میں

دقّت نہ ہو۔ دفعہ کا نام لیتے ہی اُس کا رنگ فق ہو جائے یہ نہ کیا کہ ؎

نا کردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

میرے پاس ایک مثنوی عبدالرحمان حیرت کی قلمی اردو میں ہے جس کے ڈراماٹس پرسونے DRAMATIS - PERSONE (یعنی افراد) پاکیزہ رکھے گئے ہیں۔ عالمِ ارواح میں بادشاہ کے بیٹے کا نام دل اور وزیر کا نام عقل تھا۔

دل کا مصاحب شوق اور عقل کا صلاح کار صبر تھا مگر شوق کے آگے صبر کی نہیں چلتی تھی دل کے وقائع نگار فغان و نالہ و آہ تھے اور اُن کی فوج کا سردار غم تھا۔

حسن کے حلیفوں میں وعدہ نامی ایک حسین تھی جس کی چھوٹی بہن کا نام انتظار تھا ؎

بدخُو مکن بہ وعدۂ وصل اہل درد را
بگذار تا بمحنت ہجر تو خو کنند

جان کو جسم کے قلعے میں بند کیا ہے اور تمنّا کو زندان فراموشی میں قید کیا۔ حکم ہوا کہ قید میں نگاہ کا پہرا رہے کان آئے گئے کی خبر رکھیں۔ نزاکت سے کہا کہ خبردار کوئی چھُونے نہ پائے۔

حافظہ خزانچی ہوا اور کوتوالی غصّے کو ملی۔

لیکن سب سے اچھا کام خیال کو ملا کہ خیال کو رنگ لانے کا حکم ہوا۔

جوانی ہمنشینی کو ملی اور ہوا و ہوس خدمت کو۔

یعنی یہ سب ایک رات کی کہانی تھی جو صبح ہوتے ہی یعنی موئے سپید دیکھتے ہی غائب ؎

جو ہمدرد بھتے وہ لگے چھوٹنے　　محبت کے شیشے لگے ٹوٹنے
جو ہستی سے گزرا تو گزرا ہی جان　　نہیں اور معمورہ اے خوش بیان
نہ اٹھے گا تا حشر پھر گور سے　　نہ چونکے گا ہر گز کسی شور سے

نہ شانہ ہلانے سے آئے گا ہوش
نہ مر کر کے دیکھیں سنیں چشم و گوش

انگریزی میں جان بنیان صاحب کی "پلگر میس پراگرس" کو لاجواب سمجھتے ہیں کہ اس سے بہتر اور ایک ہی مضمون پر اتنی طویل ایلیگری ALLEGOREY لکھنی مشکل ہے اُردو میں یہ مثنوی حیرت کی وسعت خیال اور پاکیزگی بیاں میں واقعی نہایت پاکیزہ ماسٹر پیس ہے کہ پلاٹ اور شاعری کا نمونہ جو مختصر سا یہاں لکھا گیا یہ دراصل قلمی ۲۴۶ صفحوں میں مشکل سے آیا ہے۔

"نوشتہ ایم"

اس ردیف میں اکثر شاعروں نے زور لگایا ہے نظیری نیشاپوری کی غزل کا ایک شعر مجھے یاد ہے۔ ؎

روئے نکو معالجہ عمر کوتہ است
ایں نسخہ از بیاض مسیحا نوشتہ ایم

اس شعر کو جب یاد آتا ہے از روئے شاعری میں بے اختیار گُن گُنایا کرتا ہوں لیکن "نوشتہ ایم" کے یہ شعر جو میں نے ایک بیاض میں دیکھے مجھے قیامت تک نہ بھولیں گے آپ بھی سُن لیں۔

از معجزِ لبت چو طبیباں بہ التماس
یک نسخہ از برائے مسیحا نوشتہ ایم
نسیاں نہ طرزِ ماست ولے بہر احتیاط
بہ لوحِ سینہ نامِ تو صد جا نوشتہ ایم
نازاندم کہ مشق بادیہ گردی نمودہ ایم
بر جائے لفظ آبلہِ پا نوشتہ ایم
دور افگند پسر ز پدر جذبہائے عشق
تعبیر خواب ہائے زلیخا نوشتہ ایم

"دور افگند پسر ز پدر" الخ جذبہائے عشق کا اثر اس طرح کہنا ذرا مشکل ہے۔ یہ ادائے بیاں میرے آپ کے بس کی نہیں اگر یہی لیل و نہار رہے جو میں دیکھ رہا ہوں تو اس طرح بیان کے سمجھنے کے بھی لالے پڑ جائینگے۔

اپنی زبان کی ادائے بیاں کا ذکر آئے تو مجھ سے رہا نہیں جاتا گیتا نجلی کی داد میں جو مضمون میں نے لکھا تھا اس کی نسبت ایک صاحب نے مجھ سے کہا ہے کہ ریویو بہت اچھا تھا مگر نازک خیالی میں گیتا نجلی کو نہیں پہنچتا' اُن سے کون کہے نسبتی کا یہ شعر آپ کیسا سمجھتے ہیں ؎

پشیمانی چہ سود اکنوں کہ در بندِ تو افتادم
تو جاں میخواستی از من چہ بد کردم کہ دل دادم

اس شعر کا مضمون اول تو شاید ہی کسی اور زبان میں اس نزاکت سے ادا ہو سکے کہ جان و دل میں آسمان و زمین کا فرق بیان ہو گیا۔ دوسرے فارسی میں بھی اگر کسی سے ادا ہو سکا تو اس سے بہتر ممکن نہیں کہ ع

تو جاں میخواستی از من چہ بد کردم کہ دل دادم

"چہ بد کردم" کا کیا کہنا۔ دوسرے اس سے بڑی غلطی اور کیا ہو سکتی ہے کہ یار نے مانگا کچھ اور ہم نے دیا کچھ اور دل دیا اور جان نہ دی گئی حق جاناں جان پر تھا۔

کسی زبان کا آپ اس طرح کا PATHETIC شعر سنائیں تو میں جانوں ؎

نمک شناس اسیراں چو از قفس رستند
بہ نخل خانۂ صیاد آشیاں بستند

آپ ذرا تحقیق کر کے دیکھیں کہ اہلِ ہند نے جب فارسی زبان میں اہلِ زبان کے برابر کمال پیدا کیا تو اردو اس مرتبہ کو پہنچی جو آج اُسے حاصل ہے۔ اہلِ ہنود میں جو زبان فارسی کے باکمال گزرے ہیں۔ اُن کا ذکر ایک دو جلدوں میں آنا مشکل ہے۔ مشہور لوگوں کا ذکر مثل رائے ٹیک چند بہار و آنند رام مخلص اور مرزا قتیل وغیرہ کو چھوڑ کر بعض کم مشہور لوگوں کا کلام جب میری نظر سے گزرتا ہے تو واہ واہ کے سوا کچھ زبان سے نہیں نکلتا۔

رائے مولچند احسان کہتے ہیں ؎

سحر با غنچۂ میگفت سنبل از پریشانی
ستم باشد بہ جمعیت زیاراں چشم پوشیدن

بندرا بن خوشگو کا شعر ہے ؎

اے کہ رختِ سفر از دارِ فنا مے بندد
محملِ داغ بہ دوشِ دل ما مے بندد

گوربخش حضوری ؎

عشق ظالم دوست چوں عاشق کشی بنیاد کرد
انچہ با پرویز میبائیست با فرہاد کرد

برہمن:

زقسمت ازلی سرنمیتواں پیچید
نصیب کرد ہمارا بہ استخواں محتاج

دُنیا میں اگر خوشی و عیش کا وجود نہیں تو شام کو زمانے کے چہرے پر سُرخی کیوں آجاتی ہے گویا کسی حسین نے غازہ ملا ہو۔ اس سُرخی سے میری مُراد شفق ہے لیکن اس تمثیل سے بہتر یہ تشبیہہ ہے ؎

نہ عشرتے نہ سرورتے چہ شد نمیدانم
کہ جامہ بر تنِ طفلان اشک گلگوں شد

دیکھئے اشک خونیں کیا رنگ لاتے ہیں !۔

دُنیا میں مصیبت اُٹھانے کے لئے کیسا اچھا سہارا ہے ؎

باایں اُمید کہ گشتی شہید غمزہ او
بہ صبر کوش دلا ورنہ مُردن آسان است

خودکشی کی تردید اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے ؟

دُنیا کہ بجز نمود آرائش نیست
راحت مطلب درد کہ گنجائش نیست

لے ذرّہ چہ اضطراب بیہودہ کنی
درسایۂ آفتاب آسائش نیست

آج جو نالہ کھنچا دل سے پریشاں ہی کھنچا
کچھ خیال ایسا بندھا زلف پریشاں کی طرف

جو آنسو کسی کے غم میں ٹپک جائیں اُن کا اثر صرف دیکھنے والوں پر ہوتا ہے۔ مگر وہ آنسو جو کہ انسان پی جاتا ہے اُن کا اثر اُسی کے دل پر ہوتا ہے اور یہ بہتر ہے کہ اوروں کا دل دُکھانے سے اپنا دل دُکھے۔

یہ جھُرّیاں جو بڑھاپے میں چہرے پر دکھائی دیتی ہیں، اُسی موجِ اشک کے ٹکڑوں کے نشان ہیں جو کسی کے غم میں میں نے یا آپ نے پی لئے، وہ اشک جو آنکھوں سے نہ ٹپکے اور دل میں جذب ہو گئے تو جذب ہوتے ہوتے دل سے چہرے پر رنگ لائے بغیر نہ رہے ؎

وہ چلتے پھرتے آنکلے تھے کھولے بال گلشن میں
لگی اک اوس سی پڑنے بہارِ سنبلستاں پر

سب سے اچھا وہ رونا ہے جس میں آنسو نہ نکلے اس کے بعد اس رونے کا مرتبہ ہے جس کی خبر کسی کو نہ ہو۔ یعنی تنہا گریستن ورنہ ع

می زیبدت بہ نرگس شہلا گریستن

بڑھاپے میں زندگی اس طرح بسر کرنی چاہیے گویا ہم کسی کی قبر کے نشان ہیں کہ مزار کو پھولوں سے جس قدر ڈھانکئے اُسی قدر قبر چھپتی جائیگی، ہم کو اپنی ہستی اگر مٹانی نہیں ہے تو دُنیا کے تعلّقات سے بچنا مناسب ہے، دُنیا میں زمین کی طرح

آسمان بھی مٹی کا ہوتا تو اس قدر جورِ فلک دیکھنے میں نہ آتے ۔

کہتے ہو تم کہ جانتے ہیں اب رات کم رہی
کیا وعدہ صبح کا بھی کسی سے مگر ہوا

پچھلی رات مجھے اس کام کے لئے زیادہ پسند ہے کہ تھوڑی رات رہے جب آنکھ کھلے تو جو مضمون پہلے کا لکھا ہوا ہے اُس کی نوک پلک ۔ کی ۔ کا ۔ دیکھ جاؤں اس وقت وہ غلطیاں نظر آجاتی ہیں جو پہلے نظر نہ آئیں اس سے میری غرض یہ ہے کہ جوانی میں جو کچھ کیا ہے بڑھاپے میں اس پر ایک نظر ڈال لی جائے ۔

یہی زندگی اچھی جو اس وقت ہمیں حاصل ہے اس لئے کہ اس حالت میں ہم شرمندۂ فنا نہیں کہ ہمارے مانگے سے موت نہیں اور شرمندۂ بقا بھی نہیں کہ ایک دن کی زندگی کا بھی بھروسا نہیں ۔

خضر کی زیست نہ دینا یونہی بھلا ہوں میں
خجل فنا سے نہ شرمندۂ بقا ہوں میں

(صلائے عام ۔ اپریل ۱۹۱۴ء)

موت

مجھے معلوم نہیں کہ موت کا خیال انسان کے لئے ہیبت ناک سمجھا جائے یا نہیں۔ مذہب والوں نے اسے ہیبت ناک بنانے میں بڑی مصلحت سمجھی کہ انسان کے لئے موت کا خوف نیک اعمال کا باعث ہو جائے تو اچھا ہے۔ صوفیائے کرام نے اس کے خوف میں بہت کمی سے کام لیا کہ موت کو وصال جاناں شاعروں نے اسے کھیل کر دیا کہ یار کی ہر ادا پر جان دینی کچھ بات ہی نہیں۔

اہل کتاب سے پہلے یعنی توریت وانجیل اور قرآن مجید ابھی نازل نہ ہوئے تھے کہ بت پرستوں میں موت کی شکل کو انسان کے ڈھانچے سے جن میں ہڈیوں کے سوا گوشت و پوست کچھ نہ ہو تشبیہہ دیتے ہیں لیکن موت سے تشبیہہ دینے کی پاکیزہ تمثیلیں اس طرح دی جاتی تھیں کہ چڑیاں کیڑوں کو کھا رہی ہیں۔

چڑیا نے کیڑا دیکھا نہیں اور چونچ سے جھنجھوڑ ڈالا یا پھول و پھل چونچ سے نوچ رہی ہے کہ کلی نے ابھی سر نہیں نکالا اور چڑیا نے نئی کونپل کھٹک لی بکریاں، انگور کی بیلوں کو جن میں انگور کے خوشے لٹک رہے ہیں۔ ساگ پات کی طرح چبا رہی ہیں — مرغ بازی میں مرغ ایک دوسرے سے لڑنے میں جان پر کھیل جاتے ہیں۔ بلی نے چوہے

کو پکڑا اور اس سے کھیل رہی ہے۔

ہومر یونان کے نامور شاعر نے موت کی تعریف میں مرنے کو نیند کا بڑا بھائی باندھا ہے۔ اور رومیوں نے اپنی لٹریچر میں اسی تشبیہہ کو پسند کیا۔ اہل عرب بھی نیند کو موت کی بہن کہتے ہیں۔

قدیم رومیوں کی قبروں پر دو فرشتوں کی شکل اس طرح بنائی جاتی تھی کہ ایک کے ہاتھ میں مُردہ کے پھولوں کا برتن اور دوسرے کے ہاتھ میں مشعل مگر معکوس کہ لَو زمین کی طرف ہے

اس نے انگشت رکھی فاتحہ کو فندق بند
شمع معکوس کو میں لحد پہ روشن سمجھا

مگر سب سے پاکیزہ تشبیہہ انسان کی روح کی تیتری سے دی جاتی ہے جو ایک بدشکل کیڑے کے قالب سے کیسی خوبصورت شکل میں پیدا ہوتی ہے اور باغوں میں زندگی بسر کرتی ہے۔

ہیروڈوٹس نامی مورخ لکھتا ہے کہ قدیم مصریوں میں عیش و نشاط کے جلسوں میں ایک شخص اس کام پر تعینات کیا جاتا تھا کہ مُردے کے ڈھانچ کی شکل سارے مہمانوں کو دکھا کر یہ کہتا جائے کہ!۔

"ایک دن تمہارا بھی یہی حال ہونا ہے اسی لئے کھاؤ پیو اور خوش رہو! قدیم عیسائیوں میں موت کی تشبیہہ ہڈیوں کے ڈھانچ سے خوف پیدا کرنے کے واسطے اسی لئے موزوں سمجھی گئی کہ توریت کی رو سے موت منع کئے ہوئے پھل کے کھانے یعنی خدا سے نافرمانی کی سزا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ انسان کے لئے موت اپنی ذات سے بہت ہیبت ناک ہونی چاہیے۔ وہ اسباب جن سے موت آئے البتہ ہولناک سمجھے جاسکتے ہیں نہ کہ

خود موت ہولناک سمجھی جائے۔ کوٹھے پر سے گرنا البتہ ہولناک ہے۔ لیکن گرتے ہی دم کا نکل جانا تکلیف سے بچ جانا ہے دنیا کے تمام درد و تکلیفوں کا علاج موت ہے جس سے دُکھ درد مٹیں، وہ خود تکلیف اور خوفوں کا باعث ہو، میری سمجھ سے باہر ہے انسان کی پیدائش اگر پیدا ہونے والے کے لئے خوفناک ہو تو مرنا بھی مرنے والے کے لئے خوفناک ہونا چاہیئے ایک میں بے خبری اور دوسرے میں تکلیف معقول دلیل نہیں۔

پیدا ہونے میں جس طرح صرف زچہ کو تکلیف ہوتی ہے اور بچے کو خبر نہیں ہوتی۔ اسی طرح موت میں دیکھنے والوں کو تکلیف ہو تو ہو مرنے والا ہر طرح کی تکلیف سے چھوٹ جاتا ہے موت دراصل ہر طرح کے محسوسات سے غفلت کا نام ہے۔

موت کو ہیبت ناک قرار دینا نازک خیالی کا خون کرنا ہے اول تو خدا تعالےٰ نے اسلام میں موت کے لئے ایک فرشتہ مقرر فرمایا ہے اور خدا کی مخلوق میں فرشتے سے زیادہ پاکیزہ صورت اور پاکیزہ طبعیت دنیا میں کوئی چیز نہیں سُنی۔ تیمارداری میں سب سے بہتر تیمارداری عزیزوں کی سمجھی جاتی ہے کہ اپنے ہیں اور ولایت میں عورتیں تیمارداری کے لئے زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں کہ اُن کا دل نرم ہوتا ہے خدا تعالےٰ کا ہم پر بڑا فضل و کرم سمجھئے کہ آخیر میں ہمیں فرشتے کی صورت دکھادے گا۔

موت کو ہڈیوں کے ڈھانچ اور کریہہ شکلوں سے جیسی کہ بُت پرستوں میں تمثیل دی جاتی ہے قیاس کرنا دل و دماغ کی تکلیف کا سبب ہے یہ رواج زیادہ تر اُس وقت کے عیسائیوں اور عیسائیوں سے پہلے کا ہے جو بزرگوں کی ہڈیاں تُبرک سمجھ کر بزرگوں کی قبروں اور ہڈیوں کی پرستش عبادت میں سمجھتے تھے لیکن سب سے زیادہ رواج قدیم عیسائیوں اور بت پرستوں میں موت کے ناچ کا تھا وجہ یہ کہ دنیا کے عیش کو ذلیل کرنے کے لئے یہ بات ذہن میں آئی کہ انسان جسقدر دنیا میں عیش و آرام سے بسر کریگا موت اُس کا عوض نکال لیگی اور جس طرح دشمن

کے مرنے کی خوشی ہوتی ہے موت جو زندگی کی دشمن ہے خوب ناچے کودے گی اور اس طرح جو مزے ہم نے دنیا میں اُڑائے ہیں، اُن کی کسر نکالے گی۔ یہ عقیدہ گورستان اور ویرانوں میں غول بیابانی کے ناچنے اور قبروں میں شہابے کے دیکھنے کا ہے کہ انسان کے ڈرانے کے لئے بھوت پریت ویرانے میں ناچتے کودتے سنے جاتے ہیں۔ بُت پرستی میں ناچنا کودنا عبادت کا جزو سمجھا جاتا ہے، اس کا شائبہ ہر فعل میں کم وبیش نظر آئے گا۔ اسلام کے سوا اکثر قدیم مذہبوں میں ناچنا کودنا گانا بجانا عبادت میں داخل تھا۔ وجہ یہ کہ اگلے لوگ حافظے کا تعلق کانوں سے سمجھتے تھے اور جیسا کہ اب بھی دستور ہے، عبرت کے لئے کانوں کو پکڑتے ہیں کہ جو کچھ سمجھا گیا وہ یاد رہے۔ ڈوم ڈھاری اور مداری وغیرہ استاد کے نام پر کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں کہ اس سے استاد کی عظمت یاد رہے گی۔ اسی طرح گانے بجانے سے خدا کی یاد کو مدد ملنے کا گمان تھا۔ یورپ کی قدیم تاریخ میں موت کے ناچنے گانے کا بہت ذکر ہے بلکہ عیسائی ہونے کے بعد بھی مدت تک اس قسم کا رواج رہا۔ یہاں تک کہ بڑی مشکلوں سے گورستان اور عبادت خانوں میں ناچنا کُودنا بند ہوا۔ اس کی ممانعت کے لئے پادریوں نے بد دعائیں دیں اور اس کے بدلے مذہبی جشن اور مقدس لوگوں کے عُرس کی تقریبیں ایجاد کیں۔

اس وقت کی تصویریں موت کے ناچ کی جو مصوروں نے کھینچیں۔ ولایت میں عجیب وغریب سمجھی جاتی ہیں ان کا مرقع ایک دفعہ میری نظر سے گزرا۔ جن میں سے چند تصویروں کا ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

۱۔ پہلی تصویر موت کی اس وقت کی تھی۔ جس وقت کہ حضرت آدم کی پسلی سے نیند کی غفلت میں (جو اخ الموت ہے) حضرت حوّا پیدا ہوئیں۔

۲۔ دوسری اس وقت کی تصویر ہے۔ جس وقت حضرت آدم و حوّا، بہشت

سے نکالے گئے ان کے آگے آگے موت خوش ہوتی اور ناچتی چلی جارہی ہے۔

۳۔ پھر پیٹ کے لئے محنت کرنی پڑی تو حضرت آدم کے ساتھ موت بھی پھاوڑا چلارہی ہے۔

۴۔ حکیم جی کی تصویر ہے۔ اور موت ایک مریض کا ہاتھ پکڑے حکیم جی سے کہہ رہی ہے کہ زیادہ تکلیف نہ کیجئے۔

۵۔ نجومی سے موت کہہ رہی ہے کہ کرہ آسمان کا دیکھنا چھوڑو۔ مردے کی کھوپڑیاں دیکھو۔

۶۔ بخیل کی دولت موت سمیٹے لئے جاتی ہے اور وہ چیخ رہا ہے۔

۷۔ موت بوڑھے کو راگ سنا رہی ہے کہ بہشت میں حوریں تیرے انتظار میں ہیں اور بوڑھا بہرا ہوگیا۔

۸۔ موت دولھا دلھن کے آگے ڈھول بجاتی جارہی ہے کہ مجھے بھی دعوت میں بلانا۔

۹۔ موت کھیلتے بچے کو ماں باپ کے سامنے سے پکڑے لئے جاتی ہے۔

۱۰۔ سپاہی نے اپنے دشمن کو تلوار سے مارا اور موت نے فوراً اس کے سر پر کلھاڑی ماری۔

۱۱۔ جواری کے لئے موت اور شیطان دونوں جھگڑ رہے ہیں کہ میں لے جاؤں یا تو۔

۱۲۔ شرابی کے ہاتھ سے ساغر چھٹا ہے اور موت کھڑی مزاج پوچھ رہی ہے۔

۱۳۔ بے وقوف ناچ رہا ہے اور موت تھپک رہی ہے غرض ایسے ہی بہت سے عبرتناک سین دکھائے ہیں جن کو دیکھ کر موت سے خوف ہوتا ہے۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے مصوری کیوں نہ سیکھی کہ اس وقت اُن کا خاکہ اُتار سکتا۔

(صلائے عام۔ نومبر ۱۹۱۰ء)

یادش بخیر

انسان کو یہ دو لفظ 'یادش بخیر' جب کبھی یاد آجاتے ہیں۔ تو تمام دنیا کی تاریخ سے زیادہ اثر کر جاتے ہیں ؎

گل جو ہنس پڑتے ہیں ہر دم سبب اس کا ہے یہی
شب کو روتی ہے جو شبنم سبب اسکا ہے یہی
سبزہ رہتا ہے جو خرم سبب اس کا ہے یہی
حال سنبل ہے جو درہم سبب اس کا ہے یہی

اس کا لطف اپنی زبان کے سوا کسی میں نہیں بلکہ میں جانتا ہوں کہ شاید کسی اور زبان میں اس کا مطلب ادا کرنا بھی مشکل ہے ؎

یادش بخیر دل جو گیا تھا شباب میں
ہم ساری عمر باغ میں کلیاں چنا کئے

دنیا و دیں سے جس نے نکالا کھڑے کھڑے
یادش بخیر، وہ دل خانہ خراب تھا

انسان کو آگے کا حال معلوم نہیں کہ کیا ہونے والا ہے۔ اس وقت جس حال میں ہے۔ اس کی قدر نہیں، رہ رہ کے اسے یاد آتی ہے تو اپنے پچھلے عیش کی، حالت جوانی میں لڑکپن یاد آتا ہے اور بڑھاپے میں جوانی یاد آتی ہے۔ آہِ سرد میں لطفِ بادِ نسیم یاد آتا ہے اور گریۂ بے اختیار میں خندۂ ابرِ بہار، سرو کو دیکھ کر قدِ یار کا خیال آجاتا ہے اور زلفِ رسا سے بختِ رسا کا ؎

ڈوبا ہوا ہے یاد میں ایسا کسی کی دل
گویا کہ اک حباب لبِ جُوئبار ہے

انسان کو پچھلی حالت سے بہتر نصیب ہونی تو درکنار پچھلی سی حالت بھی نصیب نہیں ہوتی۔ پچھلی حالت سے بہتر اللہ کا نام سمجھئے کہ غمِ امروز و اندیشۂ فردا دونوں جان کے لاگو ہیں۔ زندگی کا لطف ہے تو کسی کی یاد میں، بوڑھے جوانی کی یاد میں جیتے ہیں اور صدمۂ فراق کے مارے ہوئے شبِ وصل کے خیال میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ عُمرِ گزشتہ کی غلطیاں بھی اس وقت کی ہوشیاریوں سے اچھی سمجھئے۔ الف لیلہ کے سے ہزار قصّے ہر حسین کی کتابِ حُسن شباب کے دیباچے میں سے جب چاہے لکھ لیجئے۔ مشکل سے مشکل فلاسفی کے مسئلے پر لکھنا آسان ہے مگر ادائے یار کا سمجھنا مشکل ہے ؎

یاد ہے ہم نے تو سو بار دکھائیں آنکھیں
نیچی نظریں رہیں تم نے نہ اٹھائیں آنکھیں

یادش بخیر وہ کلیدِ درِ عیش ہے۔ جس سے پچھلی زندگی کا لطف پیشِ نظر ہو جاتا ہے۔ رعنائیٔ خیال کا اگر کوئی ذریعہ ہے تو یہی ہے۔ رہ رہ کے کسی کی یاد کا آنا گویا وعدۂ جاناں ہے۔ گو مشکل سے زبان سے نکلے مگر زندگی کا لطف نظروں میں سما جاتا ہے بلکہ یہ وہ ہلالِ عید ہے جو صرف دیکھنے والے کو نظر آتا ہے اوروں کو خبر نہیں، باغ

کے تازہ پھولوں کی کیا بات۔ مگر باسی ہار جو کسی کی یاد دلائیں اُن کا کیا کہنا جب دنیا اور عیشِ دنیا کو بقا نہیں تو اس کے باقی رکھنے کی تدبیر اگر ہے تو فقط اس کی یاد ہیں ہے۔

سعادت مند اولاد کو ماں باپ کے بعد ماں باپ کی محبت یاد کر کے رونا آتا ہے اور ماں کو بچھڑے ہوئے بچے کی نشانی خوں رُلاتی ہے بخستہ دلوں کو سہارا ہے تو یادِ رفتگاں کا رگِ جاں اسی نشتر کی مشتاق دیکھی جسے یادش بخیر کہئے ؎

ہچکیاں زخمیوں کی دیتی ہیں آواز کہ ہاں
ہم ہیں بانگِ جرس قافلۂ عمرِ رواں

نیچر کا ہم پر اسی قدر احسان ہے کہ ہم دنیا میں آگئے باقی زندگی کا لطف آیا تو یادِ عیش میں، اور اسی وجہ سے یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ دنیا اگر ہمیں یاد آئے گی تو یہاں کے عیش کی بدولت۔ انسان جب کسی سے چھوٹتا ہے تو محض اس کی یادِ محبت میں جیتا ہے۔ بالزیک نے ایک شخص کی محبت کا حال لکھا ہے کہ سات برس برابر اُسی کھڑکی کے نیچے سے گزرا جس میں ایک دفعہ یار کی پرچھائیں دیکھ لی تھی ؎

بے قراری ہے کہیں یہ کہیں بیتابی ہے
دلِ مضطر میں تڑپ آنکھوں میں بے خوابی ہے
کبھی پٹی کبھی نشتر ہے رگِ جاں کے لئے
کبھی بخیہ ہے کسی چاکِ گریباں کیلئے
چشمِ امید کبھی ہے نگہ یاس کبھی
مرہمِ ریش کبھی سودۂ الماس کبھی

کہتے ہیں کہ شامت آتی ہے تو کہہ کر نہیں آتی اور دولت پوچھ کر نہیں جاتی۔

برخلاف اس کے کسی کی یاد میں بے کہے وہ لطف آتا ہے جو کہنے سننے کا محتاج نہیں، میں نے دیکھا ہے کہ کسی کی یاد انسان کو نیک بنانے میں بڑا اثر رکھتی ہے۔ جن کو ایک دفعہ کوئی پاکیزہ طبیعت مل گئی اگر وہ جدا بھی ہوئی تو پھر دوسرے کا نام لینے کو جی نہ چاہا۔ عرصہ ہوا کسی اخبار میں، میں نے دیکھا تھا کہ ایک شائستہ مزاج انگریز کو ایک ہندو مذہب کی عورت سے رابطۂ محبت ہو گیا۔ وہ مر گئی تو اپنی کوٹھی میں اس کو دفن کروایا، اس کے بعد صاحب بیمار ہو کر صاحب فراش ہو گئے تو ڈاکٹر نے طاقت کے لئے شوربہ تجویز کیا۔ صاحب نے اس نیک بخت کی قبر کی طرف اشارہ کر کے اور ڈاکٹر سے خفا ہو کر کہا کہ "ایسی چیز کا نام نہ لو اس کی لاش یہیں کوٹھی میں دفن ہے۔ اس کی روح بُرا مانے گی۔" اللہ رے خیال کہ مرنے پر بھی کسی کا دل دکھانا شاق ہے۔

انسان میں عیش گذشتہ کی قدر دین و ایمان کے برابر ہے۔ عورت اگر بوڑھی ہو جائے تو بھی اپنے میاں کا دوسری طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا خدا بخشے تو بخشے، وہ نہیں بخشتی۔ ان کی شریعت میں ہر گناہ بخشا جا سکتا ہے، قابل عفو نہیں ہے تو مرد کی بے وفائی۔ دنیا کے بڑے بڑے معرکے کاغذ پر نہیں ہوتے ان میں سے پہلے کچھ زمین پر ہوتے ہیں اور پیچھے تاریخ کے کاغذوں پر لکھے جاتے ہیں۔ مگر عشق و محبت کے سارے ماجرے دل ہی دل میں ہوتے ہیں۔ جن کا مدار فقط دل ہی کی یاد پر رہ جاتا ہے۔

زندگی کا مدار صرف چند رنج و راحت کے خیالات پر ہے جن سے بچنے کی کوئی صورت نہیں، نہ دونوں کی یاد سے کسی کو مفر، بھول جانا انسان کے بس کا نہیں، کسی کے درد کا حال عورت ہی خوب سمجھتی ہے جس کا قول ہے کہ رومال سے آنسو پُچھے تو کیا اور نہ پُچھے تو کیا کوئی چاہنے والا پونچھے تو لطف ہے۔

ٹھنڈے پانی سے آنکھیں ٹھنڈی کریں تو کیا اپنے بچے کے لب تر سے ٹھنڈک پہنچے تو کلیجا ٹھنڈا ہو۔ انسان کو جب کسی کی یاد نہ آئے تو زندگی بے کار سمجھنے اور ایسے کی یاد آئی جس سے ملنے کی امید نہ رہی ہو غضب کا سامنا ہے ؎

زخم اس تیغ کا بسمل کو مزا دیتا ہے
مرحبا کی دہن زخم صدا دیتا ہے
یہی زخمی ہے جو قاتل کو دعا دیتا ہے
زیر شمشیر سر عجز جھکا دیتا ہے
یہی لب تشنہ ہیں مشتاق جو کوثر کے نہیں
گھونٹ شربت کے ہیں رگڑے دم خنجر کے نہیں

یہ مضمون مجھے اپنی زبان کی بربادی پر سوجھا کہ یاد ش بخیر اس نے کیسے کیسے دن دیکھے ہمارے بھلے دنوں کی یادگار یہی رہ گئی ہے۔ ؏

رنگ ان جلسوں کے اگر کوئی اس سے پوچھے

افسوس ہے کہ نئے لب ولہجے میں اپنی زبان کا مزہ جاتا رہا سبب یہ کہ ملنگے کے پروں سے اڑا نہیں جاتا ؏

یہ پر و بال نہیں قابل پرواز ابھی

انہیں کون سمجھائے کہ آپ نے ؎

ہم سے پوچھو کہ ہیں ہم میکش میخانۂ عشق
اپنی مٹی میں ہے شامل گل پیمانۂ عشق
سینکڑوں یاد میں گزرے ہوئے افسانۂ عشق
دیکھے ہیں بوقلموں جلوۂ مستانۂ عشق

سارے حالات جہاں پیش نظر رکھتے ہیں
جام جم دل ہے زمانے کی خبر رکھتے ہیں

سینۂ چاک جو دکھلائیں کبھی گُل کی طرح　　نالے کرنے لگیں گُل باغ میں بلبل کی طرح
حال اپنا جو پریشاں ہو سُنبل کی طرح　　خو بہ و آئیں ابھی پیچ میں کاکل کی طرح

ڈُون کی ہم جو یہ لیتے ہیں بجا لیتے ہیں
چار باتوں میں فرشتوں کو لگا لیتے ہیں

(اصلاحِ عام۔ نومبر ۱۹۱۰ء)

تصویر کے متعلق چند خیال

بڑھاپے میں تصویر اتروانی عقلمندی میں داخل نہیں کہ دمڑی کی بڑھیا ٹکا سر منڈائی مشہور ہے۔ لیکن میرے ایک عزیز نہ مانے۔ خاص کر اس وجہ سے کہ آفتاب لب بام اور چراغ سحری کا اعتبار نہیں۔ انہیں خیال ہوا کہ خط و خال کی طرف سے نہیں یادگار کے طور پر دوست آشناؤں عزیز یگانوں میں نشانی رہ جائے ؎

بچا نہیں جب راحت دل پر وہ رکھ گئے
چٹھی لگا گئے ہیں نشانی کے واسطے

آپ نے دیکھا کہ جس طرح ڈاک خانے کی پارسلوں اور ریل کے اسباب کی روانگی میں پتے کے لئے لیبل لگانے ضرور ہیں میرے عزیزوں نے گویا پتے کے لئے یہ چٹ لگا دی۔

اس تصویر سے میرا پورا پتا لگتا ہے کہ یہ فوٹو اصل سے بالکل مطابق ہے اور تصویریں بھی اصل سے ملتی ہوئی ہوتی ہیں۔ مگر اس میں اصل سے اس بات میں بڑی مشابہت ہے کہ جس طرح تصویر میں جان نہیں ہوتی ضعیفی سے مجھ میں بھی جان نہیں رہی۔ جان تو جوانی کے ساتھ رخصت ہو جاتی ہے بڑھاپے میں انسان پیکر تصویر ہی رہ جاتا ہے ؎

تصورات محاسن کے رکھتے تھے کیا کیا
ہمیشہ خوبیوں کا اپنی ہم کو دعویٰ تھا
یہ رفتہ رفتہ ہمارا مآل کار ہوا
خیال دل میں جو آیا سیاہ کاری کا
سپید ہو گئے مثلِ کفن مزار میں ہم

لیکن مجھے رشک ہے تو زلیخا کے بڑھاپے پر کہ خُدا نے زلیخا کو پھر سے جوانی دی۔ بڑھاپے میں جوانی کا کیا کہنا! زندگی کی نسبت بڑی شکایت یہ ہے کہ جوانی میں دنیا کا تجربہ نہیں ہوتا اور جب دنیا کا تجربہ حاصل ہوتا ہے تو جوانی نہیں رہتی۔ بڑھاپے کا تجربہ اور بڑھاپے کی نعمت دونوں باتیں انسان کی قسمت میں نہیں۔ یہ بات صرف زلیخا ہی کو نصیب ہوئی جس کا سبب مولانا وحشی کرمانی رحمۃ اللہ علیہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ؎

زلیخا را چو پیری ناتواں کرد — گلش را دست فرسود و خزاں کرد
ز چشمش روشنائی بُرد ایام — نہادش پلکہا برہم چو بادام
دراں پیری کہ صد غم حاصلش بود — ہماں اندوہ پیری در دلش بود
سرِ موئے زعشقِ او نمی کاست — بجز یوسف نمی جُست و نمی خواست
کمالِ عشق در وے کارگر شُد — نہالِ آرزو ویش بارور شُد
برو نگذشت ایام جوانی — مثنّے کرد دورِ زندگانی
نمیرد آنکہ دارد بندگی داد — خُدا اورا دو بارہ زندگی داد

اگر می بایدت عمرِ دوبارہ
مکن پیوند عمر از عشق پارہ

یہ بات ہر شخص کو نصیب نہیں۔ خاص کر مجھ جیسے بے دل و دماغ کے آدمی

کو کہ وہاں حضرتِ یوسف رُوٹھے تو زُلیخا نے تمام عمر اُن کے منانے میں کاٹ دی۔ جانِ شیریں سی عزیز چیز مُنہ پھیرے تو پیچھے مڑ کر دیکھنے کو جی نہ چاہے ؎

اک زُلیخا کی ضعیفی تھی ملا جس کو شباب
اک جوانی مری روٹھی تو منائی نہ گئی

کہتے ہیں کہ تصویر نہیں بولتی۔ مُنہ سے بول اُٹھے تو کیا کہنا! مگر بولے کیسے؟ اصل خوبصورتی صرف ذہن میں آسکتی ہے، زبان سے ادا نہیں ہوسکتی۔ خوبیٔ خیال کے سامنے زبان بھدّی چیز ہے۔ جس طرح کوچۂ جاناں کا خیال گلی کے کُتّوں کے سامنے یا عیدگاہ پہنچنے کا شوق گردِ راہ کے سامنے۔

ایک دفعہ مجھے خیال ہوا کہ میں بھی مصوّری سیکھوں، مگر زندگی کے بعد کی ہستی کی تصویر کوئی نہ کھینچ سکا تو میں نے اپنے لئے یہ فن بیکار سمجھا۔ ہستی کے بعد عدم کی تصویر کسی سے نہ کھنچی۔ اگر کسی نے کھینچی بھی تو محض خیالی۔ سبب یہ کہ اوّل تو کسی کو وہاں تک رسائی نہیں۔ گو جانے کو سب عدم سے آئے اور عدم ہی کو جاتے ہیں مگر سچ پوچھئے تو وہاں کوئی نہیں پہنچتا۔ وہاں پہنچے تو وہاں کا حال جان جائے۔ دوسرے ہستی تو ہزار رنگ میں نظر آتی ہے۔ دنیا میں ہیژدہ ہزار عالم بتاتے ہیں۔ فنا کا کوئی رنگ نہیں۔ تصویر کھنچے تو کس رنگ میں؟ عدم کا نقشہ اس تصویر کے دوسرے صفحے کی طرح خالی اور سادہ بتاتے ہیں۔

لیکن ہستی میں فنا کی باتیں بیکار ہیں کہ فنا کے سامنے ہستی کا وجود ممکن نہیں۔ اور جب تک ہستی ہے، فنا خیالی چیز ہے۔ اس وقت مجھے اپنے عمامے اور جبّہ پر ایک نقل یاد آئی جو عرض کرنے کے لائق ہے۔

ولایت میں کسی کو دینیات کا امتحان پاس کرنے کے بعد عالم دین یعنی پادری ہونے کا جُبّہ ملا۔ یہ پہن کر گھر میں آئے، حسبِ معمول بچہ پیار میں ان سے لپٹنے لگا

جُبّہ کے دامن بڑے تھے اُلجھ کر گرتے گرتے بچا۔ بی بی نے کہا تم اسے اُتار کیوں نہیں ڈالتے؟

بی بی نے تو یہ بات محض معمولی طور پر بے خیال کہدی اس میں کچھ طعن تشنیع کی بات نہ تھی کہ گھر میں جُبّہ کی کیا ضرورت ہے؟ میرا بچہ گرتے گرتے بچا۔ یہ جُبّہ و عمامہ باہر کے لئے ہے، مسجد و خانقاہ میں زیب دیتا ہے یا محلّے والوں کو دکھانے کے لئے — مگر سُنا ہے کہ اس شخص کو رات بھر نیند نہیں آئی کہ خدا جانے بی بی نے کیا سمجھ کر یہ بات کہی ؎

رہی اُلجھن سی تا سحر اس کو
نیند آئی نہ رات بھر اس کو

اہلِ تقویٰ نے جُبّہ و عمامہ کو اسبابِ ریا میں شمار کیا ہے۔ کیوں کہ نیکی کے لئے سامان کی ضرورت نہیں پھر کیوں یہ بوجھ لادا جائے —؟ دُنیا میں اگر مجھے کسی سے نفرت ہے تو مکر سے ہے۔ لیکن جس طرح کبھی کبھی سامان سے تقریب کا پتا لگتا ہے۔ دروازے پر روشن چوکی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ شادی کا گھر ہے اور ڈیوڑھی پر پہرا چوکی ہو تو ثابت ہوتا ہے کہ صاحب خانہ ذی مقدور ہے۔ اسی طرح لباسِ تقویٰ نیکی کی تقریب سمجھئے۔ ایسا لباس نیکی کو روکتا نہیں۔ بُرائی میں شرم دلاتا ہے کہ جُبّہ و عمامہ کی لاج آڑے آجاتی ہے۔ اس کے اختیار کرنے میں فائدہ اور چھوڑنے کا کوئی نتیجہ نہیں خاص کر اس عمر میں جو میری ہے اس کا چھوٹنا مُشکل ہے کہ گو بیکار ہو مگر چھوڑا نہیں جاتا۔ خستہ دلانِ محبت باسُورِ کہن سے بھی بیزار نہیں ہوتے۔ انہیں اس کی کاوش میں لُطف آتا ہے میں نے ایک بزرگ دیکھے جن کو زخمِ عشق کی طرح چوٹ لگ گئی۔ وہ چوٹ پک کر بڑا گھاؤ ہو گیا۔ کیڑے پڑ گئے۔ جرّاح نے نیلے تھوتھے کا مرہم لگایا کہ کیڑے مر جائیں اس سے اس مردِ خدا کو بہت تکلیف ہوئی اور

حالتِ نزع میں بے ہوشی ہوگئی مگر بیہوشی میں بھی جو کیڑا زخم سے گرتا تھا اس کو اُٹھا کر وہیں رکھ لیتے تھے کہ یہ بے گناہ اس وقت کہاں جائیں گے؟

انسان بُرا یا بھلا لباس اتارنے میں اس وقت جلدی کرتا ہے جبکہ بدن میں آگ لگتی ہے۔ یہاں شباب میں بھی حرارتِ نَفَس کا پتا نہ تھا تو اب اس عمر میں کہاں، اس عمر میں یہ لباس اُتر نہیں سکتا کہ کھال کی طرح جسم میں پیوست ہوگیا ہے ؎

چمک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے؟

اس کے پہننے سے اور نہیں تو نیکی کا شُبہ ہو سکتا ہے اور عدالت میں شُبہ کا فائدہ گناہگار کو پہنچتا ہے۔

میں نہیں جانتا کہ اس تصویر کی طرف سے میں کہاں تک بکے جاؤں۔ اس کی رسید میں بعض احباب کے جو خط آئے وہ لکھے دیتا ہوں۔ دیکھنے والوں کی محبت و اخلاص میں شک نہیں جس کا میں نہایت مشکور ہوں مگر میری مبادرت میں بھی کلام نہیں کہ خود اپنی تشہیر کرائی ؎

تری تو برّشِ تیغِ نگہ کا کیا کہنا؟
ہمیں تو دیکھ کہ رکھتے ہیں ہم جگر کیسا

آج گو حضرتِ ناصح سے ملاقات ہوئی
دلِ پُرشوق میں تجدیدِ سوالات ہوئی
پھر بھی حسرت یہ رہی دیکھ کے عکسی تصویر
گفتگو کیوں نہ ہوئی کیوں نہ کوئی بات ہوئی
کُھل گیا علمِ قیافہ سے کمالِ مخفی
رُخ کی ہر ایک ادا کاشفِ حالات ہوئی
وارداتِ دلِ پُرحوصلہ کا حال کُھلا
اور عیاں چہرے سے تشریحِ خیالات ہوئی
لیکن افسوس ہے کہتے ہیں جوانی جس کو
یہ تو فرمایئے کیا قبلۂ حاجات ہوئی؟

صبح پیری ہوئی ہے جلوہ فروز ہستی
کس قدر جلد فنا حیف ہے وہ رات ہوئی

لائی تخئیل مری آپ کی تصویرِ شباب
فکر کچھ دیر رہینِ غمِ آفات ہوئی

ان نگاہوں پہ نظر کی تو وہ آنکھیں یاد آئیں
رُونما کیفیتِ بزمِ خرابات ہوئی

مرحبا موسمِ پیری میں بھی ہمت ہو جواں
منتخب آج زمانے میں تری ذات ہوئی

تیری ہستی کہ جو ہے رونقِ بازارِ ادب
آج سرمایۂ صد فخر و مُباہات ہوئی

یوں ہی مل لے گا عزیز ایک نہ اک دن تجھسے
جس طرح صفحۂ کاغذ پہ ملاقات ہوئی

عزیز لکھنوی — ۲۱ فروری ۱۹۲۸ء

افتخار نامہ مع شبیہ مبارک کے پہنچا۔ ریاست ملتی، خزانہ ملتا تو بھی اس قدر دل شاد نہ ہوتا جتنا آج اس تصویر کے ملنے سے ہوا ہے۔ برسوں کی آرزو بر آئی۔ بجانے کب سے دلِ مشتاق زیارت کا متمنی تھا وہ آج خوش قسمتی سے پوری ہوگئی۔ گھنٹوں ہاتھ میں تصویر لئے دیکھتا رہا کہ یہ وہی اقلیم سخن کا بادشاہ ہے جس نے چمنستانِ اُردو میں ایک سے ایک بڑھ کر نُدرت آمیز گُل بُوٹے کھلائے۔ آج تصویر سے جیسا دل خوش ہوا پروردگار وہ دن بھی جلد لائے کہ دیدارِ فرحت آثار سے بھی اسی طرح شاد ہو۔

تیری تحریر کے جاں دادہ خواص اور عوام
تیری تقریر کے قائل فُصحائے عُظام

تُو کہ ہے چشم و چراغِ عمل و علم و ہُنر
تُو کہ ہے مایۂ ترصیعِ بیان و ارقام

نثر میں طبع تری قادرِ اصنافِ سُخن
نظم میں ذہن ترا حاویٔ جُملہ اقسام

جدتِ نثر تری مشقِ کہن کا حصّہ
نئی بندش، نئے مضمون، نیا لطفِ کلام

رشکِ فردوس بریں ہے چمنِ نثر ترا
بوئے گلہائے مضامیں سے معطر ہیں مشام

تیرا اندازِ بیاں شانۂ زلفِ مضموں
تیرا اعجازِ سخن غازۂ روئے الہام

وائے ناقدری ارباب زمانہ اخگر
جن سے ملتے ہیں ستائش کے عوض میں الزام

شمشیر بہادر اخگر

ریاست اجے گڑھ

ادھر آؤ تصویر ان کی تو دیکھو — زمانے میں جن کا خریدار سب ہے
یہ تصویر جن کی ہے اس چوکھٹے میں — ہیں ناصر علی "خاں بہادر" لقب ہے
یہ اعزاز ہیں حاکم فوجداری — یہ دہلی کی خوش قسمتی لطفِ رب ہے
فضیلت کے آثار چہرے سے روشن — یہ عالی نژاد اور عالی نسب ہے
برستی ہے صورت سے ان کی بزرگی — عبا خاص وعمامہ وضعِ عرب ہے
محل ان کا دیکھا ہے دہلی میں ہم نے — وہ فراشخانے کے بالکل عقب ہے
ضعیفی میں با ہوشمندی و تیزی — نمونہ ہے قدرت کا شانِ عجب ہے
شگفتہ کلام اور یہ جادو بیانی — لطافت طبیعت میں ان کی غضب ہے
خیالات پاکیزہ، مضمون دلکش — زباں ایسی شیریں کہ گویا رطب ہے
فصاحت، بلاغت، یہ علمی لیاقت — وقار اور عزت کا سارا سبب ہے
خدا نے دیا ہے مزاج ایسا اچھا — جو بات ان میں پائی وہ اوروں میں کب ہے
جسے دیکھو بھرتا ہے وہ دم انھی کا — ہر اک دل کے لینے کا خوب انمیں ڈھب ہے
کوئی بات اچھی نہیں ان سے چھوٹی — یہ اچھے ہیں پھر ان سے کیا کچھ عجب ہے

تمنا ہے عارف کہ ہم ان کو دیکھیں
کہ جن کا یہ فوٹو عجب خندہ لب ہے

آپ کا نیاز مندِ خاص۔ عرفان علی (ڈپٹی کلکٹر) از پیلی بھیت یکم فروری ۱۱ء

صلائے عام

شکل تسخیر ہیں تری باتیں
جانِ تصویر ہیں تری باتیں

تصویر کی طرح صلائے عام کا خاموش رہنا اس وقت اچھا نہیں۔ اس کی طرف سے بھی کچھ کہنا چاہیے۔ زمانے سے مجھے شکایت ہے کہ صلائے عام کا اہتمام مجھے زیادہ عمر میں مِلا ؎

پیری میں کس اُمید پہ اس دردِ سر کی لَو
ہستی پہ اپنی منتی ہے شمع سحر کی لَو

بالزیک نے ایک عورت کا قصّہ لکھا ہے جس کی عمر جوانی سے ڈھل چلی تھی۔ اس سے کسی نے پوچھا کہ کہو کیا حال ہے؟ جواب دیا کہ اُس کا حال کیا بیان کیجئے جس کی جوانی رخصت ہو چکی ہو، اور محبت باقی ؎

خبر ہے کچھ کہ راہی ہو چلا عالم جوانی کا
کہ منہ پر خاک سی اڑتی ہے گردِ کارواں ہو کر

اس کے مقابلے میں ایک بوڑھے ولی اللہ کا ذکر سُننے کے لائق ہے۔ شاہ صاحب کی عمر نوّے ۹۰ برس کی تھی، مُریدوں میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا ہے کہ یہی عمر کام کی ہے بشرطیکہ جان میں ذرا جان باقی رہے کہ انسان کی عمر جتنی زیادہ ہوتی ہے اتنا ہی دُنیا سے دُور اور عاقبت سے نزدیک ہوتا جاتا ہے۔ اِس وقت شاہ صاحب کو پاس سے جو عالمِ بالا کا حال نظر آتا ہے ہم کو نصیب نہیں۔ اس کو جانے دیجئے از روئے شعر و سخن پیرانہ سری میں داغ جوانی کی بہار ہے ؎

دل غنچہ ہو تو فصلِ چمن ہیچ ہے ذکیؔ

واشد سے طبع کی ہے خزاں بھی بہار پر

لائے بہار گوندھ کے پھولوں کی چادریں

پریاں چڑھائیں شمع ہمارے مزار پر

اس عمر میں لکھنے پڑھنے کا مشغلہ یوں سمجھئے کہ جس طرح کوئی یار کے دروازے سے اٹھے اور پسِ دیوار فغاں کرے یا کسی کا کوٹھے پر آنا تو درکنار گھر میں بھی دالان کے پاکھوں میں جا چھپے۔

تصویر کی خوبیوں میں رنگینی بھی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ یہ تصویر گو رنگِ جوانی سے خالی ہے مگر صلائے عام کی رنگیں بیانیاں یہ کمی پوری کر رہی ہیں جس کے سامنے کسی کی رنگیں بیانی نہیں چلتی ؎

نہ کر سکے گی کبھی ایسے نالۂ رنگیں — اڑائے بلبلِ نالاں مری ہزار زباں

زاہد ہمارے منہ پہ نہ وصفِ بہشت کر

ہم رہنے والے ہیں چمنِ کوئے یار کے

(صلائے عام۔ اپریل ۱۹۱۱ء)

مضمون پریشاں

پریشاں شانے سے زلفیں وہ زلفوں سے پریشاں ہیں
کہ سو خم اور پڑتے ہیں اگر اک خم نکلتا ہے

مضمون پریشاں ایسا مضمون ہے کہ گو اس کا سلسلہ شروع ہوئے عرصہ ہو گیا مگر زلف جاناں کی طرح بڑھتا ہی جاتا ہے۔ سبب یہ کہ پریشانی گو اچھی نہیں سمجھی جاتی مگر لیلے کی زلف پریشاں، افسانۂ قیس سے زیادہ دل کش سمجھئے کہ لیلیٰ کی محبت نے تو قیس کا دماغ مختل کر دیا تھا؛ برخلاف اس کے یہاں بوئے زلف یار سے دماغ معطر ہو رہا ہے۔ وہاں جنگل و بیاباں کی سوجھتی تھی یہاں دماغ کو ترو تازگی حاصل ہو رہی ہے۔ گویا بہار ختن نگاہ کے سامنے ہے۔ اہل محبت بڑا دماغ اس خوش نصیب کا سمجھتے ہیں، جس کے بازوؤں پر زلف جاناں بکھر رہی ہو۔ جس کے دماغ میں بوئے زلف یار سمائی ہوئی ہو۔

نیند اُس کی ہے دماغ اُسکا ہے راتیں اُسکی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

عیش و راحت کے مقابلے میں رنج و مصیبت کی تاریخ لکھی جائے تو زلف حسیناں سے زیادہ بڑھ جائے۔ وصل کی رات کو تمام دنیا کے شاعر بہت مختصر کہتے آئے ہیں مگر

شب تار کاٹے سے نہیں کٹتی! اگر کٹ گئی تو فراق کے مارے ہوئے کو صبح اور بھی بری معلوم ہونی چاہیے کہ رات کو تنہائی کی شکل کم دکھائی دیتی کیوں کہ اندھیرے میں چیز نظر نہیں آتی۔ دن کی روشنی میں مصیبت کی صورت صاف دکھائی دینے لگی۔ گویا بلائے فراق چشمۂ خورشید میں نہا دھو کر اور بھی نکھر آئی ؎

تو بھی آ کر مجمع اضداد دیکھ
ایک ہنگامہ ہے تنہائی مری

دنیا میں بڑے مرتبے کو جو پہنچتے ہیں تھوڑے ہی ہیں۔ جو رہ گئے ان کا شمار قیامت تک ختم نہیں ہونے کا۔ سکندر کی فتحوں کی حد بھی کے قنوج سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کا ذکر چند ورق میں آگیا۔ دارا کی شکست سے جو ایران اور اہل ایران کی بربادیوں کا افسانہ لکھا جاتا، قیامت تک ختم ہونا مشکل تھا۔ قافلے کو منزل پر پہنچنے کی خوشی گھڑی دو گھڑی کی ہوتی ہے جو قافلے سے بچھڑ کر رہ جائے اس کی مایوسی کی حد نہیں۔ تیمور و چنگیز خاں و نادر کے کارناموں کی تاریخ لکھی گئی، جو بندگانِ خدا ان کی یلغاروں میں مارے گئے ان کے نام بھی آج تک کسی نے نہ سنے۔

میں اس کا قائل نہیں کہ انسان کی آرزوئیں بر آئیں۔ اس کا قائل ہوں جس کی آرزو رہ جائے اور منہ سے اُف تک نہ نکلے۔

آپ کیا پوچھتے ہیں حدِ ستم ہنس ہنس کر
اب بتا دیتے ہیں گر عمر وفا کرتی ہے

چاہنے والوں کو بڑی تمنا اس بات کی ہوتی ہے کہ دمِ نزع یا دیار بالیں پر ہو، زندگی سے زیادہ دنیا میں کوئی چیز پیاری نہیں! اس خیال میں میں لیٹا ہوا تھا کہ میری

زندگی میرے سامنے آئی۔ عشاق کا عقیدہ ہے کہ یار مرتے وقت بھی اگر آجائے تو جان میں جان آجاتی ہے۔ اس وقت کی باتیں قمر بازی کو مات کرتی ہیں ؎

آجاؤ اب بھی لب پہ نہ آجائے اور کچھ
شکوے تمام گردشِ دوراں کے ہو لئے

میری زندگی میرے سرِہانے کھڑی ہو کر لگی پوچھنے کہ "کہو تمہیں زندگی کا کیا لطف آیا؟ اب میں جانے والی ہوں۔"

میں نے کہا کہ "ذرا بیٹھو تو سہی!"

جواب ملا "اتنی فرصت کسے؟ میں کھڑے کھڑے تم سے رخصت ہونے آئی ہوں۔"

میں نے جواب دیا کہ "تمہارا بڑا احسان ہے۔ تم اس وقت آئیں تو سہی۔ مگر زندگی کا لطف کیا پوچھتی ہو؟ بچپن کی تو مجھے یاد نہیں خدا ان دو خدا ترس آدمیوں کا (ماں باپ) بھلا کرے جن کی وجہ سے وہ نازک وقت کٹ گیا وہ نہ ہوتے تو تمہاری طرف سے تو جواب ہو چکا تھا۔ آج دانت نکلنے کی تکلیف ہوئی کل خسرے کی، پرسوں کچھ، اور اترسوں کچھ۔ خدا ان کو بہشت نصیب کرے ان سے زندگی ہوئی۔ جوانی میں میں نے جو تمہیں دیکھا تو تمہارا مزاج ہی اور تھا۔ جوانی کیا تھی ہزار امنگوں اور لاکھ آرزوؤں کی گٹھری تھی جس میں بے کار چیتھڑوں کے سوا کچھ نہ نکلا، جوانی میں تم نے جو سبز باغ دکھایا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے۔ میں بھی سمجھے رہا کہ تم ہمیشہ اسی طرح یار رہو گی مگر حسینان بے وفا سے بھی زیادہ تم بے وفا نکلیں کہ تاب و طاقت تو جوانی کے ساتھ لے گئیں اب وداع ہوش و حواس ہے۔

کٹ چکی ہے ہجر کی شب رات کی نیت بخیر
کل تو ہم ہیں اور روزِ حشر ہے، فریاد ہے

عیشِ جوانی حسنِ خوباں کی طرح دیر پا نہ نکلا۔ مجھے خبر نہ تھی کہ نشۂ شراب کی طرح تھوڑی دیر کا لطف اس قدر خمار کا سبب ہوگا کہ پہلی تاب و توانائی بھی چل دے گی نماز معاف کرانے میں روزے گلے پڑیں گے۔ انسان کے لئے عیش و آرام کی راہیں یونہی بنارس کی گلیوں کی طرح تنگ تھیں اب اتنا راستہ بھی نہ رہا جس کو میں نام و نمود کے اسباب سمجھے ہوئے تھا وہ پھٹے پرانے کسی کے اترے ہوئے جبے وعمامہ کی دھجیاں تھیں۔

الٰہی قبر میں انسان کیا پہنچا وہاں پہنچا
نکالا ہے عدم کے ملک کا رستہ کہاں ہوکر
ڈراتا ہے ہمیں ناصح عبث تو روز محشر سے
یہ فتنہ بھی یونہی رہ جائیگا آخر عیاں ہوکر

یہ باتیں ابھی ہو رہی تھیں کہ موت نے آکر مجھ سے پوچھا کہ مرنا تمہیں کس شرط پر قبول ہے؟ وصال میں، وصلِ یار کی امید پر، یا حرمانِ ابد کی شرط پر؟ یہ سنتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا کہ یار سے ملنا ہو یا نہ ہو، ملنے کی آس کا بڑا سہارا ہے۔ زندگی کتنی ہی مصیبت کی ہو مرنے سے اچھی ہے۔ اور خالق کے وجود کا ثابت کرنا گو ہر شخص کے بس کا نہ ہو مگر اس کو مان لینا نہ ماننے سے کہیں اچھا ہے۔ موت کے بعد پھر زندگی کی امید مایوسی سے اچھی ہے۔ اس امید میں جان دینی کہ یار کی ٹھوکر سے ہم جی اٹھیں گے اس سے اچھا ہے کہ قبر میں سڑیں گے اور کوئی خبر نہ لے گا۔ ؎

چپ چپ پڑے ہوئے تھے ابھی خانقاہ میں
کچھ کچھ کھلے ہیں بیعتِ پیرِ مغاں سے ہم

(اصلاحِ عام ۱۹۱۵ء)

دِلّی کی گلیاں

خواجہ نصیر دہلوی کو راجا چندو لال نے کئی دفعہ حیدر آباد دکن بُلایا، زادِ راہ کے واسطے جو رقم وہاں سے آتی خواجہ صاحب دہلی سے دو ایک منزل نکل کر خرچ کر ڈالتے۔ پھر منگاتے، راجا چندو لال غایت قدر دانی سے خرچ ہمیشہ بھیج دیا کرتے۔ آخر کو حیدر آباد پہنچے تو سہی مگر جناب امیر و داغ کی طرح جاں بر نہ ہوئے دکن کی قدر دانی پر استاد ذوق کو بھی خیال آیا مگر یہ کہہ کر رہ گئے ؎

اِن دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن
کون جائے ذوق پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

اسی سے یہ سُرخی میں نے اُس مضمون کی تمہید کے لئے پسند کی جو دلّی کی قدیم گلیوں کی تحقیق میں شاہجہاں آباد۔ دہلی کے نام سے صلائے عام میں شائع ہو رہا ہے۔

دلّی والے دِلّی پر اس طرح مرتے ہیں جس طرح لیلےٰ مجنوں پر کہ لیلےٰ نے مجنوں پر جان دیدی، ماں بچے پر، کہ بچّے کے لئے ماں جان دینے میں تامل نہیں کرتی۔ مچھلی پانی پر کہ مچھلی پانی بغیر رہ نہیں سکتی۔ دلّی والوں کے لئے دِلّی کی فصیل کے اندر پیدا ہو جانا ایک خاص فضیلت رکھتا ہے جو اور کسی شہر کو نصیب نہیں قدیم وضع کے

لوگوں نے از روئے شہریت (اگر شہر سے شہریت بنا لینا ناجائز نہ ہو) دلّی کو تمام شہروں سے ترجیح دی ہے۔ دلّی والوں کے روزمرہ میں کسی کو باہر والا کہہ دینا حقارت کا لفظ ہے کسی سے کوئی ناموزوں حرکت ہو جائے تو دلّی والے یہ کہہ کے چپ ہو جاتے ہیں کہ "باہر والے ہیں جانے دو" گویا دلّی سے باہر آدمیت کی امید رکھنی غلطی ہے۔ برخلاف اس کے مجھے علامہ ابوریحان محمد کے لقب کا خیال آیا جو البیرونی کے نام سے مشہور ہے یہ شخص یوں تو خوارزم کا باشندہ تھا لیکن شہر خوارزم کے اندر نہیں پیدا ہوا۔ نواح شہر میں پیدا ہوا اس لئے بیرونی، شہر مشہور ہوا البیرونی عربی ترکیب ہے فارسی میں بیرونی یا البیرونی کے معنے باہر والا ابوریحان کے لئے البیرونی امتیاز کا لفظ سمجھا جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دلّی والے دلّی پر جس قدر ناز کریں زیب دیتا ہے دلّی والوں کے لئے دلّی ان کی زندگی کا جزو اعظم ہے، دلّی بغیر انہیں چین نہیں نہ دلّی کو ان کے بغیر چین ہے دلّی والے دلّی میں تھوڑی بہت گزارے کی صورت بھی باہر کی دولت مندی سے بہتر سمجھتے ہیں ان کے لئے گندی گلی کوئے جاناں سے اچھی اور گندا نالہ فرہاد کی جوئے شیر سے بہتر۔ یہاں کے بازار، بازار مصر سے بڑھ کر مصر کے دیکھ چکے ہیں کہ مصر کی گرمیٔ بازار حضرت یوسفؑ کے قصے سے ہے یہاں کے بازاروں نے نادر و احمد شاہ دُرّانی کے قتل عام دیکھے۔ وہاں کا ایک قصہ زلیخا کا مشہور ہے یہاں کے معرکوں سے تاریخیں بھری پڑی ہیں عاشقان خونیں کفن کی طرح یہاں کے گلی کوچے خدا جانے کتنی بار خون میں نہا چکے ایک ایک گلی نے وہ وہ انقلاب دیکھے جو گردش دوراں کو نصیب نہیں یہاں کی صحبتیں نیرنگ روزگار کا جواب ہوئی ہیں۔ یہاں کے سال و ماہ ملکوں کی صدیوں اور قرنوں سے عروج و اقبال میں بازی لے گئے۔ سمندر کی طرح جس قدر طوفان و آندھیاں اٹھیں

سطح آب کی طرح اوپر اوپر گزر گئیں۔ سمندر کی تہہ کو خبر نہ ہوئی دلّی کی قدر واقعی دلّی والوں ہی کو ہے یہاں غریب کو وہ آرام ہے جو دوسری جگہ امیر کو میسّر نہیں جس شہر میں جو چیز پیدا ہوگی دلّی میں ضرور آئے گی جہاں کی جو چیز ہے اگر وہاں نہ ملے دلّی میں ضرور ملے گی نواب علاؤالدین خاں بہادر رئیس لوہارو ایک دن کا ذکر کرتے تھے کہ رام پور میں نواب کلب علی خاں بہادر کے دربار میں نارنگیوں کی ضرورت ہوئی نارنگیوں کا موسم نکل چکا تھا۔ سب جگہ تلاش ہوئی کہیں نہ ملی۔ نواب علاؤالدین خاں بہادر کی زبان سے نکلا کہ یہ بات دلّی والوں کو میسّر ہے کہ جو نعمت امیروں کو میسّر نہیں دلّی کے غریبوں کو نصیب ہے اس پر سب کو تعجب ہوا ہندوستان کے اور مشہور مقاموں سے جہاں نارنگیوں کا ملنا ممکن سمجھا گیا تھا تار بھیج کر دریافت ہو چکا تھا کہ نارنگیوں کا پتا نہیں۔ دلّی میں تلاش ہوئی تو معمولی حیثیت کے ایک بھلے آدمی نارنگیاں لئے جا رہے تھے انہوں نے بتا دیا کہ اس بازار میں فلانی جگہ سے نارنگیاں لے آیے۔

غرض یہ شہر عجیب و غریب ہے اس کی تحقیق جس قدر ہو سکے کرنی چاہیے، شاہی عمارات کی طرف سے تو اچھی تحقیق ہوئی اور ہو رہی ہے اس کے گلی کوچوں کا حال بھی لطف سے خالی نہیں :۔

شاہجہان آباد۔ دہلی

مزاج یار کی طرح اس شہر نے بھی عجیب عجیب رنگ بدلے ایک رنگ سے دوسرے رنگ میں آنے تک جو صورتیں بدلتی رہیں ان کا حال بسان رنگ بِرخ

عاشقاں کبھی کچھ رہا اور کبھی کچھ کہ ؎

ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا

یار کے عروج حسن میں جس طرح روز بروز کیا سے کیا فروغ نمایاں ہوتا ہے اسی طرح چاہنے والوں کی ناتوانی سے ان کا پہچاننا مشکل ہوجاتا ہے ؎

نہ من شناختم اورا نہ او شناخت مرا

کا معاملہ سمجھئے۔ یہی حال بعینہٖ اس شہر کا ہے کہ اس کا نقشہ طرح طرح کے رنگ بدلتا رہا۔

تاریخوں میں بادشاہوں کی لڑائیوں کے حال۔ ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں ملک و اقبال کے عروج و زوال، ان کے انتظام سلطنت کے کارنامے، ملک کے محاصل وضوابط کے تذکرے، اکثر کتابوں میں درج ہیں مگر اس شہر کی صورت کہ اس کے گلی کوچوں نے اس کی عمارتوں اور مکانوں نے اور درودیوار نے جو جو انقلاب دیکھے، ان کی تفصیل بہت کم دیکھنے میں آئی۔

مدت سے مجھے اس تحقیق کی تلاش ہے مگر اس کا مسالا ہاتھ نہیں آتا جس قدر میں دریافت کرسکا اس کو وقتاً فوقتاً عرض کیا چاہتا ہوں کہ جن کی معلومات مجھ سے زیادہ ہے وہ میری اور اپنی تحقیق کے نتیجے جمع کرکے اس شہر کے قدیم گلی کوچوں اور مکانوں کی تاریخ یادگار کے طور پر لکھ ڈالیں۔ شاہ جہاں آباد کے قدیم گلی کوچوں اور پرانی حویلیوں اور مشہور مکانوں کی تاریخ جس قدر جلدی لکھی جاسکے اچھا ہے کہ اگلے مقامات اور اگلے لوگ اب روز بروز مٹتے جاتے ہیں۔ دلّی کے گلی کوچوں میں پرانی حویلیوں اور عمارتوں میں بہت فرق آگیا جس کا پہچاننا بھی اب مشکل ہے۔

یہی جگہ شاہجہاں کا مرکز سمجھی گئی۔

مرزا سنگین بیگ نے سیر المنازل میں جو جناب مٹکاف صاحب بہادر

رزیڈنٹ دہلی کے لئے لکھی گئی' لکھتے ہیں کہ جامع مسجد کے شرقی دروازے کی سیڑھیوں پر شام کو گزری بازار لگتا ہے جہاں کبوتر اور لال وغیرہ چڑیاں ہر موسم میں فروخت ہوتی ہیں (یہ بات اس وقت بھی جاری ہے) دکھن کی سیڑھیوں کی طرف بزاز کپڑا فروخت کرتے ہیں۔ (اس وقت بزاز شرقی دروازے کے نیچے شام کو دکانیں لگاتے ہیں) شمالی طرف کی سیڑھیوں پر قصہ خواں شام کو قصہ خوانی کرتے ہیں اور سُننے والوں سے اجرت کے طور پر کچھ وصول ہوجاتا ہے (یہ بات اب نہیں رہی۔ نہ قصّہ خواں ہیں نہ قصّہ خوانی ہے) جنوبی دروازے کی طرف پہر دِن سے پُرانی کتابیں اور ہتھیار بکنے آتے ہیں اور مسجد کی پشت پر دال والوں اور غلّے والوں کی دکانیں ہیں (یہ دکانیں اب بھی موجود ہیں) اسی رُخ کے سامنے چاوڑی بازار ہے۔ جس کے بارے میں راسخ کا شعر ہے !

چاوڑی قاف ہے یا خُلد بریں ہے راسخ
جمگھٹے حوروں کے پریوں کے پرے رہتے ہیں

جامع مسجد کے ایک سمت شاہجہاں نے مسافروں اور طالب علموں کے علاج معالجے کے لئے شفا خانہ تعمیر کرایا تھا جس کا نام دارالشفا تھا اس کے مقابلے میں دارالبقا نامی دوسرا مکان تھا' یہاں محتاجوں اور مسکینوں کو بادشاہ کی طرف سے خیرات تقسیم ہوتی تھی یک ۱۸۱۷ء میں دارالشفا نامی مکان میں مرشد زادہ مرزا مُنعَم بخت سکونت پذیر تھے' اسی طرح دارالبقا والے مکان میں بھی اور لوگوں کی سکونت تھی (یہ دونوں عمارتیں جس غرض سے بنی تھیں اس غرض سے عرصہ ہوا خارج ہو چکیں) اس کے آگے نواب بہادر علی خاں کی حویلی تھی اور چھتہ شاہ نظام الدین کے دروازے کا راستہ تھا اور انھی دونوں کے مکانات تھے ان کے مقابل میں جنوب کی طرف چتلہ دروازہ تھا جس میں نامور رئیسوں کے مکان تھے' یہ جگہ گڑھیا

کے نام سے بھی مشہور تھی، اس کے بائیں ہاتھ کو امام کے کوچے کو راستہ جاتا تھا۔ اس کوچے میں اکبر بادشاہ کے ماموں میر جھبو کی حویلی تھی اور میاں عبد المجید اور احسن وغیرہ کی حویلیاں تھیں۔

چتلہ دروازے چاوڑی بازار میں شاہ بولا کا بڑ قدیم الایام سے مشہور ہے شاہجہاں کے عہد سے شاہ بولا درویش کی قبر اسی بڑ کے درخت کے نیچے ہے اس کے متصل کوچہ محلہ روشن پورہ اور نواب محمد میر خاں بن شاہ نظام الدین کا اصطبل اور کوچہ نائی واڑہ ہے۔

روشن پورہ کے سامنے بتاشے والوں کا کوچہ اور چرخے والوں کا کوچہ اور کسیرں کی دوکانیں ہیں، بازار کے بیچ میں کھاری کواں ہے اور نئے بازار کے مقابل میں کوچہ حمام سیتل داس ہے جہاں راجا کدار ناتھ کی حویلی ہے یہیں گاڑی بانوں کا کڑہ ہے جہاں سے چوڑی گروں کے محلے کو راہ جاتی ہے۔

کھاری کنوئیں سے آگے کوچہ چنی بیگم اور کوچۂ مکانات حکیم بقا اور پیپل مہادیو واقع ہیں ان کے مقابل دکھن رخ کو کوچہ سیدی مرجاں ہے جس کو عوام غلطی سے کوچہ مُرغاں کہتے ہیں۔

اس کے آگے وسط بازار میں قاضی کا حوض ہے جو ان دنوں بند پڑا ہے (یہ حوض میں نے کھلا دیکھا تھا اب پھر بند ہو کر اس پر دکانیں مارکیٹ کے طور پر بنا دی گئی ہیں) قاضی کے حوض سے چاروں طرف کو راستہ جاتا ہے، شمال کو سرکی والوں کی دوکانیں ہیں اور راجا سید سہل و نواب ترنگ جنگ و بدل بیگ خاں وغیرہ کی حویلیوں کو راستہ جاتا ہے یہاں رجنا بیگم کی حویلی کے دروازے پر مکان پولیس ہے جو "گزر الہ آباد" کے نام سے مشہور ہے اور کوچہ شاہ تارا بھی اسی سمت ہے۔

کوچہ شاہ تارا کے مقابل میں نواب قمر الدین خاں کی حویلی ہے جو محمد شاہ بادشاہ کے وزیر تھے۔ ان دنوں اس میں شہر کے اور لوگ بستے ہیں۔

اس کے آگے بڑھ کر جوتے والوں کا بازار ہے جس کے سامنے محلہ جاٹاں ہے اس سے آگے اجمیری دروازے کے قریب خلیل اللہ خاں کی مسجد بنی ہوئی ہے اس پر یہ تاریخ کندہ ہے۔

تاریخ مسجد

حبذا مسجدے کہ شد ز شرف — سجدہ گاہ گدا و شاہنشاہ

شد بنایش ارادِ عالمگیر — بطفیلِ نبی رسول اللہ

گفت تاریخ ایں حرم ہاتف — کرد کعبہ بنا خلیل اللہ

حوض قاضی کے از طرف سرکی والوں کی دکانوں سے آگے ریوڑی فروش کی دکان مشہور ہے اور راجا سیڈ ہمل کی حویلی کے متصل کوچہ مکانات جے سنگھ رائے ہے اور صوفی اللہ یار خاں بن طہماسپ خاں رومی کا مکان ہے صوفی اللہ یار خاں اکبر شاہ بادشاہ کی سرکار کے میر تزک تھے یہیں اور رئیسوں کی بھی حویلیاں ہیں۔

اس کے آگے تزک جنگ کی حویلی ہے یہیں عبدالرحمان خاں کی بھی حویلی ہے جو شہزادہ مرزا نیلی کی سرکار کے مختار تھے اور مرزا نیلی اکبر شاہ بادشاہ کے بھائی تھے۔

اسی کے متصل مسماۃ نجیا طوائف کا مکان ہے کہ عشرہ محرم میں دیو کی شکل تیار کرا کر دروازے کے آگے کھڑا کرتی تھی اس وجہ سے نجیا طوائف کی شہرت ہو گئی اس بازار میں ٹھٹھیرے اور دیگر اہل حرفہ کی بھی دکانیں ہیں۔ اس کے آگے شادل

خاں کی حویلی ہے جس میں آج کل مرزا مغل بیگ خاں عرب رہتے ہیں اس سے آگے مکان خواجہ نور اللہ خاں اور کوچہ پنڈت ہے یہیں پسند خان و سربلند خاں رسالدار شاہی کی حویلیاں ہیں ان کے علاوہ یہاں مرزا مینا بیگ وکیل راؤ راجہ کی بھی حویلی ہے اور دیگر رئیس و اہل حرفہ کے مکانات ہیں پنڈت کے کوچے کے دروازے کے سامنے میر جان صاحب کا مکان و مسجد ہے علاوہ اس کے چوڑی گروں کی دکانیں اور ہیجڑوں کا کٹرا اور محلہ سبز چاہ اور دینہ بیگ خاں کا کڑہ اور مسجد بھی یہیں ہے۔ مسجد پر یہ تاریخ کندہ ہے۔

تاریخ

بکارِ نیک خدا بسکہ داد توفیقش بنا نمود چو باغِ ارم یکے مسجد
چنانچہ کعبہ نوشتن سزد ز تعریفش خط کتابۂ او را ببیں کہ میگوید
بیا بخانۂ دین است سال تاریخش

فتح اللہ بیگ خاں کا مکان اور بالاخانہ اور دکانیں بھی اسی جگہ ہیں کوچے کا دروازہ نواب سہراب جنگ قاسم علی خاں کی حویلی کی طرف ہے اس کے اندر محمد خاں کروڑہ کا مکان و مسجد اور فتح اللہ بیگ خاں بن عارف جان کا مکان ہے ان کے بیٹے نواب فیض اللہ خاں کی حویلی و دیوان خانے کے علاوہ تیر انداز خاں کا مکان اور نواب احمد بخش کی حویلی ہے قاسم جان کی مسجد بھی اسی جگہ ہے اس کے شمالی پہلو پر یہ تاریخ کندہ ہے۔

تاریخ

مسجدِ مثلِ روضۂ رضواں شد بنایش زدستِ قاسم جان

آب شیریں وچاہ چوں زمزم — وقف او کردہ چاہ وچار دکاں
از رفیع خواست چوں زتار بخش — گفت سہراب جنگ قاسم جان
۱۱۹۶ھ

اس کوچے کا راستہ فتح اللہ بیگ خاں کے مکان و بالاخانے کے پاس سے کوچۂ بلیماراں میں جاتا ہے۔ قاسم جان کی گلی کا کنواں حال ہی میں اٹا دیا گیا۔

اس کے آگے خلیفہ بخشو رحمت اللہ علیہ واستاد بندہ کی مسجد ہے، کوچہ کھڑکی فراشخانہ بھی اسی جگہ ہے۔ فراش خانہ آج کل خوب آباد ہے۔ مسلمانوں کے محلّوں میں اس کی آبادی سب سے زیادہ ہے (صلائے عام کا دفتر یہیں ہے) میر جُملہ و قطب الملک کے مکانات بھی یہیں ہیں، میرزا شرف الدولہ کا مزار بھی اسی جگہ ہے، اس کے نیچے یہ شعر کندہ ہے۔

بمددگاریِ توفیق خداوند جہاں
کہ شد از قُدرت او گنبد گردوں گرداں

مکان خواجہ کمہاری صاحب وحویلی کاکواں صاحب ومکان میر کلن صاحب دوکمبل پوش "بھی اسی جگہ ہے میر صاحب موصوف درویش صفت اور عامل وکامل شخص ہیں، ان کے بزرگوں نے احمد شاہ درّانی کی فوج کا خوب مقابلہ کیا تھا۔

دروازے کے قریب خلیل اللہ خاں کی مسجد اور تیرانداز خاں کا مکان ہے، بازار کے عین وسط میں ایک کنواں ہے جس کو لال کنواں کہتے ہیں، اس کے متصل اسد خاں کا چوک اور شیخ چاند کا کڑہ ہے، میر جملہ کی حویلی اور جائداد اور رعایا بھی اسی جگہ ہے، مکان پولیس یعنی تھانہ گزر قاسم جان بھی یہیں ہے۔ ان سب کے علاوہ کوچہ سموسہ میں حکیم ذکاء اللہ خاں اور ان کے رشتے داروں کے مکانات ہیں۔

عبدالرحیم اور فیض اللہ چابک سوار کی حویلی بھی یہیں ہے، ناظر لطافت علی خان

خواجہ سرا اور نواب نجف خاں کے مکان کے علاوہ مولوی قطب الدین صاحب ابن حضرت فخر المشائخ فخر عالم جناب فخر الدین رحمت اللہ علیہ کا مکان بھی اس کوچے میں ہے۔ میر حامد علی صاحب پٹہ باز (پھکیت) کا مکان بھی یہیں ہے جو اس فن میں استادِ کامل ہیں خال بیگ خاں عرب کا مکان اور کھڑکی فراشخانہ شہر پناہ کا راستہ بھی اس کوچے سے ہے اس کوچے میں گلفروش کی دکان کے علاوہ چابک سواروں اور گھوڑے کے دلالوں کی ایک بیٹھک (نشست) بھی ہے۔

اس سے آگے فتح پوری کی مسجد کی طرف ایک کوچہ ہے اس کوچے میں گوندنی اور بڑیوں کے کڑوں کے علاوہ کلال خانہ (شراب خانہ) اور رعایا کی حویلیاں ہیں اس سے آگے نواب شہ نواز خاں مختار شاہ عالم بادشاہ کی حویلی ہے اور تہور خاں کی مسجد بھی اسی جگہ ہے۔ مسجد کے دروازہ پر یہ کندہ ہے۔

ہر کہ آمد زارادت بہ یقین شام وسحر
خانہ از غیب ندا داد، بیا فیض بہ بر

مسجد کی سقف بالائی میں یہ کندہ ہے۔

بدوران محمد شاہ تہور خان تاشکندی (تشقندی یعنی ساکن تاشقند)
بنا فرمود مسجد را بتوفیق خداوندی
ہزار ویکصد ۱۱۴۰ وچل بود تا شد ایں بنائے خیر
بسعیٔ خانِ عالی شاں مرتب شد بخورسندی

اس کے آگے کہاری باوڑی کا کوچہ اور نیا باس ہے یہاں بھی ایک مسجد ہے باوڑی کے دروازے پر یہ کتبہ کندہ ہے۔

یا اللہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ یا اللہ

باوڑی کے دروازے کے اندرونی رخ کی طرف چوکھٹ کی پیشانی پر خطِ ثلث میں یہ عبارت کندہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وبہ نستعین یارب بعونت تمام شد این باوڑے وچاہ در ماہ رمضان سنہ ثمان صد وپنجاہ وہشت ہجری بروح محمد مصطفےٰ رسول درگاہ حضرۃ الٰہ در زمان عادلِ اسلام شاہ بن شیر شاہ بنا کردہ کار کردین از جملہ بیتے خواجہ عماد الملک عرف لاذر قریشی بندہ کارکرد باورے اُمید وار عنایت و برحمتک کردد بار بیرے بالتسک ط

(پُرانی دلّی جو پٹھانوں کے وقت میں تھی اس کی صرف دو عمارتیں شاہجہاں آباد میں ہیں۔ ایک کھاری باؤلی، دوسری کالی مسجد)

کھاری باوڑی کی دوسری منزل کی جنوب رویہ دیوار پر گیارہویں سیڑھی کے بعد جنوبی دروں کے قریب سنگِ مرمر پر خط ثلث میں یہ کتبہ کندہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم در عہد وزمان شاہ سلطان السلاطین و المظفر الاسلام شاہ بن شیر شاہ سلطان خلد اللہ ملکہ وسلطان بنا کرد این جا بتوفیق اللہ و بروح رسول اللہ ملک عماد الملک عرف خواجہ عبد اللہ لاذر قریشی بداد الملک حضرت دہلی فی سنہ اثنی و خمسین وتسعمات ۵

یہی کتبہ باوڑی کی مغربی دیوار پر بھی شرق رویہ کندہ ہے یہاں بہت سے رئیسوں کی حویلیوں کے علاوہ حلوائیوں کا ایک بازار بھی ہے۔ یہ حلوائی بتاشے نبات والائچی دانے کے علاوہ سب قسم کی مٹھائیاں فروخت کرتے ہیں۔

قاضی کے حوض کے جنوب کی طرف سے ترکمان دروازے تک ایک بازار ہے اس بازار کے دونوں جانب اہل حرفہ کی دکانیں ہیں۔ محلہ املی۔ کوچہ پاتی رام

بنگلہ حافظ فدا اور نمد گروں کا محلہ بھی اسی جگہ ہے۔

یہاں سے کوچہ مرجان کو بھی راستہ جاتا ہے اس کوچے میں زیادہ تر کشمیری پنڈت رہتے ہیں پنڈت نرائن داس اور دیگر کشمیری رئیسوں کے مکان بھی اسی جگہ ہیں۔ کوچے کے سامنے باہر کی طرف چھیپیوں کی دکانیں اور گھوسیوں کے گھر ہیں۔ تحصیلدار گلاب رائے کا مکان اور ماہی داس کا کوچہ اور پنج میراں کا تھان بھی اسی بازار میں ہے (بازار کے عین وسط میں ایک چبوترہ اور پیپل کا درخت ہے جو عام طور پر تھان پنج میراں کہلاتا ہے۔)

اس جگہ ایک اور کوچہ بھی ہے اور اس کا راستہ کوچہ پاتی رام اور فصیل شہر کی طرف جاتا ہے اس کوچے میں زیادہ تر کھٹیک اور چرم ساز بستے ہیں۔ تنسکھ رائے کاغذی کا باغ اور نواب مظفر خاں کا حوض اور مکان اور رعایا اور دیگر اہل حرفہ کے مکان بھی یہاں ہیں ان کے مقابل کشمیریوں کی جائداد کے علاوہ راجہ سوہن لعل کا مکان اور بستی رام اور پنڈت سدا سکھ کی حویلی اور سیتا رام کا بازار جانی خان کا کٹرہ ہے اس کوچے کے مقابل شاہ جی کا چھتہ اور بہادر جنگ خاں والئی بہادر گڑھ کی حویلی ہے، یہاں ایک دوراہا ہے جو ایک طرف محلہ چوڑی گراں میں اور دوسری طرف سیتل داس کے حمام اور مرتضٰے خاں کے طویلے کی جانب جاتا ہے۔ یہاں سے سید فولاد خاں کے بنگلے اور امام کے کوچے کو بھی راستہ جاتا ہے جانی خان کے کٹرے میں سے ایک تراہا پھٹتا ہے جو ایک طرف کالی مسجد کے پیچھے اور مظفر خاں کے حوض پر پہنچتا ہے۔ حوض کے نواح میں زیادہ تر ڈنالی اور جُلاہے بستے ہیں جو نواب مظفر خاں کی رعایا ہیں۔ دوسری طرف یہ راستہ میر میرزا کی حویلی کو (جس میں اب مینڈھو خاں رہتے ہیں) جاتا ہے یہیں سے میر نقی علی کی مسجد کو راہ جاتی ہے جو حضرت سید حسن رسول نما کے نواسے ہیں اور

بھوجلا پہاڑی اور بلبلی خانے کو بھی راہ جاتی ہے اسی جگہ جبّار بیگ خاں داروغہ توپ خانہ شاہی کی حویلی اور کشمیریوں کے مکانات ہیں اب ان کو منشی شیر علی صاحب نے خرید لیا ہے اس محلے کے دروازے کے باہر شاہ حسین صاحب واعظ کی مسجد ہے مسجد پر یہ شعر کندہ ہے۔

سال و مکان بزرگ ساختہ بازیب وزین

مدرسہ و مسجدے کرد بنا شاہ حسین

۱۱۹۴ھ

مسجد کے دروازے کے قریب شاہ جی کا مقبرہ ہے۔

اس کے آگے حسن علی خاں عرف حسنو کی پہاڑی پر حویلیاں ہیں اور میر فتح علی شاہ صاحب کا مزار ہے۔ روشن موچی کا مکان اور معماروں کا چھتہ اور محمد خاں اور حافظ خیراتی کی حویلی بھی یہیں ہے یہاں سے پہاڑی کے دیگر مکانات کی طرف بھی راستہ جاتا ہے تیسرا راستہ میر علی نقی صاحب کے مکان کے پاس سے ترکمان دروازے کے مغرب کی طرف جاتا ہے اس بازار میں جنوب کی طرف کالی مسجد ہے یہ مسجد شاہجہاں آباد کی آبادی سے پہلے فیروز شاہ بادشاہ کے عہد میں تعمیر ہوئی اس میں بتیس ۳۲ سیڑھیاں اور چونتیس ۳۴ گنبد ہیں مسجد کے صحن میں دو[۲] قبریں ہیں جن میں سے ایک خان جہاں کی اور دوسری اس کے باپ بانی مسجد کی ہے خان جہاں نے اس کی سات منزلیں تعمیر کرا کر اس کا نام کلاں مسجد رکھا تھا لیکن بہت عرصہ گزرنے کے بعد کالی مسجد زبان زد عوام ہو گئی کہ پرانی عمارت ہونے سے سیاہ رنگ ہو گیا۔ مسجد کے دروازے پر یہ کتبہ کندہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بفضل عنایت آفریدگار در عہد دولت پادشاہ دین

دار الواثق بتائید الرحمٰن ابو المظفر فیروز شاہ از سلطان خلد اللہ ملکہ سلطانہ

این مسجد بنا کردہ بندہ زادہ درگاہ جونانشہ مقبول المخاطب خان جہان

ابن خان جہان خدا بران رحمت کنذ ہر کہ دریں مسجد بیاید بدعائے

خیر بادشاہ مسلمانان وَاین بندہ را بفاتحہ و اخلاص یاد کند حق تعالیٰ

آن بندہ را فرزد بحرمتہ النبی وآلہٖ مسجد مرتب شد بتاریخ دہم ماہ جمادی

الاخر تسع و ثمانین و سبعمات ہجری۔

اس سے آگے حضرت شمس العارفین ترکمان بیابانی کی درگاہ ہے جن کی تاریخ

وفات ۲۴ رجب ۶۳۷ ہجری بیان کی جاتی ہے۔ درگاہ سے آگے سید نور علی خاں

داروغہ توشک خانہ شاہی کے مکانات اور رعایا ہے یہاں سے نواب مظفر خاں کے حوض کو بھی

بھی راستہ جاتا ہے اور اس جگہ ڈکوت برہمن اور غریب لوگ بستے ہیں شہر پناہ کے

ترکمان دروازے کے قریب ایک مسجد قدیم ہے مسجد کی پیشانی پر یہ کتبہ کندہ ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ بنائے

مسجد صالح بن بہادر حسین بدور سلطان عالمگیر ۱۰۹۱ ہجری

اس کے مقابل شہر پناہ کا ترکمان دروازہ اور نواب سلیمان خاں کی حویلی ہے

جس کو اب میر بھکاری نے نیلام میں خرید لیا ہے۔

جامع مسجد کی جنوبی سیڑھیوں کے نیچے ایک بازار ہے جو دونوں طرف سے

آباد ہے۔ بساطیوں اور بانس اور بلی اور ہتھیار بیچنے والوں کی دکانوں کے علاوہ جُوتے

بیچنے والوں (جُفت فروشوں) کی دکانیں بھی اسی بازار میں ہیں۔

اسی بازار میں کشمیری فتح جیو کریم جیو پگڑی بند و پگڑی فروش کی دکان بھی ہے

امام جامع مسجد کی جائداد اور کوچہ امام بھی یہیں ہے امام صاحب اسی کوچے میں رہتے

ہیں نواب فیض علی خان و اکبر علی خاں کے بزرگ نواب نجابت علی خان و فیض علی

خان کے ملازم شیخ منگلو کی حویلی بھی یہیں ہے۔ اسی جگہ ٹوکری بنانے والوں کی

دکانیں اور دیگر رئیسوں کے مکانات بھی ہیں نواب خان دوراں خان کی حویلی کا

کوچہ اور مٹیا محل اور نواب احمد علی خاں محتسب کی حویلی بھی یہیں ہے مٹیا محل کے دروازے کے مقابل کلاں حویلی کا بھی دروازہ ہے اس سے آگے لالہ زار بیگ کی حویلی ہے جس کو اب مفتی صاحب صدر الصدور مولوی صدر الدین خاں نے خرید کر از سر نو تعمیر کرلیا ہے۔ شیدی فولاد خان کا بنگلہ بھی یہیں ہے جو محمد شاہ بادشاہ کے وقت میں شہر کا کوتوال تھا۔ بنگلے کا اب کوئی نشان باقی نہیں ہے اس کی جگہ اور رئیسوں کے مکانات بن گئے ہیں۔ نواب عزیز آبادی بیگم کی حویلی بھی یہیں ہے۔ بھوجلا پہاڑی کو یہاں سے بھی راستہ جاتا ہے، راستے کے پیچھے فیض اللہ رکاب دار کا مکان اور دیگر رئیسوں کی حویلیاں ہیں۔

اس کے آگے نواب مرتضےٰ خاں کا مکان اور دکانیں ہیں سید رفاہی صاحب کی مسجد بھی یہیں ہے چتلی قبر کا تراہا بازار یہاں سے شروع ہوتا ہے شہر کے ترکمان دروازے کی طرف ایک چھوٹا سا سہ درہ ہے جس میں ایک قبر ہے جس پر پچی کاری ہوئی ہے اور اس کو چتلی قبر کہتے ہیں یہاں سے بھوجلا پہاڑی کو بھی راستہ جاتا ہے پہاڑی پر معماروں اور دیگر رئیسوں کے مکانات ہیں یہ مقام شہر کی اور عمارتوں کی بہ نسبت زیادہ بلند ہے بلبلی خانے کو بھی یہاں سے راستہ جاتا ہے یہاں سے پیر و مرشد میر محمدی صاحب و مرزا سلیم مرشد زادے کے مکانوں کو بھی راستہ جاتا ہے۔ ان دونوں مرشدوں کے مزار اسی جگہ ہیں اس سے آگے میر ہاشم کی حویلی اور حضرت شاہ آفاق رحمت اللہ علیہ کا مکان ہے حکیم قدرت اللہ کا مکان اور مسجد بھی یہیں ہے مسجد کی پیشانی پر خود حکیم صاحب نے یہ تاریخ کندہ کی ہے۔

چو نو گشت ایں معبدِ دلکشا — بتائیدِ لطفِ امام الورے

خطیب خرد گفت از سالِ او — زہے مسجدِ پُر ز نورِ خدا

حکیم صاحب کا دیوان خانہ اور حضرت شاہ غلام علی صاحب کا مکان بھی

یہیں ہے اسی جگہ میرزا جان جاناں صاحب رحمت اللہ علیہ کا مزار اور شاہ صاحب کا مزار بھی ہے میاں ابو سعید صاحب رحمت اللہ علیہ کا مزار اور خانقاہ بھی یہیں ہے۔ شاہ صاحب کی مسجد بھی یہیں ہے مسجد کے متصل سہ درہ ہے اور اس میں دو یا تین قبریں ہیں۔ دالان کے پیچھے ہندی زبان کے شاعر حکیم عزت اللہ عشق کا مکان ہے۔ حکیم صاحب کی غزل کے چند شعر جو مجھے یاد آ گئے ہیں لکھتا ہوں۔

گلشن میں جو کل خنداں وہ مستِ شراب آیا
گل ہاتھ پہ رکھ اپنے جام مئے ناب آیا
مجلس میں وہ شیریں لب جب گرم عتاب آیا
لب بند ہوئے سب کے کچھ بھی نہ جواب آیا
خاموش جو ہے شاید لے کر نہ جواب آیا
ہے خیر تو اے قاصد کیوں چشم پُر آب آیا
بے چین ہو کیوں بیٹھے لو چین کرو مشفق
اے راحتِ جاں دیکھو وہ خانہ خراب آیا

اس کے آگے حضرت شمس العارفین کے مزار کے نواح میں قبرستان ہے یہاں سے ایک دو راہا جاتا ہے جو ایک طرف محلہ کلیان پورہ میں اور دوسری طرف گنج نواب میر خاں کی طرف پہنچتا ہے۔ دوسرا راستہ جو چتلی قبر سے جاتا ہے وہ قبر سے لے کر دہلی دروازے تک پہنچتا ہے اعظم خاں کی حویلی اسی جگہ ہے یہاں دیگر رئیسوں کے مکانات اور چرینے کی منڈی بھی ہے کلو بادشاہی خواص کی حویلی بھی یہیں ہے اور آج کل اس میں مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مکان اور مدرسہ ہے، اس مدرسے میں مولوی محمد اسحاق صاحب تعلیم دیتے ہیں۔

(صلائے عام۔ نومبر ۱۹۱۵ء)

کسی کے آنے کا انتظار

کسی کے آنے کا انتظار عبادتِ الٰہی سے کم نہیں کہ جس طرح عبادت کا نتیجہ عاقبت میں ملنے کی اُمید ہے (گو کسی نے عاقبت آنکھ سے دیکھی نہیں، مگر اُس کے آنے کا اور میاں سے ملنے کا بڑا سہارا ہے)

اسی طرح یار آئے نہ آئے۔ لیکن انتظار میں جی ایسا بہلتا ہے کہ کسی مشغلے میں یہ لطف نہیں آتا۔ بلکہ وعدہ پورا ہونے میں بھی یہ بات میسّر نہیں۔

ماں کو بازار سے بچے کے آنے کا انتظار کہ دیر ہوگئی تو دو دفعہ دروازے کے کواڑوں سے جھانک آئی دلھن کا چوتھی کے بعد میکے میں آنے کا انتظار کہ چھوٹے بھائی صبح سے لینے پہنچ گئے۔ نئی نئی شادی میں میاں کے آنے کا انتظار کہ کچہری کے ختم ہونے کا وقت ہوگیا تو نوکر جا رہے ہیں کہ دیر کیوں لگائی ؎

خاصداں پھر دوسرا پانوں کا لے پہنچا وہیں
دو گھڑی میں یہ پیام آیا "رہو شب کو وہیں"

مسافروں کا سفر سے پلٹنے کا انتظار — مردانِ جنگ کا لڑائی سے واپس ہونے کا انتظار۔ کشتگانِ ستم کو روزِ جزا کا انتظار۔ ان میں سے ایک ایک کا ذکر وعدۂ فردا سے زیادہ طویل سمجھئے لیکن دنیا کے سارے انتظاروں میں کسی حسین کو

کسی کے آنے کا انتظار قیامت کا سامنا۔ اور غضب یہ کہ جسقدر پارسائی کا پاس ہے اُسیقدر اضطراب زیادہ ہے۔ وفورِ اضطراب اور اندیشۂ رسوائی دونوں کا جمع ہونا ہنگامۂ محشر سے کم نہیں۔

دوپٹے کی ہر چُنّت (شکن) پر نگاہ ہے کہ چینِ جبیں کی طرح کسی کی مرضی کے خلاف تو نہیں۔ ریشمی پائنچے کی دھاری کا خیال ہے کہ بے موقع تو نہیں۔ کوئی بات کرنے والا ہو نہ ہو مگر دالان میں جتنی چیزیں ہیں۔ سب کو معلوم ہو گیا کہ کسی کا انتظار ہے آئینہ سے تو کوئی بات چھپی ہی نہیں رہی کہ جتنی دفعہ اُدھر سے نکلیں بے دیکھے رہا نہ گیا۔ وہ گول گول بھرے ہوئے بازو جن کا دیکھنا کسی کو نصیب نہ ہوا، بالوں کا جوڑا درست کرنے کے لئے کئی دفعہ اُٹھے۔ ایک تو بازو ہی کیا کم دل فریب ہیں اس پر ان کا قدِ جاناں کی طرح اُٹھنا کیا کہیے۔ مانی و بہزاد نہیں ؎

لے بروئے تو گرد آئینہ را چشمِ نیاز
شانہ را دستِ دُعا در شبِ زُلفِ تو دراز

میرے دیکھتے دیکھتے رومال سے ہونٹوں کو دو دفعہ پیام پہنچ گیا کہ پان کی سُرخی پاؤں پھیلا رہی ہے۔ آرسی کو حُکم ہے کہ سامنے سے نہ ہٹے۔ پاندان کو ٹھکانے سے رکھا گیا۔ اور غلاف جھاڑ کر ڈھانکا گیا۔ تکیوں کو بے کہے خبر ہو گئی کہ کوئی آنے والا ہے۔ ہر چیز میں جان آگئی اور جان کے ساتھ زبان۔ ہاتھوں کی مہندی نے کہا کہ نگہِ انتظار سے خون ٹپکنا مشکل نہیں ؎

برائے زینتِ مژگاں بدیدہ خواہم خُوں
وگرنہ بر کفِ دریا کسے نہ بستہ حنا

جس کا انتظار ہے اس سے اقرار ہے کہ دروازہ آہستہ سے کھولنا۔ اس خیال میں ذرا سی آہٹ پر اسی طرف کان لگے ہوئے ہیں۔ کانوں کی بالیاں اُتار ڈالی ہیں کہ

آواز کے سننے میں سدِ راہ نہ ہوں۔ یہ احتیاط غلط سہی۔ مگر وفورِ محبت میں جب کہ تیرہ چودہ برس کا سن ہو سمجھ کی ضرورت نہیں، دوسرے گو عورت کو زیور و آرائش سے شوق ہوتا ہے مگر بڑی آرائش اس کی اُس کا چاہنے والا ہے۔ حسینانِ پردہ نشیناں کے لئے اُن کا گھر اُن کے لئے گویا صدف ہے جن میں یہ بے بندھے موتی کی طرح جو سیپ سے باہر نہیں ہوا تمام عالم سے بے خبر رہتی ہیں ؎

وہ ہر اک بات میں اٹھلانا وہ البیلاپن
وہ دبی بات وہ لجیائی کسی کی چتون

لیکن بے لگاؤ محبت اور کچھ کچھ سن تمیز یہ دونوں مل کر جانے کیا کچھ آفت برپا نہیں کر سکتے۔ ماما کے سونے کا وقت ابھی نہیں ہوا۔ مگر ماما سے کہا جا رہا ہے کہ رات زیادہ آگئی ہے تم سو رہو۔ اپنے کھانے کے لئے ایک دو پان کافی ہیں۔ مگر اپنے ہاتھ سے جانے کتنے پان لگائے جا رہے ہیں کہ انتظار میں عورت کو یہی مشغلہ بھاتا ہے۔

محبت کو آفاتِ آسمانی میں سمجھتے ہیں۔ لیکن عورت جس وقت کسی کا اس طرح انتظار کرے تو ایسا کون کم بخت ہے جو اُسے آفت سمجھے گا۔ اس وقت اس انتظار کرنے والی میں دو خوبیاں ایسی ہیں جو زلیخا کو نصیب نہ ہوئیں۔ اول تو اپنی پارسائی کا خیال جو صبرِ دل عاشقاں کی طرح زلیخا سے نہ بن پڑا ۔۔۔ دوسرے اس بات سے بے خبری کہ کوئی مجھے مجھ سے زیادہ چاہنے والا ہے۔ شکل جس قدر اچھی ہو اسی قدر جوشِ محبت زیادہ ہوتا ہے فریب میں اتنی تکلیف نہیں ہوتی۔

محبت کے عہد نامے اسٹامپ کے کاغذ پر نہیں لکھے جاتے بلکہ دلوں پر نقش ہوتے ہیں۔ اُن کی رجسٹری بے کار ہے کہ عہد شکنی میں زندگی سے ہاتھ دھونے کے سوا کوئی چارہ نہیں جس کا اپیل داورِ محشر کے سوا کوئی سن نہیں سکتا اور وہاں کے

فریادیوں کی میعاد مقرر نہیں۔

میں نے دیکھا ہے کہ پہلوانوں کی طرح حسین جب گرتے ہیں اپنے ہی زور میں گرتے ہیں۔ حسن کا بڑا زور پارسائی ہے جو اُس کے چاہنے والے کا انتظار کروا رہی ہے۔ جوں جوں رات جا رہی ہے اداسی بڑھتی جاتی ہے اس کے بالوں کی طرح حسرتیں اُلجھ رہی ہیں ؎

بدیں حسنِ تو اگر زلف چوں دلق گدا داری
کہ گاہے سائبانِ رخ کنی گہ بر کمر پیچی

جی میں ہے کہ اگر خود نہ آئیں تو خبر ہی بھیجدیں یا میری خبر سن لیں کہ ؎

کتنا ہی دل کو تھامتی ہوں شب سے بار بار
تھمتا ہے دل تو اشک نکلتے ہیں بے شمار
گنتی ہوں اضطراب میں تاروں کو بار بار
گھڑیال کی صدا کا ہے کانوں کو انتظار
یہ ناامیدیاں یہ طبیعت کو انتشار
یہ عالم سکوت کہ جیسے گناہ گار
ڈرتا ہے جی جو گھر کی طرف دیکھتی ہوں میں
اندھیر ہے جدھر کی طرف دیکھتی ہوں میں

کیسا بے درد ہے وہ دل جو اس انتظار کی داد نہ دے اور اس سے زیادہ بُری طبیعت اس کی ہے جس کو ایسی باتوں میں معصیت کا خیال آئے۔

ہاں اِک نگاہِ لُطف و کَرَم تو کریم ہے
اللہ تیری ذات غفور الرحیم ہے

(صلائے عام۔ مارچ ۱۹۱۲ء)

مضمون پریشاں

اب تک بھی یہ خیال پریشاں ہے عرش سیر
اُس مُرغ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا

مجھ سے اکثر اس بات کی بحث رہتی ہے کہ صلائے عام نکالنے کی بجائے کوئی کتاب کسی خاص مضمون پر کیوں نہیں لکھتا۔ میرے ذہن میں ہے کہ کسی خاص مضمون پر کتاب لکھنے سے اخبار و رسالہ میں مختلف مضامین لکھنا زیادہ مشکل ہے۔ کتاب کے مصنف کو تو اپنی مرضی کے موافق فرصت میں لکھنے کا موقع حاصل ہوتا ہے کہ جب طبیعت راغب ہوئی لکھا، پھر اسی کو دوبارہ سہ بارہ جتنی دفعہ جی چاہا، گھٹا بڑھا لیا جہاں جس لفظ کی ضرورت ہوئی بڑھا دیا، جو لفظ بیکار دیکھا نکال ڈالا۔ آج نہ لکھا کل لکھا، جب جی میں آئی لکھا یا نہ لکھا۔ میر حسن کی مثنوی کو میر حسن نے بیس[۲۰] پچیس[۲۵] برس تک سنوارا تب اس صورت میں نظر آئی۔ مقاماتِ حریری و مقاماتِ حمیدی، ایک دن میں نہیں لکھی گئیں۔ جتنی نادر تصانیف ہیں، ایک عمر کی محنت کا نتیجہ ہیں۔ شاہ نامہ، فردوسی کی تمام عمر کا کارنامہ ہے اور مولانا روم کی مثنوی سالہا سال کی محنت کا نتیجہ۔

برخلاف اس کے اخبار و رسالوں کے لئے مضامین اُسی وقت لکھنے پڑتے

ہیں، جو اخبار یا رسالے نکلنے کا وقت ہے اور بعض دفعہ تو دن ہی کے دن خیال ہوتا ہے کہ رسالے کی اشاعت کی تاریخ آگئی اور مضمون اب تک ذہن میں نہیں آیا۔ شاعری میں تو فی البدیہہ کی کبھی کبھی نوبت آئی اور یہاں روز یہی جھگڑا ہے۔

کتاب کی تصنیف میں وقت و مسالا دونوں آرام سے میسر ہوتا ہے۔ فرہنگ لغت کی کتابیں پاس رکھ لیجئے کتب خانے سے جس کتاب کی ضرورت ہو۔ اٹھا کر دیکھ لیجئے جس لفظ و عبارت میں شبہ ہو اس کی صحت کر لیجئے۔ برخلاف اس کے صلائے عام کے مضامین کے لئے میں کہیں ہوتا ہوں اور کتابیں کہیں، طبیعت اگر حاضر ہے تو کہتا ہوں کہ ابھی جلدی کیا؟ جب وقت آجاتا ہے تو طبیعت حاضر نہیں ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کسی لفظ یا عبارت کی صحت منظور ہو تو یاد نہیں آتا۔ کہاں دیکھی تھی۔ یاد آگیا تو جس کتاب میں دیکھنا منظور ہے اس کا پتا نہیں۔ مجھے گمان ہے کہ اگلے انشا پرداز جو بے مثل کتابیں لکھ گئے۔ اُنہیں آج کل کے رسالوں اور اخباروں میں مضمون لکھنا مشکل ہو جاتا۔ یہ خوب ہوا کہ اُس وقت آج کل کی سی مضمون نگاری کی ضرورت نہ تھی۔ اگلے وقتوں میں کسی خاص کتاب کی تصنیف اور آج کل کی مضمون نگاری کی تمثیل اسی طرح سمجھئے کہ تاج گنج کا مقبرہ اور سرراہ کی ٹوٹی پھوٹی قبر، تاج گنج کے لئے شوقین ارادہ کر کے جائیں تو پہنچیں اور پہنچ کر عمارت کی خوبیوں میں کسی کو ممتاز محل کے واسطے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھانا یاد آئے نہ آئے سرراہ کی ٹوٹی قبر کو دیکھ کر جہاں سے ہر شخص کا گزر ہو فاتحہ کے سوا اور کوئی خیال نہیں آئے گا۔

جس طرح فاتحہ کے خیال سے سرراہ کی قبر دور کے مقبرے سے بہتر ہے اسی

طرح میں کسی خاص کتاب کی تصنیف سے صلائے عام کے لئے مضمون لکھنا بہتر جانتا ہوں کہ کتاب تو کوئی ارادہ کرکے دیکھے تو دیکھے۔ صلائے عام جہاں مل جائیگا کوئی نہ کوئی دیکھ ہی لے گا۔

کتاب سے اگر کوئی ناراض ہوا تو اس کو راضی کرنا مشکل ہے۔ صلائے عام کے کسی مضمون سے کوئی خفا ہوا تو دوسرا موجود ہے مجھ سے کوئی خفا ہے تو اور مضمون نگاروں نے کیا خطا کی ہے سب تو گردن زدنی نہیں اور اگر ایک پرچہ ناپسند ہے تو ضرور نہیں کہ دوسرا پسند نہ ہو۔

اسی طرح مضامین میں مجھے مضمون پریشان کی ترکیب اچھی لگتی ہے کہ اس کی ایک بات کسی وجہ سے اگر ناپسند ہوئی تو ساتھ ہی اور کئی باتیں ہیں، جن میں سے کوئی نہ کوئی پسند ضرور ہوگی۔ مضمون پریشاں پر اس شعر کا اطلاق خاصا ہے کہ ؎

فسانہ تری زلف شب رنگ کا
بڑھے گا جہاں تک بڑھائیں گے ہم

افکار زمانہ میں یہ بات عجیب دیکھی کہ مختلف افکار انسان کی جانکاہی کا اس قدر باعث نہیں ہوتے جس قدر کہ کوئی خاص فکر، تھوڑی تھوڑی متعدد باتوں کی فکر سے انسان کو اتنی تکلیف نہیں ہوتی جس قدر کہ کوئی خاص جھگڑا انسان کی زندگی کو اجیرن ہو جاتا ہے۔ انسان اولاد سے محبت کرے۔ ماں باپ کی اطاعت کرے۔ بال بچوں کی پرورش کے لئے محنت کرے۔ ہمسروں میں آبرو پیدا کرے اور ایسی ہی ہزار فکریں کرے۔ ان میں جان پر نہیں بن جائے گی، لیکن مجنوں کی طرح اکیلی لیلےٰ ہی کی دھن میں رہے تو جاں بر نہیں ہو سکتا یا فرہاد کی طرح صرف جوئے شیر کے پیچھے پڑ جائے تو مر جائے گا۔ سکندر نے گو ملک گیری کو حاصل زندگی جانا مگر زندگی

ہی نے وفا نہ کی۔

یہ اصول عالم اسباب میں داخل ہے کہ ایک چیز کے پیچھے پڑنے سے سب چیزیں چھوٹ جاتی ہیں، اگر ایک ایسی تمنّا پوری ہوئی جو جان سے زیادہ عزیز ہو تو جان پر بن جاتی ہے۔ برخلاف اس کے اگر چھوٹی موٹی کئی باتوں کی فکر ہو تو سب اگر پوری نہ ہوں۔ دُو دُو چار ضرور پوری ہوں گی۔ فلاسفی کا مسئلہ ہے کہ عالمِ ذرّات میں انسان خدا جانے کیا کیا رہ چکا ہے تب ازروئے مسئلہ ارتقا (ایوولیوشن) اس حالت کو پہنچا ہے

رہے ہیں عالمِ ذرّات میں ہم ناتواں برسوں
بنایا ہے ہمیں جب کر چکے ہیں امتحاں برسوں

جس چیز کا برسوں امتحان لیا گیا۔ اُس کا کیا کہنا۔

مجھے اس قوم پر افسوس آتا ہے جس کی خوبیاں زبان غیر کی محتاج ہوں، جسے اپنے عزیزوں کا حال بیگانوں سے دریافت کرنا پڑے مہاراج کالیداس جی دُنیا میں آئیں اور شکنتلا کی داد یورپ والوں سے پوچھیں۔ شاہجہاں بادشاہ۔ روضہ تاج گنج دیکھیں اور امریکا کے پریسیڈنٹ سے دریافت کریں کہ تم کو معلوم ہے کہ ممتاز محل کہاں دفن ہے نورجہاں کا حال جہانگیر کو انگریزی مورخوں سے پوچھنے کی ضرورت ہو۔

میں جس گھر میں پیدا ہوا اُس کا نقشہ اُن لوگوں سے پوچھوں جو اُس گلی کے پاس سے نہیں نکلے جس زبان میں میری ماں نے مجھے لوریاں دیں، اُس زبان سے مجھے نفرت ہو۔ سورج مکھی کا پھول سورج سے منہ پھیرے۔ نسیم سحر چلے اور پھول نہ کھلے

زندگی سے غرض نری تکلیف و محتاجی نہیں۔ زندگی میں عیش و آرام بھی ضرور ہے۔ بلکہ جو شخص عیش کر لیتا ہے وہ عیش پر جان نہیں دیتا۔ کباب دار جو رات دن مُشک و زعفران کے کھانے پکاتے ہیں۔ اُن کی طبیعت تکلف کے کھانوں کی طرف سے بھر جاتی ہے حلوائی جن کی دکانیں مٹھائیوں سے لدی ہوتی ہیں اپنے لئے ساگ ترکاری پسند کرتے ہیں۔ مگر لڑکوں کو جو دکان پر نوکر ہوں پہلے خوب مٹھائی پوری کچوریاں کھلاتے ہیں کہ ان کا جی بھر جائے عیش کر کے ترک کرنا اُس سے اچھا ہے جسے عیش نصیب ہی نہیں ہوا۔ جس طرح انگریزی میں مثل ہے کہ عشق کر کے ہجر کی مصیبت برداشت کرنی اُس سے اچھی ہے جو آزارِ محبت ہی سے ناواقف ہو۔

انسان کسی سے بھلائی کی اُمید ہی کیوں رکھے کہ نااُمیدی کا رنج اٹھانا پڑے۔ محفل میں آپ اس نظر ہی سے کیوں جائیں کہ صدر میں جگہ ملے گی۔ جہاں جگہ ملی بیٹھ گئے۔ نہیں تو کھڑے کھڑے تماشا دیکھ کر چلے آئے۔ دُنیا میں اُمید تمام رنج و مصیبت کی جڑ ہے۔

لکھا ہے کہ اگلے زمانے میں بادشاہت کے امیدواروں کو سول سروس کی ملازمت کی طرح مقابلے کا امتحان دینا پڑتا تھا۔ ممتحن بڑے بڑے فلاسفر ہوتے تھے۔ سلطنتِ کوبیہ کی اُمیدواری کے امتحان میں سوال تھا کہ دُنیا میں خوش کون ہے جواب ملا کہ حقیقت میں خوش وہی شخص ہے جو اپنے تئیں خوش سمجھ لے۔ دولت مندی و محتاجی، امیری و غریبی مال و دولت، عقل و فراست، بیماری و تندرستی تابعداری و آزادی، تنہائی و صحبت، جوانی و پیری، توانائی و ناتوانی کسی خاص چیز پر خوشی کا مدار نہیں۔ مشہور ہے ؎

دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند
کانرا کہ عقل بیش غم روزگار بیش

لیکن عقل کا خون کر کے زندگی میں اگر انسان خوش رہا بھی تو کمال بیوقوفی ہے۔

کہتے ہیں کہ حکیم بیدؔپائی (جو کلیلہ دمنہ سی لاجواب کتاب کا مصنّف سمجھا جاتا ہے) عقل کا پُتلا تھا۔ تمام عالم کے دانا و خردمند اس کی فراست کے قائل تھے اور بہت خوش حال سمجھا جاتا تھا۔

اس کے ہمسائے میں ایک ضعیفہ رہتی تھی۔ جس کی عقل میں زیادہ عُمر ہو جانے سے فتور آگیا تھا۔ اور محتاجی کی وجہ سے گو عُسرت میں زندگی بسر کرتی تھی۔ مگر اپنے حال میں مست تھی ؎

مستغرقانِ نشۂ ہستی کو کیا ثبات
کچّے گھڑے حباب شرابِ فنا کے ہیں

راوی کا بیان ہے کہ ایک دن بیدؔپائی مجھ سے کہنے لگا کہ میں ناحق پیدا ہوا۔ میں نے پوچھا کہ اس بیزاری کی وجہ کیا ہے۔

حکیم نے ایک آہ بھر کر کہا کہ میں نے چالیس برس تمام علوم و فنون پر محنت کی اور کارخانہ عالم سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح چل رہا ہے۔ پڑھ کر نکلا تو اوروں کو مُدّت تک پڑھایا، مگر خود نہ سمجھا کہ دُنیا میں کیوں آیا اور کیوں جانا پڑے گا۔ میری اتنی عمر ہوئی کہ زمانے کا حال نہ جانا۔ سُنا ہے کہ عدم اور ازل دو چیزیں ہیں اور انسان دونوں کے بیچ میں ہے مگر یہ دونوں کیا چیز ہیں اوروں کو سمجھاتا پھرتا ہوں مگر خود آج تک سمجھ نہ سکا مرنے کے بعد کیا ہوگا اور جینے سے کیا غرض ہے۔ یہ زندگی یونہی بےکار گزر رہی ہے

راوی کہتا ہے کہ اتفاق سے وہ بڑھیا بھی مجھے ملی۔ اُس سے میں نے پوچھا کہ زندگی کس طرح ہو رہی ہے۔ اُسے تعجب ہوا کہ اس حماقت کے سوال کا کیا جواب

ہے۔ زندگی جس طرح گزر رہی ہے گزر رہی ہے۔ اس کی فکر کیا۔ بہت گزر گئی تھوڑی رہی ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ مرتے وقت خدا ایمان نصیب کرے۔

(ایمان سے غرض کسی خاص خیال کو جان سے زیادہ عزیز سمجھ لینا)۔

میں نے حکیم سے پوچھا کہ آپ تو اس فکر میں غلطاں پیچاں رہتے ہیں کہ زندگی کیا چیز ہے اور مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ اس بڑھیا کو دیکھئے کہ ان جھگڑوں سے بے فکر ہے۔

حکیم نے جواب دیا کہ اس میں شک نہیں کہ بڑھیا کو کچھ فکر نہیں۔ اسے ان جھگڑوں سے اطمینان ہے۔ جہالت و بے وقوفی میں خوش ہے مگر اس کی خوشی اور اطمینان سے میں اپنی الجھن و پریشانی کو اچھا سمجھتا ہوں۔

یہاں یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ انسان کو اطمینان و خوشی کے لئے عقل کی ضرورت ہے یا بیوقوفی کی۔

دنیا میں جو لوگ اس جھگڑے میں نہیں پڑتے۔ ظاہرا خوش نظر آتے ہیں برخلاف اس کے جو اس میں غلطاں پیچاں رہتے ہیں۔ الجھن میں ہیں۔

اس سے ثابت ہے کہ عقل الجھن کا سبب ہے اور بیوقوفی اطمینان کا باعث ہے لیکن غایت حماقت یہی ہے کہ انسان بیوقوفی کو عقلمندی پر ترجیح دے۔ خوشی ہو یا ناخوشی بیوقوفی سے دانائی بہتر ہے۔

(صلائے عام مارچ ۱۹۱۶ء)

گیتانجلی، دادِ نازک خیالی

اس مضمون میں میرا ارادہ بابو رابندر ناتھ ٹیگور کے کلام پر ریویو لکھنے کا ہے جو انگریزی میں گیتانجلی کے نام سے شایع ہوا ہے۔ ریویو سے میری غرض نکتہ چینی کی نہیں۔ گیتانجلی کو انگریزی زبان میں دیکھنے سے جو باتیں میرے ذہن میں آئیں عرض کیا چاہتا ہوں۔ مشہور ہے کہ اصل زبان کی خوبیاں ترجمہ میں دکھانی مشکل ہیں۔ مگر کبھی کبھی بقول میر حسن؎

کبھی یوں بھی ہے گردش روزگار الخ

ترجمہ اصل کی شہرت کا سبب ہو جاتا ہے اور نقل سے اصل کی رونق ہو جاتی ہے انگور اچھی چیز ہیں مگر کھینچ کر اور بھی اچھے ہو جاتے ہیں۔ توریت سے زلیخا کے نام کا بھی پتہ نہیں لگتا۔ مگر حضرت جامی نے سراپا عضب کا لکھ ڈالا اور قیس کو نجد سے زیادہ ہم نے وردِ زباں کر رکھا ہے جس طرح عمر خیام کی رباعیاں فٹز جیرالڈ صاحب کے انگریزی ترجمے سے زیادہ مشہور ہو گئیں۔ اسی طرح گیتانجلی کو انگریزی لباس بہت راس آیا کہ ولایت ہی میں اس کی قدر زیادہ ہوئی؎

بہ نالہ شہرہ عشق است عندلیب ارنہ
نفس گداختہ مرغاں دریں چمن ہستند

گیتانجلی کی انگریزی کا کیا کہنا مگر ریٹس صاحب کے دیباچے نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔ یہ دیباچہ خود انگریزی زبان میں کمال فصاحت کا نمونہ ہے۔ دیباچہ میں نے کئی بار پڑھا۔ اور جب دیکھتا ہوں پھر پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؎

چو بہ اور سم سخنہا ز زبانِ غیر گویم

کہ بہ ایں بہانہ شاید کہ نگاہ دارم اورا

صاحب دیباچہ لکھتے ہیں کہ گیتانجلی کا قلمی ترجمہ میں چھپا چھپا کر ریل میں، ہوٹل میں، گاڑیوں کی چھت پر پڑھتا اور بند کر دیتا کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی میرے چہرے سے اس اثر کے آثار دیکھ لے جو گیتانجلی سے پیدا ہوئے۔ اس میں کلام نہیں کہ گیتانجلی کی نازک خیالیاں غضب کی ہیں، پڑھنے والے پر اگر دل و دماغ سے عاری نہ ہو تو وجد کی سی حالت طاری ہو جانی مشکل نہیں۔ آپ کو یقین نہ آئے تو یہ چند تمثیلیں جو نمونے کے طور پر میں اپنی زبان میں عرض کرتا ہوں، سن لیجئے:

"جوگن جو کسی کی تلاش میں بھبھوت مل کر اس لئے نکلی ہے کہ کوئی پہچانے نہیں، وہ ایک رات کی بیاہی جو صبح کو دولھا کے باسی ہار کے پھول پلنگ پر سے چن رہی ہے، وہ مبتلائے صدمۂ فراق جس کی ساری رات انتظار میں کٹی ہو اور تمام گھر خالی پڑا ہو، یہ خداوند کریم کی نظر میں مقبول ہونے کے مرقعے ہیں"۔

"جو لوگ زندگی کو فضول سمجھتے ہیں، معذور ہیں، وہ اس سے زیادہ سمجھنے کی قابلیت نہیں رکھتے، دنیا کو جو برا جانے، جانے دیجئے۔ بچے جو الف بے تے کو مصیبت جانیں وہ گلستاں کے دیباچے کو کیا خاک سمجھیں گے ؎

زندگی خاک ہو جب فہم میں اتنا ہو خلاف
ہم اجل کہتے ہیں تم جس کو صبا کہتے ہو

"خدائے لایزال کی نعمتیں بھی اس کی طرح لایزال ہیں۔ کاسۂ درویشاں کی طرح اُن کا لطف اس میں ہے کہ ؂

خالی کُن و پر کُن کہ ہمی ے ماند

نعمہائے الہٰی کی حد نہیں۔ موج دریا کی طرح ایک آتی ایک جاتی ہے یا رنگِ رُخِ عاشقاں کی طرح ع

ایک رنگ آتا ایک جاتا ہے

"بسانِ کاسۂ گدایاں اس میں خدا جانے کیا کیا آیا اور کیا کیا گیا اور پھر بھی گنجائش ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ اس وقت تجھ سے باتیں کر لوں دنیا کے اور کام تو ہوتے ہی رہیں گے ۔ ۔ ۔"

یہ پھول توڑ ہی لے دیر نہ کر۔ ایسا نہ ہو کہ شاخ سے گر کر خاک میں مل جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ؂

ایں رسم قدیم است کہ در گلشن مقصود
بر خاک بریزد گل و چیدن نگزارند

میرا کلام تکلّف و تصنّع سے عاری ہے۔ یار سے ملنے میں زیور گہنے سے ہرج ہوتا ہے۔ ہاتھ کی چوڑیاں بدن میں چبھتی ہیں اور پازیب کی جھنکار سرگوشیوں کے لئے مانع آتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اشکی شیرازی کا شعر ہے ؂

اشکی بصد خونِ تو ئی عمداً نمی آید کسے
شاید بدامے ادفتی از آشیاں پرواز کن

ماں جو اپنے بچے کو خاک میں لوٹنے نہیں دیتی کہ خاک میں لوٹنے سے بچّے کے کپڑے میلے ہو جائیں گے، ماں کو معلوم نہیں کہ بچّے کی نگاہ میں ان گوٹوں کے کپڑوں سے خاک مٹّی میں لوٹنا زیادہ پیارا ہے۔

خانقاہ کے گوشے میں بیٹھ کر حجرے کا دروازہ بند کر کے اندھیرے میں تو کس کو ٹٹول رہا ہے آنکھیں کھول کر دیکھ ؎

چشم موسٰی میں نہ تجھ میں نہ ہمارے دل میں
اب ٹھکانا ہی نہیں وادیٔ ایمن اُن کا

آزادی جس کا نام ہے۔ وہ تو اب خالق کے حصے میں بھی نہیں رہی، مخلوق کو پیدا کر کے خالق نے اپنے پاؤں میں ارادتاً زنجیر ڈال لی۔ اب میرا آپ کا کیا ذکر۔

(یہ ہمہ اوست و ہمہ از وست کا نتیجہ ہے)

آخر ہمہ کدورتِ گلچین و باغباں
گردد بدل بہ صلح چو فصلِ خزاں رسد

"مُراقبہ چھوڑ اور تسبیح و مصلّےٰ الگ رکھ۔ کیا ہے اگر میرے کپڑے پھٹے ہیں۔ تر دامنی کے دھبوں سے کیا ہوتا ہے۔ تو اپنے مالک سے مل اور دنیا کی محنت و مشقت میں ساتھ دے۔"

مُدت ہو گئی کہ طنبورے کی طرح میں سازِ ہستی کی کھونٹیاں اُتار چڑھا رہا ہوں اور ہنوز روزِ اول ہے۔ تار سُر میں نہیں ملتے۔ نہ راگ

ٹھیک بیٹھتا ہے جو ساز کہ سُر کا ساتھ نہ دے اس کو رکھ کر کیا کیجئے۔
دہن غنچہ وا نہیں ہوتا گو نسیم سحر اٹھکھیلیاں کرتی جا رہی ہے۔۔۔"
میری تمنّائیں بڑی اور حسرتیں بے گنتی۔ لیکن جب تجھ سے عرضِ مدعا کا ارادہ کرتا ہوں تو ڈرتا ہوں کہ ایسا نہ ہو کہ پوری ہو جائیں۔۔ میں نہیں چاہتا کہ مرغانِ گلستاں کی آواز سے میں اٹھوں۔ نہیں چاہتا کہ نسیم سحر سے میری آنکھ کھلے۔ خیال یار میں میری آنکھ لگی ہے" مجھے کوئی جگائے نہیں، اگر نسیم سحر آئے تو کہہ دو کہ دروازہ بند ہے۔ ؎

اگر حور آید ایں دروازہ بستہ است
بگوئیدش کلیدِ در شکستہ است
اگر بیروں شتابد بادِ خمّاز
بگردیش کہ بوئے یار ہے باز

"جس دن موت آئیگی اس دن میرے پاس دینے کو کیا ہے لوگ کہتے ہیں کہ انسان خالی ہاتھ آیا اور خالی ہاتھ جائیگا۔ میں اجل کو خالی ہاتھ نہ جانے دوں گا۔ کاسۂ حیات جو لبلب ہو چکا ہے نذر اجل ہے اے میری زندگی کی غایت اور میری ہستی کا ماحصل یعنی موت تو جب چاہے آجا اک نگاہِ واپسیں اور میں تیرا ہو لیا۔۔۔۔"
شادی کے بعد دلھن کو میکہ چھوڑنا ضروری ہے اور دولھا سے اکیلے خلوت میں ملتا ہے ـــــــ

آخر سر خود در رہ آں ماہ نہادیم
اول قدم است ایں کہ دریں راہ نہادیم

میں اپنا گھر چھوڑتا ہوں اور مکان کی کنجیاں دیتا ہوں، اب تم جا لو

اور تمہارا کام اس وقت کوئی بات میری تسلّی کی کہو۔ یہ کیا قیامت ہے کہ خدا کے سامنے جانے سے ڈراتے ہو اور عاقبت کو خدا جانے کیا سمجھتے ہو ؎

سنبھلنے دے ذرا اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

ماں جب بچے کو ایک طرف کی چھاتی سے ہٹاتی ہے تو بچہ سمجھتا ہے کہ دودھ چھُٹا۔ مگر جھٹ دوسری طرف کی چھاتی بچے کے منہ سے لگا دیتی ہے۔

ایمان کی بات تو یہ ہے کہ گیتانجلی کی نازک خیالیاں داد دینے کے لائق ہیں اور جس قدر داد دیجیئے تھوڑی ہے۔

کہتے ہیں کہ خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے گیتانجلی کی نازک خیالیوں پر مجھے اپنی زبان کی نازک خیالیوں کا خیال آیا۔ آپ داد دیں یا نہ دیں۔ یہ آپ کو اختیار ہے مگر سن ضرور لیں ؎

با غیر نشینی و فرستی زپے ما
آں را کہ نہ داند رہ کاشانہ مارا

عتیقی کا قطعہ ہے ؎

بر آں گروہ بخندد ملک کہ بر قدمے
کہ روح دامن ازو بر کشیدہ میگیرند
ہمہ مسافر و ایں بس عجب کہ طائفۂ
ہر آں کہ پیش نہ منزل رسیدہ میگیرند

جب یہ ثابت ہے کہ دنیا میں جو آیا مسافر ہے جو مسافر کہ منزل پر ذرا پہلے جائے اُس کی پیش قدمی پر افسوس کرنا تعجب کا مقام ہے!

ستم ہائے روزگار کی نسبت کہا ہے کہ مادرِ گیتی جسے نیچر کہیے ؎

گہ از پرِ پشہ ہمائے سازد
گہ طعمۂ در اژدہائے سازد
درہم شکند کاسۂ سرِ کسریٰ را
تا دستۂ کوزۂ گدائے سازد

اسی طرح یہ شعر ہے ؎

رفت گلم تمام بہ آہ و فغاں گذشت
چوں بگذرد خزاں کہ بہارم چناں گذشت

مشہور ہے ع

قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا

یہاں معاملہ بالعکس ہے کہ بہار سے خزاں کا قیاس کر لیجئے ؎

دور از انصاف برق آشیاں باید شدن
مشت خاشاکے بصد محنت فراہم کردہ ام

ہر حال میں خوش رہنے کی نصیحت خوب کی کہ ؎

تا کے عمرت بخود پرستی گزرد
یا در غم نیستی و ہستی گزرد

آں عمر کہ مرگ باشد اندر پئے آں
آں بہ کہ بخواب یا بہ مستی گزرد

ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے اگر ہنستے ہوئے مرے تو قیامت کو ہنستے ہی اٹھیں گے۔

مولانا لسانی فرماتے ہیں ؎

دوش آمد بر سرم از نالہ ام رنجید و رفت
عذر ہا گفتم کہ شاید بشنود نشنید و رفت
آہ ازیں پرسش کہ دیر آید سوئے بیمار خویش
مردہ بودم حال من از دیگرے پرسید و رفت

واقعی بہت حسرت کا مقام ہے کہ یار عیادت کو آئے اور محلے والوں سے حال پوچھ کر چلا جائے۔

یہ شعر جو درجِ ذیل ہے بالکل گیتانجلی کی طرز پر ہے ؎

خوشم زشورشِ محشر کہ کس نخواہد دید
کہ گرد من زکدام آستانہ بر خیزد

اللہ رے اخفائے راز!

انشائے محبت کا جو تھا خوف تو ہر اشک
دامن میں چھپا تھا کوئی پلکوں میں نہاں تھا

پیش من در طلب یا نہ بحسرت مردن
بہ ازان است کہ پرسم زکسے یار کجاست

سراغ یار میگیرم بہر کس میرسم امّا
بخود آہستہ میگویم کہ یارب بے خبر باشد

آپ خفا نہ ہوں تو نازک خیالی اور پاکیزہ بیانی میں فارسی کا یہ شعر گیتانجلی سے بڑھا ہوا نہیں ہے تو کم ہرگز نہیں ؎

گر بجاناں زندۂ از رفتن جاں غم مخور
جاں ستاند از تو در مردن نہ جاناں غم مخور

خیال جاناں میں جان جانے سے زیاں ممکن نہیں کہ جان سے جاناں یوں بھی زیادہ ہے جان جانے پر بھی خیال جاناں نہ جانا کمال ادائے بیان ہے کہ جان لینے میں جاناں نہیں لیتے ؎

اے قدم ننہادہ ہرگز از دل تنگم بروں
حیرتے دارم کہ چوں از ہر دلے جا کردہ

عرفی کے شعر جو عرض کئے جاتے ہیں۔ گیتانجلی سے کسی طرح کم نہیں۔

طغیانِ ناز بیں کہ جگر گوشۂ خلیل
خود زیرِ تیغ رفت و شہیدش نمے کند

(طغیان ناز۔ یہ ادائے بیان آسان نہیں جگر گوشہ خلیل کا خود زیرِ تیغ جانا اور پھر شہادت سے محروم رہ جانا کہ جاؤ منہ نہیں لگاتے طغیان ناز کا کس بلا کا ثبوت ہے۔

بہ بیں در مقتلِ دست آزمائیہا چہ بے قدرم
کہ زخمم ناتمام افتاد و خجلت گشت قاتل را

ولہ

عرفی بحال نزع رسیدی و بہ شدی

شرمت نیامد از دلِ امیدوار دوست؟

ولہ

غیرتم بین کہ برآرندۂ حاجات ہنوز

از لبم نام تو ہنگام دُعا نشنیدہ است

ولہ

چمنے دیدہ و ہوائے خوش و پروازے کرد

کبک مسکیں چہ خبر داشت کہ شہبازے ہست

(چمن ہے اور ہوائے خوش چل رہی ہے کوئی طائر بیچارہ کلیل میں آکر پر پھیلا کر فضائے آسماں کی سیر دیکھنے کو اڑا کہ اتنے میں باز نے دبوچ لیا تو ستم ہائے روزگار میں کیا شبہ رہا۔ چمن نہ ہوتا اور ہوائے خوش نہ چلتی تو طائر کا اڑنے کو جی کیوں چاہتا نہ اڑتا نہ باز کے چنگل میں پھنستا)

در گلہ ہائے ودستاں ہست حلاوتے بسے

گر گلہ نشنوی زکس خود گلہ کن از کسے

ولہ

گر نخل وفا بر نہ دہد چشم ترے ہست

تا ریشہ در آب است اُمید ثمرے ہست

میں نہیں جانتا کہ میں کہاں تک اپنے ہاں کے شاعروں کی نازک خیالی بیان کئے جاؤں آنکھیں بند کر کے کسی کا دیوان اٹھا لیجئے گیتا نجلی سے کم مرتبے کا کلام نہ ملے گا یہ چند شعر اور سن لیجئے۔

غمت ہر لحظہ جانے خواہد از من
چہ انصاف است چندیں جاں کہ دارد
مرا گویند فردا روزِ وصل است
دگر نہ طاقتِ ہجراں کہ دارد
گویند دل بہ آں بت نامہرباں مدہ
دل آں زماں رود کہ نامہرباں نہ بود
آمدی و رفت زخود دل بکنارم بہ نشیں
نہ نشیں تا بہ خود آید دل زارم بہ نشیں
بسیار اگر نظر برخت مے کنم مرنج
بسیار ہم گذشتہ کہ رویت نہ دیدہ ام
جام و سبو شکستہ ام لے مرگ مہلتے
تا توبہ کہ کردہ ام آں نیز بشکنم

(صلائے عام۔ اپریل ۱۹۱۴ء)

قلعۂ معلّٰی کا عجائب خانہ

پچھلے مہینے میں مجھے اس عجائب خانے کا حال لکھنے کی فرصت نہ ہوئی۔ یہ عجائب خانہ جشن دربار دہلی کی تقریب میں حسب ایماء والا عالی جناب نواب لفٹننٹ گورنر بہادر پنجاب بالقابہم قلعۂ معلّٰی (لال قلعہ) میں جمع کیا گیا۔ اور بڑی عزت کی بات ہے کہ اس عجائب خانے کی اشیاء نادرہ دیر امپریل میجسٹیز اعلیٰ حضرت قدر قدرت شہنشاہ معظم قیصر ہند اور علیا حضرت حضور ملکہ معظمہ قیصر ہند کی نظرِ اقدس سے گزریں اور پسند خاطرِ والا ہوئیں۔ یہاں کی عجیب و نادر اشیا کا ذخیرہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے مگر ان چیزوں کی فہرست اور ان کی تحقیق و تاریخ کا حال جو انگریزی میں علیحدہ لکھا گیا ہے، ایک کارنامہ ہے۔ یہ تصنیف از روئے معلومات فنونِ لطیفہ و آثار الصنادید، دہلی دربار کی بہت پاکیزہ یادگار ہے۔ اس کو عجائب خانے کی محض فہرست نہ سمجھئے۔ بلکہ یہ کیٹے لاگ ایسا نادر تذکرہ ہے جس میں قدیم اسلحہ ماہی مراتب خلعتِ شاہی۔ فنِّ مصوّری و سنگتراشی و خوشنویسی۔ فرامین شاہی ایام غدر یعنی ۱۸۵۷ء کے متعلق یادگار چیزیں خاندانِ مغلیہ کے رسم و رواج کی از روئے تحقیق ایسی اچھی تاریخ ہے۔ جس کا اہلِ علم کے کتب خانوں میں موجود ہونا سامانِ لیاقت و پاکیزہ مزاجی میں داخل ہے۔

سنگتراشی کے نمونے اکثر مسلمانوں سے پہلے اہل ہنود کی سلطنت کے زمانے کے ہیں۔ مسلمانوں کے وقت کے کتبے نہ صرف خوش خطی کا کمال ظاہر کرتے ہیں۔ بلکہ پاکیزگی کلام کے اچھّے نمونے ہیں۔

(اللہ اکبر) بحکم پادشاہ ہفت کشور
(جل جلالہٗ) شہنشاہ بعدل وداد تدبیر (یا فتاح)
(یا ناصر) جہانگیر ابن شاہنشاہ اکبر
(یا فیاض) کہ شمشیرش جہاں را کرد تسخیر (یا حی)
(سنہ ۱۲) چو ایں پُل گشت در دہلی مُرتّب
(جلوس) کہ وصفش را نشاید کرد تحریر
(با ہتمام) پئے تاریخ اتمامش خرد گُفت
(حسین حلبی) پُل شاہنشہ دہلی جہانگیر (کعبہ شریف)

کتبوں کا ذخیرہ ۱۱۹۳ء سے ۱۸۵۷ء تک کے زمانے سے تعلّق رکھتا ہے۔ اِن میں محمود رکابدار نے گو رخانے کا کتبہ، قلعہ سلیم گڑھ کی تاریخ فرخ سیر کے زمانہ کے پتھر کا کتبہ اور سنگ تراشی کے کام اچھے ہیں۔ سنگتراشی میں فرہاد کا نام مشہور ہے کہ ؎

تراشد چوں شود دستش سُبک پَے
زلعل دلبراں آلایش ۰ مَے

پتھر میں مسلمانوں نے جو گُل بُوٹے اور خوشخطی دکھائی اس کے سامنے فرہاد کا ذکر محض افسانہ رہ گیا۔

اسلحہ قدیم و نادر اسلحہ کا ذخیرہ نہایت عجیب ہے کہ تیر و خنجر سے لے کر توپ و تفنگ کے عجیب عجیب نادر نمونے ہیں۔ ہر ایک ہتھیار کا حال کہ کس طرح کام آتا

ہے۔ اور اس کی اصل کیا ہے۔ بڑی خوبی سے لکھا گیا ہے۔

ابوالفضل نے آئین اکبری میں اپنے زمانے کے ہتھیاروں کی تفصیل لکھی ہے۔ اس عجائب خانے میں اُس سے زیادہ عجیب عجیب قدیم ہتھیار دیکھنے میں آئے۔ نادر کی تلوار۔ اودے پور کے مہاراجہ پرتاب سنگھ جی کی زرہ بکتر، ایران کی تلواریں نامور لوگوں کے خنجر کی کٹار پیش قبض وغیرہ، اورنگ زیب کا ظفر تکیہ۔ چار آئینے کا نمونہ چار آئینہ میں نے دیکھا نہ تھا۔ صرف کتابوں میں ذکر سُنا تھا کہ:۔

"نوع از لباس جنگ کہ چہار تختۂ از آہن ساختہ و در بنات یا مخمل گرفتہ گرد پشت و سینہ کشند۔"

ماہی مراتب

ماہی مراتب اور نشانات شاہی کا حال بہت مفصّل لکھا گیا ہے مسلمانوں میں حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کو یداللہ کا لقب ہے۔ ید یعنی ہاتھ سے پنجے کا تعلق سمجھا جاتا ہے۔ آفتاب و شیر و ماہی ایرانیوں کے نشان میں جو اُن کے ہاں قدیم سے رائج تھے اور جس طرح سلطنت انگریزی کی تعریف میں ہے کہ اس پر آفتاب غروب نہیں ہوتا۔ فارسی میں وسعتِ عملداری کی نسبت مشہور ہے کہ از ماہ تا بہ ماہی کہتے ہیں کہ زمین سے آسمان تک حکم جاری ہے ماہ اونچی چیزوں میں اور ماہی نشیب کی چیزوں میں ظاہر ہے۔

"نشانِ کوکبہ چوبے باشد بلند و کج کہ از سر آں گوئے فولادی مصیقل آویزند و پیشِ سواریٔ ملوک مے برند و آن از لوازم بادشاہی است۔"

قمقمہ "ظرف کوچک کہ آنرا کوزہ گویند۔"

خلعت

"خلعت جامہ باشد کہ از تن کشیدہ بر دیگرے دہند"

خلعت کی بڑی عزت یہ ہے کہ بادشاہ کا پہنا ہوا لباس کسی کو عطا ہو۔ بہادر شاہ کے اخبار قلعہ معلیٰ سراج الاخبار نامی ہفتہ من ابتدائے روز پنجشنبہ لغایت شارم چہار شنبہ شعبان المعظم ۱۲۵۷ھ (مطابق ۱۸۴۱ء) کی خبروں میں لکھا ہے کہ ـــ

"فرزند ارجمند معظم الدولہ بہادر جناب صاحب رزیڈنٹ بہادر دہلی معہ سکتر صاحب باستان بوسی فائز شدہ صیقل آئینہ اعزاز رنگ چہرۂ امتیاز گردیدہ بعرض رسانید کہ فدوی ارادۂ روانگی کوہ شملہ برسم دورہ دارد . . . . . چون محمول این خاندان رفیع الشان است کہ ہنگامِ رجعتِ اُمرار بعطائے خلعت سرفراز میگردند بہادر موصوف بعنایتِ دوشالۂ ملبوسِ خاص ممتاز گردیدہ نذرِ تہنیت گزرانید . . . خلعت شاہی تین پارچے سے کم کا نہیں ہوتا تھا۔"

اسی طرح کھانے کی عزت اس بات کی تھی کہ خاصے سے بھیجا جائے جس کو اُلش کہتے تھے۔

فرامین

فرامین شاہی کی تحقیق میں صاحب فہرست نے کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ سلطنت مغلیہ میں فرمان نویسی کا صیغہ ہی علیحدہ تھا۔ جو مسلمانوں کے وقت میں ایک خاص فن کے مرتبے کو پہنچ گیا۔ اچھّے سے اچھّے خوشنویس اور اہلِ کمال اس صیغے کے متعلق تھے۔ ایک ایک کاغذ پانچ چھ جگہ اور دس بارہ معزز اہلکاروں کی نظر سے گزرتا تھا۔

ان کی تصحیح ونقل کی اصلاحیں جُدا جُدا تھیں۔ مُہر ثبت کرنے کی تاریخ بھی بالتحقیق لکھی جاتی تھی۔ اہلِ علم وتحقیق کے واسطے فرامین شاہی بڑے دِل کش اسباب میں سمجھے اِن فرمانوں میں سُلطان غیاث الدین بلبن کے عہد کا ایک فرمان خط نسخ میں ہے کہ اُس وقت نستعلیق کا رواج نہ تھا۔ ہندوستان میں خطِ نسخ پٹھانوں کے زمانے تک جاری رہا۔ خاندان مغلیہ کے فرمان سب نستعلیق خط میں ہیں اور خطِ نستعلیق کے بہت اچھی طرز کے بقول صاحب فہرست جوں جوں سلطنت مغلیہ میں ضُعف آتا گیا۔ فرمانوں کی حالت میں بھی زوال کی صورت نظر آتی ہے۔

دکھن میں عالمگیر کا فرمان پہنچنے پر مرہٹوں کا سردار راجہ تین لعل معہ لشکر شہر سے باہر استقبال کو آیا تھا۔ اس وقت کے فرامینِ شاہی کی شان ایسی تزک واحتشام کی تھی۔ جس کے لئے ایک کتاب علیحدہ لکھی جائے تو مناسب ہے' فرمان نویسی میں قدیم تعلیم کا کیسا اچھا ثبوت ہے کہ بڑے کے نام کا بڑا ادب تھا۔ خُدا۔ رسول۔ بادشاہ اور بڑوں کے نام ہمیشہ اوپر لکھے جاتے تھے اور اگر کوئی نام عبارت میں کہیں نیچے آجاتا تو وہ جگہ خالی چھوڑ کر اوپر لکھا جاتا تھا۔ یہ حفظِ مراتب ہماری گھٹی میں پڑا ہوا ہے فرامین کے ساتھ جرنیل پران صاحب کا ایک قول (عہد نامے کے طور پر) ہے جسمیں جناب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام آیا تو نیچے جگہ خالی چھوڑ کر اوپر لکھا۔

اُس وقت کی طرزِ تحریر اور تاریخ لکھنے کے لئے یہ فرامین اور خطوط جو اس عجائب خانے میں جمع کئے گئے بڑے کام کے ہیں۔

خوش خطی

یہ فن ہندوستان اور ایران کا حصّہ ہے چھاپے خانے کی وجہ سے یورپ میں اس کا رواج نہ ہوا۔

خوش خطی کی قدر ہندوستان میں سلاطین مغلیہ کے زمانہ میں زیادہ ہوئی اور جوں جوں چھاپے کا رواج ہوا کم ہوتا گیا اس فن کے صاحبِ کمال اور شوقین روز بروز گھٹتے جاتے ہیں۔ لیکن اب بھی گو چھاپے خانوں کی کثرت ہے مگر نستعلیق ہاتھ ہی سے لکھا جاتا ہے۔ اس کا ٹائپ اب تک کسی سے بن نہ سکا کہ نستعلیق خط کے لئے کم وبیش چار سو پانسو توڑ جوڑ چاہئیں۔

مجھے اس فن کا شوق ہے اور شوق کے موافق اگر خوش خطی کا ذکر کئے جاؤں تو ایک کتاب ہو جائے۔ فارسی میں اس فن کی کتابیں موجود ہیں۔ اس لئے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

تصویریں

تصویروں کا ذخیرہ واقعی لاجواب ہے۔ جن کی فہرست تیار کرنے اور ترتیب دینے میں بڑی لیاقت دکھائی گئی ہے اکثر تصویریں ایسی بے مثل ہیں جنھیں فنِ مصوّری کی جان کہیے۔ یہ فن مسلمانوں نے باوجود شرعی ممانعت کے کمال کو پہنچا دیا۔ حکام کا ہم پر احسان ہے جن کی پرورش سے ایسی پاکیزہ تصویریں ہمارے دیکھنے میں آئیں فنِ مصوّری اب ہندوستان سے مٹا جاتا ہے۔ اوّل تو اس فن کے اہلِ کمال نہیں رہے۔ دوسرے شوخ رنگ کے وہ مسالے جو مچھلی کے پوٹے سے تیار ہوتے تھے شنجرف کا برسوں گھوٹنا اب کہاں۔ ہمارے ہاں کے مصوّر چہرہ تو ایسا پاکیزہ بناتے ہیں کہ اور ملکوں میں یہ بات میسر نہیں اور تصویر بھی جس قدر چھوٹی بنائی اسی قدر خوبصورت۔ شروع میں تو مغلیہ اسکول میں تاتاریوں کی تقلید رہی۔ جن میں مانی و بہزاد کا نام ہر شخص کی زبان پر ہے۔ پھر ہندوستان کے خط وخال کا اسکول علیحدہ پیدا ہوا۔ دہلی میں ہندوستانی خط وخال کی تعریف سمجھی جاتی ہے۔ اور لکھنؤ میں یورپ کے مصوّروں کی تقلید زیادہ پائی جاتی ہے۔ آخر میں دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ یورپ کے مصوّر زیادہ آ گئے۔ بہادر شاہ کے

زمانے میں مسٹر سُوفٹ صاحب بہادر نامی مصوّر انگریزی نے سواری کی تصویریں اچھی کھینچیں۔ ہمارے ہاں کے مصوّروں کو ہاتھی گھوڑے کی تصویریں کھینچنے میں کمال نہیں ہُوا۔ مصوری کا فوٹوگرافی کی طرح گو اہلِ علم سے بہت تعلّق نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن قدیم تصویروں کی بڑی خوبی یہ ہے کہ بیش قیمت تصویروں کے ساتھ فارسی کلام نظم موقع کے مناسب ضرور ہوتا ہے یا ایک طرف خوش خطی کا کوئی نمونہ قطعے کے طور پر اور دوسری طرف تصویر کہ متقّی اور مولوی لوگ جو تصویر دیکھنا ناجائز سمجھتے ہیں اُن کے لئے قطعے کا رُخ کافی ہے۔ خوبصورتی میں تصویر اور خوش خطی و پاکیزہ کلامی میں قطعہ دونوں لاجواب سمجھئے۔

میں دیکھتا ہوں کہ یہ مضمون بہت بڑھا جاتا ہے اور واقعی مصوّری اور تصویروں کا حال اس مضمون میں آنا مشکل ہے۔ اس لئے تصویر اور مصوّروں کی نسبت میں پھر عرض کروں گا۔ لیکن اس وقت اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ واقعی ان مختلف اور متعدد فنون کی تحقیق میں اس قدر کمال اور واقف کاری جو عجائب خانے کے کیٹے لاگ (فہرست) سے ثابت ہوتی ہے۔ ہزار تحسین کے قابل ہے اس فہرست میں بعض مدوں کا ذکر میں جان بُوجھ کر چھوڑ گیا کہ مجھے ان میں دخل نہیں۔ اور جن میں کچھ دخل ہے اُن کے لکھنے کی رسالے کے مضامین میں زیادہ گنجائش نہیں۔

صلائے عام (جنوری ۱۹۱۲ء)

مضمون پریشاں

چند باید بر خش زُلفِ پریشاں دیدن
صورتِ کفر در آئینۂ ایماں دیدن

یہ شعر چندر بھان برہمن کا ہے۔ پہلے مجھے یہ کہہ لینے دیجئے کہ اہلِ ہنود نے زبانِ فارسی کی تکمیل میں اہلِ زبان سے کسی طرح کمی نہیں کی، کفر و ایمان کے جھگڑوں کی طرح مضمون پریشاں کے لکھنے میں مجھے زیادہ پریشانی ہوتی ہے کہ اکثر بکھرے ہوئے خیالوں کو جمع کرنا پڑتا ہے۔ جن کا تعلق ایک دوسرے سے منطقیانہ ہو یا نہ ہو مگر سخن گسترانہ ضرور ہوتا کہ سب ہِل ملا کر اس مضمون میں کھپ جائیں۔ اس میں ایک دقّت اور بھی میں نے اپنے اوپر گوارا کر رکھی ہے کہ ایک ہی طرز کی باتیں نہ ہوں، متانت کے ساتھ شوخی اور اطمینان کے ساتھ بے قراری ہو ؎

بہم متانت و تمکین و شوخی و تیزی
ملی جلی ہوئی ترکیب کا نیا جوبن

پرانی بات بھی نئے طرز پر ادا کی جائے۔ غزل استاد کی ہو اور مغنّی نیا۔ بادۂ کہن ہو اور ساغر نئے۔

گل پریشاں نسزد ہمسریٔ کاکل را
نہ کنم قافیہ اش بارِ دگر سنبل را

اس مضمون میں مجھے اظہار پریشانی منظور نہیں بلکہ بہت سے بے بندھے چھوٹے بڑے موتی جو ہماری زبان کی پوٹلی میں بیکار سے پڑے ہیں، ان کو آہستہ آہستہ ہار میں پرونے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ یا یوں کہیے کہ تسبیح کے دانے جو ڈورا پرانا ہو جانے سے ٹوٹ پڑے جس قدر مل جائیں، سمیٹ رہا ہوں۔ جلدی میں، میں یہ نہیں دیکھتا کہ زُنار کا ڈورا ہے یا وہ ڈورا ہے جس میں رات کے باسی ہار گندھے ہوئے تھے۔ اور جلدی کی وجہ یہ ہے کہ ڈورے کی تلاش میں کہیں دانے کھوئے نہ جائیں اور پھر نہ ملیں۔ ابھی آپ اس سے بحث نہ کریں کہ تسبیح کے دانے ہیں یا موتیوں کے بلکہ بادہ کشان محبت سے پوچھئے تو انگور کے دانے سب سے بہتر بتائیں گے کہ ؏

قطرہ تا مے میتواند شد چرا گوہر شود

یُوں تو ہماری زبان میں حُسن و محبت کے افسانے کثرت سے ہیں لیکن یوسف زلیخا کا قصہ بچے بچے کی زبان پر ہے۔ سبب یہ ہے کہ احسن القصص ہونے کی وجہ سے ضرب المثل کے مرتبے کو پہنچ گیا ہے حضرت اشرف مازندرانی فرماتے ہیں ؎

پیر گشتی حرف عشق و عاشقی را در گزار
خواندن طفلاں بود یوسف زُلیخا بیشتر

فارسی میں جس نامور شاعر نے زبان کھولی۔ اس قصے پر طبع آزمائی ضرور کی۔ اس میں زورِ طبیعت دکھانے کے سوا ثواب بھی سمجھا جاتا ہے۔ ایسی لاتعداد مثنویاں میری نظر سے گزریں جن میں غایت درجے کی نازک خیالی اور پاکیزہ بیانی کی داد دی گئی ہے لکھا ہے کہ حضرت یوسف کی خاطر سے زلیخا نے نہایت دل کش قصر و باغ بنوائے تھے جو نفس کو معصیت کی طرف راغب کریں کیوں کہ بقول ناظم ہروی ؎

دل افسردہ را درمان بہار است
علاج دردِ سر زانوئے یار است
بہر جانب در آں گلزارِ صورت
بُتے باسادہ روئے گرم صحبت
رقم کردہ بصدرش صورت آرا
مثال یوسف ونقش زلیخا

تمام قصر و باغ میں سارے جہان کا سامان عیش مہیا تھا۔ فرش سے سقف تک اور دیوار سے در تک نقش و نگار فسوں و نیرنگ جمع کئے گئے تھے۔ جو انسان تو کیا چیز ہے فرشتوں کو دام فریب میں لائیں۔ اس وقت زلیخا کا ہوائے نفس سے لاچار ہونا اور حضرت یوسفؑ کا دامن عصمت ہاتھ سے نہ چھوڑنا بڑی عبرت کا مقام ہے کہ ایک طرف سے اصرار جس کی حد نہیں اور دوسری طرف سے انکار جس کا علاج نہیں زلیخا کا بیان ہے کہ ؎

تلاشِ کام گر گوئی گناہ است
تقاضائے جوانی عذر خواہ است
گناہ کش کند زائیل معاذیر
نباید از تکابش بود دل گیر
مدہ غم را بجود زیں جرم راہے
گناہے بہ کہ خونِ بیگناہے
بنودے عفو گر منظورِ واہب
نمی شد توبہ و کفارہ واجب

(ناظم ہردی)

خدائے لایزال جو ہماری خطاؤں کو دیکھتا ہے کیا ہماری توبہ و استغفار سے آنکھ چرالے گا۔ وہ آنکھ جو ہمارے عیب دیکھتی ہے ہمارے ہنر سے چشم پوشی نہیں کر سکتی۔ اس وقت کی یہ صحبت اگر پروردگار کو ناپسند ہے تو اس کے دوسری طرف منہ پھیر لینے سے کون مانع ہے۔ کیوں کہ اس کی بڑی تعریف یہ سُنی گئی ہے ع

کہ جرم بیند و ناں برقرار می دارد

گناہگاروں کو روٹی کی اتنی ضرورت نہیں جتنی کہ ہماری خطاؤں سے درگذر کرنے کی ہے، ہزار خطاؤں کے بعد بھی انسان کو جو اُمیدِ عفو ہے۔ یہ اس کی آمرزش کی قوی دلیل ہے۔

یہ اُمید عقیدے میں داخل ہے۔ جس کا سمجھنا مشکل اور سمجھانا اور بھی مشکل ہر عقیدے کے معنی یہی ہیں جو سمجھ سے باہر ہو، جو عقیدہ سمجھ میں آجائے اُسے عقیدہ نہیں کہنا چاہیے۔ اس کی تمثیل اس طرح ہے کہ جو تعویذ و نقش آپ کھول کر دیکھ لیں۔ اس میں اثر کی اُمید نہیں۔ حالانکہ کھولنے اور بند رکھنے سے اثر کو کیا تعلق ہے۔ وہ اُنگل بھر کاغذ کا ٹکڑا جس پر شاہ صاحب نے اُلٹی سیدھی لکیریں بنا دی ہیں یوں ہی اسی طرح تہ کیا ہوا آپ چاندی میں منڈھوا کر بچے کے گلے میں ڈال دیں۔ پھر اس کی ماں کے دل سے پوچھیں۔ ہزاروں مائیں قسمیں کھا جائیں گی کہ تعویذ میں بڑا اثر ہے خُدا نے میرے بچے کو تعویذ کی برکت سے بچا لیا۔ دُعا کے اثر کا میں بہت قائل ہوں لیکن کبھی سُنی جاتی ہے اور کبھی نہیں، جو دُعا نہیں سُنی جاتی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ فلکِ پیر اونچا سُنتا ہے کہ در اصل سُنی ہی نہیں گئی، بلکہ اکثر دیر میں قبول ہوتی ہے۔ ؎

وہ یہ کہتے ہیں جو کرنی ہے دُعا بھی کرلو
ہم مزا تم کو دکھا دیں گے اثر ہونے تک

دُعا کے قبول ہونے کا سب سے اچھا زمانہ جوانی ہے کہ اس وقت دل و دماغ

کی قوتیں معراجِ کمال کو پہنچی ہوتی ہیں اور سب سے جلدی وُہ دعا قبول ہوتی ہے جس میں محبّت کے سوا اور کوئی غرض نہ ہو۔

محبّت کے معاملے میں میری رائے ہے کہ آسمان و زمین، جمادات، نباتات حیوانات میں عورت سے بہتر کوئی چیز نہیں جس سے محبت کی جائے اور چیزیں دنیا کی قیمت میں بہتر سہی، مثلاً جواہرات۔ بکار آمد زیادہ سہی۔ جیسے نباتات۔ لیکن نیچر نے عورت کو اس وضع پر بنایا ہے کہ اگر بیکار بھی ہو تو تمام عالم اسی پر مُبتلا نظر آتا ہے۔ خُدا نے عورت کو حُسن کی ایسی خوبی دی ہے جس کی خوبی کو کوئی چیز نہیں پہنچتی گویا تمام دنیا کی خوبیاں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہیں۔ قدرعنا کے آگے سارے شمشاد زمین میں گڑے جاتے ہیں۔ برگِ گل کو وہ نزاکت کہاں نصیب جو لبِ جاناں میں ہر ضیائے رخِ یار کو نہ چاند پہنچتا ہے نہ سورج، چاند اسی فکر میں گھٹتا بڑھتا ہے کہ کبھی تو کسی کے چاند سے چہرے سے مقابل ہو سکے اور آفتاب رات کو شرم کے مارے نہیں نکلتا کہ رات حسینوں کے لئے بنی ہے کبک رعنا نے خوبی رفتار حسینوں سے اُڑائی ہے اور غزالوں نے شوخی رفتار، غنچوں نے دہن یار سے مسکرانا سیکھا۔ اور شاخِ گُل نے کمرِ یار سے لچکنا۔ غرض یادِ خدا کی طرح ہر دل میں حُسنِ بتاں کا اثر موجود ہے دُور کیوں جایئے۔ ذرا گردن جھُکایئے اور اپنے ہی دل میں دیکھ لیجئے۔ لیلےٰ کی ہڈیاں بھی خُدا جانے کہاں گئیں۔ مگر نام لیتے ہی اس کی جوانی آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ شیریں کی شکل کسی نے نہیں دیکھی مگر اس کا نام وردِ زباں ہے۔ انسان کا دل جسے خانۂ خدا سمجھتے ہیں در اصل بتوں کا گھر ہے۔ فلسفی خدا کے وجود سے انکار کریں تو کریں، حسینانِ جہاں کا کلمہ پڑھتے جب چاہے دیکھ لیجئے آواگون کی طرح حُسن کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔ لیلےٰ سے نکلا تو شیریں میں آگیا اور شیریں سے دمن میں۔ دمن سے ہیر میں۔ ماں سے جُدا

ہوا تو بیٹی کی شکل میں پہنچ گیا۔ غرض نیرنگِ روزگار کی طرح سے ہر رنگ میں دیکھ لیجئے۔ یہ نہ فنا ہوا نہ ہوگا۔

عیش میں اسے دیکھا تو عبادت میں بھی موجود پایا۔ محفلِ نشاط میں رقص وسرود کی صورت بن گیا تو صوفیائے کرام کی مجلس میں سماع و وجد بن کر بڑے بڑے بزرگوں کو لٹا لٹا دیا۔ حضرت حافظ شیرازی رح کی غزلوں میں مے و معشوق کا لطف دکھا دیا تو نیک بندوں کے کلام میں حمد و نعت کا ثواب کمایا، حُسنِ بیاں، حُسنِ صَوت، حسنِ صورت ایک چیز ہو تو کہیے۔ یہاں تک کہ مرنے کے بعد بہشت میں بھی اچھی صورتوں ہی کا دور دورہ سُنا جاتا ہے۔ لیکن بقولِ حضرت غالبؔ وہ اُمید جس کا مدار مرنے پر ہو غایت نااُمیدی میں داخل ہے ؎

مُنحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نا اُمیدی اس کی دیکھا چاہیے

یہ مسئلہ واقعی تحقیق طلب ہے کہ جب زندگی و موت دونوں برابر ہیں، جیسا کہ اہل اللہ کا عقیدہ ہے تو انسان کے لئے نہ زندگی کا کچھ نتیجہ ہے نہ موت کا۔ جب ہم جئے ہی نہیں تو مرنا کیسا ؟

اس گفتگو کے لئے علیحدہ مضمون کی ضرورت ہے۔ کوئی صاحب اس پر طبع آزمائی کریں۔

ناظمؔ وفائے وعدہ کی اُمید ہے کسے
مرنا بھی اس فریب میں دشوار ہو گیا

(اصلاحِ عام۔ مارچ ۱۹۱۷ء)

پابندیِ عقاید بمقابلۂ آزادیِ عقائد

تمام دنیا کے مذہبوں کا مدار عقاید کی پابندی پر ہے اور اسلام کا سب سے زیادہ کہ اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ مسلمان ہو کر اس کے عقائد میں چون وچرا کی گنجائش نہیں۔ کسی مذہب میں یہ بات جائز نہیں کہ مذہب قبول کرنے کے بعد اس میں تاویل اور ترمیم کو دخل دیا جائے۔ اگر ایسا ہوا بھی ہے تو اس سے مذہب میں ضعف ہی ہوا ہے۔ علمائے دین ہمیشہ اس بات پر متفق رہے ہیں کہ دینیات میں کسی کو دخل در معقولات کی اجازت نہ دی جائے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اصولِ جراحی کے موافق بگڑا ہوا عضو بدن سے جُدا کر دینا اچھا ہے کہ باقی بدن درست رہے۔ اسلام نے شروع سے اس معاملے میں جو احتیاطیں کیں وہ بہت کام آئیں۔

یہ حکایت بہت مشہور رہے کہ ۸۳۳ء میں خلیفہ مامون نے جب یونان کو فلسفہ اور سائنس کی کتابوں کے لئے لکھا تو شاہ یونان نے اپنے مصاحبوں سے صلاح لی کہ یہ کتابیں بھیجی جائیں یا نہیں۔ مصاحبوں نے جو علمائے مذہب عیسائی تھے، صلاح دی کہ علوم یونانی کا کتب خانہ خلیفہ اسلام کے پاس بھیج دینا بہت مناسب ہے کہ بحث مباحثہ کی کتابیں جس مذہب میں مل جائیں پھر اس کی خیر نہیں۔ اسلام کے آغاز و

عروج کے دنوں میں غیر قوموں میں دو عقیدوں کا زیادہ رواج تھا۔ ایک تو یہ کہ الوہیت میں ایک سے زیادہ کا عقیدہ، دوسرے خدا کے وجود سے قطعی انکار۔ یہ دونوں عقیدے اسلام کے خلاف ہیں۔ مخالف عقیدوں کی دلیلیں رد کرنے کے لئے اُن کے علوم کی طرف بہت توجہ کی گئی جس کا نتیجہ اور نہیں تو یہ ہوا کہ وہ راسخ الاعتقادی جو بے دلیل و حجت خدا کے ماننے میں ضرور تھی، کم ہو گئی۔

عقائد کے لئے دلیل و حجت اس لئے بیکار سمجھنی چاہیے کہ اسلام میں ایمان مقدم ہے۔ تحقیق مقدم نہیں پہلے ایمان لانا پھر تحقیق کرنا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لڑکی کی شادی کے بعد سمدھیانے کا حسب نسب دریافت کرنا بیکار ہے۔

تیرہ سو برس پہلے تو مسلمان اسلام قبول کریں اور چودھویں صدی میں اس کی تحقیق کی جائے۔ بیکاری کا مشغلہ سمجھئے۔ سائنس اور تحقیق کے بغیر اسلام نے جس قدر ترقی کی پھر نہ ہوئی۔ بلکہ زندقہ و دہریت اور الحاد کا وجود علوم یونانی کے رواج کے بعد ہوا۔ اتفاق سمجھئے یا فلسفے کے رواج کا نتیجہ کہیے کہ زندقہ کا زور انھی دنوں زیادہ ہوا جن دنوں کہ عقائد مذہبی میں آزادی نامناسب نہ سمجھی گئی۔ خلیفہ منصور کے زمانے میں راوندی نامی ایک فرقہ پیدا ہوا جس نے فیضی اور ابوالفضل کی طرح خلیفہ کو الوہیت کے صفات سے منسوب کیا۔ اور جس طرح اکبر کے لئے قرآن اُتارنے کی سوجھی تھی ابناء الدولہ نے دو ہزار ورق کی ایک کتاب الوہیت کے ثبوت میں لکھی۔ راوند کاشان اور اصفہان کے درمیان میں ہے۔ اس فرقے نے منصور کو خدا قرار دیا اور ابناء الدولہ نے مادے کو ازلی ثابت کیا۔ سنہ ہجری کی چوتھی صدی میں زندقہ کا بہت زور ہوا۔ آزادی عقاید کے انسداد کے لئے جو جو تدبیریں شروع سے ہوتی ہیں۔ اُن کا ذکر بہت طول طویل ہے۔ آزاد خیال آدمی سلطنت اسلامیہ میں سرکاری عہدوں پر نہیں مقرر ہونے پاتے تھے۔ اور حضرت امام حنبلؒ نے

ایسے لوگوں کو اچھا نہیں سمجھا۔

اسلام میں عقاید کا مدار الہام اور وحی پر ہے اور الہام و وحی کا دروازہ قرآن نازل ہونے کے بعد بند ہو گیا جو کچھ کہ از روئے الہام طے ہونا تھا طے ہو چکا اس سے آگے چلنا عقائد اسلام کے خلاف ہے حضرت امام غزالی کا عقیدہ ہے کہ الہام میں چون وچرا کو دخل نہیں۔ اور اُن کی تصنیف ردِ فلاسفر پڑھنے کے لایق ہے۔

وحی والہام کے مشکل مسائل کو توڑنے مروڑنے سے اگر کوئی بات اپنی مرضی کے موافق پیدا کی، تو اس کا میں قائل نہیں، جب صاف اور بدیہی احکام اس کے خلاف موجود ہیں۔ انسان پر صاف اور بدیہی احکام کی تابعداری فرض ہے نہ کہ تاویلات کی۔ مذہب اسلام میں پہلے تو غیر مذہب کے لوگوں کو اسلام میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی۔ پھر بحث مباحثے کی وجہ سے اختلاف پیدا ہوا جب اختلافات کی کثرت ہوئی تو سفر میں ضرورت سے زیادہ اسباب کی طرح اُن سے سبکدوشی مناسب سمجھی گئی۔

ملک ابن اماس کا قول ہے کہ بلاکیف ایمان لانا چاہیے۔ اور بخاری کا ارشاد ہے کہ امتحان بدعت ہے۔ میرے عقیدے میں اسرار ازل اور ابد جس قدر کہ وحی والہام سے معلوم ہوئے ان پر ایمان رکھنا مقدم ہے۔ باقی ازل ہو یا ابد میری دانست میں خموشی کا نام ہے۔ اور آسمان و زمین کے قلابے ملانے سے نماز روزے اور فرائض مذہبی کا بجالانا بہتر ہے ؎

بندگی کن ترا ز حکم چہ کار

جیسا میں پہلے عرض کر چکا۔ اکثر مذہبوں کے مقابلے میں اسلام ایسا مذہب ہے جس میں عقاید کی طرف سے اوہام اور اختلاف کی بہت کم گنجایش ہے، اس میں پروردگار کی طرف سے تقدیر اور 'مارل گورنمنٹ' کا سب سے بڑا عقیدہ ہے۔ اس سے اختلاف

کرنے والوں کی نسبت خیالاتِ زندقہ کا اطلاق عائد ہوتا ہے زندیق سریانی لفظ ہے یا قدیم پہلوی ان لوگوں کو دہریہ بھی کہتے ہیں کہ معتقدانِ زرتشت دہر کا آغاز نہیں مانتے۔ فساد عقائد مٹانے کے لئے خلیفہ منصور اور مہدی نے احتساب اور انسداد پر بہت زور دیا اور بڑے بڑے جھگڑوں کے بعد یہی طے ہوا کہ عقائد مذہبی کی پابندی مذہب کے لئے بہت ضرور ہے۔ دنیا میں آزادی عقائد سے پابندی عقائد ہمیشہ زبردست رہی اور جہاں کہیں دونوں کو ملنے کا سابقہ پڑا ہے پابندی زیادہ کام آئی۔ دارا کی شکست کی وجہ آزادی عقائد تھی اور اورنگ زیب کے اقبال کی وجہ پابندی عقائد۔ آزادی عقائد کو اگر نئی تہذیب میں سمجھئے اور پابندی عقائد کو مذہب قرار دیجئے تو جس طرح مخلوق میں تذکیر و تانیث کا رواج ہے، نباتات میں بھی نر و مادہ بتاتے ہیں۔ اور ہماری زبان میں تانیث و تذکیر کا جھگڑا ہے۔ خیالات میں مذہب کو صیغۂ تذکیر میں سمجھئے اور تہذیب کو تانیث میں اور دیکھ لیجئے کہ دنیا میں جو کچھ ترقی ہوئی اس کا مدار زیادہ تر مذہب پر ہے۔ اور تہذیب ہمیشہ مذہب کی دست نگر رہی۔ میرا عقیدہ ہے کہ انسان کے لئے عقاید مذہبی کی پابندی سب سے زیادہ ضروری ہے، باقی جو خدا کی مرضی۔

(صلائے عام۔ اکتوبر ۱۹۱۱ء)

شعر و سخن کی ترقی اقبال کے اسباب میں ہے

نظم جلوسیہ[۵] کے لئے میں نے اہلِ سخن کو تکلیف دی تو اکثر لوگوں نے شعر و سخن کی بے قدری کی شکایت لکھی۔ انگریزی خواں اور بعض غیر انگریزی خواں بھی یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ شاعری خبط نہیں تو بیکار ضرور ہے۔ ان کا بیان ہے کہ جس قدر سائنس اور سویلیزیشن (نئی تہذیب و تعلیم و تحقیق) کو ترقی ہوگی یعنی ریل و تار و مشین اور کلوں کی ایجاد کا رواج ہوگا، شعر و سخن کا دنیا میں رہنا مشکل ہو جائے گا گویا بے سدھائے ہوئے جانور کی طرح شاعری انجن کی سیٹی سے بھڑک کر کوسوں بھاگتی نظر آئے گی۔ مجھے اس قیاس سے اتفاق نہیں اور ثبوت میں عرض کرتا ہوں کہ تمام دنیا کی قوموں میں شعر و سخن کی ترقی کا وہی زمانہ تھا جس میں ان کو اقبال نصیب ہوا۔ سبب یہ کہ کسی فن کے لئے دل و دماغ کی اس قدر ضرورت نہیں جس قدر کہ شعر و سخن میں ہے۔ اور غایت درجے کی تہذیب یعنی ہر طرح کی علوم و فنون میں ترقی کرنا بغیر دل و دماغ کی خوبیوں کے ممکن نہیں۔ یونانیوں اور رومیوں میں بڑے بڑے شاعر اُس وقت پیدا ہوئے جبکہ ان کے اقبال کا زمانہ تھا۔ ایران میں جتنے شاعر اقبال کے دنوں میں پیدا ہوئے پھر نہ ہوئے۔ فردوسی، نظامی، سعدی اور اُس وقت کے نامور شاعر سب میرے گواہ ہیں۔ ان کی قدر کرنے والے اُس وقت نہ ہوتے تو ان کی اس قدر

۵[!!] مشاہیر شعرائے اردو کے قصاید کا مجموعہ جو میر ناصر علی نے جشن دربار دہلی کے موقع پر ۱۲-۱۹۱۱ء میں شائع کیا۔

شہرت نہ ہوتی۔ عرفی نے جب دربار میں قصیدے پڑھے ہوں گے تو اس کے کلام کے سمجھنے والے ضرور ہوں گے اور یہ بات مشہور ہے کہ شعر کے کہنے سے شعر کے سمجھنے کے لئے زیادہ لیاقت چاہیے۔ ؎

شعر گفتن گرچہ الخ

مسلمانوں کو جب ملک گیری سے فرصت ملی تو خلفائے بنی اُمیہ اور عباسیہ کے دربار میں شعر و سخن ہی کا چرچا رہتا تھا، کوئی کسی سے ملتا تو یہی پوچھتا تھا کہ کوئی تازہ کلام سُنا ہے۔ ہارون رشید۔ مامون رشید۔ محمود غزنوی۔ سیف الدولہ کے دربار شاعروں سے بھرے رہتے تھے۔ ابن خلقان ایک شاعر کا حال اُس کی زبانی اس طرح لکھتا ہے کہ:

"ایک دن ظُہر کے وقت ایک آدمی بلادِ مشرق سے یہ پوچھتا ہوا میرے گھر آیا کہ فلاں شعر (جو نووارد نے پڑھ کر سُنایا) تمہارا ہے؟ اور اسی دن مغرب کے وقت ایک اور شخص الجیریا سے آیا اُس نے بھی اس شعر کا حال پوچھا کہ کس کا ہے؟ صاحبِ کلام کو نہایت حیرت ہوئی کہ دونوں شخص بُعد المشرقین کے رہنے والے اور شعر دونوں جگہ پہنچ گیا۔"

ابوبکر خوارزمی جب وزیر عباد سے ملنے گیا تو ناظرِ بارگاہ نے روکا کہ وزیر کا حکم ہے کہ اہلِ علم میں سے جس شخص کو بدوی اعراب کے بیس[۲۰] ہزار شعر یاد نہ ہوں وہ دربار میں نہ آنے پائے۔ ابوبکر خوارزمی نے جواب دیا کہ اپنے آقا سے پوچھو بیس[۲۰] ہزار شعر مردوں کے کلام میں سے سناؤں یا عورتوں کے کلام میں سے؟

اس پر وزیر نے پہچان لیا کہ ابوبکر خوارزمی ہے۔ حکم دیا کہ آنے دو۔

اس وقت شعر وسخن کی بے قدری اس وجہ سے نہیں کہ ہماری شاعری پہلی سی نہیں بلکہ اس کے سمجھنے والے نہیں رہے آسمان وہی ہے جو پہلے تھا مگر اس نگاہ سے دیکھنے والے نہیں۔ آپ آسمان کا وجود نہیں بتاتے، ہم اسے پردۂ زنگاری کہتے ہیں۔ جسے آپ دیدۂ گریاں

کہتے ہیں ہم اُسے ابرِ گہربار کہتے ہیں۔ آپ جسے اندھیری رات کہتے ہیں ہم اُسے کاکلِ مُشکیں کا جواب سمجھتے ہیں۔ آپ جسے پریشانی سمجھتے ہیں ہم اُسے زُلفِ یار سے تشبیہ دیتے ہیں ؎

زندگی خاک ہو جب فہم میں اتنا ہو خلاف
ہم اَجَل کہتے ہیں تم جس کو حَیا کہتے ہو

ہمیں شمشاد میں قامتِ یار نظر آتا ہے، ابروئے یار میں کلام نظم کی موزونیت اور خطِ عارض میں نثر کا جواب۔ ہم شیشۂ مے کو مینائے گردوں سے تمثیل دیتے ہیں، مے کو آفتاب سے اور جامِ بلور کو مہِ تاباں سے۔ ہم تعلّی میں آفتاب محشر کو گلِ خورشید سمجھتے ہیں اور نالۂ صور کو خندۂ دل۔ ہماری نگاہ میں نرگسِ بیمار چشمِ مخمور کا جواب ہے اور گردشِ چرخ دورِ ساغر کے برابر ہے۔ دلِ داغدار کو ہم بہارِ باغ سے تشبیہ دیتے ہیں اور عُریانیِ تن کو بوئے گل کی طرح جامے سے باہر ہو جانا کہتے ہیں، آپ ہماری برابری کہاں تک کرینگے ہم دیدۂ گریاں پر سحاب کی پھبتی ایسی کستے ہیں کہ چھا جاتی ہے اور کوتاہیٔ شبِ وصل پر ہمیں کسی کے خالِ سیاہ کا دھوکا ہوتا ہے۔ ہم اپنے مزار کا غلاف سبز اس لئے چاہتے ہیں کہ سبزۂ خط کی یاد نہ بھولے۔ قیامت پر کوئی ایمان لائے یا نہ لائے مگر خرامِ ناز سے ہر قدم پر قیامت برپا نہ ہو، یہ ممکن نہیں۔ غرض آپ سے کہاں تک عرض کیا جائے کہ ہم کیا کرتے ہیں اور کیا نہیں کرتے؟

ایشیا کی شاعری جو پہاڑ اور میدان و جنگل کی تعریف سے (جسے آپ نیچرل طرز کہتے ہیں) عاری رہی تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہم اس طرز میں قاصر ہیں، ہرگز نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اقبال و آرام میں ان کی طرف کوئی نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ ہم آسمان کو بھی بُرے وقت میں دیکھتے ہیں ؎

دیکھتا کون ہے محمودؔ عدو کو بخوشی
ہم نظر کرتے ہیں افلاک پہ ناچاری سے

جس کی تمام رات عیش میں کٹتی ہو اس سے اتنے سویرے کب اٹھا جاتا ہے کہ آفتاب کے دیکھنے کے لئے تکیے سے سر اٹھائے؟ بہار باغ کی سیر چھوڑ کر جنگلوں میدانوں کے دیکھنے کو کون جائے؟ پہاڑ پر کون چڑھتا پھرے اور جنگل کی خاک کون چھانے؟ جنگل قیس کے حوالے کر دیا، اور پہاڑ فرہاد کو مل گیا۔ حضرتِ موسیٰؑ کے ذکر میں وادیٔ ایمن اور جلوۂ طور کا نام جو سُنا تھا، سُن لیا۔ پھر کوئی دیکھنے گیا ہو تو "اقرارِ صالح" بغیر مجھے یقین نہ آئے گا۔ آہِ رَسا اور عرش سے پرے نکلتے ہوئے نالوں کی دھوم میں ایروپلین (ہوائی جہاز) کا ذہن میں آنا مشکل تھا۔

ہندوستان کی طرح مُلکِ یونان میں بھی بڑی پُرفضا سینری تھی لیکن شعرائے یونان نے اپنے کلام میں نیچرل سینری کا ذکر بہت کم کیا۔ کمیڈی، ٹریجیڈی اور ڈراما پر شاعری کا سارا زور ختم کر دیا۔

اس وقت کی بے قدری آپ شعر و سخن کے زوال میں ہرگز نہ جانیں۔ آپ کو خیال نہیں کہ جس طرح ہر ہفتے میں یوم السبت ہے، چاہے مسلمانوں کا جمعہ یا بنی اسرائیل کا شنبہ یا مذہبِ عیسائی کا اتوار ہو کہ چھ دن متواتر کام کاج سے وقفہ ضرور ہے اسی طرح ہر فن کے عروج کے لئے وقفہ چاہیے کہ ذرا ٹھہر کر چلنا اچھا ہے ؎

یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

یہ وقفہ زبان انگریزی کی علامات وقف کا فُل سٹاپ یا مکتب کی "آگے آئی آیت" نہ سمجھئے۔ بلکہ سانس لینے کے لئے زمانے کی طرف سے اشارہ کاما یعنی خفیف علامت وقف ہو کہ ابھی مطلب پُورا نہیں ہوا، مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جس قدر علوم و فنون میں ترقی ہو گی اُسی قدر شعر و سخن کی ترقی سمجھئے۔

اس کو بھی جانے دیجئے۔ ہماری شاعری کو مذہب سے اس قدر تعلق ہے کہ مذہب کا بڑا جزو اسی کو سمجھئے۔ تصوف کی ساری لٹریچر نہیں تو زیادہ تر نظم میں ہے حضرت مولانا رومؒ۔ جامیؒ، نظامیؒ، امیر خسروؒ اور نامور شاعر سب صوفیائے کرام میں تھے۔ تصوف میں مثنویاں اس قدر رہیں کہ شاید ہی کسی زبان میں نکلیں گی ایک مثنوئ معنوی کو لیجئے جس کی شرحیں اتنی لکھی گئی ہیں کہ ایک کتب خانہ علیحدہ جمع ہو جائے اس کے سوا حمد و نعت' مناجات، پند و نصائح جس خوبصورتی سے نظم میں ادا ہوتی ہیں نثر میں ممکن نہیں۔ یہ خوبیاں صرف نظم کا حصہ ہیں نثر میں یہ بات میسر نہیں۔ خاص کر بزم عزا میں شاعری نے مرثیوں کی صورت میں وہ پاکیزہ اثر دل و دماغ میں پیدا کر دیا ہے جو قیامت تک بنا رہے گا۔ دنیا کے ہزار مورخ اور لاکھ تاریخیں ایک طرف اور جناب دبیر و انیس کا کلام ایک طرف۔

زُلیخا کا نام کسی تاریخ میں نہیں ملتا مگر شاعری اسے قیامت تک زندہ رکھے گی لیلیٰ و مجنوں، فرہاد و شیریں، وامق و عذرا کا پتا از روئے تحقیق کہیں نہیں لیکن شاعروں کی بدولت یہ سب زندۂ جاوید ہیں۔ ایران کی قدیم تاریخیں ساری مٹ گئیں تو مٹ جانے دیجئے فقط ایک شاہ نامہ، ضحاک و رستم و اسفندیار کو زندہ رکھنے کے لئے بس ہی۔

شروع میں جب مجھے نثر لکھنے کا خبط ہوا تو میں نے اپنے والد ماجد قبلہ سے اصلاح کی التجا کی۔ آپ نے فرمایا کہ یُوں چاہے تو کتنی ہی محنت کیا کر، جب تک شعر و سخن سے مناسبت پیدا نہ ہو ایسی نثر لکھنی کبھی نہ آئیگی جسے پڑھ کر کوئی خوش ہو۔ یہی وجہ ہے جو اکثر انگریزی خواں یا جن کو شعر و سخن سے لگاؤ نہیں اپنا مطلب اپنی زبان میں اس طرح ادا نہیں کرتے جس کے سُننے کو بے اختیار جی چاہے۔ محض نثر تو وہ حالت ہے جو انسان کے لاحقِ حال سمجھئے کہ بُری بھلی خطِ تقدیر کی طرح پیش آ رہی ہے اسی لئے کہتے ہیں کہ خطِ تقدیر نثر میں ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ کوئی اپنی تقدیر کے لکھے سے خوش نہیں

لیکن آپ کا جی چاہے یا نہ چاہے تقدیر کا لکھا حرف بحرف پورا ہو کر رہتا ہے برخلاف اس کے نظم وہ چیز ہے کہ اس صورتِ حال کو بہتر سے بہتر خیال سے ملا دیتی ہے جس سے آگے ذہن کی رسائی ممکن نہیں۔ مولوی محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ اُستاد ذوق کو جب جاں کنی کی تکلیف زیادہ ہوئی تو میں نے پوچھا کہ آپ نے درد و الم کے مضامین بہت مبالغے سے باندھے اس وقت کی تکلیف کا حال فرمایئے کہا کہ اس وقت کی تکلیف سارے شعر و سخن کے مبالغے سے بڑھ کر ہے۔ شعر و سخن کے بغیر یہ ادائے بیان کہاں نصیب؟ دنیا و دین دونوں جگہ شعر و سخن کا بول بالا ہے۔

واقعی امر یہ ہے کہ کیسا ہی رنج و فکر ہو جب میں کسی کا دیوان ہاتھ میں لے لیتا ہوں غم غلط ہو جاتا ہے۔ کل طبیعت کو اُلجھن زیادہ تھی تو اساتذہ میں سے ایک مختصر دیوان لے کر بیٹھ گیا جو شعر سمجھ میں آئے ان سے ایسی کچھ تسلّی ہوئی کہ ساری اُلجھن بھول گیا آپ بھی اس کے چند شعر جابجا سے سُن لیں کہ غلط تو نہیں کہتا۔ اِن سے میری مُراد شاعری نہیں، صرف تفنّنِ طبع منظور ہے دوسرے شعر و سخن کے متعلق جو مضمون ہو اس کے اخیر میں دو چار شعر لکھ دینا ناموزوں نہیں۔

راحت نہیں بے رنج، دلا باغ جہاں میں
پھول آتے ہیں گلزار میں کب خار سے پہلے
ہر صُبح کو مسجد میں اذاں ہوتی ہے پیچھے
پھر آتے ہیں ہم خانۂ خمّار سے پہلے

جھوٹ ہی کہدے تسلّی کے لئے او صیّاد
ہم اسیرانِ قفس پھر بھی چمن دیکھیں گے
بڑھ چکے وادئی غربت کی طرف اپنے پاؤں
یوں ہی مُڑ مُڑ کے جو یارانِ وطن دیکھیں گے

چمن کو چھوڑ چکے ہیں ہم ایک مُدت سے
بھلا نسیم ہمیں کیا جو اب بہار آئے

او برق حُسنِ عارضِ تاباں دکھا کہیں
افسانہ کیا سُناتا ہے ہم کو کلیم کا

ثبات فصلِ خزاں کو بھی اس چمن میں نہیں
اگر بہار کو بُلبُل قیام ہو نہ سکا

ہیہات عندلیب بکی ہاتھ غیر کے
کیا او نسیمِ باغ، کفِ گُل میں زر نہیں؟

سارا عالم ہے خریدار مرے یوسف کا
اب بگڑتا نظر آتا ہے یہ سودا مجھ کو

کہتے ہیں شوقِ اسیری اسے اللہ اللہ
ہم دہل جاتے ہیں جب کوئی رہا ہوتا ہی

دستِ جنُوں سے اتنی نہ امداد ہو سکی
پھاڑا کبھی نہ جامۂ ہستی اتار کے

گزر کرو نہ کرو تم کبھی اِدھر اپنا
کھڑے رہو مجھے بتلا کے جاؤ گھر اپنا
ہجومِ داغ سے پھولے ہیں اس میں گل کیا کیا
جو آپ آئیں دکھاؤں دل و جگر اپنا

رہا نہ رنج مرے دل میں بے زبانی کا
لگیں ہیں ناوک و شمشیرِ خونچکاں کیا کیا
ہزار شکر کہ صدقے میں اپنے قاتل کے
زبانیں پائی ہیں کیا کیا، ملے دہن کیا کیا

صلائے عام (جولائی ۱۹۱۱ء)

اُردو۔ ہندی

اب کی دفعہ مردم شماری میں اخبار والوں نے اردو۔ ہندی پر بہت بحث کی۔ گو مردم شماری کے اصول کے موافق کاغذات میں وہی لکھا گیا جو جس نے بتایا اور جو کچھ لکھا گیا اس کی صحت میں کمی نہیں ہوئی۔ خیر مردم شماری سے پہلے دلّی کے ٹاؤن ہال میں صوبۂ پنجاب کے محکمۂ مردم شماری کے افسر اعلیٰ، جناب پنڈت ہری کشن کول صاحب کی خدمت میں جب اس معاملے میں عرض کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ جس زبان میں اس وقت گفتگو ہو رہی ہے یہی اُردو ہے اور یہ میں اپنی طرف سے عرض کرتا ہوں کہ جناب کی تقریر نہایت فصیح اُردو میں تھی۔

ضد کی اور بات ہے مگر شروع میں اہلِ علم اس زبان کو جو کم و بیش اس وقت رائج ہے قدیم کتابوں میں ہندی لکھتے آئے ہیں۔ محمد عوفیؔ اپنے تذکرے میں جو ۶۱۷ھ ہجری میں لکھا گیا۔ امیر سعد اللہ مسعود کی نسبت لکھتا ہے کہ:

"اورا سہ دیوان ست یکے بہ تازی (عربی) ویکے بہ پارسی و یکے بہ ہندی"

خوشگوؔ اس کی تصدیق کرتا ہے کہ:

امیر خسروؔ دہلوی در دیباچہ غرۃ الکمال اُورا ببیار ستودہ و

گفتہ کہ در سہ زبان عربی و فارسی و ہندی دیوان ہائے ضخیم دارد"

ڈاکٹر اسپرینگر صاحب فرماتے ہیں کہ دونوں جگہ اس ہندی سے مراد وہ زبان ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں میں رائج ہے اور یہ تو سب جانتے ہیں کہ دیوان سے مراد کبت اشلوک اور دوہرے نہیں بلکہ غزل، مثنوی اور قصیدے ہیں، جو فارسی حروف میں لکھے جاتے ہیں۔

تقی کاشی لکھتا ہے کہ یہ امیر (مسعود) غزنہ میں پیدا ہوا اور نامور عمائد غزنوی میں سے تھا۔ اور غزنین کا مستوفی اور میر منشی رہا۔ ثنائی نے اس کی تعریف میں کہا ہے کہ ؎

اے عمیدے کہ باز غزنیں را
صورت و سیرتت گلستاں کرد

حضرت امیر خسروؒ کے زمانے میں میر مسعود کے ہندی شعر مشہور تھے اور امیر خسروؒ کے ہندی شعر زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ خاص کر حضرت کی خالق باری جو میرے وقت میں مکتبوں کے نصاب میں تھی عربی و فارسی و ہندی یعنی اردو کا خاصا نمونہ ہے۔ فرماتے ہیں ؎

شرم و حیا در ہندی لاج
حاصل کہیے باج۔ خَرَم اج
طالع بخت جو کہیے بھاگ
لحن سِبَرُود ترنم راگ

امیر خسرو کے بعد قائم نے نوری کو ہندی کا شاعر لکھا ہے جو فیضی کا ہمعصر تھا اور دونوں میں رابطۂ محبت تھا۔ نوری کا یہ شعر مشہور ہے۔

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد

بیچارۂ لوزی نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

جناب میکسمولر صاحب فرماتے ہیں کہ ہندی سنسکرت کی بیٹی نہیں ہے اس سنسکرت کی جو ویدوں اور برہمنوں کی لٹریچر کی زبان ہے۔ ہندی ہندوستان کی زندہ زبان کی شاخ ہے، اس کی اصل بھی وہیں سے ہے جہاں سے سنسکرت کی ہے مگر جناب سر لائیل صاحب کی رائے میں اردو جو آج کل بولی جاتی ہے سولہویں صدی کی ہندی ہے جس میں فارسی حسب ضرورت مل گئی ہے۔

کامروپ کی مثنوی میں ہندوستان کے راجا رانی ہیرو اور ہیروئن ہیں سہ نثر ظہوری کو ہندی کی لوزس کے تین دیباچے سمجھئے اور کامروپ کی طرح گلستانِ عشق منوہر اور مدمالتی کا افسانہ ہے۔ لوازکبیشر کی شکنتلا کو کاظم علی جوان دہلوی نے اردو میں لکھا اور پنڈت للولال اور جوان دہلوی نے سنگاسن بتیسی لکھی اور کہتے ہیں کہ مظہر علی وِلا نے بیتال پچیسی کے مصنف کو بہت مدد دی، یہ کتابیں حکام انگریزی کے عہد میں اردو ہندی میں ہندو مسلمانوں نے سرکار کے لئے لکھیں۔

انگریزی محاورے میں ہندوستانی زبان سے مراد ہندی اور اردو دونوں زبانیں ہیں۔

اردو میں پاکیزہ زبان وہی سمجھی جاتی ہے جس میں فارسی کے الفاظ و محاورے کم ہوں۔ بلکہ اردو کی بڑی خوبی یہی کہلاتی ہے کہ غیر زبان کے لفظ نہ آنے پائیں اسی کا نام ٹھیٹھ اردو ہے۔ انشاءاللہ خاں نے ایک قصّے کا قصہ اردو میں اس التزام سے لکھا ہے جس میں فارسی و عربی کا کوئی لفظ نہیں آنے دیا، خدا کی حمد ٹھیٹھ اردو میں لکھنی ذرا مشکل ہے جس میں عربی فارسی کو دخل نہ ہو، انشاءاللہ خاں نے اس صنعت کو خوب نباہا۔ حمد میں لکھتے ہیں!

"اس بنانے والے کے سامنے میں ناک رگڑتا ہوں جس نے ہم سب کو بنایا اور بات کی بات میں ایسا کر دکھایا جسکا بھید کسی نے نہ پایا۔

آتیاں جاتیاں جو سانسیں ہیں
اسکے بن دھیان ساری پھانسیں ہیں

یہ کل کا پُتلا جو اپنے اس کھلاڑی کی سُدھ رکھے تو کھٹائی میں کیوں پڑے؟ اور کڑوا کسیلا کیوں ہو؟ اس نے دیکھنے کو آنکھ دی اور سننے کو کان دیے۔ تیری ناک سب میں اونچی کر دی کہ اس کی بڑائی کیا کرمٹی کے باسن کو یہ سکت کہاں جو کمھار کے کرتب کچھ بتا سکے؟ سچ ہے جو بنایا ہوا ہے وہ اپنے بنانے والے کو کس طرح سراہے اور کیا کہے؟ اور یوں تو جس کا جی چاہے پڑا بکا کرے۔ سر سے لگا پاؤں تک جتنے رونگٹے ہیں یہ سب کے سب بول اٹھیں اور سراہا کریں اور اتنے ہی برسوں اسی دھیان میں رہیں جتنے ساری ندیوں میں ریت اور پیڑوں میں پتیاں ہیں تو بھی کچھ نہ ہو سکے۔" الخ

اسی طرح نعت و منقبت میں لکھا ہے سبب تالیف میں کہتے ہیں کہ:

"ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات میرے دھیان میں آئی کہ کوئی کہانی ایسی کہیے جس میں ٹھیٹھ اردو ہو۔ سُننے والوں میں سے ایک بڑے پڑھے لکھے سر ہلا کر منہ بنا کر ناک بھوں چڑھا کر آنکھیں پھرا کر کہنے لگے کہ یہ بات ہوتی نہیں دکھائی دیتی کہ ہندی پن نہ نکلے اور بھاکا پن بھی نہ آنے پائے جیسے بھلے مانس آپس میں بولتے چالتے ہیں جیوں کا تیوں وہی ڈھنگ رہے اور چھانھ کسی کی نہ پڑے۔ اچھوتی بات ہو۔ یہ نہیں ہونے کا میں نے جھنجھلا کر کہا کہ یہ انوکھی بات نہیں جو رائی کا پہاڑ بناؤں اور جھوٹ سچ بول کر انگلیاں نچاؤں اور بے سری بے ٹھکانے کی الجھی سلجھی باتیں بناؤں جو مجھ سے نہ

ہوسکتا تو بھلا میں یہ بات منہ سے کیوں نکالتا جس ڈھب سے ہوسکتا اس بکھیڑے کو ٹالتا۔ الخ

غرض اس ذی کمال نے بہت بڑا افسانہ اس صنعت میں لکھ ڈالا جس میں فارسی یا عربی کسی غیر زبان کا ایک لفظ نہ آنے پایا۔

یہ التزام اکثر اہلِ کمال نے اور زبانوں میں بھی کیا کہ جہاں تک ممکن ہوا غیر زبان کے الفاظ نہیں آنے دیے۔ فردوسی نے شاہنامہ میں اور غالب نے کلامِ فارسی میں اس کی احتیاط رکھی اور میں نے جناب شیخ محمد جان شاد لکھنوی کا دیوان دیکھا ہے کہ مقطع اور مطلع کے سوا سارے دیوان کی نظموں کے قافیے ہندی زبان میں کئے۔

میری دانست میں ایسی پابندیاں زبان کے ضُعف میں داخل ہیں کہ غیر زبان سے اس قدر پرہیز کیا جائے۔ جس زبان میں ایسی تکالیف پر زور دیا جائے یہ نشان اس زبان کے زوال کے سمجھئے۔ جب زبان کے زوال کے دن قریب ہوتے ہیں تو ایسی قیدوں کی زیادہ سوجھتی ہے۔ یونانی اور لاطینی زبانوں کا یہی حال ہوا۔ پُرانی فارسی پر بھی یہی گزری زبان کی عارضی پاکیزگی کے لئے ایسی شرطیں بری نہیں لیکن وسعتِ خیال و بیان کا خون ہوجاتا ہے۔ بیش ازیں نیست کہ ان کو صنائع بدایع میں سمجھئے مگر جس طرح آپ دعوت میں بلائیں تو دس مہمان، اور ایک کو تکلّف کے کھانے کھلائیں۔ باقی کو تو بھوکا رکھیں اس سے یہ کہیں بہتر ہے کہ نانِ جویں سہی مگر سب کو مل جائے۔ انھی پابندیوں کی وجہ سے اردو فارسی کی شاعری کو یورپ والے اجیرن بتاتے ہیں۔ وہی بات ہزار بار سینکڑوں برس سے کہتے چلے آئے جس سے بلاغت اور صنائع بدائع کا ثبوت تو ہوا مگر شاعری اور مضمون آفرینی کم ہوگئی۔

اردو دراصل صلائے عام ہے:

بریں خوانِ یغما چہ دشمن چہ دوست

اس میں آپ نے کتر بیونت شروع کی تو یہ دسترخوان بہت مختصر رہ جائے گا۔ اُردو

کو غیر زبانوں سے آپ بچایئے۔ آپ کی خوشی۔ لیکن جب غیر زبانوں کے سارے الفاظ نکل گئے تو اردو بھی رہ چکی اور آگے کو چل سکی۔ جس طرح بچے کو نئی چیزوں کا شوق ہوتا ہے۔ زبان کو بھی اس کا چسکا پڑا رہنے دیجئے۔ دیکھئے اردو میں فارسی کی اضافت سے کیسی خوبی سے کام نکل جاتا ہے "زلفِ یار" یار کے سر کے بڑے بڑے بالوں سے زیادہ فصیح ہے ؎

تب نازِ گراں مایہ گئے اشک بجا ہے
جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آوے

اگر آپ اپنی زبان سے فارسی و عربی و ہندی کو جواب دے دیں گے تو زبانِ اردو ہی کو الفقط کرنا پڑے گا۔ حروف اور رسمِ خط کچھ چیز نہیں ؎

الفقط ہے قلم کی دوست داری | پھر خط کی نہ ہو امید واری
تھوڑا ہی لکھا بہت سمجھنا | کانٹوں میں نہ ہو۔ اگر الجھنا

کہتے ہیں کہ انسان ایک دوسرے کی بات سمجھ لے تو دنیا سے لڑائی بند ہو جائے۔ ورنہ بقول سعدیؒ ؎

اگر در ہر دو جانب جاہلانند الخ

میں چاہتا ہوں کہ آپ اردو۔ ہندی ایک کر دیں۔ آپ میری زبان اختیار کریں اور میں آپ کی۔ نئے خیال سے نئے لفظ اور نئے سامان سے نئے محاورے آپ سے آپ پیدا ہو جائیں گے۔ ریل کی سواری نے ٹکٹ، انجن، گارڈ، پائنٹ مین پیدا کر دیئے۔

تار نے ارجنٹ۔ ڈفرڈ سکھا دیا۔ عدالتوں کی بدولت اسٹامپ۔ کورٹ فیس اپیل سے واقف ہو گئے اور ہندی تو اردو میں ایسی اچھی طرح کھپتی ہے کہ سونے میں سہاگہ۔ دیکھئے اس کلام میں ہندی الفاظ کتنے پاکیزہ ہیں۔ برہمن شہزادے کی پیدائش میں

کہہ رہے ہیں ؎

غور کر کے جو ہم نے دیکھا ہے
اپنی پوتھی سے پایا جاتا ہے
کہ یہ لڑکا بڑا گنی ہے بھیا
سب طرح اس پہ رام کی ہر دیا
سکھ سے یہ راج پر براجے گا
سامنے اس کے ڈنکا باجے گا

اس طرح اس کلام میں دیکھئے ؎

دھن اور مین اور میگھ میں سر بسر
گنا ثور و جوزا کیا دلو تر
پھر اس میں خیال آیا ان کا ادھر
جنم پترہ شاہ کا دیکھ کر
تلا اور برچھک پہ کر کر نظر
اٹھے اور آداب کر کے ثنا

کرشن اپنی کرپا کریں برملا
مہا راج آنند! رہیو سدا
کیا رام جی نے ہے تجھ پر دیا
چندرماں سا بالک ترے ہووے گا
کریں دیوتا اب دیا جان من
سکھی رہیو تم اور تمہارا برن

دہن تا زباں اور زباں تا دہن
نکلتے ہیں اب تو خوشی کے وچن
نہ ہو گر خوشی تو نہ ہو برہمن
ضرور اور بے شبہ چاہے جو ہر
مقرر ترے چاہیے ہو پسر
کہ دیتی ہے یوں اپنی پوتھی خبر

اردو سے اگر فارسی عربی نکالی گئی تو بہت دنوں کا بنابنایا کھیل بگڑ جائیگا ؎

کھیل یہ تم نے کیا نیا کھیلا
آیا چڑیوں میں جس طرح ڈھیلا

اس میں ہندی، فارسی، عربی، انگریزی جو کھپ سکے کھپنے دیجئے۔ گھر بیٹھے غیر زبانوں سے واقف کاری اردو کے لئے خدا کی دین ہے جو کسی اور زبان کو میسّر نہیں ؎

کیوں نہ لے بت ہو تری کم سخنی کی تعریف
جس میں جو بات بھلی ہو وہ کہی جاتی ہے

(اصلاحِ عام۔ اپریل ۱۹۱۱ء)

مضمونِ پریشان

'صلائے عام' میں اکثر مختلف طرزِ بیاں کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں زیادہ تر اپنی زبان کے اور گاہ گاہ غیر زبانوں کے کسی زبان کی چوری مجھے پسند نہیں۔ مگر کسی طرز کی تقلید اپنی ہو یا پرائی 'سرقے' میں داخل نہیں، بلکہ وسعتِ بیاں کے لئے ضرور ہے کہ غیر زبانوں کے اندازِ بیاں جو ہماری زبان میں کھپ سکیں، کوشش کر کے اپنی زبان میں اس طرح مل جل کر کھپائے جائیں کہ بوئے بیگانگی نہ رہے۔

بیگم کی غزل کا یہ مطلع بہت مشہور ہے۔

ہیں جب سے محوِ ناز کہ روزِ ازل نہ تھا
پہلے ہمارے مرنے سے نامِ اجل نہ تھا

بالزیک نے ازل کی تعریف میں لکھا ہے کہ اُس وقت جب تک آفتاب کو بھی سوجھتا نہ تھا اور چاند کو بھی انگلی پکڑ کر چلانے والا کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ عدم کے ذہن میں بھی ہستی نہ تھی۔ نہ فنا و بقا میں کوئی امتیاز کی صورت تھی اُس وقت کا نام ازل ہے۔

رہی اجل ازروئے تحقیق، عالم اسباب میں کوئی چیز فنا نہیں ہو سکتی۔ کسی چیز کا فنا ہونا دراصل بقائے ہستی کا سامان ہے کہ حالتِ موجودہ میں تو تغیر و تبدّل کا جھگڑا

ظاہرا ہماری اُلجھن کا سبب ہو رہا ہے لیکن جب ایک دفعہ اس کی عادت پڑ جائے تو مساوات میں داخل ہے ؎

وہ ناداں ہیں جو ہیں یاں انقلابِ دہر کے شاکی
وہ احمق ہیں جو سمجھیں سیدھی بات کو اُلٹی
جو دیکھو چشمِ بینا سے تو پیدا غم سے ہو شادی
کیا اضداد سے سرسبز حق نے گلشنِ ہستی
خزاں کا موسمِ گُل دیدۂ خونبارِ بُلبل ہے

جب یہ مان لیا گیا کہ کسی چیز کو فنا نہیں تو انسان ہی کیوں فانی سمجھا جائے۔ انسان نے ایسا کیا قصور کیا ہے کہ اسی کا نام و نشان مٹانے کی فکر رات دن عالمِ اسباب کو رہے۔

خُدا کی طرف سے جو زندگی ہمیں ملی ہے وہ اپنے مٹنے اور برباد ہو جانے سے قطعی بیزار ہے اور خدائے ازل کی طرف سے مجھے یقین ہے کہ اس کو ہمارا مٹانا کبھی پسند نہیں ہو سکتا۔

لیکن بات یہ ہے کہ دستِ اجل سے ہماری آنکھوں کا بند ہونا گویا خوابِ ہستی سے بیدار ہونا ہے۔ اجل کی ساعت گویا آغازِ ازل ہے کہ آج سے مرنے جینے کا جھگڑا مٹا! زندگی کو زوال سہی عدم کو زوال نہیں۔

مرنے والے کو جو ہم پکارتے ہیں اور جواب نہیں دیتے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ محبّت میں فرق آگیا بلکہ ہوائے عدم مرنے والے کو ہماری آواز سُننے نہیں دیتی۔ کہتے ہیں کہ دم نکلتے وقت شادی و غم میں امتیاز کی قوت نہیں رہتی۔

جناب غالبؔ کا شعر ہے ؎

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اسی مضمون کو میرتقی نے کس خوبصورتی سے ادا کیا ہے ؎

شب دردِ ز فریاد کرنا اُسے
کئی بار اِک دم میں مرنا اُسے

اس مضمون کو انگریزی میں اس طرح ادا کیا ہے کہ :-

میں جان دینے کو تیار ہوں۔ مگر تکّہ بوٹی کر کے زندگی کی مٹی خراب کرنا پسند نہیں، یار کے کوٹھے سے گر کر اکبارگی جان دینے کے عوض زینے سے ہر سیڑھی پر سر کو ٹکرا ٹکرا کر مرنا کونسی عقلمندی ہے۔

مرنے کا مضمون مرزا حاتم علی مہرؔ نے خوب باندھا ہے

کعبہ ویراں سا نظر آتا ہے خالی ہے دیر
لیکن اس کوچے میں اک نعش پہ کچھ جمع ہیں غیر
مرزا حاتم علی مہرؔ کی ہو جان کی خیر
وہ کہا کرتا تھا اکثر کہ کبھی دیکھیو سیر
پھینک دیں گے اسے ہم چیر کے پہلو اپنا
تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

محبّت میں کسی پر مرنا زندگی کے لئے جان دینی ہے لیکن اس کے لئے بقول میرحسن "جوانی کی راتیں مرادوں کے دن" چاہیئیں ورنہ مرنا نہیں جھک مارنا ہے ؎

زندگی زندہ دلی کا ہے نام
مُردہ دِل خاک جیا کرتے ہیں

مُردہ مُردے کے ساتھ قیامت تک بسر کر سکتا ہے' زندہ مردے کے ساتھ جی نہیں سکتا۔ انسان جب مر جاتا ہے تو اُس کا رکھنا وبال ہو جاتا ہے۔ جس کا دل مر جائے۔ اُس کا جینا مشکل ہے۔ نعش کا جب گھر میں رکھنا مشکل ہے تو دل میں کون رکھ سکتا ہے۔

انسان نے آج تک نہ جانا۔ کہ عیش کب مصیبت بن جاتا ہے اور مصیبت کب عیش ہو جاتی ہے۔ اس امتیاز کو اگر کچھ سمجھے تو اہل اللہ اور اہل اللہ کے بعد وہ شخص سمجھا جو کسی پہ مرا ؎

کہا پتنگے نے یہ شمع سے دار پر چڑھ کر
بڑا مزا ہے جو مر یے کسی کے سر چڑھ کر

محبّت میں موت کی تلاش حماقت ہے اور فراق وشبِ ہجر کے مرتبے موت سے بہت زیادہ بڑھے ہوئے ہیں۔ یقین نہ ہو تو شاعروں سے پوچھ لیجئے۔ محبّت میں افشائے راز بے حیائی ہے۔ عورت کو جس قدر زیادہ محبّت ہوگی اُسی قدر حیا آئے گی۔

لیکن یہ سب باتیں سُنی سُنائی ہیں پوچھئے تو دنیا میں محبّت سے زیادہ بیکار مشغلہ کوئی نہیں۔ یہ کون سی عقلمندی ہے کہ مرنے کے لئے جب اجل موجود ہے تو بے موت مرنے کی فکر کی جائے۔ لڑائی میں دادِ شجاعت دے کر مرنے کے عوض کسی کی جنبش ابرو کے زخمی بنیں یسیروا فی الارض کے معنے کوچۂ جاناں کے چکر سمجھیں۔ اپنی عُمرِ رواں کا اس قدر خیال نہ ہو جس قدر کہ

جلوۂ رفتارِ یار کا خیال رہے۔ چشم بیمار جاناں کے فراق میں آپ بیمارِ محبت ہو جائیں۔ یار کے سایۂ دیوار کو ظلِ ہما سے بہتر جانیں۔ کمرِ یار کے خیال میں اس قدر نحیف و زار ہو جائیں کہ دہن یار کا جواب سمجھے جائیں ؎

معشوقوں پہ مرتا ہے تری عقل کہاں ہے
بُلبل کی جہاں قبر ہے گُل بھی کوئی واں ہے
بے مہر ہیں بیدرد ہیں بیرحم ہیں یہ لوگ
کیوں جان کھپاتا ہے تو جی ہے تو جہاں ہے

صلائے عام اپریل ۱۹۱۷ء

دادِ صلائے عام

غمزۂ بیباک مشتاقِ دل آرائی ہوا　　مژدہ اے شورِ جنوں سامانِ رسوائی ہوا

اگلے وقتوں کے لوگ مشغلۂ محبت میں سامانِ رسوائی کو باعثِ نمود سمجھتے تھے۔ آج کل اخباروں میں اشتہار چھپوانا شہرت کے سامانوں میں ہے۔ صلائے عام کو اشتہاروں کی ضرورت نہیں ہوئی۔ اس کی شہرت کا ثبوت اس کی روزمرّہ کی ڈاک میں دیکھ لیجئے۔ جس طرح آفتاب کے ساتھ روشنی کا خیال اور ابر و باراں کے ساتھ لطفِ سبزۂ باغ ذہن میں آجاتا ہے۔ صلائے عام کے ساتھ نازک خیالی و خوش بیانی کا ذکر ہر زبان سے سن لیجئے۔ مجنوں کا نام لیا نہیں اور لیلیٰ ذہن میں آئی نہیں۔ شیریں کا ذکر آیا نہیں اور فرہاد کا خیال آیا نہیں۔ بہار آئی نہیں اور جنوں زا سامان پیدا ہوئے نہیں۔

ڈی کوئنسی لکھتا ہے کہ کسی زبان کی خوبیاں بلا تصنّع اور بے ساختہ دیکھنی ہوں تو شرفا کی ڈاک چرا کر دیکھ لیجئے۔ میں یہی وطیرہ اختیار کرتا ہوں کہ صلائے عام کی ڈاک چرا کر ناظرین صلائے عام کو دکھلائے دیتا ہوں کہ جس نے صلائے عام کی داد دی ہے کس خوبی سے دی ہے۔

انسان کے دل میں اگر کسی کی داد کا خیال نہ ہو تو وہ نیک نہیں اور نیکی کی قدر نیکی سے کم نہیں۔ میں خوش ہوں کہ میری محنت کی داد مجھے جلد ہی مل رہی ہے۔ اس داد

کا مجھے یوں بھی حسب ضابطہ، شکر گزار ہونا چاہیے۔ اس وقت جو عمر میری ہے اس میں جلدی داد ملنے کا میں خاص طور پر احسان مند ہوں کہ اگر اس عمر کی محنت کی داد میں غفلت کی جائے تو جس طرح شاہ نامہ کی قدر محمود کی طرف سے فردوسی کے لئے بیکار گئی شاہ نامہ کے کام آئی تو کس کام کی۔ میری محنت بھی بے کار نہ جانے دیجائے میری کم ظرفی ہو گی اگر داد دینے والوں کی قدر نہ کروں۔ یا یہ نہ سمجھوں کہ صلائے عام کی تحسین میں زیادہ تر قدر دانوں کے حسن اخلاق کو دخل ہے ؎

بیساختہ خونناب جگر آنکھ سے ٹپکا کم ظرفیٔ دل پر جو ہنسا جام ہمارا

احسان کا چرچا کرنا احسان شناسی کا نہایت اچھا طریقہ ہے۔ ارادہ ہے کہ صلائے عام کی ڈاک سے ایسی تحریریں جن میں لٹریری خوبیاں ہوں چھاپ دی جایا کریں۔ تاکہ اس تدبیر سے انشا پردازی کے اچھے نمونے جمع ہو جائیں۔

صلائے عام نکالنے سے جو مجھے فائدہ ہوا وہ یہی ہے کہ ایسے باکمالوں سے خط و کتابت ہو گئی جن کی تحریریں مجھے اس قدر خوش کر دیتی ہیں کہ تمام دنیا کی دولت ملنے سے بھی نہ حاصل ہو ؎

ملا ہے یار تو نواب اتنے خوش کیوں ہو

خدا ملا۔ کوئی دولت ملی۔ خزانہ ملا؟

اس وقت چند خطوط کے اقتباس پیش کرتا ہوں جو میرے کرمفرماؤں نے اس غرض سے نہیں لکھے کہ میں سب کو سناتا پھروں مگر مجھ سے رہا نہ گیا۔

خان بہادر اکبر حسین اکبر الہ آبادی لکھتے ہیں:

"...... تیرھویں صدی میں مذہب کی حمایت تھی۔ اس نے بڑا ثواب حاصل کیا۔ یہ پرچہ صلائے عام تو جان ہی ہے کہ ادب و زبان

کا حامی ہے، انشاء اللہ یہ بھی نام پائیگا ـــــ ارادہ ہو رہا ہے کہ بعد رمضان دہلی آؤں - اگر ایسا ہوا تو ضرور زیارت کو حاضر ہونگا ـــــ ..... "

لالہ نوبت رائے نظرؔ، مدیر "خدنگ نظر"، لکھنؤ سے لکھتے ہیں۔

"........ صلائے عام دیکھ کر نہایت مسرت ہوئی - اس آب و تاب اور پاکیزہ ذوق کا رسالہ ملک میں دوسرا نہیں، خداوند کریم آپ کی عمر میں برکت دے اور آپ کے قلم سے اردو کو تادیر فیضیاب کرے ..... "

جناب حکیم محمد علی خاں صاحب ایڈیٹر مرقع عالم ہر دوئی۔

"......... خان بہادر میر ناصر علی کا زورِ قلم زبان زدِ خاص و عام ہے - ہندوستان میں بڑے سے بڑا ادیب بھی آپ کے رنگ میں دو سطریں نہیں لکھ سکتا - جو ادائے خاص آپ کی ہے، وہ آپ ہی کا حصّہ ہے - میرے مضامین کی بڑی خوش نصیبی ہے کہ آپ کے اعلیٰ رسالے تک رسائی ہوئی۔"

جناب مہدی حسن گورکھپور سے لکھتے ہیں!

"مشرق" میں میں نے "دائرۂ ادبیہ" کا سلسلہ چھیڑا ہے اور اپنے خیالات کی پہلی قسط بھیج دی ہے - جس کا موضوعِ سخن آپ کا لٹریچر ہے۔ مدت سے آپ کی فکر میں تھا "تیرھویں صدی" کے متفرق پرچے جانے کہاں کہاں سے بہم پہنچائے جس کا حرف حرف ایسے زبردست قلم کے سانچے میں ہے کہ اگر آپ اس کے مصنف نہ ہوتے تو خود آپ سے داد چاہتا۔ آپ مجھے نہیں جانتے، مگر مجھے پندرہ برس کا غائبانہ تعلق ہے .... نوجوانوں میں اتنی سچی عقیدت شاید ہی کسی کو ہو - وہ بھی اس حیثیت سے کہ آپ جیسے مرتبہ شناس اُسے تحسین ناشناس نہ کہہ سکیں .... میں آپ کی پاکیزہ خیالی اور خوش بیانی میں ایک خاص بات پاتا ہوں جو اور کسی کے ہاں

نہیں.... بہرحال! جس طرح آپ انشا پردازی کی صفِ اوّل میں ہیں اپنے خیال میں، آپ کے پرستاروں میں ہیں کسی سے پیچھے نہیں ہوں۔ دیکھئے ضمناً اپنی تعریف کر گیا۔

...... مجھ کو اصرار ہے کہ "تیرھویں صدی" میں آپ کی لایقِ رشک انشا پردازی، اختراعِ فائقہ (ماسٹرپیسیز) کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اسے جلد ہی کتابی صورت میں شائع ہونا چاہیے۔ لیکن "مضامینِ غیر" نہ ہوں، آبِ رواں میں گاڑھے کا پیوند بے جوڑ رہے گا۔ (یہ فقرہ آپ کے رنگ میں ہے)

اس سے زیادہ آپ کی لٹریری عظمت کا ثبوت اور کیا ہوگا کہ آپ کے ہاں مضمون نگاروں کی مٹی خراب ہے۔ یعنی آپ کے ساتھ کسی طرح کھپ نہیں سکتے۔ دنیا کے اور پرچوں کو دیکھئے "غیروں" کے ہاتھوں جی رہے ہیں۔ اُردو انشا پردازی کو آپ پر ہمیشہ ناز رہے گا — اتنے ناصر علی کہاں سے آئیں گے......"

جناب مہدی حسن کا ایک اور خط!

"......... میری گزشتہ شام اس لئے قیمتی تھی کہ ہاتفِ ڈاک "صلائے عام" کے پچھلے نمبروں کا پیکیٹ لایا۔ کیا بتاؤں کتنی خوشی ہوئی۔ میں شب کو معمولاً پانیر پڑھتا ہوں۔ یہی فرصت کا وقت ہوتا ہے۔ لیکن قسم لے لیجیئے جو اُسے چھوا بھی ہو — ایک ہی نشست میں سارے پرچے ختم کئے۔ بس یہ قطع تھی جیسے کسی بھوکے فاقہ مست کو سادے خشکے کی جگہ خوش ذائقہ بریانی مل جائے اور ڈھکائے نہیں بلکہ ایک دم سے نگلنا شروع کر دے....... اب جگالی کی پڑے گی یعنی اطمینان سے آپ کے

افکارِ تازہ پھر آنکھوں میں جگہ پائیں گے اور دل میں اُتریں گے ۔ باقساط دوہراتا رہوں گا۔

میری مختصر اور جامع تعریف یہ ہے کہ بندۂ ناصر ہوں۔ آج تک آپ کے سوا کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی .... گو ایک حد تک بچھڑ گیا تھا جس کا افسوس ہے۔ تاہم اس حیثیت سے خوش نصیب ہوں کہ آپ کے "اجزائے غیر فانی" کا ایک معقول حصہ ایک وقت میں اتنا بہت سا ہاتھ آیا جس کے لئے میرا دلی شکریہ قبول فرمایئے ....!

مرزا عرفان علی بیگ ڈپٹی کلکٹر پیلی بھیت ۔

"........ صلائے عام ماہ اکتوبر پہنچا ۔ از اوّل تا آخر میں نے خوب جی لگا کر پڑھا ۔ ہر مضمون متقاضی ہے کہ پھر پڑھو ۔ سچ یہ ہے کہ آپ نے اُردو کو کمال پر پہنچا دیا ۔ یا حضرت ! آپ کے آگے اُردو کون لکھے گا ۔ میری نظر سے تو آج تک نہ ایسی آب و تاب کا کوئی رسالہ گزرا نہ ایسے مضمون کہیں دیکھنے میں آئے ۔ جو مضمون ہے وہ آپ کی عالی دماغی ، نازک خیالی اور رنگیں بیانی کی شہادت دے رہا ہے .... آپ نے ماہ اکتوبر کے واسطے تو خدا جانے کہاں سے خزانہ جمع کر رکھا تھا کہ چھاج بھر بھر کر موتی انڈیل دیئے ۔ افسوس تو ان لوگوں کی حالت پر ہے جو صلائے عام کے مُطالعے سے نفع نہ اٹھائیں ۔ کون کہتا ہے کہ اس میں خالی زبان کی خوبی ہے اس میں وہ عالی مضامین ہیں جو علم و ادب ، فلسفہ و حکمت کا اعلیٰ نمونہ ہیں ۔ اور ایسے اخلاق حسنہ کی تعلیم ہے جو سوسائٹی کے تمام افراد کو مہذب بنانا چاہتے ہیں ۔ صلائے عام اپنے ناظرین پر فی الواقع دو احسان کرتا ہے ۔ اوّل تو فصیح اُردو سکھاتا ہے دوم ، تہذیب اخلاق کرتا ہے اور

رموزِ فطرت سکھاتا ہے۔ اس سے زیادہ نعمت اور دُنیا کے پردے میں کیا ہوگی —!"

سیّد نظام الدین دلگیر اکبر آبادی کے خط کا انتخاب۔

"........ یوں تو صلائے عام کا ہر نمبر کوئی نہ کوئی خاص دلچسپی اور رنگینی لئے ہوئے نکلتا ہے۔ لیکن اکتوبر کے نمبر کا کیا کہنا ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا ایں جاست

"کمالِ دہلی" میں میں نے صلائے عام کے بارے میں جو کچھ خامہ فرسائی کی، وہ تحسین ناشناس سے زیادہ وقیع نہ تھی، آپ نے اسے ازراہ قدر افزائی صلائے عام میں نقل کر کے شرمندۂ احساں کیا —"

راقم

میں ہوں آپ کے کمالاتِ انشا پردازی

کا معتقد یا مختصر الفاظ میں حقیر بندۂ ناصری

دلگیر

خان صاحب پیرزادہ محمد حسین صاحب مؤلف سفرنامہ ابن بطوطہ، افسر اعلےٰ عدالتِ کشمیر نے ازراہِ کرم جہاں اور باتیں صلائے عام کی داد میں لکھی ہیں یہ بھی ارقام فرمایا ہے کہ :-

"........ آپ کے کمال انشا پردازی میں شک لانے والے کو میں کافر سے کم نہیں سمجھتا۔ ڈرتا ہوں کہ آپ کے میگزین میں زبان کے سنہری روپہلی ہونے کی شرط ہے، میری طرز سادہ، انگریزیت کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ آپ کو خدا نے نازک و رنگین استعارہ پسند

طبیعت بخشی ہے، جس پر مجھے ضرور رشک ہے۔ اس لئے جرات نہیں ہوئی کہ اس خط کے نیچے یا نظموں کے ساتھ اپنا نام لکھوں۔"

سیّد علی حیدر صاحب نظم طبا طبائی لکھنؤ سے لکھتے ہیں:

"آپ کا رسالہ "بے بہا صلائے عام" دیکھا۔ تصویریں تو اس میں نہ تھیں لیکن ہر ہر صفحے کو ارژنگ مانی کہوں یا نگارستانِ بہزاد سمجھوں — ہر ہر ورق ناظورۂ معانی کا مرقع — اس سادگی میں بھی مرصع۔ مضامین دلکش، تحریریں دلفریب، خدا فرصت دے تو اسے دیکھا کرے اور دل خوش کیا کرے، جسے مذاقِ صحیح ہوگا وہ ضرور اس رسالے کی قدر کرے گا — یہ وہ طرزِ تحریر ہے جو پیکرِ اردو کا ملبوس خاص ہے جس میں انگریزیت کی بو نہیں پائی جاتی سچ یہ ہے کہ اس حسین چہرے پر بنارسی دوپٹے کا آنچل ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اسے کلاہِ فرنگی پہنا کر بہروپیا بنانا مجھے پسند نہیں۔ کچھ انگریزی میں بھی جانتا ہوں۔ لیکن اس زبان کا طرزِ بیاں مجھے اسی زبان کے ساتھ مخصوص رکھنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اردو اب اوجِ کمال پر ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس ترقی کے چلتے دہلی و لکھنؤ کی زبان بھی بگڑی جاتی ہے۔ جن اصحاب نے زبان کو سمجھا اور اس کا مزا اٹھایا ہے وہی میری بات کو سمجھیں گے۔ جو اس طرزِ ادا اور لطافتِ بیان سے آشنا نہیں وہ البتہ افسوس کریں گے۔

اگر آپ کے معاصرین اجازت دیں اور نکتہ چینی سے خفا نہ ہو جائیں تو اپنے موقر رسالے میں ایک فصل تنقید کی بھی ضرور بڑھا لیجیے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے کہ نفس واپسیں تک اردو کا ساتھ دیئے جاتے ہیں۔ میں

تو سمجھتا ہوں کہ اُردو روز بروز خراب ہوتی جارہی ہے۔ جو لوگ اہلِ قلم، صاحبِ تصانیف ہیں یا مضمون نگار و صاحبِ اخبار ہیں، انہوں نے من مانی گھڑ جانی مچا رکھی ہے۔ صدہا لوگ اپنی زبان کو دہلی یا لکھنؤ کی طرف نسبت دیتے ہیں لیکن طرزِ بیاں اُن کا کچھ اور ہی کہتا ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ انھی کا کلام بیاضِ انتخاب میں گلِ سرسبد، قواعد کی کتابوں میں قابلِ سند اور تحقیقِ محاورات میں مستند مانا جاتا ہے...... اب وہ زمانہ قریب آگیا ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کی زبان قابلِ سند نہ سمجھی جائے گی اور اُردوئے معلّیٰ فقط کتابوں ہی میں رہ جائے گی..... آپ کا مؤقر رسالہ اس کام کے لئے شایاں ہے کہ تصحیحِ محاورات کا ذمہ لے اور معاصرین کی تحریروں پر نکتہ چینی کرنے میں دریغ نہ کرے........"

جناب مہدی حسن صاحب!۔

"......."عید" پر آپ کی فلسفیانہ نکتہ سنجی کی داد کے لئے الفاظ کہاں سے لاؤں۔ نہایت اہم مسائل کو آپ باتوں باتوں میں جس طرح ادا کر دیتے ہیں یہ فقط آپ ہی کا حصّہ ہے....... میرا خیال ہے اکیلا یہی مضمون اکتوبر کے لئے کافی تھا....... آپ یہ کیا لکھا کرتے ہیں کہ میرے بعد کوئی اور صلائے عام کو سنبھال لے تو اچھا ہے۔ یہ میرا حسنِ ظن نہیں بلکہ واقعہ ہے کہ جس وضعِ خاص پر آپ لکھتے پڑھتے ہیں، یہ مشغلہ آپ کی ذات سے آگے بڑھتا نظر نہیں آتا۔ ملک میں کسی ایک شخص کا نام بتایئے جو آپ کی طرح قلم اُٹھا سکتا ہو۔ بڑے بڑے فاضل موجود ہیں لیکن "ناصر علیت" کسی میں نہیں"۔

آپکا فدائی ـــــ مہدی، ۲۰ر اکتوبر ۱۹۰۹ء

جناب مہدی حسن صاحب کے ایک اور خط کا مختصر خلاصہ (خلاصہ اس پر مختصر، یعنی بہت ہی اختصار) سُن لیجئے۔

"اکتوبر کا صلائے عام عروسِ جمیل ولباسِ حریر، لاجواب نکلا، پاکیزگیٔ لٹریچر کے ساتھ صنعت گری یعنی آرٹ کا اچھا خاصا مُرقع ہے۔ جو یہاں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ اکثر مقامات پر آپ کی نزاکتِ خیال میری آنکھ سے آنسو بن کر ٹپکی —— لیکن دل کا درد نہ گیا —— خدا جانے کیا بات ہے ——؟ آپ کی تحریر سے دل کو چوٹ لگتی ہے، جیسے مجھ پر گزری ہوئی کوئی پتے پتے کی کہہ رہا ہو۔۔۔۔"

جتنے مضامین خاص تھے ایک ایک کو یاد نہیں کے دفعہ پڑھا۔ اور ابھی یہ وظیفہ جاری رہے گا۔ آپ نے جن مقامات کی طرف بالتخصیص مجھے متوجہ کیا تھا وہ دل پر نقش ہو گئے ہیں۔ جس طرح چھُری گلے مل کر تڑپ بڑھا دیتی ہے، میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی تحریر آشناؤں کو مل کر مارتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ خدا ہی ہے جو جان بچے ——

ایک فقرہ میرے خاص ڈھب کا تھا جس پر لوٹ گیا!

"عورت جب مُنہ پھیر کر چلنے کے لئے کھڑی ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ چاہتی ہے کہ کوئی دوڑ کر اس کا دامن پکڑ لے!! ہائے —— کیسے پتے کی بات اور کتنے سادہ الفاظ میں کہہ دی آپ نے —— یہ رعنائی خیال اور یہ اچھوتا طرزِ بیاں کوئی کہاں سے لائے گا۔

دائرہ ادبیہ (کھلی چٹھی) آپ کی نظر سے گزرا اور آپ کو پسند آیا۔ یہ میری طفلانہ اُپج کا بہترین صلہ تھا جو آپ سے زیردست

انشا پرداز کے ہاتھوں مجھے مل سکتا تھا۔ آپ لکھتے ہیں۔

"تمہاری کھلی چٹھی نے مار ڈالا جس کام کے لئے نیچر جلدی کر رہی ہے، تم اپنے ذمے اس کا عذاب نہ لو۔ میں تم سے جیت نہیں سکتا ــــ تم نے اپنے مضمون میں جوانی کا زور دکھایا ہے"ــ

کیا بتاؤں ان فقروں نے مجھ پر کیا ستم ڈھایا.......

آپ کا ہر ہر فقرہ ریویو کے لئے مستقل عنوان چاہتا ہے۔ اور میں لطف کو قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ اس لئے جستہ جستہ عرض کرتا رہونگا۔"

آپ کا فدائی ــــ مہدی

جناب شمشیر بہادر اخگر، ریاست لچے گڑھ سے لکھتے ہیں۔

"اکتوبر کا صلائے عام واقعی بڑی دھوم کا نکلا۔ میں کیا اور میری تعریف کیا، جب ہندوستان کے مستند شاعر اور نثار مدح خواں ہوں تو میں بے چارہ کس شمار میں ہوں، مگر دل نہیں مانتا اس لئے بے حجاب عرض کرتا ہوں۔ معاف فرمایئے گا

لٹائے دیتی ہے لذّت ترے سخن کی ہمیں

کہ بات بات میں دلکش ادا نکلتی ہے

بخدا آج تک کسی رسالے یا کتاب کے لئے میری یہ حالت نہیں ہوئی جو صلائے عام کے لئے ہوتی ہے۔ ۲۰ تاریخ سے ۲۸ تاریخ تک مجھے دن گننے پڑتے ہیں اور جب تک ڈاک نہیں آجاتی دروازے پر آنکھیں لگی رہتی ہیں ؎

آہٹ پہ کان در پہ نظر رہتی ہے مدام

جب تک کہ مجھ کو مل نہیں جاتا صلائے عام

اور جس وقت رسالہ ہاتھ میں آتا ہے۔ اس وقت کی خوشی کی کیفیت عرض نہیں کرسکتا۔ دل کہتا ہے کہ ایک بارگی سب کچھ کسی طرح پڑھ جاؤں۔ جب ذرا دل کی تیزی ٹھہرتی ہے تو ابتداسے دیکھنا شروع کرتا ہوں۔ ایک ایک مضمون کو مکرر سہ کرر پڑھتا ہوں ـــ پھر بھی سیری نہیں ہوتی۔ بخدا یہ سب میں نے بلا مبالغہ عرض کیا ہے۔

ناچیز و بے ہنر
شمشیر بہادر اخگر

جناب سید حسن عابد جعفری آگرے کے خط کا خلاصہ ـ

"....... میں تو آپ کو پیغمبر زباں سمجھتا تھا۔ مگر اپنی خطا پر نادم ہوں آپ کو خدائے سخن کہوں گا جو آپ کی جودتِ طبع اور پاکیزگیٔ بیاں کا منکر وہ خدا سے منکر ـــ جس بے تکلفانہ انداز میں آپ فلسفے کے کڑوے کسیلے مضامین کو اپنی حسین و دلنشین تحریر سے لطیف و شیریں بنا دیتے ہیں وہ کسی فلسفی کے دل سے پوچھئے ـــ اللہ ـــ اللہ ـــ!! جناب مہدی حسن اور مرزا عرفان علی بیگ جس قدر بھی آپ کی مدح سرائی کریں کم ہے۔

.... آپ لکھتے ہیں "کھلی چٹھی" نے مار ڈالا مجھ سے پوچھئے ـ تین ہفتے سے مریض ہوں ـ ...... مگر آپ کے "حسنِ تحسین مضموں" پر طائرِ مذبوح کی طرح تڑپ رہا ہوں ...... آپ کو کیا خبر آپ کے چھوٹے چھوٹے جملے کیسا غضب ڈھاتے ہیں ......"

صلائے عام

یہ سلسلہ مجھے تو بہت پسند تھا۔ لیکن عیب دوست طبیعتیں، کسی ہنر کو پسند نہیں کرتیں۔ ایک صاحب نے اعتراض کیا ہے کہ ادھر اُدھر کے خطوط نقل کر دیے جاتے ہیں۔ جن سے کوئی فائدہ نہیں۔

اس وقت تک کی ڈاک میں سے دو ایک خطوں کا خلاصہ آج نقل کیے دیتا ہوں۔ اگر ناظرین صلائے عام ناپسند کریں تو کثرتِ رائے پر یہ سلسلہ آیندہ سے ترک کر دیا جائے گا۔ میرے پاس تو صلائے عام کی ڈاک بدستور آتی رہے گی مگر آپ کو دکھائی نہ جائے گی۔

جناب نیاز محمد خاں صاحب نیاز فتحپوری کے خط کا خلاصہ سُن لیجیے!

حضور ــــ ایک عربی مقولہ ہے "من الجنون فنون" قوائے عقلی کا جذباتِ نفسانی پر غالب ہو سکنا یہ بھی ایک نوع کا جنون ہے۔۔۔۔۔ آج نومبر کا صلائے عام ملا۔۔۔۔ بحیثیت مجموعی جو اثر اس نے مجھ پر کیا وہ ان گزری ہوئی چوٹوں سے تعلق رکھتا ہے جو اس وقت تک دبی دبی سی چلی آ رہی تھیں۔ اب آپ کے پرچے نے اکبارگی پھریری کر دیں۔ میں نے آپ کو کوسا بھی بُرا بھلا بھی کہا مگر تخیل میں۔ زبان سے نہیں قسم لے لیجیے۔ واللہ اس عالم کی بھی کیا باتیں ہیں۔ ہائے رے وارفتگی ــــ اور اب آپ ہی سے بُرا بھلا کہنے کی داد لینے بیٹھا ہوں ــــ تکلف برطرف، عرض کر چکا ہوں کہ جنون کی باتیں ہیں۔ اگر کچھ پتے کی کہہ جاؤں تو اسے اتفاقیہ ہی سمجھیے۔

آپ اپنے منہ سے اپنے کو میرا ہمدرد نہ کہیں۔ لیکن میں تو یہی سمجھتا ہوں۔ کیسی انوکھی بات ہے۔ خدا اس رمز و کنایہ اور کنایہ پسند طبیعتوں کو

قائم رکھے۔ ورنہ یہ بھی آپ کے رنگ کے ساتھ مٹ جانے والی چیز ہے جب دین کی حالت ابتر ہوئی تو محی الدین نامی ایک بزرگ پیدا ہوئے اب زبان کی بقا کی ضرورت تھی سو اللہ نے آپ کو محی اللسان بنایا۔ کم از کم اس وقت تک تو آپ کی ضرورت اور ہے جب تک ہر مخالف کی نگاہ اس رنگ میں ڈوب کر خوننابہ چکاں نہ ہو جائے۔

کمبخت مدعی نہیں سمجھتا کہ فلسفہ کن قدرتی خیالوں کا نام ہے "اوّل یا آخر بر منتہیٰ" اب سے پہلا خیال سب سے پہلا خیال جو کسی کی نگاہ صبر آزما کے ساتھ ہی قلب میں ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ وہی سچا سرچشمہ اور نقطۂ معراج فلسفے کا ہے۔ آپ کی حکیمانہ موشگافیاں میرے قلب پر کیا اثر کرتی ہیں۔ کس کو اپنا دل چیر کر دکھاؤں، اس خیال سے نہیں کہ میں دکھا نہیں سکتا، بلکہ اس بنا پر کہ کوئی اس پر بھی ملنے والا نہیں۔

صلائے عام کی مقبولیت کے لئے آپ کا نام ہی کافی ضمانت ہے مگر کن لوگوں میں؟ یہ غالب علیہ الرحمۃ کے کلام سے معلوم ہوگا جو اتنے سال قبل آپ کے پرچے "صلائے عام" کے لئے پیشین گوئی کر چکے ہیں کہ ع

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

بس کلیہ قائم ہو گیا، جو نکتہ داں نہ ہو اسے اس ذیل سے خارج سمجھئے......

ایک عرصے کے بعد ایسا سرور حاصل ہوا اور خدا کرے اس کے ساتھ ہی اس سرور کا قائم رکھنے والا بھی قایم رہے آمین"

جناب مرزا احمد ہادی، صاحب عزیز لکھنوی - آج عین انتظار میں صلائے عام پہنچا سرور و کیف حاصل ہوا۔۔ میں صلائے عام کو بہت دوست رکھتا ہوں۔ اردو کی نمائش گاہ میں یہ ایک اعلیٰ نمونہ علم و فن کا ہے"

جناب مہدی حسن کا بہت پاکیزہ خط آیا جس میں سے صلائے عام کے متعلق یہ عبارت

لئے بغیر مجھ سے نہ رہا گیا۔

"حُسن تحسین مضموں" میں آپ نے جو کچھ فرمایا، میری بے انتہا عزت افزائی ہوئی۔ یہ بجائے خود آپ کے اچھوتے لٹریچر کا ایک خوبصورت مُرقع ہے۔ خاص کر مجنوں کا کاسۂ گدائی لیلیٰ کے ہاتھ سے جس خوش ادائی کے ساتھ شکست ہوا ہے وہ قطعاً بھولنے کی چیز نہیں۔ آپ کی چشمِ سخن کے امتیاز کا کیا کہنا!

خالص ادب یعنی ارفع مضامین کے ساتھ پاکیزگیٔ بیاں کا آپ کے سوا اس وقت کہیں پتا نہیں۔ فلسفے یا تاریخ کی انشا پردازی ایک ضمنی چیز ہے۔ اس میں مستقلاً ادبی پہلو نہیں ہوتا۔ نہ یہ غایت اس اخباری لٹریچر سے پوری ہوتی ہے۔ جس کی ملک کے ہر حصے میں بھرمار ہو رہی ہے میری غرض مستقلاً لطائف ادبی یعنے بیلے لیٹر BELLES LETTRS سے ہے۔ غالب نے اپنی مشکل پسندی کے ساتھ بھی اس رنگ کو ایک حد تک نبھایا...... نفس لٹریچر جو خود ایک مستقل چیز ہے خاص طرح کی شرافت اور نزاکتِ خیال چاہتا ہے۔ نرے روزمرّہ اور محاورے کی اُلٹ پھیر سے کام نہیں چلتا...... یہ بات میں آپ اور صرف آپ ہی میں پاتا ہوں۔ آپ جو کچھ لکھتے ہیں خالص ادیب کی حیثیت سے اور کمال انشا پردازی کا اقتضا بھی یہی ہے کہ لٹریچر اور اصنافِ سخن کی طرح اپنے وجود میں مستقل، بالذات ہو۔ کیا آپ ثبوت چاہتے ہیں؟ دسمبر کا صلائے عام دیکھیے۔

"دیکھا جو اس نے چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ"

اس عنوان سے آپ نے مسکرانے کی نزاکتیں جس انداز سے دکھائی ہیں میں نہیں جانتا کہ کسی مشرقی لٹریچر میں اس موضوعِ لطیف پر ایک حرف

بھی کسی نے اس طرح لکھا ہو۔"

آپ کا فدائی ــــ مہدی

خان بہادر مرزا سلطان احمد اسسٹنٹ کمشنر:

"صلائے عام کی تقطیع وضع قطع اور خالص ادبی ذوق نے گئے گزرے مرحوم رسالے تیرھویں صدی کی یاد تازہ کر دی ــ لیکن صلائے عام کی شان اور ہی کچھ ہے۔ یہ نازک خیالیاں یہ حکیمانہ تیر و نشتر، یہ بیان یہ کلام اور ایسی پیاری دل میں گھر کرنے والی زبان آج تک کسی کو نصیب، نہ ہوئی ماللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔"

شمس العلما محمد امین ڈسٹرکٹ جج۔

.... آپ کے شوخ و شنگ فلسفیانہ مضامین پڑھ کر وہ قصہ یاد آیا کہ بڈھے کو کوئی صندوق میں بند کر کے لے گیا تھا کہ ضرورت کے وقت اس سے مشورہ لیا جائے ؏

کہن گشتی و ہمچنیں تازہ ....

ماشاءاللہ اس عمر میں اور یہ اندازِ تحریر ؏

پیرے کہ دم زعشق زند بس غنیمت است

میرؔ کو کیوں نہ مغتنم جانیں — اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

فی الحقیقت آپ کو رنگین بیانی اور نثر میں تشبیہہ و استعارہ کے برمحل استعمال میں یدِ طولیٰ ہے۔ ایک سے زیادہ دوسری تشبیہہ چسپاں ہوئی ہوتی ہے۔ میری تحسین تو تحسین ناشناس ہی ہے لیکن جو جانتے ہیں وہ سب آپ کا لوہا مانتے ہیں۔ صلائے عام کے ساتھ دو تین دن نہایت لطیف و پُرکیف گزرے۔ خوب خوب مزے لئے اب پھر تشنگی ہے۔ یعنی پھر چھینے

پھر انتظار کریں جب اگلا چاند (صلائے عام) دکھائی دے گا۔ پھر یہ شعر وردِ زباں ہو گا ؎

ساقیا عید ہے لا بادے سے مینا بھر کے

کہ مے آشام پیاسے ہیں مہینا بھر کے

ہم بھی صبر کرتے ہیں' اتنی ڈھارس پھر بھی بندھی ہوئی ہے کہ یار زندہ صحبت باقی ـــ"

جناب لطیف احمد آگرے سے لکھتے ہیں!

"صرف یہ لکھنا کہ صلائے عام بہت پسند آیا اس کی توہین ہے لیکن اس کی واقعی و جامع تعریف کے لئے میں اپنی معلومات اور ذخیرۂ الفاظ میں کوئی موزوں لفظ نہیں پاتا۔ میرے ایک قابل دوست کا قول ہے کہ اُردو اگر کوئی مجسّم چیز ہوتی تو ایک دم کو جُدا نہ کرتا۔ میں نے ان کو لکھا ہے کہ بندہ پرور، اُسی مجسّم چیز، اُردو نے کاغذی لباس زیب تن کر کے اپنا نام صلائے عام رکھا ہے۔ اب دل کھول کر جان نچھاور کیجئے اور اپنی اور میری بدبختی پر افسوس کیجئے کہ اب تک اس سے ناآشنا رہے۔"

ارادت کیش ـــ ل۔ احمد۔

حضرت گرامی، شاعرِ خاص، حضور نظامِ دکن کے خط کا خلاصہ!

"میں آپ کے حکیمانہ دل و دماغ اور دلکش طرزِ تحریر سے اکثر استفادہ کرتا ہوں۔ ممکن ہے صلائے عام کے پڑھنے سے مجھے بھی اُردو عبارت لکھنے کی ایسی ہی معجز نما طرز اور دلرُبا انداز حاصل ہو جائے۔ گویا صلائے عام میرا اتالیق بن جائے۔

آپ کا "خیال و زبان" کا مضمون بہت ہی خوب رہا۔ آپ کے اعلیٰ تخیل اور پاکیزہ بیانی کی شان بیان کرنے سے زبان قاصر ہے۔ بیں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں ـــ؟ آپ کا خیال بالکل صحیح ہے کہ زبان اور خیال لازم و ملزوم ہیں۔ بمنزلہ روح اور جسد کے ہیں اور اگر آپ کی طرح زبان و خیال دونوں پاکیزہ ہوں تو کیا ہی کہنا ـــ نورٌ علیٰ نور گرامی زبان سے بے خبر ہے۔ خیال سے محبت رکھتا ہے۔

راقم ـــ آپکا گرویدہ گرامی

نواب سراج الدین احمد سائل دہلوی:

"مکرمی خان بہادر صاحب ـ آپ کا صلائے عام دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ آپ نے دلی کی لاج رکھ لی۔ ماشاء اللہ ـــ کیسا مرصع رسالہ ہے۔ شب کو اس کے مطالعے سے مجھے تکلیف ہو گئی۔ یعنی الف سے ی تک جب سارا رسالہ دیکھ چکا اس وقت سونا نصیب ہوا ـــ آشوبِ چشم کی بھی پروا نہ کی۔ اللہ تعالیٰ اسے نظرِ بد سے بچائے۔"

آثم ابوالمعظم سراج الدین احمد خاں سائل ـ ۳۱ر جنوری ۱۹۱۰ء

جناب شیخ عاشق حسین صاحب سیماب اکبر آبادی لکھتے ہیں:

"صلائے عام ایسا صحیفۂ خاص ہے جو مروجہ صحائف عام سے زیادہ خاص رنگِ عبارت سے خصوصی طور پر مزین کیا جاتا ہے۔ تاکہ عوام اور خواص دونوں اس کی خصوصیاتِ خاص سے عام طور پر حظِّ خاص اٹھائیں ـــ خواص کا طبقہ اگر اس زریں کارنامۂ ناصر کی عامیت کو مقصودِ خاص سمجھ لے تو یہ نکتۂ خاص ہے ورنہ ع

ناصر علی بنام علی بر دہ پناہ   ورنہ بہ ذوالفقار علی سر بریدمت

کہنے والے بھی اگر اپنے تمام و کمال خصوصیات کے ساتھ پھر زندہ ہو جائیں تب بھی زبان و بیانِ ناصری کی یورش سے پناہ لیتے پھریں ؎

اُن کے آگے لب نہیں کھلتے مرے   کچھ نہیں معلوم یہ کیا بات ہے

حضور والا! جو حضرات میری طرح نثر کے مضامین میں آپ کی تقلید کرنا چاہتے ہیں وہ اگر آیندہ سے اپنے نام کے آگے "ناصری" لکھ لیا کریں تو آپ کے عقیدتمندوں کو امتیازِ خاص حاصل ہو جائے۔ اگر آپ اجازت دیں تو یہ بندۂ حقیر بھی اس حلقۂ ارادتمندی میں عملاً شامل ہو جائے......"

الراقم سیماب ناصری

حضرت امجد علی صاحب اشہری۔ دبدبۂ سکندری میں لکھتے ہیں!

"......... خان بہادر میر ناصر علی کی سخن طرازی و ناطقہ پردازی انھی کا حصّہ ہے۔ آج کل کے نہایت سنجیدہ نوجوان ادیب مسٹر ایم مہدی حسن نے ان کی نسبت دو فقرے ایسے جامع لکھے ہیں، یعنی جب تہذیب الاخلاق مشقِ سخن کرتا تھا تو آپ کا لٹریچر شباب پر تھا یہیں سے اپنا مرتبہ دیکھ لیجئے ـــــ" واقعی دادِ سخن اسی کا نام ہے، کیسی برحق بات کہی......"

جناب دلگیر اکبر آبادی ـــــ آگرہ اخبار مورخہ ۲۸ جنوری ۱۹۱۰ء میں صلائے عام پر ریویو کرتے ہوئے لکھتے ہیں!

زباں بیاں کے لئے ہے بیاں زباں کے لئے

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے آج

اُردو نثر میں جو رنگِ خاص خان بہادر میر ناصر علی کو میسر ہے شاید کسی

کو نصیب ہو۔ انوکھے خیال، اچھوتا بیان، لم یطمثہن انس قبلہم ولا جان۔ یوں تو فضلنا بعضکم علی بعض سے کس کو انکار ہے۔ مگر اس میں جس سادگی اور خوبصورتی سے عروس اُردو جلوہ نما نظر آتی ہے اس کی نظیر اب تک نظر نہیں آتی۔ ہائے وہ رنگین تشبیہیں، وہ جواہر نگار الفاظ کانہن الیاقوت والمرجان۔ خان بہادر کا احسان زبان اُردو پر ہے اور خان بہادر پر فضل ایزد منّان اور ہل جزاء الاحسان الّا الاحسان۔

اگر میرا بیان غلط ہے تو ملک کے اکثر نامور انشا پرداز خان بہادر کے ہاتھ پر کیوں بیعت ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ شراب اُردو کی کشید کے لئے اگر کوئی خاص میکدہ ہے تو وہ دلّی ہے۔ اور اس کے ساقی خان بہادر میر ناصر علی ہیں جو ہر ماہ صلائے عام کے ذریعے اس بادۂ خیال انگیز کے کنٹر پر کنٹر لنڈھا رہے ہیں۔ بادہ خواران ہم آہنگ اگر صہبائے کلام کی مستیاں دیکھنا چاہیں تو جام ناصری کے کیف آگیں دور میں شریک ہو جائیں۔"

(۳)

صلائے عام

میں نے صلائے عام کی ڈاک کا سلسلہ بند کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن سلطنتِ انگریزی میں بڑا جرم ڈاک کا روکنا ہے۔ دوسرے جن احباب کو اس کی خبر لگی وہ میرے مخالف ہو گئے، کہ صلائے عام کی ڈاک کو کون روک سکتا ہے، ناصر علی کو اپنی ڈاک کا اختیار ہے۔ صلائے عام کی ڈاک تو پبلک کی ملکیت ہے۔ اور سرکاری ڈاک سے بھی زیادہ ضروری۔۔۔

اس تمہید کے بعد اس بات کا کہنا بے کار ہے کہ تازہ ڈاک میں جو خط آئے ان کا

ہاتھ آنا بڑی نعمت ہے۔ دیوان ظہیر فاریابی کی طرح خانہ کعبہ سے بھی ان کے چرانے کا لطف ہے۔ ؎

دیوان ظہیر فاریابی در کعبہ بدزد اگر بیابی

آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بہادر، علی گڑھ سے ارقام فرماتے ہیں:

"......... صلائے عام کو میں نہایت شوق سے پڑھتا ہوں۔ جناب اُردو کی جس طرح خدمت کر رہے ہیں اس کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں روز بروز اُردو کی حمایت اور خدمت کا خیال بڑھتا جاتا ہے۔ اور اس حقیقت کا بھی ان پر انکشاف ہو رہا ہے کہ جس قدر ترقی وہ اپنی مادری زبان میں کر سکتے ہیں کسی غیر زبان میں ممکن نہیں اور بغیر زبان کی ترقی کے کسی ملک کی علمی اور دماغی ترقی ممکن نہیں۔ زبان کی ترقی کا مسئلہ قومی تحریک کا نہایت اہم جزو ہے۔ اس لئے جناب نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اس سے ہر بہی خواہ قوم کو دلی ہمدردی ہے۔"

گیتانجلی کے مصنف بابو رابندر ناتھ ٹیگور کلکتے سے لکھتے ہیں:-

"......... بلاشک آپ کا صلائے عام اُردو کی ترقی اور فروغ کے لئے اعلیٰ خدمات انجام دے رہا ہے......"

(ترجمہ از انگریزی)

مولوی سبحان اللہ صاحب گورکھپور سے لکھتے ہیں:

"میرا یہ عریضہ بھی ویسا ہی سچا ہے جیسا پہلا تھا۔ یعنی تملّق و خوشامد و مروّت سے قطعی بری ہے۔ آپ کی قادر الکلامی، شیوہ بیانی اور روزمرّہ کی باتوں کا برجستہ اور بے ساختہ تشبیہات میں استعمال،

خیالات کی حکیمانہ نکتہ رسی، مضمون کی سنجیدہ روش، شرافت و پاکیزگی بیاں اس پر زیرِ لب تبسم کا سا عالم، ان سب پر بالا وہ کیف و سرور جس کے اظہار کے لئے بجز واہ واہ، ماشاء اللہ، سبحان اللہ، اور ہا ہا کے کچھ اور زبان سے نہیں نکل سکتا۔ یہ تمام چیزیں ایسی ہیں کہ خدا گواہ ہے ہر روز آپ سے ملنے، آپ کو دیکھنے کا آرزومند رہتا ہوں اور خدا سے ہر دم دعا کرتا ہوں کہ خان بہادر کی عمر میں ایسی برکت دے کہ وہ خود گھبرا جائیں۔ . .

دو باتیں مشہور رہیں۔ صورت پرستی اور سیرت پرستی، صورت پرستی کو . . . ہَوسنا کی اور سیرت پرستی کو لوگوں نے خدا پرستی سے ملا دیا ہے۔ لہٰذا میں خوش ہوں کہ اگرچہ خدا پرستی تک نہیں پہنچا مگر سیرت پرستی میں مبتلا ہوں اور دن رات سوچتا رہتا ہوں کہ الٰہی جس کی ایسی تحریر ہے وہ خود کیسا ہوگا . . . .

حضرت مجھے گستاخانہ کچھ اور عرض کرنے دیجئے، عرض تو کر ہی لوں گا، آپ سُن بھی لیجیے کہ آپ کے مضامین یہ صاف بتاتے ہیں کہ چھوٹا ہو یا بڑا ہر مضمون آپ کے خیالات کی گنجائش کے لئے تنگ ہے۔ اس طرح وسیع خیالات آپ کے چھوٹے چھوٹے سادہ سے جملوں میں سما کر اور بھی زوردار ہو جاتے ہیں۔ نکتہ رس سمجھ لیتے ہیں لیکن ناپختہ ذہن تشنگی محسوس کرتے ہیں۔ ایک اور بات بھی عرض کروں کہ حضور کی خصوصیت نثر میں شاعرانہ تعلّی کی اس خوبی کے ساتھ نبھ رہی ہے کہ اس خاص صفت میں دعوے کرتا ہوں کہ کوئی آپ کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ لوگ شاید تقلید کریں اور زوردار الفاظ بھی اپنی تحریروں میں ٹھونس ٹھانس کر لے آئیں مگر جو کیفیت آپ پیدا کر دیتے ہیں۔ ہزاروں کوس تک اُس کا

کہیں پتا نہ ہو گا۔

زیادہ عرض کرنا ممکن ہے کہ سمع خراشی اور اضاعتِ وقت ہو اور کہیں ستم بر ستم یہ نہ سمجھا جائے کہ پہلی بیہودگی کو اسی طرح دھونا چاہتا ہے جس میں سچ مقصود نہ ہو اس لئے کہ واہمہ خلّاق ہے۔ زیادہ بجز شوقِ نیاز و اشتیاقِ صلائے عام کے کیا عرض کر سکتا ہوں .....!"

جناب صفدر مرزاپوری :

"مدت کے بعد یہ عریضہ لکھ رہا ہوں۔ آپ کو شاید یاد ہو گا کہ جب "مرقع ادب" کے لئے آپ کے خطوط شائع کرنے کی اجازت چاہی تھی تو آپ نے ارقام فرمایا تھا کہ اگر تم میرے خطوط چھاپو گے تو میں تم کو خط لکھنا چھوڑ دوں گا ...... الخ۔ اس ڈر سے نہ آج تک "مرقع ادب" آپ کی خدمت میں ارسال کیا نہ کوئی عریضہ لکھ سکا۔ پچھلے دنوں صلائے عام کے دیدار نے پھر دبی ہوئی آگ کو بھڑکا دیا۔ بے اختیار جی چاہا کہ "مرقع ادب" جیسا بھی ہے پیشِ خدمت کر دوں اور پھر آپ کی خفگی کے مزے لوں۔ کیوں کہ اس میں آپ کے خطوط بھی ہیں۔ اپنی اس خطا پر نادم و شرمسار ہوں جو مجھ سے اس باب میں سرزد ہو گئی اگر آپ ازراہِ الطافِ کریمانہ اس خطا پر چشم پوشی فرما کر مجھے بخش دیں تو میں ڈرتے ڈرتے اس انشائے لطیف کی روانگی کی جسارت کروں۔ ملک کے نامور اہلِ قلم حضرات نے بہت میری ہمت افزائی کی ہے۔ مگر میں اس سے اس قدر خوش نہیں، جب تک کہ آپ کی زبان و قلم سے اس کی نسبت کچھ فیصلہ نہ ہو۔ آپ کا فیصلہ اُردو لٹریچر کا حتمی فیصلہ ہے جس کی اپیل اللہ میاں کے ہاں

بھی نہیں ہو سکتی ...... ؛

حضرت، گرامی، شاعرِ خاص، حضور نظام دکن :

"یا حضرت! شمس العلما مولوی شبلی نعمانی صاحب کے عالمگیر نامہ کا ریویو آپ نے خوب لکھا۔ سبحان اللہ کیا کہنا — راست باز کبھی حق سے انحراف نہیں کرتے۔ سہ

کسے کو راستی در دل پذیرد — جہاں گیر و جہاں او را نہ گیرد

آپ کا ریویو مجھے بے حد پسند آیا۔ اعتراض بھی صحیح کئے اور اصلاح بھی بہت ٹھیک دی۔

گرامی اُردو سے بے بہرہ تھا۔ صلائے عام نے اُستادِ شفیق کا کام دیا۔ طرزِ تحریر اور انداز ادا سے باخبر ہوتا جاتا ہوں۔

حضرت خان بہادر! میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ کو بہت بڑا اعزاز حاصل ہوا ہے۔ وہ یہ کہ آپ کو اعلیٰ حضرت قیصرِ ہند کے حضور پیش کیا گیا۔ یہ عزت پنجاب میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ دہلی والوں کو ناز کرنا چاہیے کہ میر ناصر علی نہ صرف دہلی کی نازش کا سبب ہیں بلکہ واقعی نازشِ ہند ہیں۔ اس کی مناسبت سے یہ قطعہ نذرِ خدمت والا ہے :

من و گل گشت دل آویز جہانِ دھلی
من و دہلی و دل آویزیٔ شانِ دھلی
شرق تا غرب ہمہ سکہ بنامش زدہ اند
اللہ اللہ چہ زبان است زبانِ دھلی
مژدہ و اکن کہ بود نازش دہلی امروز
میر ناصر علی، آں مرتبہ دانِ دھلی

جناب قاضی عبدالودود صاحب کے خط کا خلاصہ:

فروری کا صلائے عام نظر سے گزرا۔ آپ کی زبان، آپ کے اسلوبِ بیان، نیز آپ کے پاکیزہ خیالات کے متعلق مجھ ہیچمدان کا کچھ لکھنا اگر سوئے ادب نہ ہوتا تو میں ایک ایک فقرے کی داد دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے مضامین تعریف و توصیف سے بے نیاز ہیں اُردو کی عزت آپ کے دم سے قائم ہے برہمن کا کلام شائع فرماکر آپ نے اہل ذوق پر خاص احسان کیا ہے۔ برہمن باوجود ہندو ہونے کے عمدہ شعرائے شاہجہانی میں ہے۔ اللہ، اللہ، ایک زمانہ تھا کہ ہندو فارسی میں اہلِ زبان کی طرح دادِ خوش کلامی دیتے تھے اور آج اُردو سے وہ نفرت ہے کہ اگر بس چلے تو ہندوستان سے اسے خارج کر دیں۔

آپ کی پاکیزہ کوثر سے دُھلی ہوئی زبان آپ کی فلسفیانہ اور شاعرانہ نازک خیالیاں اور آپ کا بے نظیر اسلوبِ بیان، ان سب خوبیوں کو صلائے عام کی ہر دلعزیزی اور قبولِ عام کا ضامن ہونا تھا۔ لیکن دُنیائے اُردو کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ آپ کے ہموطن غالب کو اپنے زمانے میں کس کس کے طعنے نہ سُننے پڑے لیکن آج ساری دنیا اس کے کمالات کی معترف ہے۔ یہی حال آپ کی نثر کا ہے۔ آنے والی نسلیں ہرگز اس سے بے التفاتی نہیں کر سکتیں۔ آپ اپنے کام میں مصروف رہیں اور صلائے عام کو بالاستقلال نکالتے رہیں۔۔۔"

مہدی حسن کا ایک پُرانا پوسٹ کارڈ!۔

"خط کے اڈھے یعنی پوسٹ کارڈ کے لئے معذرت خواہ ہوں کیا بتاؤں آج کل کس عالم میں ہوں، "دلکش وجہ" مفصّل سُنیے گا۔

جب تک ناصر علی دنیا میں ہیں، مکروہاتِ زمانہ سے مجھے کیا واسطہ صلائے عام برابر قلب و روح کو معطّر کرتا رہتا ہے۔"

آپ کا فدائی — مہدی

جناب صفدر مرزا پوری کا تازہ خط:

یہ اپنے چاہنے والوں سے آپ کا برتاؤ

یہاں تک آتی ہے آواز لن ترانی کی

حضرت قبلہ! صفدر غریب کو ترسا کے آپ کیا پائیں گے۔

جب تک گونڈے میں رہا، کبھی کبھی صلائے عام کی زیارت ہو جاتی تھی

اب تو بے رخی کا یہ عالم ہے کہ ع

دیدار می نمائی و پرہیز می کنی

چھ مہینے نہ دیکھے جب گل کو　　حال کیا ہو بتاؤ بلبل کا

اُردو کی عزت و نمود آپ کے دم قدم سے ہے، خاص کر ان آنکھوں میں۔ بلا مبالغہ عرض کروں گا گویا کہ میں دیکھتا ہوں کہ غالبؔ، سرسید، آزادؔ حالیؔ، نذیر احمد اور مہدی کی روحیں اور روحانیتیں آپ کے گرد چکر لگاتی رہتی ہیں۔ آپ کی مبارک ہستی میں ان تمام برگزیدہ ہستیوں کی نمود نمایاں ہے ع

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

دُعا ہے کہ آپ کا سایہ مدتوں تک زبانِ اُردو پر قائم رہے۔۔۔۔۔"

نواب فصاحت جنگ جلیل۔ حیدرآباد سے لکھتے ہیں:

"۔۔۔۔ آپ کا قلم گلفشانی میں شاخِ گُل سے کم نہیں۔ ایسے اچھوتے پھولوں

سے صلائے عام کے صفحات کو دامن گلچیں بنا رہے ہیں کہ دل کو باغ و بہار اور دماغ کو شگفتہ کر دیتے ہیں۔ کس زبان سے تعریف کروں ع

خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست

جناب احسن مارہروی علی گڑھ یونیورسٹی سے لکھتے ہیں:

"......... جب پہلے پہل خدمت عالی میں حاضر ہوا تھا۔ اس وقت سے آپ کے تبحر علمی اور اس کے ساتھ لطیف بذلہ سنجی کا گرویدہ ہوں۔ میں مسئلہ تناسخ کا قائل نہیں ورنہ شاید خیال کرتا کہ حضرت غالب کی روح نے آپ کی ذات میں دوبارہ جنم لیا۔ غالب نے نظم میں وہ فلسفۂ حکمت کوٹ کوٹ کر بھرا ہے جس کی مثال مشرق و مغرب کا کوئی سخنور پیش نہیں کر سکتا۔ صلائے عام کے تازہ پرچے میں آپ نے فلسفۂ یونان و مصر کو اپنے مخصوص شاعرانہ رنگ میں لطیف پیرائے میں پیش کیا ہے اردو ادب ابد تک اس کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

...... میری جرات معاف فرمائیں لیکن میں بتاکید مہدی حسن گورکھپوری کی اس تجویز کی طرف آپ کی نظرِ التفات مبذول کرانا چاہتا ہوں "موجودہ نسل آپ کو نہیں جانتی یا کم سے کم میری طرح نہیں جانتی —— اور یہ آپ ہی کا قصور رہے۔ ہر فعل خود اپنی مکافات ہے۔ جس طرح ہو اپنی مستقل یادگار چھوڑیے۔ اس کی چلتی ہوئی ترکیب یہ ہے کہ جس طرح ہو سکے اپنے رشحاتِ عالیہ کا مجموعہ اپنے اہتمام سے جلد شائع کر دیجئے ——"

مہدی حسن مرحوم کی جو کچھ امیدیں آپ سے وابستہ تھیں وہ ہنوز روزِ اول کی مصداق ہیں خدا کرے میری طرح آپکے دیگر عقیدت مند آپ کی طبیعت کو اس جانب مائل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ ..."

جناب اختر شیرانی ـــــ لاہور سے لکھتے ہیں۔

"فدایت شوم! کیا بتاؤں کتنی بار چاہا کہ عریضہ لکھوں، مگر خدا ہی جانے کیوں نہ لکھ سکا، یوں تو لکھنے کا سبب بھی معلوم نہ تھا اور سچ پوچھئے تو اب بھی معلوم نہیں۔ مگر اتنا یقین ہے کہ اس پر مجھے افسوس نہ تھا اور نہ ہے آپ کی خدمت میں حاضری ایک فخر سے کم نہیں ـــــ ہاں نہ لکھنے کی وجہ افسوس کے قابل تھی اب اور اس سے زیادہ رنج کا باعث ہے بلکہ اب تو بے حجابی کی حالت میں اس کا نام بدقسمتی ہے۔ ع

اب تو ہیں یہ ندامتیں صبر کیا تھا ہائے کیوں

آپ کے ادب العالیہ کے شیدائیوں کی فہرست ہو تو اس میں میرا نام بھی داخل کر لیجئے ـــــ ع

یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

بشرطیکہ زخم کی اہمیت کے لئے زخم رسیدہ کی جواں سالی، ناقابلِ التفات نہ سمجھی جائے۔ کیوں کہ ذوقِ ارادت کی یہ لن ترانیاں، بہ ہر تقدیر نوائے ازلی سے بے نیاز ہیں۔ اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ نیاز نامے کا مقصد اظہارِ عقیدت و احترام کے سوا کچھ نہیں۔ رہا آپ کی انشائے لطیف پر اظہارِ خیال یہ حقیقتاً مجھ سے بہتر اہلِ ذوق کا کام ہے۔ گستاخانہ جرأت کے ساتھ کچھ لکھا جائے تو ع

سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کیلئے

ہاں یہ تمنا ضرور ہے کہ آپ کے جواہرِ افکار جس انتشار کی حالت میں ہیں۔ اس سے انہیں نکال لیجئے تو ہمارے ذوقِ ادب پر بڑا ہی احسان ہوگا، بکھرے ہوئے پھولوں میں جو نظر پڑتی ہیں ان میں

جمعیتِ خاطر کا رنگ نہیں ہوتا ضرورت اس کی ہے کہ نگاہوں کو در در کی ٹھوکریں کھانے کی پریشانی سے بچا کر ایک ہی محوَر پر جمع کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہم میں سے بہتوں کا اس کا ارمان ہے لیکن اس دُنیا میں جس بات کا زیادہ ارمان ہوتا ہے وہی نہیں ہوتی۔ آپ اپنی لازوال تحریروں کی یکجائی کی طرف سے جو بے پروائی برت رہے ہیں اس کی تہہ میں شاید یہی فلسفہ کار فرما ہے ......"

(انتخاب)

عذرِ تقصیر.....

ہمیں بس شاہدِ بے اختیار یہائے مشتاقاں
کہ عُذر از جانبِ یوسف بُود جُرمِ زلیخارا

یہ لاچاری بھی عجیب ہے کہ قصور کسی کا ہو اور عُذر کوئی اور کرے صلائے عام میں غلطیاں تو چھاپے والے کریں اور عُذر مجھے کرنا پڑے۔

دنیا میں تمام غلطیوں کی اصلاح ممکن ہے۔ نہیں ہے تو چھاپے کی غلطیوں کی۔ گناہ کیسا ہی کبیرہ کیوں نہو، مرنے سے پہلے توبہ کیجئے تو ایسا ہے کہ گویا کیا ہی نہیں۔ خلاف اس کے چھاپنے میں جو غلطی ہو گئی وہ قیامت تک نہیں ہٹتی بلکہ وہاں بھی شبہ ہی ہے۔ ہر قصور کا علاج اپنے ہاتھ ہے کہ جب عفوِ تقصیر چاہی پھر کچھ نہیں رہا۔ چھاپنے میں جو رہ گیا وہ کسی کے بس کا نہیں۔ اور خطا تو چُھپ بھی سکتی ہے مگر جو چھپ گئی وہ فاش ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ دیکھتے دیکھتے کہاں سے کہاں پہنچتی ہے۔ اور قصور کر کے تو آدمی مکر بھی سکتا ہے لیکن اس میں تو ہزاروں لاکھوں گواہی دینے کو موجود ہو جاتے ہیں جس نے ایک نظر دیکھ لیا گواہ ہو گیا۔ کراماً کاتبین بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ خطِ تقدیر سے زیادہ لاعلاج ہے۔ ایسی غلطی کا اقرار بھی کیجئے تو کیا؟ بعضے مطبع والوں کی طرح جو ہر کتاب کے ساتھ ایک غلط نامہ چھاپتے ہیں ایسا اقرار عذرِ گناہ بدتر از گناہ سے بھی زیادہ گیا گزرا ہے

یہ دستخطی ثبوت اپنی حماقت کا ہمیشہ کو موجود رہا کہ جو دیکھتا ہے کہتا ہے کہ پہلے ہی کیوں نہ صحت کرلی، جو مُشتے کہ بعد از جنگ یاد آید کی طرح پیچھے سے منہ پیٹنے کو بیٹھتے ہیں۔ اب اس غلط نامے کے سبب صحیح کا پڑھنا بھی مشکل ہوگیا کہ خُدا جانے جسے ہم صحیح سمجھ رہے ہیں کہیں یہ بھی غلط نہ ہو۔ اس الجھن میں عبارت کو وہیں چھوڑا۔ اور کود پھاند کر غلط نامہ دیکھا تو اطمینان ہوا۔ ادھر غلط نامے سے اطمینان ہوا اُدھر وہ پڑھا لکھا سب خیال سے اُتر گیا خاصا ایک سفر ہوگیا۔ اور سفر بھی منزلِ ملکِ عدم کا کہ کسی طرح یاد نہیں آتا کہ کیا ذہن میں تھا؟ لیکن خیر کتاب میں تو بُری بھلی گنجائش اتنی بھی ہے۔ اخبار رسالے میں تو یہ بھی ممکن نہیں کہ پیچھے سے ایک دُم چھلاّ اس غرض سے لگایا کریں کہ جس سے اخبار کا پڑھنا ہی ایک بلائے جان ہو جائے کہ دیکھئے جو چیز یہاں پڑھ رہے ہیں کہیں غلط نامے میں اُلٹی نہ ہو۔ پہلے غلط نامہ حفظ ہو تو پڑھا جائے۔ غرض جیسا کہ میں نے ابھی کہا چھاپے کی غلطیاں غضب کی غلطیاں ہیں۔ ان کا علاج نہ میرے ہاتھ میں ہے نہ آپ کے۔ میرے اختیار میں تو اسی قدر ہے کہ ایک دفعہ لکھ دیں اس کے بعد کاتب جانے اور کارپردازان مطبع لیکن جس طرح ازروئے آدابِ انسان کو سب سے اخلاق و شرافت سے پیش آنا ضرور ہے۔ نہ اس سبب سے کہ سب جن سے سابقہ پڑے اخلاقِ ناصری و اخلاقِ جلالی میں پاس شدہ ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ آدمی اپنے تئیں شریف جانتا ہے۔ اسی طرح یہ لابُد نہیں کہ مطبع میں بھی سارے کارپرداز مضمون نگار کی طرح فاضل اور ذہین ہوں۔ نہ یہ ممکن ہے کہ اوروں کا ذہن بھی صاحبِ مضمون کی طرح اسی تحریر میں لگا ہو۔ اس حال میں ضرور ہے کہ متباین طبائع اپنا اثر دکھائیں۔ اس وقت امید ہے کہ ہمارے ناظرین ترس کھا کے ایسی غلطیوں سے درگزر فرمائیں گے آپ سے تو ہمیں قدرشناسی کی توقع ہے نہ کہ ان سے۔

اس قدر کارکردگی تو اہلِ اہتمام کی بھی ہے کہ بمقابلہ اور اخباروں کے اس پرچے

کی خوشخطی، کاغذ کی عمدگی، چھاپے کی صفائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں ہوتا، صحت تحریر کی غلطیاں ذرا لاچاری میں ہیں۔ ان کے رفع کرنے میں حتی الامکان کوشش کی ہوتی ہے مگر مضامین علمی اور اعلیٰ لٹریچر کی تحریریں ہیں۔ ان کی جس قدر کہیں چاہتا ہوں صحت نہیں ہوتی۔ خدا نے چاہا تو رفتہ رفتہ یہ غلطیاں بھی نہ رہیں گی۔ تب تک دُعا پر آسرا رہا کہ خُدا کرے جو بات میرے ذہن میں ہے وہی پڑھنے والے بھی سمجھیں، آگے یا نصیب یا بخت ! ؎

ہو یا نہ ہو قبول زباں تک تو آ کہیں
پھیلے ہیں ہاتھ کب سے دُعا تیرے واسطے

میر ناصر علی

تذکرہ

از

سیّد انصار ناصری

"....... سوانح عمری مشکوک اور بھدا سا لفظ ہے۔ آج کل کے انگریزی خواں اسے 'بیاگرافی' یعنی حیات کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اساتذہ کی تحریروں میں یہ کہیں دیکھنے میں نہ آیا۔ 'سوانح' جمع ہے 'سانحہ' کی اس پر 'عمری' کے اضافہ نے جس کی سند غالباً ملانوں کی اصطلاح "قضائے عمری" سے لی گئی ہے، اسے اور بھی بے ڈھنگا بنا دیا۔ اگر کسی کی عمر بھر کی نری مصیبتیں ہی بیان کرنی ہوں تو اور بات ہے ورنہ حیات کہہ دینا اچھا ہے۔ ادیبوں اور سخنوروں کے حالات کے لئے تذکرہ، زبان اساتذہ کا نہایت شائستہ اور پاکیزہ لفظ پہلے سے موجود ہے۔ اسے بلا وجہ کیوں ترک کیا جائے اور اس کے ہوتے غلط اور بھدی ترکیبیں کیوں بے ضرورت گھڑی جائیں۔ مجھے حیات، سے تذکرہ، کہنا بہتر معلوم ہوتا ہے......"

(میر ناصر علی)

ولادت

میر ناصر علی دہلی میں ۱۸۴۷ء میں پیدا ہوئے۔

خاندان

آپ ایک ایسے خاندانِ سادات سے تعلّق رکھتے تھے جس میں پشتوں سے علم و فضل کی روایات چلی آتی تھیں۔ شجرۂ نسب حضرت امام جعفر صادق سے ملتا ہے۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ ترمذ میں (جواب سوویت ترکستان میں ہے) خلفائے اسلامیہ کے عہد میں قاضی القضاۃ تھے۔ آپ کے اجداد ہجرت کرکے ہندوستان آگئے اور پہلے پہل سید آباد (معروف بہ داتی پور) پرگنہ سکت پور (قنوج) میں سکونت اختیار کی۔ آپ کے امجاد میں مولوی سید عبدالغفور صاحب جو دینی علوم میں خاص امتیاز رکھتے تھے، شاہی زمانے میں پرگنہ سکت پور کے قاضی تھے۔ ان کے صاحبزادے سیّد حیدر علی صاحب بھی جیّد عالمِ دین تھے۔ ان کے صاحبزادے سیّد فاروق علی صاحب بھی اپنی فضیلت اور درویش منشی کے باعث مقبولِ خلائق تھے۔ سیّد فاروق علی صاحب کے صاحبزادے سید محمد علی صاحب فضائل دینی اور علومِ مشرقی میں یکتائے روزگار مانے جاتے تھے آپ پہلے ناگپور ریذیڈنسی میں میر منشی تھے۔ بعد ازاں نواب صدیق علی خاں وزیر اعظم بھوپال آپ کو اپنے مشیر خاص کی حیثیت سے بھوپال لے آئے۔ سید محمد علی صاحب کے چھوٹے بھائی سید محمد مہدی صاحب کانپور کے مفتی شہر، اور بڑے علم نواز رئیس تھے شیخ امام بخش ناسخ اور رجب علی بیگ سرور کے استاد مرزا خانی عرصۂ دراز تک آپ سے متوسل رہے۔

والد ماجدؒ

سیّد محمد علی صاحب کے صاحب زادے اور میر ناصر علی صاحب کے والد ماجد

سید ناصر الدین محمد ابو المنصور، جلیل القدر عالم دین، مبلغ و مناظر اور باکمال مصنف تھے۔ آپ نہ صرف اسلامی تاریخ فقہ و حدیث کے فاضل اجل تھے بلکہ مذاہب یہود و نصاریٰ کی تاریخ و روایات پر بھی عبور تامہ رکھتے تھے۔ اور قرآن پاک کے علاوہ دیگر کتب الٰہیہ، توریت و زبور و اناجیل کے بھی عالم تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلّط قایم ہو چکا تھا اور عیسائیت کی تبلیغ و ترویج کے لئے خزانوں کے منہ کھول دیے گئے تھے۔ بڑے بڑے فاضل مستشرق اور نامور پادری ولایت سے آتے اور ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ اور مشنری نظام کو مستحکم کر رہے تھے۔ جن چند علمائے اسلام نے اس وقت اس مہم کے خلاف تحریر و تقریر کے ذریعے زبردست جہاد کیا، ان میں سیّد ناصر الدین محمد المنصور پیش پیش رہے۔ آپ نے عیسائی مبلّغین کی کتابوں کے رد میں لاتعداد کتابیں تصنیف کیں۔ اور بے شمار رسالے چھاپ چھاپ کر مفت تقسیم کئے اور عیسائیت کے تبلیغی پرچے، "نور افشاں" کے جواب میں دلّی سے اپنا پرچا "مہر درخشاں" جاری کیا۔ تصنیف و تالیف کے علاوہ آپ عیسائی علما کے ساتھ برسرِ عام مناظرے بھی کرتے تھے، اور انھی کے صحائف سے اُن کے مروّجہ ادیان میں تحریفات کی نشاندہی کرکے دینِ اسلام کی برتری اور افضل الانبیا رسولِ کریم صلعم کے شرفِ عظیم کے ثبوت فراہم کرتے تھے ان مناظروں کا شہرہ دور دور تک پہنچا۔ فتنۂ نصرانیت کے انسداد کے سلسلے میں آپ کی بے لوث خدمات کے اعتراف میں ہندوستان کے مشاہیر شیعہ سُنی علما نے آپ کو "امام المناظرہ" کا لقب دیا۔ مشائخ عرب و مصر و شام اور ایران کے اکابر نے بھی آپ کی فضیلت کو تسلیم کیا اور سلطان عبد الحمید خلیفۂ ترکی نے آپ کے لئے خلعت فاخرہ اور دیگر اعزازات بھیجے۔ آپ کے ایک ہمعصر خان بہادر محمد عبد الشکور عرف رحمان علی صاحب نے اپنی معرکہ آرا کتاب "تذکرۂ علمائے ہند" میں ان الفاظ میں آپ کا مختصر

حال لکھا ہے :-

"مولوی سید ناصر الدین محمد ابو المنصور دہلوی، امام فن مناظرہ اہل کتاب ابن سید محمد علی ابن سید فاروق علی از علمائے اعلام ہندوستان است، در فن مناظرۂ مذہبی، دستگاہی کامل دارد و بر امامتش در فن مناظرہ علمائے وقت متفق اند تصدیق ایں بیان از رسالہ عین الیقین می تواند۔ با قسیسانِ نصاریٰ بارہا در مناظرہ غالب آمدہ ___ وے از اولادِ سید عبد الغفور قاضی سکت پور کہ وطنِ قدیمش قصبہ سید آباد عرف دائی پور مضافِ قنوج است، پدرش سید محمد علی میر منشی ریذیڈنسی ناگپور بود، سید ناصر الدین محمد ابو المنصور اکتساب علوم دینی از والد ماجد و جد امجد خود نمودہ، توراۃ و انجیل با تفسیر عربی و یونانی از علمائے اہل کتاب خواندہ بسیار کتب بجواب علمائے اہل کتاب تالیف فرمودہ، اگاہے ملازمت کسے نکرد، مگر چندے مصاحبت نواب جہانگیر محمد خاں ابن نواب صدیق علی خاں، رئیس بھوپال امتیازی داشت۔ اکنوں عمر شریفش شصت و چہار سال رسیدہ تفسیر قرآن بزبانِ فارسی می نویسد و تفسیر آیۂ کریمہ باحادیث صحیحہ مطابق می نماید و شہادتش از توراۃ و انجیل می آرد، درحقیقت کاریست بسیار اہم۔ اللہم تمہٗ! سید موصوف الالقاب بدختر مولوی مہدی رئیسِ کانپور کہ بعلم و فضل خود شہرہ آفاق بود کدخدا شد، دو فرزند نامی و گرامی دارد، اول سید ناصر علی و دوم سید نصرت علی۔ بالفعل با اہل و عیال در دہلی قیام پذیر است سلمہٗ و اولادہٗ چندے از تصانیف العالیہ :-

۱۔ نوید جاوید ___ بجواب سوالات مختلف عیسائیان۔

۲۔ دراتِ فاروقی ___ در تاریخ بیت المقدس

۳۔ میزان المیزان ———— جواب میزان الحق، از پادری فانڈرز

۴۔ افحام الخصام ———— جواب "تفتیش الاسلام" از پادری راجرس۔

۵۔ عقوبۃ الضالین ———— جواب "ہدایۃ المسلمین" از پادری عماد الدین۔

۶۔ اعزاز قرآن ———— جواب "اعجاز قرآن" از پادری رام چندر۔

۷۔ استیصال ———— جواب "مسیح الاجلال" از پادری رام چندر۔

۸۔ رقیمۃ الوداد ———— جواب "نیاز نامہ" از پادری صفدر علی

۹۔ لحن داؤدی ———— جواب "نغمہ طنبوری" از پادری عماد الدین۔

۱۰۔ حرز جاں ———— جواب "اصلیت قرآن" از پادری آرتھم۔

۱۱۔ مصباح الابرار ———— جواب "مفتاح الاسرار" از پادری فانڈرز۔

۱۲۔ نمونۂ تحریف

۱۳۔ الحق مر

۱۴۔ تثلیث الفیس

۱۵۔ تنقیح البیان ———— جواب تفسیر قرآن (نیچری)

و دیگر رسالہ جات مثل "تریاق" "انکشاف" "محاکمہ" "تادیب" "مجموعہ وعظ"

وغیرہ وغیرہ"

جس تفسیر کا مولوی احسان علی صاحب نے اپنی کتاب میں تذکرہ کیا وہ چند سال بعد شائع ہوئی "تجلیل التنزیل" اس تفسیر کا نام تھا، اس کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مطالب قرآن کی تائید میں توریت و انجیل کی آیات کے حوالے اور معنی بھی دیے گئے تھے، اس لحاظ سے یہ تفسیر نادر اور بے مثال تھی۔ ان صفات خصوصیہ کا تذکرہ مولوی ابو المنصور نے تفسیر کے دیباچے میں اس طرح فرمایا:

"عبدہٗ محمد ابو المنصور۔ ابن جناب سید محمد علی مغفور ابن عالیجناب سید فاروق علی قدس سرہٗ ابن سید حیدر علی مغفور ابن سید عبد الغفور قاضی پرگنہ سکت پور از سادات ترمذ، اولاد امجاد حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام بخدمت ارباب فضل و کمال ملتمس است کہ دریں عرصہ باوجود قلت بضاعت علم و فضل چوں ایں ہیچداں راجرات بتحریر تفسیر قرآن مجید در دل فزود اور التجلیل التنزیل موسوم نمود۔ خدائے قدیر ایں بندۂ حقیر و ایں عام فہم تفسیر را از رحمت و مکرمت بے پایان خود در دنیا و دیں قبول فرماید۔

مضامین ایں تفسیر آنکہ از ہیچ تفسیرے قدیم و جدید استنباط نشدند و روایات وصفی و قیاسی را دراں دخلے نبودہ سہ امر را ملحوظ داشتہ ام۔ اول آنکہ تفسیر ہر آیہ از احادیث صحیحہ بلکہ اکثر از صحیحین برنگاشتہ ام۔ دوم اینکہ آیات کتب الہامیہ سابقہ را در تائید مطالب قرآنی درج ساختہ ام تا اہلیان مذاہب دیگر راہیچ شکے و اعتراضے وار تسلیمش، ہیچگونہ اعراض و اغماضے نہ باشد۔ سوم اینکہ در تفسیر ہر آیہ مسائل ضروریہ متعلقہ اش را از احادیث مبرہن کردہ شد و صحت حالات تواریخی و جغرافیائی و معانی صحیحہ، اسما و لغات و اصل ہر لغت و توافق محاورات تمامی کتابہائے

سماوی، باوجود تباین زبانہائے عربی وعبرانی ویونانی وباوصف بتاعد مدتہائے دراز۔ دراوقاتِ نزول آں کتابہا و دیگر مضامین عدیدہ مُشعرِ معلوماتِ جدیدہ ومطالبِ مفیدہ کہ ہیچ چشمے مثلش ندیدہ از صفحاتِ مخصوصہ ایں تفسیر است۔"

تفسیر بتجیل التنزیل اور دو ایک مختصر رسالوں کے علاوہ مولوی سید ناصر الدین محمد ابو المنصور کی بقیہ تمام تصانیف اُردو میں تھیں، (یہ تمام تصانیف اب نایاب ہیں میرے پاس "نوید جاوید" اور "دولتِ فاروقی" اور چند رسالوں کی ایک ایک دو دو جلدیں ہی ہیں) قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لئے ان نادر کتابوں سے ایک دو اقتباس پیش کئے جاتے ہیں۔

"نوید جاوید" پہلی مرتبہ ۱۲۹۶ھ میں نصرتِ المطابع دہلی سے شائع ہوئی اس کے آغاز میں فاضل مصنف علیہ رحمہ نے اس کتاب کی غرض وغایت بیان فرماتے ہوئے لکھا:

"ہیلیلویا، علیٰ احسانہٖ کہ ہنوز آفتاب مشرق سے طلوع کرنا بندۂ تائب کو رحمتِ الٰہی تک راہ ہے۔ میرے اس کہنے پر صُبح صادق گواہ ہے وہ اپنے بندوں پر ستر درجے ماں باپ سے زیادہ مہربان ہے۔"

(اسیعیا ۴۹ باب ۲)

(لہ ہیلولویا — یعنی خداوند را ستائش کنید، ع.بی محاورے میں بجائے الحمد للہ)

الٰہی ہم کس زبان سے تیرا شکر بجالائیں کہ تیری ادنیٰ بخشش کا بھی ہم شکر ادا نہیں کرسکتے، اگرچہ ہر سر مو زبان ہو اور ہر زبان ہزار داستان ہو سے

ہر صنعت تو بروں ز ادراک — ادنیٰ ادنیٰ بہ مرکز خاک
بے حد ہمہ کبریائی تو — اللہ اللہ خدائی تو

الٰہی ہماری زبان کو ہمارے بشیر و نذیر، خاتم المرسلین، شفیع المذنبین حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعت میں گویا رکھ کہ جو ہماری بخشش و نجات کے لئے ہمیشہ فکر مند ہیں۔ خدا کی رحمت ہو آپؐ پر اور آپؐ کی سب آل اور سارے اصحاب پر کہ جنہوں نے شام و مصر و عراق و فارس و ہند کو نورِ ایمان سے منور کیا اور جہالِ زباں دراز کو زبان تیغ سے خاموشی سکھائی۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

اما بعد عبدہ سید محمد ابو المنصور بن جناب سید محمد علی مغفور کی طرف سے صاحبانِ عقل پر واضح ہو کہ یہ کتاب جس کا نام نوید جاوید ہے اس میں دو لوحیں ہیں۔ اگرچہ علتِ غائی اس کی تالیف سے صرف اتحاف خدمت ارباب عیسائی ہے لیکن بحکم آنکہ اولاً خویش بعدہٗ درویش' لوحِ اول میں کہ وہ کلیسیا جس سے متعلق ہیں' اہالیانِ اسلام کے لئے کچھ ہدیہ برگ سبز بالخیر ہے۔ اور لوحِ ثانی میں ذش کلیسیا جس سے متعلق ہیں اہل کتاب کو سبز باغ کی سیر ہے......"

اور خاتمہ کتاب پر یہ التماس ہے'

"......میں نے یہ کتاب اس لئے نہیں لکھی کہ اس سے مسلمانوں اور عیسائیوں میں سلسلۂ حجت و بحث دراز ہو بلکہ اس لئے کہ جو اس کتاب میں سچ پایا جائے وہ پڑھنے والوں کے فائدے کا باعث ہو—میں نے کسی قدر مذہب اہل ہنود میں درس لیا اور اسی طرح عیسائی علما سے بھی تربیت پائی لیکن جب بھی قدم جما صراطِ مستقیم پر ہی جما یعنی اسلام ہی کی پابندی ثابت قدمی کے ساتھ

دل میں جمتی گئی — "میں اُس گھاس کی مانند تھا جو ہوا کے جھونکوں سے ہر طرف لہرائی مگر اپنی ہی جڑ پر قائم رہی" (دوٹنا)

اے عزیزو، منصف مزاجو! اگر میں یہ بات سچ کہتا ہوں تو مجھ سے ناراض نہ ہونا اور خدا نہ کرے کہ میں کچھ تعصب کو کام میں لاتا ہوں - پہلے میں نے اس میں اپنی ہی روح کی بہتری دیکھ لی تب لوقا (باب ۱۲) کے بموجب اوروں کو بھی یہ نیک صلاح دینے سے باز نہ رہا، ظاہر ہے کہ کوئی اپنی جان سے دشمنی نہیں کرتا۔ پس میں وہی صلاح دیتا ہوں کہ جو اپنی جان کے واسطے بہتر سمجھ چکا ہوں۔ میرا التماس سب سے یہی ہے بلکہ عقل اور انسانیت اور شرافت بھی یہی پکار رہی ہے کہ خدا پر اعتقاد نہایت مضبوط کرو اور خدا کے واسطے اس کے رسول آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ کی شفاعت کو اپنے لئے تیار رکھو کہ دنیا کے لئے عاقبت نہ بگڑنے پاوے -! الٰہی سارے جہان کو ایمان وامان سے بھر دے — آمین، ثم آمین "

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب ۵ ربنا اننا فاغفر لنا ذنوبنا وقنا عذاب النار برحمتک یا ارحم الراحمین۔

"دولتِ فاروقی" پہلی بار ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں نصرت المطابع دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں حضرت عمر فاروق رض کی فتح مصر و بیت المقدس کی تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔ حضرت علیہ الرحمہ نے اس نسبت سے اور اپنے جدِ امجد محمد فاروق علی کے نام نامی کی رعایت سے اس کا نام دولتِ فاروقی رکھا۔ کتاب کے آغاز میں حمد و نعت و منقبت کے بعد مصنف علیہ الرحمہ اسی کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اما بعد عبدہٗ محمد ابو المنصور ابن جناب عظمت مآب قبلۂ صوری و معنوی کعبۂ دینی و دنیوی سید محمد علی صاحب مغفور نے بنظرِ ثواب یہ کتاب بیادگار جناب تقدس مآب، سراپا برکت جناب جدّ امجد برگزیدہ ایزد مثال درویش بے سوال جنید تمثال، شبلی خصال، مسافر پر ور سالکِ باخبر سید فاروق علی صاحب قدس سرہٗ العزیز تالیف کی ہے اور چونکہ مقصود اس تالیف سے بیانِ شوکتِ اسلام بتصرفِ مملکتِ یہودیہ و شام نصرت صمصام خلیفۂ عالی مقام، رکن ثانی القصر الخلافت والاجناب حضرت امیر المومنین عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے ہے اس لئے بہ دو وجہ اس کا نام دولتِ فاروقی رکھا۔

خدائے واحد و حقیقی جل شانہٗ اس تالیف و مؤلف دونوں کو برکتِ ارواح پاک ان دونوں بزرگوں کے دونوں جہان میں قبول فرمائے اور اس کے لکھنے والے اور پڑھنے والوں پر دوچند برکتیں نازل ہوں اور میری غلطیوں اور خطاؤں کا مجھ سے حساب نہ لے۔

در مدح عمرؓ قلم بمیدانِ ورق — افراشت لوائے نصرتِ فاروقی
منصور نوشت سالِ تالیفِ کتاب — آن ابرارِ دولتِ فاروقی

۱۲ھ ۹۲

منصور ثمر است دولتِ فاروقی — انعام خداست دولتِ فاروقی
این است صحیح سالِ عیسوی او — وقفِ فقراست دولتِ فاروقی

۱۸۶۷۵

مولوی ابو المنصور کے دوسرے صاحبزادے مولوی سید نصرت علی صاحب مرحوم بھی جو میر ناصر علی صاحب سے تین برس چھوٹے تھے، علوم مشرقی کے فاضل

تھے۔ آپ شاعر بھی تھے اور قیصرؔ تخلص کرتے تھے، اور اپنے مطبع "نصرت المطابع" سے "نصرت الاخبار"، "ناصر الاسلام"، وغیرہ مختلف جرائد شائع کرتے تھے۔ تاریخ دینیات، اور علوم شرقیہ سے متعلق آپ نے بے شمار تالیفات اسی مطبع سے وقتاً فوقتاً شائع کیں۔ چند تالیفات کے نام یہ ہیں۔

۱۔ رحمتِ کریم ـــ (در ذکرِ اولیائے کرام) ۲۔ ذخیرۂ حسنات (مجموعہ نظمہائے عربی، فارسی و اُردو در مدح سرورِ کونین صلعم) ۳۔ اتالیق۔ در زبان عربی، فارسی ترکی، اردو، انگریزی، ۴۔ قیصریہ ـــ تاریخ سلطنتِ روم ـــ ۵۔ مراۃ السلاطین تواریخ سلاطین ۶؛ جواہر بے بہا۔ رسالہ خوش دلی ـــ ۷۔ سرابِ عالم، اسباب مضامین در ذکر بے ثباتیٔ دنیا ۸ ـــ مفید عام۔ در تعلیم زبانِ عربی و فارسی، انگریزی ترکی۔ ۹ ـــ نصرت اللغات لغتِ فارسی ۱۰۔ انشائے نصرت وغیرہ۔

مولوی نصرت علی بڑے پائے کے خوشنویس بھی تھے بالخصوص خط طغریٰ میں آپ کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ آپ مدت العمر تک درس و تدریس اور تبلیغ واشاعت اسلام میں مصروف رہے، میر ناصر علی صاحب سے چھ ماہ پیشتر رحلت فرمائی۔

۱۸۵۷ء کے مفسدات کے دوران مولوی ابوالمنصور صاحب کو تبلیغ عیسائیت کے سبب انگریز حاکموں کے ہاتھوں بڑی اذیتیں اٹھانی پڑیں۔ مطبع جلا دیا گیا۔ کتب خانہ ضبط کر لیا گیا۔ جب دلّی میں رہنا ناممکن ہو گیا تو آپ اپنے دونوں صاحبزادوں کو لے کر آبائی وطن سید آباد (دالی پور) تشریف لے گئے۔ بعد چندے لکھنؤ آ گئے۔ میر ناصر علی صاحب کا بچپن کا زمانہ لکھنؤ اور مضافاتِ لکھنؤ میں گزرا۔ جب ہنگامے فرو ہو گئے اور امن و امان ہو گیا اور سفر کی سہولتیں بھی پیدا ہو گئیں تو مولوی ابوالمنصور صاحب پھر واپس دلی تشریف لے آئے اور فراش خانے کی کھڑکی کے پاس اپنا مکان نجف منزل تعمیر کرایا اور آخر دم تک اسی میں مقیم رہے۔

تعلیم

میر ناصر علی صاحب نے قرآن پاک اپنے والد ماجد سے پڑھا اور علوم دین میں ابتدائی تعلیم بھی انھی سے حاصل کی۔ ختم قرآن پاک کے بعد مولوی ابوالمنصور صاحب نے میر ناصر علی کو دلّی کے جلیل القدر عالم مولانا نجم الدین صاحب کے سپرد کیا۔ جن کے مکتب میں میر صاحب نے دینیات، فقہ، حدیث وغیرہ درس نظامیہ تک اور عربی، فارسی میں آخری مدارج تک تعلیم پائی۔ مولانا نجم الدین صاحب کے مکتب سے فراغت حاصل کرنے کے بعد آپ نے عربی فارسی کی بعض کتب دلّی کے دیگر مقتدر علما سے پڑھیں۔ برائے چندے دلّی کے ایک نامور بزرگ حضرت حافظ ویراںؔ سے قرأت و تجوید بھی سیکھی اور تصوّف کی چند مستند کتب ختم کیں (حضرت ویرآںؔ کا مزار درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے شمالی دروازے کے قریب واقع تھا۔ مزار پر یہ شعر کندہ تھا ؎

فاتحہ مرقدِ ویرآںؔ پہ بھی پڑھتے جاؤ
اُن سے کہدو جو ہیں اس در سے گزرنے والے

"مقاماتِ حریری" میر صاحب نے نواب علاء الدین احمد خاں سے پڑھی اور گلستاں پڑھانے کے لئے آپ کے والد ماجد آپ کو حضرت غالبؔ کی خدمت میں بھی لے گئے تھے۔ اس کا تذکرہ میر صاحب نے خود ایک مقام پر اس طرح کیا ہے:-

"بلّی ماروں میں نواب امین الدین خاں بہادر اور اُن کے بھائی کی بہت وسیع کوٹھیاں تھیں ان کوٹھیوں سے ریاست لوہارو کا قدیم سے بڑا نام تھا۔ ایک کوٹھی کے صحن میں ہاتھی بندھا رہتا تھا۔ اسی میں نواب علاء الدین خاں نے شطرنج کلب کی طرح ڈالی تھی۔ جس میں اکثر حکام انگریزی شریک ہوتے تھے۔ نواب علاء الدین خاں کو عربی فارسی میں کمال حاصل تھا۔ میں نے اپنے بچپن میں،

"مقاماتِ حریری" آپ سے اسی کوٹھی میں پڑھی۔ کوٹھیوں کے درمیان میں موڑ پر مرزا نوشہ (حضرتِ غالبؔ) کا کوٹھا تھا۔ میرے والد ماجد ایک دفعہ مجھے حضرت کی خدمت میں بھی لے گئے اور عرض کی "اس لڑکے کو گلستان پڑھا دیا کیجئے۔" آپ نے فرمایا "گلستان پڑھانی تو مشکل ہے، کہو تو دوسری گلستان لکھ دوں۔" حضرت کو ان دنوں ضعف بہت تھا۔ چارپائی پر لیٹے رہتے تھے، بہت کم اٹھ کر بیٹھتے تھے۔ والد ماجد نے اثنائے گفتگو میں کہا کہ آپ کے دیوان میں اکثر شعر چھپنے سے رہ گئے چنانچہ ایک شعر والد ماجد نے آپ کو سُنایا، وہ شعر تو مجھے اب یاد نہیں مگر حضرت نے اس کی شرح جو بیان کی، وہ کچھ کچھ یاد ہے۔ فرمانے لگے کہ بھئی یہ شعر ایک کالی عورت کی تعریف میں ہے کہ سانولی رنگت جو اس کی ہے، یہ اس کے سر کے بالوں کا عکس ہے کہ بدن کی صفائی آئینے کی طرح اس درجے کی ہے کہ بالوں کے عکس سے سارا جسم سانولا دکھائی دیتا ہے۔"

مولوی ابوالمنصور صاحب کے پاس اکثر انگریز عالم اور پادری وغیرہ بحث و تکرار کیلئے آیا کرتے تھے انکی باتیں سُن سنکر میر ناصر علی کو انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا۔ نہ معلوم کسطرح اور کس سے انہوں نے خاندانی بزرگوں سے چھپ کر انگریزی پڑھنی شروع کردی یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی پڑھنا کفر کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ لیکن میر صاحب نے چوری چھپے اپنے اس شوق کو جاری رکھا۔ بعدازاں مولوی نجم الدین صاحب اور دیگر مربیّوں کی سفارش پر بالآخر انہیں دہلی کالج میں داخل کر دیا گیا۔ ذہین اور محنتی تو تھے ہی ۱۸۶۷ء میں انٹرنس کے امتحان میں اوّل آئے اور سر لیپل گریفن سے طلائی تمغہ حاصل کیا۔ اپنی اس کامیابی کا اکثر بڑے لطف کے ساتھ ذکر فرمایا کرتے تھے۔

اسی سال میر احمد علی رئیس دہلی کی بڑی صاحبزادی سے آپ کی شادی ہو گئی

اُنہی کی دوسری صاحبزادی سیّد نصرت علی صاحب سے منسوب ہوئیں۔

سلسلۂ ملازمت

انٹرنس پاس کرتے ہی آپ کو محکمۂ تعلیم صوبجات متحدہ کی طرف سے نان پارہ ضلع بہرائچ میں گورنمنٹ سکول کے ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے نامزد کیا گیا جہاں میر صاحب ایک سال تک رہے۔

۱۸۶۸ء میں آپ کی خدمات حکومت ہند کے محکمۂ آبکاری (محکمۂ نمک شمالی ہند) میں منتقل ہوگئیں۔ جہاں آپ ۱۹۰۸ء تک یعنی پورے چالیس سال تک مختلف عہدوں پر فائز اور مختلف مقامات پر تعینات رہے۔ آپ کی اعلیٰ خدمات کے اعتراف میں آپ کو ۱۸۹۷ء میں "خان بہادر" کا خطاب اور دیگر اعزازات عطا ہوئے۔ محکمۂ نمک میں اپنی ملازمت کے آخری دور میں آپ فرخ نگر (ضلع گوڑگاؤں) کے سالٹ ورکس کے افسرِ اعلیٰ کی حیثیت سے مستقل ۲۰ برس تک تعینات رہے اور یہیں سے پنشن پائی۔ فرخ نگر میں اپنے فرائض منصبی کے علاوہ آپ ۱۶ برس تک فرخ نگر میونسپل کمیٹی کے نائب صدر رہے ان خدمات کے صلے میں آپ کو سرکار کی طرف سے کئی انعامات و اعزازات عطا ہوئے۔

مجسٹریٹ دہلی

محکمۂ نمک سے پنشن حاصل کرنے کے بعد آپ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۳ء تک دہلی میں مجسٹریٹ رہے۔

۱۹۱۲ء میں جب دلّی میں شاہنشاہ جارج پنجم کا دربار منعقد ہوا تو آپ کو ملک معظم کی خدمت میں پیش کئے جانے کی عزت حاصل ہوئی۔ قلعہ معلّی میں ملک معظم کے معائنے کے لئے نوادر کا جو عجائب خانہ قائم کیا گیا آپ اس کے

ناظم ونگراں بھی مقرر ہوئے۔

دیوان ریاست پاٹودی

ابھی مجسٹریٹی کا زمانہ ختم نہیں ہوا تھا کہ میر ناصر علی کو ریاست پاٹودی کا دیوان (چیف منسٹر) مقرر کیا گیا جہاں آپ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۲ء تک یعنی ہز ہائی نس نواب مظفر علی خاں صاحب کے زمانے سے لے کر ہز ہائی نس نواب افتخار علی خان کے زمانۂ طفولیت تک ریاست کے دیوان رہے۔

اس خدمت سے سبکدوش ہونے پر اپنی عزلت گزینی کا ذکر کرتے ہوئے ایک مقام پر لکھتے ہیں!

......" میں نے ریاست کی ملازمت سے عزلت گزینی اختیار کی تو بیگم صاحبہ ریاست پاٹودی نے ازراہ کرم بطورِ تقریبِ رخصت مجھے یاد فرمایا اور جو جو مراسم اس تقریب کے ہوتے ہیں، وہ سب ادا ہوئے، اس وقت جیساکہ تقاضائے وضع شرافت واخلاق ہے، لوگوں کو میری اور مجھے اُن کی جدائی شاق معلوم ہوئی۔ یہ چند الفاظ اس تقریب کی دلی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں ـــــ کہتے ہیں کہ چین میں کسی بادشاہ کی تخت نشینی کی تقریب میں ایک دائم الحبس، جس کی ساری عمر قید میں گزری تھی، رہا ہوا تو وہ قیدی تمام شہر میں پھر پھرا کر پھر قید خانے کے دروازے پر آن پڑا، اور پاسبانوں سے منت کی کہ مجھے پھر قید میں لے لو، لوگوں کو تعجب ہوا کہ بات کیا ہے جو یہ پھر قید ہونا چاہتا ہے۔ اس سے پوچھا تو بولا کہ میری ساری عمر اسی زندان میں گزری، در و دیوارِ زنداں سے اس قدر آشنا ہو گیا ہوں کہ قید خانے کے باہر بیگانہ معلوم ہوتا ہوں۔ سوائے یہاں کے کہیں دل نہیں لگتا....

کچھ ایسا ہی حال اس وقت میرا ہے چالیس سال تک سرکار انگریزی اور

دس سال کے قریب ریاست پاٹودی کی ملازمت کی۔ یہ ملازمت خدمت کے مرتبے کو پہنچ گئی، ملازمت سے زیادہ خدمت کا حق ہے۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ ریاست کے فرمانروا کے خاندان سے مجھے خاص تعلق رہا۔ اس خاندان کی تین پشتوں کی میں نے خدمت کی، گو موجودہ رئیس کی نابالغی کا زمانہ ہے، مگر رئیس کی والدہ ماجدہ حضور بیگم صاحبہ پاٹودی کے الطاف و کرم سے میرا آخری زمانۂ ملازمت نہایت خوش اسلوبی سے گزرا۔ میرے اس وقت کے جدا ہونے سے گو ملازمت میں فرق آیا، مگر میری طرف سے رئیس و ریاست کی خدمت گزاری میں ہرگز فرق نہ آئیگا۔ میں اس خاندان کی خدمت کے لئے جس حال میں بھی ہوں، ہر وقت حاضر رہوں گا۔ اور اس ریاست کو جہاں میری عمر کا آخری حصہ بسر ہوا ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ پروردگارِ عالم رئیس و ریاست کو سلامت رکھے ملازم و خادم آتے جاتے رہیں گے۔ باغ سلامت رہے۔ بہار آتی ہی رہیگی۔

شمع ہر صبح یہ کہتی ہے کہ پھر آئے گی شام
رکھے اللہ سلامت مرے پروانے کو

زیادہ کیا عرض کروں۔ ضعیفی رعایت ہی چاہتی ہے ؎

معاف کی ہے خدا نے ضعیف پر تکلیف
ستم کیا اگر اب دست و پا سے کام لیا۔"

[55] سلسلۂ ملازمت جو ۱۸۶۷ء میں شروع ہوا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں یعنی پچپن برس بعد ختم ہوا۔ اس وقت میر ناصر علی کی عمر چھتر[75] سال کے قریب تھی۔ یہ ذکر رہ گیا کہ پاٹودی کی ملازمت کے دوران یعنی ۱۹۱۵ء میں آپ کی شریکِ حیات کا انتقال

ہو چکا تھا۔

اولاد

میر صاحب مرحوم کثیر الاولاد تھے۔ آپ کے پانچ بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں۔ جن میں سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی چھٹپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ باقی صاحبزادوں کے نام یہ ہیں۔ (مولوی ابو المنصور صاحب نے خاندانی ناموں کے لئے مادہ "نصر" تجویز فرمایا تھا، سب مردوں کے نام اسی مادّے سے مشتق تھے) سید نصیر علی صاحب سید منتصر علی صاحب۔ سید انتصار علی صاحب (میرے والد ماجد قبلہ) اور سید تنصیر علی صاحب۔ ان میں سب سے چھوٹے صاحبزادے سید تنصیر علی صاحب انجینئرنگ کا امتحان پاس کرتے ہی، عین عنفوانِ شباب میں رحلت فرما گئے۔ سید تنصیر علی صاحب جو سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد کسی فرم میں ملازم تھے میر صاحب کے پنشن لینے کے بعد لاولد فوت ہوئے۔ سیّد نصیر علی صاحب پہلے پرمٹ کے محکمے میں ملازم تھے۔ بعد ازاں ریاست اوچھ میں ملازم ہوئے۔ یہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد گھر پر ہی رہتے تھے۔ اور میر صاحب کی جائداد کا انتظام کرتے تھے آپ میر صاحب کے انتقال کے پانچ سال بعد فوت ہوئے۔ میر صاحب کے سب سے چہیتے بیٹے سیّد انتصار علی صاحب محکمہ نمک میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تھے چھتیس ۳۶ سال کی ملازمت کے بعد پنشن پائی۔ پھر ریاست ٹوڈی فتحپور کے کلکٹر رہے اور اس کے بعد ریاست پہاسو کے مینیجر رہے۔

صاحبزادیوں میں سے میر صاحب کے انتقال کے وقت تین حیات تھیں اور دلّی کے معزز گھرانوں میں منسوب تھیں۔ اب صرف سب سے چھوٹی صاحبزادی حیات ہیں۔

پاٹوڈی کی ملازمت سے فراغت پانے کے بعد میر صاحب دلی میں اپنے مکان "حویلی میر ناصر علی" میں جو آپ نے اپنے والد ماجد کے مکان نجف منزل سے چند قدم کے فاصلے پر محلّہ فراشِ خانے میں بنوایا تھا مستقل طور پر عزلت گزیں ہو گئے اور دلجمعی کے ساتھ اپنے محبوب مشاغل کتب بینی، صحیفہ نگاری، اور نوادر جمع کرنے میں تادمِ آخر مشغول رہے۔ اپنے ذاتی پریس "مطبع ناصری" کو پھر سے درست کرایا اس سے پہلے صلائے عام آپ کے بھتیجے سیّد مستنصر علی کے چھاپے خانے "مستنصر پریس" میں چھپتا تھا جو گویا ان کے والد ماجد اور میر ناصر علی کے برادرِ عزیز سید نصرت علی صاحب کے مطبع "نصرت المطابع" کا جانشین تھا۔ انہی دنوں آپ نے اپنا کتب خانہ اور عجائب خانہ از سرِ نو آراستہ کیا جس کی آپ کو عرصے سے تمنا تھی۔ حویلی کی نچلی منزل کا شمالی حصّہ جو دیوان خانہ یا مردانہ کہلاتا تھا اس کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ پرانی قلمی کتابیں، قلمی تصاویر، قطعات و مخطوطات، فرامینِ شاہی اور خوشنویسی کی وصلیاں وغیرہ اور دیگر نوادرات جمع کرنے کا آپ کو ہمیشہ سے شوق تھا۔ آمدنی کا کثیر حصّہ اسی شوق کی نذر ہوتا تھا۔ عجائب خانہ جو ان کی سب سے بڑی دولت تھی، اکثر مقفل ہی رہتا تھا۔ سوائے میرے والد ماجد قبلہ کے گھر کے کسی اور فرد کو اس میں جانے کی بھی اجازت نہ تھی یہی حال کتب خانے کا تھا لیکن کتابیں شیشے کی کھلی الماریوں میں رکھی رہتی تھیں۔ البتہ مخطوطات اور نادر کتب بکسوں میں بند رہتی تھیں عربی، فارسی کی ہزارہا قلمی کتابیں اساتذہ کے قلمی دیوان، بادشاہوں اور مشاہیر کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن مجید اور دیگر نایاب و بیش قیمت نسخوں کے علاوہ اردو اور انگریزی کی ہزاروں کتابیں بالخصوص تاریخ و سیر، فلسفہ و ادب فارسی اور اردو شعرا کے دواوین اور مثنویاں اس کتب خانے کی زینت تھیں۔ نایاب و نادر کتب کے بیش بہا ذخیرے کے اعتبار سے

آپ کا کتب خانہ دلی کے نجی کتب خانوں میں سب سے اعلیٰ سمجھا جاتا تھا۔ پرانے مخطوطات اور قلمی تصاویر کے حسن و قبح پرکھنے میں آپ کی نظر عمیق اور ذوق اعلیٰ اور نہایت پاکیزہ تھا اور اس فن کی وسیع معلومات حاصل تھیں۔ اکثر مشاہیر آپ سے پرانے مخطوطات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے تشریف لاتے تھے۔ جن نامور ہستیوں کو میں نے اپنے لڑکپن میں آتے جاتے دیکھا، اُن میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ حکیم اجمل خاں صاحب، لالہ سری رام صاحب، مؤلف خمخانۂ جاوید، پنڈت امرناتھ ساحر، نواب صاحب لوہارو، مولوی عنایت اللہ۔ سرج پی ٹامسن۔ (چیف کمشنر دہلی) شمس العلما مولوی عبدالرحمٰن صاحب پروفیسر سینٹ اسٹیفن کالج دہلی، پروفیسر سپیرز، پروفیسر ڈیون پورٹ۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی خاں صاحب محمد علی خاں، مولوی بشیر الدین احمد (بھائی شاہد احمد دہلوی کے والد ماجد) جناب مہر محمد خاں صاحب شہاب مالیر کوٹلوی نے اپنے ایک مضمون میں اس کتب خانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"...... مجھے اکثر آپ کے دولت خانے پر حاضری کی عزت حاصل ہوئی اور اس یادگارِ زمانہ بزرگ کی بے تکلف محبت اور نادرہ روزگار عجائب خانے کی زیارت کی بھی سعادت حاصل ہوئی۔ عجائب خانہ اکثر بند ہی رہتا تھا۔ آپ نے بڑے اہتمام سے اسے کھلوایا، مجھے اپنے ہمراہ لیا۔ ہر چیز خود دکھاتے اور اس کی فنی خصوصیات کے بارے میں دیر تک تقریر فرماتے رہے۔ ان کی معلومات کو دیکھ کر میں ششدر رہ گیا کہ بحر بیکراں بھی استعارہ ہی ہے۔ تسلیم کرنا پڑا کہ ممدوح صرف الفاظ و معانی کے ہی بادشاہ نہیں بلکہ نوادر و عجائب کی پرکھ اور اس فن کی معلومات میں بھی آپ اپنے عصر کے یگانہ اور فرزانہ تھے۔ اسی طرح کتابوں کا حال تھا۔ تاریخ اسلام

علم الکلام، فلسفہ اُن کے محبوب مضامین تھے جن کی ان گنت پرانی اور نئی سے نئی کتابیں آپ کے کتب خانے کی زینت تھیں۔ ساتھ ہی شعر و سخن کی سینکڑوں جلدیں، مثنویاں تو ہزاروں کی تعداد میں ہوں گی۔ کوئی کتاب ایسی نہ تھی جس پر حاشیے پر سُرخ پنسل کے نشانات یا کچھ نوٹ نہ ہوں جس پر ان کی ژرف نگاہی اور وسعتِ مطالعہ کا ثبوت ملتا ہے۔ میں ان کو دیکھتا تھا اور ان ہزارہا کتابوں کو، اور حیرت زدہ ہو جاتا تھا جس احتیاط کے ساتھ مجھے اس عجائب خانے یا پری خانے کی سیر کرائی گئی اس سے معلوم ہوا کہ آپ کو یہ ذخیرہ بے حد عزیز تھا۔ اور اس معاملے میں آپ کو اپنے مہمانوں پر بھی غیر معمولی اعتماد نہ ہوتا تھا . . . . "

تاریخ و تحقیق سے گہری دلچسپی کے باعث میر ناصر علی پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی کے رُکن رکین بنائے گئے تھے، اس کے علاوہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے ممبر بھی تھے اور پنجاب یونیورسٹی کی الیگزینڈر فیلوشپ بھی آپ کو دی گئی تھی۔ یہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ۱۹۱۲ء میں جب قیصر ہند جارج پنجم کے دربار کے موقع پر قلعہ معلیٰ میں نوادر کا عظیم الشان عجائب خانہ قائم کیا گیا تو میر ناصر علی اس کے نگراں اور مہتمم اعلیٰ مقرر ہوئے تھے۔

تصنیف و تالیف

میر ناصر علی کو اوائل عمر ہی سے انشا پردازی کا شوق تھا۔ اس کا ذکر آپ کے کئی مضامین میں پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ کی پہلی تصنیف کیا تھی، صلائے عام کے مضامین میں ایک جگہ اس کا ذکر آتا ہے کہ بعض تاریخی مضامین کی بنا پر آپ کو ۱۸۷۳ء میں پنجاب یونیورسٹی کی الیگزینڈر فیلوشپ بھی ملی تھی اسی زمانے کی یادگار ایک مختصر سی کتاب یا رسالہ "مجربات کیمیا"

(کیمسٹری کی ابتدائی کتاب) ہے۔ جس پر سنِ اشاعت ۱۸۷۶ء لکھا ہے۔ یہ آگرے کے کسی مطبع میں چھپی تھی۔ اس پر حکومت صوبجات متحدہ کی طرف سے انعام بھی دیا گیا تھا یہ کتاب تمام اسکولوں کے لئے نصاب میں شامل کی گئی تھی۔ (یہ رسالہ نایاب ہے، میرے پاس صرف ایک ہی نسخہ ہے) ہر چند میر صاحب کے خصوصی رنگِ انشا سے اسے خاص مناسبت نہیں لیکن میر صاحب کے اس شوق کی اچھی مثال ہے کہ اردو میں ہر قسم کے مضامین پر کتابیں اور مضامین شائع ہونے چاہئیں، اردو زبان میں سائنس کی چند اوّلین کتابوں میں اس کا بھی شمار ہونا چاہیے۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے اس کے دیباچے سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:-

"اس کتاب کا نام سن کر لوگ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ لو اب تو چاندی سونا بنانا آجائے گا — صاحبو! یہ وہ کیمیا نہیں ہے جسے مہوس ڈھونڈتے پھرتے ہیں، خود خراب ہو چکے تو دنیا کو ٹھگتے پھرتے ہیں۔ اس کی کچھ اصل نہیں، محض دھوکا ہے، لیکن یہ فن جسے انگریزی میں کیمسٹری کہتے ہیں، نہایت شریف ہے جس سے تمام دنیا کی چیزوں کی ماہیت اور مرکبات عالم کے اجزا معلوم ہوتے ہیں۔ انگریزی میں اس فن کی بہت کتابیں ہیں لیکن اردو میں ایک دو جواب تک شائع ہوئیں ان میں کئی نقص ہیں۔ اوّل تو ایسی اصطلاحوں اور مشکل مسئلوں سے بھری ہوئی ہیں کہ نیا آدمی سمجھنا کیسا، گھبرا جاتا ہے دوسرے بول چال ایسی نہیں جسے ہر شخص سمجھ لے اور تجربہ بھی کر سکے۔ اس مختصر رسالے میں محض ضروری اور مجرّب باتیں اس فن کی بیان کئے دیتا ہوں پھر ایسی بول چال میں کہ اس فن سے محض بیگانہ بھی سمجھ سکے اور چاہے تو آزما بھی لے، حتی الامکان غیر زبان کے لفظوں سے میں نے احتراز کیا ہے۔ اور غیر مانوس

باتوں کو نہیں آنے دیا ہے لیکن پھر بھی ٹھیٹ اُردو میں یہ گنجائش کہاں کہ ایک نئے فن کے بیان میں یہ رعایت تمام وکمال نبھ سکے۔ لاچار بعض اجزا کے نام جن کی اُردو نہیں ہو سکی بدستور رہنے دی ہے۔ یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ نام انگریزی میں بھی بدستور غیر زبانوں سے چلے آتے ہیں اور جن کی اُردو مجھ سے نہ ہو سکی اس کی شاید کسی دوسرے سے بھی ممکن نہ ہوگی، یہ میں بے مبالغہ اور بے اظہار نمود کہتا ہوں علاوہ اس کے ہماری زبان بھی مجموعہ اور زبانوں کا ہے، یورپ کے دو چار لفظ رفتہ رفتہ گھل مل کر اس میں آجائیں تو بڑا گناہ نہیں۔ یہاں پر کوئی یہ کہے کہ ان کو عربی یا سنسکرت میں ادا کیا جاتا۔ بجا لیکن پھر بھی باوجود اس محنت کے یہ اصطلاحیں بیگانہ اور غیر مانوس ہی رہتیں خواہ مخواہ ٹیڑھے میڑھے لفظ تراشنے پڑتے۔ اس سے تو اصل زبان کے رہنے دیے تو اچھا کیا —— جہاں انگریزی اصطلاحیں اُردو املا میں لکھی ہیں ان کے اوپر وہی انگریزی حرفوں میں بھی لکھ دی ہیں۔ اُردو میں انگریزی لفظوں کا تلفظ ذرا درست نہیں آتا۔ جنہیں ذرا بھی شُدبُد انگریزی کی ہو گی صحتِ الفاظ سے مطمئن ہو جائیں گے۔ بعض بعض مثالوں اور تجربوں کی شکلیں بھی دیدی گئی ہیں تاکہ پڑھنے والے جلدی سمجھ جائیں۔"

اس مختصر رسالے میں محض کیمیا ہی کا بیان نہیں آخر میں فلاحت وزراعت کے لیے بہت کچھ مفید مضمون لکھ دیے ہیں سرکار کو زراعت کیطرف ان دنوں بہت توجہ ہے اور زراعت کیلئے، مختلف زمینوں کی قسموں کی شناخت اور ان علم شرط ہے"

اس رسالے کے علاوہ میر صاحب نے اور کوئی مستقل کتاب تصنیف نہیں کی، البتہ ۱۹۱۲ء میں نظم جلوسیہ کے نام سے قصائد کا ایک مجموعہ تالیف کیا تھا جو آپ نے مشاہیر شعرا سے دلّی میں شہنشاہ جارج پنجم کے دربار کے موقع

پر بفرمائش خاص لکھوائے تھے۔ یہ بڑی تقطیع پر نہایت اہتمام سے چھپی تھی اور مفت ہی تقسیم کر دی گئی۔

میر ناصر علی کو مدت العمر تک صحیفہ نگاری ہی کا شوق رہا شروع میں "آگرہ اخبار" "دبدبۂ آصفی" وغیرہ جریدوں میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ لہٰذا بعد ازاں خود مختلف ادبی رسائل شائع کرتے رہے۔ یہ رسالے کس درجہ وقیع اور معیاری تھے اور ان کے ذریعے انشا پردازی کا جو شعور و سلیقہ اُردو صحافت میں اس وقت سے رائج ہوا یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ اس کی تفصیل بیان کی جاسکے۔ فی الحال ہر رسالے کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے اور انہی پرچوں سے ضروری اقتباسات درج کئے جاتے ہیں؛

رسائل

تیرھویں صدی سب سے پہلا رسالہ تیرھویں صدی تھا جو آگرہ اخبار کے مالک خواجہ محمد یوسف صاحب کے زیر اہتمام "آگرہ اخبار" آگرہ سے ۱۸۷۶ء میں شائع ہونا شروع ہوا۔ اس رسالے میں اسلامیات کے مختلف موضوعات پر تحقیقی مضامین شائع ہوتے تھے اور بیشتر "تہذیب الاخلاق" کے نیچری عقائد کے مضامین پر تنقید کی جاتی تھی۔ خالص ادبی انشایئے بھی بکثرت شامل ہوتے تھے۔ "تیرھویں صدی" کے مقاصد کی اس طرح وضاحت کی گئی تھی۔

> "اس پرچے میں الٰہیات قدیم کی تحقیقات لی جائے گی۔ یعنی آج کل کے ڈھنگ پر علم کلام اور دینیات کی داد دی جائے گی۔ جن باتوں میں کہ زمانے کو اس وقت نمود حاصل ہے ان کی حقیقت لکھی جائے گی اور تحقیقات نیچر و غیر نیچر کی کیفیت بیان کی جائے گی۔ ساتھ ہی اس پرچے کو انشا کا اعلیٰ نمونہ اور صرفِ اوقات کا عمدہ ذریعہ بنایا جائے گا۔۔۔

غرض تحقیق وتحریر کی تکمیل میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا جائے گا۔ جس سے یہ پرچہ

ہم دارُوئے مستاں | ہم ہوشِ دہِ خرد پرستاں
یاقوت بہ مغزِ جان پاکاں | الماس بہ چشم خوابناکاں

بنا رہے ۔ اہلِ کمال کے لئے یہ پرچہ اُن کے اظہارِ لیاقت کا عمدہ ذریعہ ہے۔ اس میں پرانی اور نئی طرز سے لکھنے والے، علمی اور مذہبی تحقیق کرنے والے، اپنے اپنے کمال اچھی طرح دکھا سکتے ہیں۔"

اسی طرز پر پرچے کی دوسری جلد کے پہلے نمبر کے اداریے میں میر ناصر علی لکھتے ہیں:

در مشکل است کارِ دل از عشق وخوش دلم
شاید رسد بخاطرِ مشکل پسند تو

اس میں شک نہیں کہ "تہذیب الاخلاق" کی بدولت ہمیں وہ عمدہ موقع طبع آزمائی کا ملا ہے کہ شاید پھر نہ ملے عقل ونقل کے وہ معرکہ انگیز مسئلے چھڑے ہیں کہ کبھی گو۔ لڈن ایج یعنی غایت درجہ اقبالِ اسلام کے زمانے میں چھڑے ہوں تو چھڑے ہوں۔ مگر پھر کسی نے انہیں نہ چھوا۔ انھیں جگایا تو سید احمد خاں نے جگایا۔ لیکن اس بری طرح کہ اپنے بیگانے ہو گئے۔ ملے ملائے بچھڑ گئے۔ اس لئے ارادہ ہے کہ ان کے جواب میں چوٹی کے مسئلے اور عقائد کے مشکل معاملے اس پرچے میں ان کی طرز لیکن اپنی وضع پر طے کئے جائیں۔ اب تک تو تمہیدی جھگڑوں سے فرصت نہ ملی۔ سو اس کی انھیں بھی ادھر کوئی توجہ نہیں ہوئی۔ مگر اب کے پرچے سے مذہب کے اہم مسئلوں میں دادِ سخن دی جائیگی مثلاً تقدیر، جبر واختیار، روح، جزا وسزا وغیرہ وغیرہ کے اسلامی عقائد

کے ثبوت میں محنت کی جائے گی ؂

حزیں از خامہ ات ریزد سروش وادیٔ ایمن

تجلی طور می سازد نے آتش نوا ہارا

پرچے کی قیمت کے بارے میں "اطلاع" کے عنوان سے یہ نوٹ بھی شروع کے پرچوں میں شائع ہوتا تھا۔

"سخن دوست گراں بود فراواں کردم

جہاں بہ بیعانہ بیارید کہ ارزاں کردم

یہ پرچہ محض قومی خیر خواہی کا نتیجہ ہے، جس سے مقصود اپنی زبان کی ترقی اور ابنائے زماں کی ہمدردی ہے۔ جس سے وسعتِ سخن کے ساتھ وسعتِ خیال مدِ نظر ہے، ترقی و فلاح سوسائٹی و لٹریچر ہے۔ اور چونکہ ابھی تک اس ملک میں ایسی باتوں کی طرف توجہ نہیں۔ اس پرچے کا مدار خاص لوگوں کے بذل و کرم پر رہا۔ عام سے اس کی قدر دانی کی امید نہیں، تھوڑے ہی ہیں جو اس کی داد دے سکیں گے۔ لاچار ہمیں اس قلت کی کسر اپنے تھوڑے قدر دانوں سے یوں نکالنی پڑی کہ دس روپے سال قیمت رکھی۔ ان کو اتنے میں بھی سستا ہے، عوام سے صرف پانچ ہی روپے رکھے تاکہ ان کو ادھر توجہ تو ہو، اس میں ڈاک کا محصول دونوں سے نہیں ؂

اسرافِ معانیم نظر کن زیں گنج بہ مفلساں خبر کن

پرچے کے نام کے بارے میں میر ناصر علی صاحب نے ایک مقام پر یوں گہر افشانی فرمائی:

"تیرھویں صدی" جو لوگ ابھی تک اس نام سے چونکتے ہیں پہلے

بالزیکؔ نامی ایک بڑے خوش بیان سے "نام" کی تعریف میں سُن لیں، جو کہتا ہے کہ:

"نام وہ ہے جو اپنے مالک سے اس طرح چمٹا رہے جس طرح دانت مسوڑوں سے، بال جڑوں سے، ناخن گوشت سے۔ وہ نام ہی کیا، جو اپنے آقا کی شکل وصورت کا نقشہ نہ ہو۔ اس کے خیال وگمان کا چربہ نہ ہو۔ نام لیتے ہی اس کے اقبال وحوصلہ، اس کے غم وغصہ کی تصویر کھنچ جائے۔ سُنتے ہی اس کے ارمان وآرزوئیں، لب ولہجہ وگفتگو ذہن میں آجائیں۔ ہزار خونِ جگر کھا کر میں نے دریافت کیا ہے کہ نام کا رکھنا فرہادؔ کی کوہکنی کے برابر ہے۔ نام ایک زمانے کا کام ہے۔ ہزار گردشوں اور لاکھ انقلابوں کا نام، نام ہے۔"

یہی سبب ہے کہ جو باوجود ہزار اعتراضوں کے اس پرچے کا نام ہم نے "تیرھویں صدی" رکھا کہ لینے میں آسانی ہے، اور ناموروں کے نام کی طرح سب کو برزبان ہے۔ اس کی شہرت ہماری ناموری کا دیباچہ اور اس کا ذکرِ خیر اس کے مشن (پیغام) کا خلاصہ ہے کہ ہمارا گیا گذرا زمانہ بھی یادگارِ روزگار رہے، دن ڈھلے ہی ساری کیفیت کا دارومدار ہے سے

چوں شوم پیر ہمہ عیشِ شباب است مرا
چوں شود خم قدِ من جامِ شراب است مرا

اس لئے ارادہ ہے کہ یہ پرچہ ایک زمانے کا خلاصہ بنے، جس کی بدولت اس صدی کا دم واپسیں، دمِ عیسٰی سے بڑھا ہے ساتھ ہی اس زمانے کا نقشہ

اس طرح کھچے کہ اسم و مسمیٰ ایک ہو جائے۔ ہمارا زمانہ اور ہماری سوسائٹی مورخ تو یہ سکریٹری ہو، نیچر اور تیرھویں صدی لکھانے والے تو یہ پرچہ میر منشی ہو سے

منم آں کہنہ درا قافلۂ وحشت را

کہ زسرتا سرایں دشت خروشاں رفتم

تیرھویں صدی ہر قمری مہینے کے آخر میں شائع ہوتا تھا۔ اس کے بارے میں بھی میر صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں ایک مقام پر اس طرح تصریح فرمائی:

"اس صدی کے اخیر ہونے کی رعایت سے یہ پرچہ ہر مہینے کے آخر میں نکلتا ہے۔ تہذیب الاخلاق والے جنہیں نئی روشنی کا دعویٰ ہے، میونسپل کمیٹیوں کی لالٹینوں اور چندے کی روشنیوں کی طرح، یا دیوالی کے چراغوں کی طرح جو گھڑی بھر دن سے جلتے ہیں اور تھوڑی دیر رات ہوتے ہی بجھ جاتے ہیں، اپنا پرچہ شروع ماہ سے نکالا کریں، ہم تو شمع سحری کی طرح آخیر تک ساتھ دیتے ہیں......"

"تیرھویں صدی" نے جس روشِ خاص سے انشائیہ نگاری کو فروغ دیا اور سر سید رح کے نیچری معتقدات کو اپنے شوخ و ملیح انتقاد کا موضوع بنا کر جس انداز سے دادِ سخن دی اُس پر اُردو انشا پردازی ہمیشہ ناز کرے گی۔ سنجیدہ طبقہ "ناصر علی" کا گرویدہ ہو گیا۔ مشاہیر سخنوروں نے اس کی جس طرح داد دی وہ بجائے خود یادگار بن گئی ہے۔ ریاض خیر آبادی کے خطوط اور مہدی حسن کی کھلی چٹھی اس کی چند مثالیں ہیں۔

زمانہ : تیرھویں صدی ہجری کے ختم ہونے پر یعنی ۱۸۸۰ء کے لگ بھگ اس رسالے کا نام تیرھویں صدی کے بجائے زمانہ رکھ دیا گیا ادھر تہذیب الاخلاق بھی بند ہو چکا تھا۔ جب تہذیب الاخلاق دوبارہ جاری ہوا تو زمانہ بھی شائع ہونے لگا۔ چار پانچ برس تک جاری رہا۔ لیکن میر ناصر علی اپنی ملازمت کی مصروفیات کی وجہ سے اس کی ادارت سے سبکدوش ہو گئے۔

تیرھویں صدی اور زمانہ کو میر ناصر علی خود عرصے تک نہ بھلا سکے اور صلائے عام کے آخری دور تک اکثر مقامات پر بڑے لطف کے ساتھ ان کا تذکرہ کرتے رہے، دو ایک اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔

"ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری دور" اس عنوان سے عصرِ جدید میں بڑے کام کا مضمون حال ہی میں شائع ہوا۔ اعلیٰ درجے کی نثر میں صاحبِ مضمون نے تین پرچوں کا نام لیا ہے۔ درجے سے تہذیب الاخلاق آگرے سے "تیرھویں صدی" اور لکھنؤ سے "اودھ پنچ" اودھ پنچ ایک خاص وضع کا پرچہ تھا۔ تہذیب الاخلاق کا کیا کہنا! تیرھویں صدی کی نسبت صاحبِ مضمون لکھتے ہیں!

"تیرھویں صدی" میں اعلیٰ منشیانہ قابلیت کے ساتھ قدیم مذاق کی نگہداشت، نئی خیال آرائیوں اور جدتوں کے ساتھ کی جاتی تھی، اور پرانی مشرقی لٹریچر کو کچھ ایسی جدت طرازیوں کے ساتھ نئے لباس میں پیش کیا جاتا تھا کہ نئے اور پرانے دونوں گروہوں کی طرف سے بے اختیار واہ واہ کے نعرے بلند ہوتے تھے ......"

اس تعریف کی تصدیق تو راقم کے ذمے نہیں تیرھویں صدی رسالہ نکالنے کی تکلیف نیاز مند نے خواجہ یوسف علی مالک آگرہ اخبار کو دی کہ

آگرہ اخبار میں جو مضامین میں لکھا کرتا تھا وہ لٹریچر کے لحاظ سے باقی خبروں والے مضامین کے ساتھ بے میل سے ہو جاتے تھے۔ ان دنوں نئی تہذیب کا بڑا زور تھا کہ پرانی وضع اور زبان کو بیکار سمجھ کر ترک کرنا مناسب ہے، دلیل یہ بیان کی گئی تھی کہ اگلی طرز میں نئے خیال اور نئے مضمون ادا نہیں ہو سکتے۔ اس شکایت کو مٹانے کے لئے "تیرھویں صدی" کی نثر کا ذمہ میں نے لیا۔ دوسرے اصحاب جو نظم و نثر لکھتے تھے اُنکی مدّ "مضامین غیر" کے نام سے علیحدہ قرار دی گئی۔ شرط یہ ہوئی کہ مشکل سے مشکل مضمون اساتذہ کی زبان میں ادا کئے جائیں اور اس طرح بیگانے سے بیگانے خیال بھی بیگانے معلوم نہ ہوں اسی اردو میں جسے نئی روشنی والے ذلیل بتاتے ہیں، الٰہیات و فلاسفی کے مشکل سے مشکل مسئلے آسانی سے بیان کئے جائیں ....."

"...... تہذیب الاخلاق کے مضامین کی اُن دنوں بہت تعریف تھی اُسی زمانے میں ولایت میں ایک انگریزی رسالے کی شہرت تھی جس کا نام NINETEENTH CENTURY تھا۔ مجھے خبط ہوا کہ انگریزی میں جس طرح NINETEENTH CENTURY کی شہرت ہے، تیرھویں صدی میں بھی وہی بات پیدا کی جائے۔ صاحب "آگرہ اخبار" نے بہت اصرار کیا کہ تیرھویں صدی کا اخیر ہے یہ نام بدلنا پڑے گا۔ میں نے کہا یہی فکر NINETEENTH CENTURY کو ہوگی کہ انیسویں صدی عیسوی بھی ختم ہونے والی ہے۔ آخر جب انیسویں صدی ختم ہوگئی تو ولایت والوں نے اُس رسالے کے نام کے ساتھ AFTER کا اضافہ کر دیا۔ گویا رسالے کا نام NINETENTH CENTURY AND AFTER ہو گیا۔ یہ ذرا طول سا ہے تیرھویں صدی ہجری کے اختتام پر میں نے اس رسالے کا نام زمانہ کر دیا کہ اب قیامت تک فرصت رہے گی .... سچ پوچھئے تو تیرھویں صدی

کے طرزِ بیاں کا لطف تہذیب الاخلاق کے ساتھ تھا جس طرح شورِ جنوں بہار میں اور چاند سی صورت کا خیال اندھیری رات میں۔ زلفِ شبگوں کا بکھرنا رخسارِ تاباں کے ساتھ اور بلبل کا چہکنا شوقِ گلزار میں ؎

تھا حُسن میں نہ رنگ ادا کا نہ ناز کا یہ نقش یادگار ہے آئینہ ساز کا

کوئی کچھ کہا کرے شاعرانہ طرزِ بیاں، اگلے اور پچھلے، پُرانے اور نئے لوگوں کی نگاہ میں ہمیشہ زیادہ دلکش رہے گا۔ نئے لوگوں کو جب بھی پچھلی باتوں کا خیال آئے گا، بے اثر نہ رہے گا ؎

عاشقانہ سُخن اب تک تو ہے عالم میں ذکیؔ

دیکھئے آگے زمانے میں ہو چرچا کیا کیا"

صلائے عام ۱۹۱۵ء

" ازل سے ہزاروں صدیاں ہوئیں اور ابد تک ہوتی رہیں گی مگر تیرھویں صدی کو جو بات حاصل ہوئی وہ کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ نہ گمان ہے کہ آگے کو نصیب ہو۔ خاص کر اس کا اخیر وقت، عجب و غریب گزرا کہ اسلام کی قدیم تہذیب رخصت ہو رہی تھی اور تہذیبِ جدید جس کو نئی روشنی کہتے ہیں، نئی نئی نکلی تھی۔

نئی تہذیب والوں کا دعویٰ تھا کہ جب تک ہم ہر بات میں آنکھ بند کر کے اہلِ یورپ کی تقلید نہ کریں ہمارا طرزِ تمدن معیوب سمجھا جائیگا اور گو اُن دنوں زبانِ انگریزی کا زیادہ رواج نہ تھا مگر جا و بے جا لباس و طعام و نشست و برخاست میں اسی طرح جدّت ہونے لگی جس طرح چھوٹے بچّوں کو ہوتی ہے کہ جب نئے دانت نکلتے ہیں تو ہر چیز جو منہ میں آسکے اس

پر اپنے دانتوں کا زور آزماتے ہیں اور جب نیا نیا کھڑا ہونا سیکھتے ہیں
تو ذرا سہارا ملا نہیں اور تن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

"تہذیب الاخلاق" نئی روشنی کا لیمپ سمجھا جاتا تھا جو از روئے معلومات مذہبی ذور سے ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے آج کل کے بجلی کے ہنڈے کہ ان کا دور رکھنا ہی آنکھوں کے لئے اچھا ہے۔ اس کی تیز روشنی سے نگاہ خیرہ ہونے کے خیال سے آنکھوں کے لئے شیڈ یعنی اوٹ کی ضرورت سمجھی گئی کہ یکبارگی چکاچوند نہ پیدا کرے۔ اس غرض سے اس وقت کے بزرگوں نے اپنے اپنے خیال کے مطابق بہت سی کاغذی اوٹیں نکالیں جس طرح کہ لیمپ کی روشنی ہلکی کرنے کے واسطے چمنی کے آگے کاغذ کی آڑ لگا دیتے ہیں۔ اس خیال کے لوگوں میں مولوی امداد العلی صاحب اور حاجی علی بخش صاحب اور مولوی امان علی خاں رعنا، معزز بزرگان قوم تھے، جنہوں نے نئی تہذیب کے عقائد سے اختلاف کیا۔ اس اختلاف کی حمایت میں اکثر رسالے اور اخبار نکالے گئے جن میں دینیات پر زیادہ زور دیا گیا یہ اختلاف یہاں تک بڑھا کہ آپس میں کفر و الحاد کے فتوے شائع ہوتے رہے۔

اس بے مزگی کو مٹانے کے لئے تیرھویں صدی رسالہ مطبع آگرہ اخبار سے نکالا گیا تھا جس سے یہ غرض تھی کہ از روئے علم و فضل، اسلام، کسی دین و معاشرت سے خوبیوں میں کم نہیں۔ ہم بلا تکرار اپنے مسائل اس خوبصورتی اور خوش بیانی سے اپنی زبان میں ادا کر سکتے ہیں جو کسی بیگانہ زبان سے مشکل ہے۔ ہمیں پہلے اپنی قومی تہذیب کی پابندی چاہیے جس میں شور و شغب کی ضرورت نہیں۔ رسالہ تیرھویں صدی میں زیادہ تر لٹریچر

کی خوبیوں کا خیال رکھا گیا تھا کہ قوم پر سب سے بڑا حق اپنی زبان کا ہے۔
عرصے سے اُردو لٹریچر کے واسطے مسالا جمع کرنے کے خیال سے "تیرھویں صدی" کے پرچوں کی لوگوں کو تلاش ہوئی، معلوم ہوا کہ ان کا ملنا مشکل ہے"!

صلائے عام ۱۹۱۰ء

تیرھویں صدی اور زمانہ کے پرانے پرچوں کے بارے میں میر ناصر علی نے کئی بار صلائے عام میں اعلانات شائع کئے۔ لیکن پرانے پرچے دستیاب نہ ہو سکے۔ اس طرز کا ایک نوٹ نقل کیا جاتا ہے؛

"تیرھویں صدی" اور "زمانہ"

"پہلے تہذیب الاخلاق نکلا تو آگرہ اخبار نے تیرھویں صدی کا مقبولِ عام ماہوار رسالہ شائع کیا جس نے نیچری پارٹی والوں کے ایسی چٹکیاں لیں جن کا مزا آج تک اُن کے دلوں کو آ رہا ہے۔

گورنمنٹ اور سررشتہ تعلیم بھی اس کی لٹریچر پر قدر افزا نگاہ کرتے رہے۔ ہندوستان کے ہر حصے میں اس کو بڑی دلچسپی سے دیکھا گیا۔ ہز ایکسی لنسی سر آسماں جاہ بہادر ہزار روپے سال سے اعانت فرماتے تھے۔ عالی جناب نواب کلب علی خاں بہادر والی رام پور بھی اس کے بڑے قدر دان تھے۔ نواب علی مراد خاں صاحب بہادر والی خیر پور جناب حاجی امداد العلی صاحب بہادر وغیرہ وغیرہ اس کے خاص معاون تھے۔ جب وہ صدی ختم ہوئی تو ہم نے اُسی پرچے کا نام زمانہ رکھ دیا کہ قیامت تک کو کافی ہے۔

جب تہذیب الاخلاق بند ہوا تو زمانہ بھی ٹھہر گیا۔ اب وہ پھر نکلا تو زمانہ بھی اس کے ساتھ ہوا۔"

یہ عبارت رسالہ زمانہ سے نقل کی گئی۔ جو عرصہ ہوا کہ مطبع آگرہ سے حضرت خواجہ محمد یوسف صاحب کے اہتمام سے نکلتا تھا۔ تیرھویں صدی اور زمانہ دونوں رسالے آپ ہی کے اہتمام سے آگرے سے عرصے تک نکلتے رہے۔ شروع میں تفریحاً آگرہ اخبار میں مضمون لکھا کرتا تھا۔ اخبار میں معمولی اور غیر معمولی خبروں کے ساتھ ایسے مضامین کی جو یادگارِ زمانہ سمجھے جاسکیں احتیاط سے رکھنے کی زیادہ امید نہیں ہو سکتی۔

وہ زمانہ میری جوانی اور ملازمت کا زمانہ تھا۔ جوانی میں دل و دماغ کی شکایت نہ تھی لیکن ملازمت کے افکار سے زیادہ لکھنے پڑھنے کی فرصت نہ ملی۔ پھر مجھے معلوم نہیں کہ زمانہ پر کیا گزری۔

میں نے صاحب آگرہ اخبار کو لکھا ہے کہ تیرھویں صدی اور زمانہ کے پرچے تلاش کر کے مجھے بھیجدیں تاکہ وہ مضامین ایک جگہ جمع کر کے کتابی صورت میں چھاپ دیے جائیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس زمانے کے پرچے شاید ہی مل سکیں۔ اس لئے صلائے عام میں یہ التماس شائع کرنے کی ضرورت ہوئی کہ جو صاحب تیرھویں صدی اور زمانہ کے پرانے پرچے عاریتاً یا قیمتاً مجھے بھیج سکیں میں بہت ہی ممنون ہوں گا۔ جناب جلیل کا شعر ہے ؎

گوشہ گیری سے بھی شہرت یہ مری کم نہ ہوئی
پر نکالے مرے مضمون نے عنقا ہو کر

صلائے عام۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء

اور ایک مقام پر اردو رسالوں اخباروں اور اگلی صحبتوں کے بارے میں ایک تذکرہ مرتب کرنے کی تجویز کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں!

.... مجھے یاد ہے کہ بیس بائیس برس ہوئے اُردو اخباروں کا ایک تذکرہ" "اخترِ شاہنشاہی" نامی ڈائریکٹری کے طور پر نکلا تھا۔ اُس میں اُس وقت کے اخباروں اور رسالوں کا حال زیادہ تھا۔ ردیف وار الف سے ی تک قریب ڈیڑھ ہزار کے نام تھے۔ ان اخباروں میں زیادہ تر بند ہو گئے۔ اُس وقت کے لکھنے والے چل بسے۔ بعض یہ مشغلہ چھوڑ بیٹھے بلکہ مجھے اندیشہ ہے کہ اُس وقت کی صحبتوں کے دیکھنے والے بھی بہت ہی کم رہے ہوں۔

از خیلِ اسیرانِ کہن نیستم امّا
روزے زدہ ام در قفسے بال و پرے چند

اگلے اخبار نویسوں اور انشا پردازوں کو اپنی زبان میں اظہارِ کمال کا خیال زیادہ رہتا تھا۔ اچھے اچھے ذی کمال اخبار نویس تھے۔ مردان علی خاں رعنا کی شہرت اودھ اخبار سے ہوئی۔ تہذیب الاخلاق سید احمد خاں بہادر محسن الملک بہادر اور مولوی چراغ علی صاحب کی ناموری کا سبب ہوا۔ ان کے مقابلے میں مولوی امداد العلی صاحب، حاجی علی بخش خاں نے تیرھویں صدی میں بہت کچھ لکھا۔ یہ مشغلے اُردو لٹریچر کی ترقی کا سبب ہوئے اُن صحبتوں کے دیکھنے والوں میں کوئی صاحب اگر تکلیف کریں تو اُس وقت کے اخباروں رسالوں سے لے کر آج تک کے اخبار رسائل کا ایک تذکرہ لکھ ڈالیں۔ یہ تذکرہ اہلِ علم کی اچھی یادگار بنا رہے گا اور نہیں تو جس طرح شب برات کو مردوں کی فاتحہ کا دستور ہے جس سے بزرگوں کے نام یاد آجاتے ہیں۔ آغازِ سال میں یارانِ رفتہ کا خیال آجایا کرے تو گزری صحبتوں کا حق ہے۔

یاران باہم چو عیش بنیاد کنید | وز صحبت ہم خاطر خود شاد کنید
شکرانۂ عیش و کامرانی گاہے | از حسرت ناکامی ما یاد کنید

صلائے عام جنوری ۱۹۱۷ء

سر سید اور میر ناصر علی

مندرجۂ بالا اقتباسات سے "تیرھویں صدی" کے مقاصد بخوبی واضح ہو گئے ہوں گے۔ تاہم سر سید علیہ الرحمہ اور میر ناصر علی کے تعلقات کے بارے میں دو ایک باتیں عرض کرنے کے لائق ہیں۔

ایک عام سا اصول گھڑ لیا گیا ہے کہ سر سید علیہ رحمتہ کے معاصرین میں سے جو بھی ذی قدر شخصیت اُن کی کُلّی طور پر ہمنوا اور شریکِ کار نہ ہوئی اُسے آنکھ بند کر کے اُن کے "مخالفین" کی فہرست میں شمار کیا جائے۔ حالانکہ اربابِ نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اُن کے قریب ترشرکائے کار میں بھی بعض اصحاب کئی معاملوں میں اُن کے صد فی صد ہمنوا و ہم خیال نہ تھے۔ اور بعض ایسے مقتدر حضرات سے جو عملاً اُن کے ساتھ نہ تھے، سر سیّد علیہ رحمتہ خود بعض اہم معاملوں میں صلاح مشورے کرتے رہتے تھے۔ مثلاً مولوی امداد العلی صاحب، جنہوں نے اپنے اخبار "نور الآفاق" کے ذریعے اُن کے نیچری معتقدات کی سختی کے ساتھ مخالفت کی لیکن تعلیمی اور اصلاحی کوششوں کی ہمیشہ حمایت کی۔ سر سید مرحوم انھیں اپنا "شفیق دوست" کہتے تھے۔ اسی گروہ میں میر ناصر علی صاحب کا بھی شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے بھی مولوی امداد العلی صاحب اور حاجی علی بخش وغیرہم کی تائید سے سر سید علیہ رحمہ کے نیچری خیالات پر تنقیدیں کیں لیکن اُن

کے اصل مشن سے کبھی تعرض نہیں کیا، بلکہ ہر ممکن طریق پر حمایت کی۔ اس کے علاوہ سرسید علیہ رحمہ کی ادبی کاوشوں پر انتقادات میں جو شوخی کہیں کہیں نظر آتی ہے اُسے "معاصرانہ دادِ سخن" سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس سخن گسترانہ نوک جھونک کے باوصف دونوں بزرگوں کے مابین گہرے خاندانی مراسم اور ذاتی تعلقات تھے۔ سرسید علیہ رحمہ خود ان لطیف انتقادات سے محظوظ اور مستفیض ہوتے تھے اور میر ناصر علی کو ہمیشہ اپنا "ناصح مشفق" کہتے اور مانتے تھے۔ اس کے بڑے لطیف حوالے تہذیب الاخلاق کی جلدوں میں اور مکاتیب سرسید میں نظر آتے ہیں۔ ایک دو اقتباس ملاحظہ ہوں۔

"تیرھویں صدی" (آگرہ اخبار) کو دل لگی کی عادت ہے۔ وہ ہمارے افعال واقوال کا ناقد اور ہمارا ناصح مشفق ہر اس کے ایڈیٹر نہایت لائق، مولوی اور منشی ہیں یہ اخبار ہماری ہنسی اُڑاتا ہے لیکن اس کو ہم اپنے کام کا یعنی مدرستہ العلوم کا مخالف نہیں سمجھتے۔"

(تہذیب الاخلاق جلد ہفتم ۱۲۹۴ھ)

"ناصر الاخبار" (افسانۂ ایام) دہلی کی عنایتوں کو بالخصوص ان عنایتوں کو جو خاص محاکمے کے آرٹیکل لکھنے میں کی ہے ہم بھول نہیں سکتے۔ اے ناصح مشفق کہاں ہے وہ دلّی اور دلّی والے! جو نقش کہ مٹ گیا اس کا نام اب کیا لینا ـــــ...."

(تہذیب الاخلاق جلد نہم ۱۲۹۶ھ)

سرسید علیہ رحمہ کے گزر جانے کے بعد، اُن کی علمی اور اصلاحی خدمات کے

بارے میں صلائے عام کے اخیر دور تک کسی نہ کسی نہج سے ذکر خیر ہوتا رہا۔ اور جس درد و سوز کے ساتھ اُن کی تحریروں اور علمی تحریکوں پر اظہارِ خیال کیا گیا وہ دونوں کی گہری وابستگی کی لازوال مثالیں ہیں۔ صلائے عام کے صفحات ان تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر دو ایک مقام سے چند یادگار جملے نقل کئے جاتے ہیں علی گڑھ کالج کا ذکر کرتے ہوئے میر ناصر علی لکھتے ہیں!

"میں دیکھتا ہوں کہ عرصے سے علی گڑھ کالج کی نسبت اکثر اخباروں میں مضمون لکھے جاتے ہیں۔ جن سے درپردہ شکایت کی بو آتی ہے۔ آج کل کے لکھنے والے اپنی ناواقفیت کی بنا پر کچھ ہی کیوں نہ لکھا کریں، کالج کی اہمیت میں شک نہیں کیا جاسکتا۔ راقم السطور نے اس مدرسے کی بنیاد سے پہلے مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں بہت کچھ لکھا لکھایا۔ مدرسہ کے مخالف اور موافق فریق کے بزرگوں سے مجھے نیاز حاصل تھا۔ خدا کو اچھا کرنا منظور تھا کہ وہ بحث تو اس وقت کے بزرگوں کے ساتھ داخل دفتر ہوگئی۔ اور مدرسہ برابر ترقی کرتا رہا۔ اس وقت دو باتیں بڑے اطمینان کی ہیں کہ نواب وقارالملک بہادر سا سکریٹری اور نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر سا مربی ملنا مشکل ہے۔ جب تک یہ دونوں نعمتیں کالج کو حاصل ہیں مسلمانوں کو کالج کی طرف سے اطمینان رکھنا چاہیے۔

(صلائے عام۔ جون ۱۹۰۹ء)

اسی طرح علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ پر اظہار رائے فرماتے ہیں!

"یہ دیکھ کر میں بہت خوش ہوا کہ نواب محمد اسحاق خاں بہادر سکریٹری علی گڑھ کالج نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی طرف توجہ کی۔ سرسید احمد خاں کے بعد اس اخبار کے نصیب جاگے۔ سکریٹری صاحب نے یہ بات

اچھی کی کہ کالج کا اخبار اور پریس اپنے چارج میں رکھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ انتظام اچھے شگونوں میں ہے۔ سرسید احمد خاں اپنی زبان میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور نہایت اچھی اردو لکھتے تھے۔ جب تک مسلمانوں میں لکھے پڑھے نظر آئیں گے ان کے کارناموں میں سب سے بڑا کام یہی سمجھا جائیگا ان کو مضمون نگاری کا خاص ملکہ حاصل تھا۔ جو دوسروں کو نصیب نہ ہوا۔ وہ اوروں کے مضامین کے محتاج نہ تھے۔ اور اسی وجہ سے ان کی ایڈیٹری کی دھاک تھی۔ ان کے بعد علی گڑھ کے اصحاب میں مولوی مہدی حسن مرحوم کی انشا پردازی کی تعریف جس قدر کیجئے تھوڑی ہے۔ پھر میری نگاہ کوتاہ بیں میں علی گڑھ کے لکھنے والوں میں کوئی خاص انشا پرداز نظر نہیں آیا۔ میں نے صلائے عام نکال کر دیکھ لیا کہ جب تک خود پڑھنے لکھنے کا خبط نہ ہو، مانگے تانگے کے مضامین سے کام نہیں چلتا ....

سرسید مرحوم کے بعد کالج میں انگریزی سکریٹری شپ کا کام زیادہ ہوگیا...

سرسید کو اپنی زبان سے غایت درجے کی محبت تھی۔ اور یہ ہمارے لئے ناز کا مقام تھا۔ اب خود علی گڑھ کالج میں اپنی زبان کی قدر روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔

ہماری قومی بربادی کے دو سبب ہیں ایک تو اپنی زبان کی بے قدری دوسرے اپنے اسلاف کے کارناموں سے بے خبری، آپ اپنے بزرگوں کے کارنامے یاد رکھ سکیں اور خود سمجھ کر اوروں کو سمجھا سکیں تو یہ غیروں کی باتیں غیروں کے لب و لہجہ میں سمجھانے سے زیادہ بکار آمد ہے۔"

(صلائے عام —— اپریل ۱۹۱۳ء)

سرسیّد علیہ رحمہ کے اسٹائل کے بارے میں لکھتے ہوئے کہتے ہیں!

"۔۔۔۔۔۔۔۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ دل سے نکلنے والی اور دل میں اثر کرنے والی اُردو سر سیّد احمد خاں نے ایجاد کی اور یہی متاخرین کی نگاہ میں مقبول ہوئی ۔۔۔۔۔"

(صلائے عام ـــ جولائی ۱۹۱۷ء)

افسانۂ ایّام

تیرھویں صدی اور زمانہ کے بعد نصرت المطابع دہلی سے ۱۸۸۵ء میں رسالہ "افسانۂ ایام" جاری کیا۔ پہلے پرچے میں اس کے مقاصد بیان کرتے ہوئے میر ناصر علی لکھتے ہیں:۔

"افسانۂ ایام" نامی ایسا پرچہ نکالا جاتا ہے جو اعلیٰ لٹریچر یعنی غایت فصاحت اور کمال انشا کا نمونہ ہے اس میں وسعتِ خیال اور ہر طرح کے اظہارِ کمال کا وہ اہتمام کیا گیا ہے کہ مضامینِ علمی تحقیقِ فلاسفی اور الٰہیات و دینیات میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا۔ یعنی جو غرض "تیرھویں صدی" اور "زمانہ" نامی پرچوں سے تھی وہ نہ جانے پائے اور ساتھ ہی عمدگی مضامین میں ولایت کے اعلیٰ لٹریچر کے عمدہ پرچوں سے کم نہ ہو جن باتوں میں زمانے نے ترقی کی ہے، اس کی حقیقت بتائی جائے کہ اقبال مند قوموں کے نمونے کیا اثر پیدا کرتے ہیں ـــ ہماری بگڑی طبیعتیں کس طرح سنبھل سکتی ہیں، زمانے کے ساتھ ترقی کرنے میں ہمیں کیا چھوڑنا اور کیا اختیار کرنا ہے ؎

اور ا بہ سعی گر نہ تواں ساختن نہ خویش
فرض است در تلاش کہ خود را ازو کنند

یہ پرچہ صرف اُن لوگوں کے کام کا ہے جن کی علمی لیاقتیں بڑھی ہوئی ہیں۔
اس سے بڑی غرض یہ ہے کہ جن باتوں اور مسئلوں کا زمانے میں شور ہے
اُن کے سمجھنے اور اُن پر رائے دینے کا موقع اہلِ علم کو ملے اور یہ پرچہ
اسلام کی طرف سے زمانے میں ایسا یادگار رہے جس کی اہلِ کمال کی نظر
میں ہمیشہ قدر ہو تاکہ کہنے کو ہو جائے کہ ؎

کیا پھوٹ کے روئے ہیں مرے پاؤں کے چھالے
پوچھی تھی ذرا چھیڑ کے تکلیف سفر آج۔"

"افسانۂ ایام" میں سر تا سر سب ہی مضامین میر ناصر علی خود ہی لکھتے تھے ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ مہینے بھر کی خبروں کا خلاصہ بھی ناصر الاخبار کے ضمیمے کے طور پر ہر پرچے میں شائع ہوتا تھا۔ وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ رسالہ کب تک جاری رہا۔ شاید دو تین برس تک نکلتا رہا۔

ناصری

افسانۂ ایام کے بند ہو جانے کے بعد نصرت المطابع دہلی سے ۱۸۸۸ء میں ماہانہ رسالہ ناصری جاری ہوا۔ اس کے مقالۂ افتتاحیہ میں میر ناصر علی لکھتے ہیں:

"مدت سے یہ شکایت ہے کہ اعلیٰ لٹریچر کا کوئی پرچہ ایسا نہیں نکلتا جس میں ہمارے ملک اور زبان کی ترقی کے پورے سامان ہوں یہ شکایت مٹانے کے لئے "ناصری" نامی یہ پرچہ نصرت المطابع دہلی سے نکالا جاتا ہے۔ پُرانے اخباروں کی بے قدری میں نیا پرچہ نکالنا گویا بے قراری میں برقِ رخسار کا تماشا ہے، لیکن جس طرح بیدک کے

علاج میں گرمی کا علاج گرمی سمجھا جاتا ہے اسی طرح نئے پرچوں کا نکلنا اخباروں کی ترقی کے عجیب سامانوں میں ہے۔ یہ نہیں تو بڑی وجہ اس پرچہ کے نکالنے کی یوں سمجھئے کہ عموماً ہندوستان کے اخباروں کی ردی حالت ہی اس بات کی متحرک ہوئی کہ ایک اچھا پرچہ نکالا جائے جو اس فن کی آبرو کا سبب ہو۔

این نامہ کہ بود نطع این فرش　　من می برمش بہ کنگرۂ عرش
این لعل کے داشت پائے در گل　　من می نہمش بہ کرسئ دل
این جرعہ کہ ریختند بر خاک　　من می کشمش بجام افلاک

مرزا حیرت دہلوی اس کے خاص مضمون نگاروں میں سے تھے۔ یہ رسالہ بھی تین چار برس تک جاری رہا۔

صلائے عام

۱۹۰۸ء میں میر ناصر علی صاحب سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر دلّی آگئے تھے۔ اسی سال آپ نے اپنا مطبع ناصری قائم کیا اور یہیں سے مارچ ۱۹۰۸ء میں اپنا نادر و یادگار ماہنامہ "صلائے عام" جاری کیا۔ پہلے پرچے میں اداریے کے طور پر صلائے عام کی تمہید اس طرح لکھی ہے۔

صلائے عام کی تمہید:

گو ہر کش و طبلہ برملا زن
بر جوہریاں دم صلا زن

"عرصہ ہوا کہ میں اُردو میں کچھ لکھا پڑھا کرتا تھا۔ اس وقت نثر کے لکھنے والے کم تھے۔ دنیا کے معمولی اور اکثر غیر معمولی جھگڑوں کی وجہ سے یہ مشغلہ مجھ سے اچھی طرح نہ نبھا۔ لیکن اتنا فائدہ ہوا کہ مجھ سے اچھے لکھنے والے پیدا ہوگئے۔ یہ بات خوش ہونے کی ہے کہ اُس وقت سے اب اُردو لٹریچر میں ترقی کے سامان زیادہ نظر آتے ہیں نظم تو اس کی ہمیشہ سے لاجواب ہے نثر میں بھی بہت پاکیزہ مضامین نکلتے ہیں۔ جن میں سے اکثر کمالِ فصاحت و خوش بیانی کے نمونے یعنی ماسٹر پیسز سمجھئے، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اچھے اچھے مضامین مختلف اخبارِ اور متفرق پرچوں میں پریشان ہو کر اکثر ضائع ہوتے ہیں اس لئے میرا ارادہ ہے کہ یہ رسالہ صلائے عام اس غرض سے نکالا جائے کہ اُردو لٹریچر میں جسے جس طرز پر لکھنے میں کمال و دعویٰ ہو، لکھے ـــــ اس رسالے میں ہر طرح کے مضامین کی گنجائش رکھی گئی ہے نظم میں، نثر میں۔ کسی طرز پر کوئی لکھے اگر اس طرز کے کمال کا حق ادا کیا گیا ہے تو سب سے پہلے یہاں سے داد دی جائے گی۔"

سخن را من قدیمے خانہ زادم ولیکن اند کے کاہل نہادم
بخدمت دیر دیر آیم ازاں ست کہ بامن گاہ گاہے سرگراں ست
کنم ایں خدمت شائستہ زیں پس کہ نبود پیش خدمت طرزِ من کس

انصاف سے دیکھئے تو اُردو کی ترقی کا مدار اخباروں و رسالوں پر منحصر ہے۔ انھی سے اُردو لٹریچر چل رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ صلائے عام کے ذریعے ہماری زبان کی کوئی یادگار باقی رہے۔ اس بہانے سے اہلِ علم و کمال کے لئے لکھنے پڑھنے کا مشغلہ

پیدا ہو جس طرح موتیوں کے لئے ڈورا ضرور ہے یہ پرچہ ہر طرح کے لآلیٔ سخن کے لئے رشتہ سمجھئے۔ ؎

مے پذیرند بداں را بہ طفیل نیکاں

رشتہ را بس ندہد آنکہ گہر میگردد

صلائے عام کی اظہارِ غرض کے ساتھ میری تمنا یہ ہے کہ جس طرح کسی کے خیال میں آنکھیں بند کر لی جائیں اور جب کھولئے تو وہی سامان آنکھوں کے سامنے موجود ہو جو ذہن میں تھا تو طبیعت کیسی خوش ہوتی ہے۔

اہلِ کمال سے استدعا ہے کہ اپنی اپنی نظم و نثر کے ماسٹر پیسز یعنی کلام و تحریر کے اعلیٰ نمونے عنایت فرمائیں تاکہ یہ کہنے کو ہو کہ

دوش در خواب چو آں طرۂ پیچاں دیدم

صبح بر بسترِ خود سنبل و ریحاں دیدم ...!

پرچہ اوّلی ۱۹۰۸ء

صلائے عام کے پہلے پرچے کے آخر میں یہ التماس بھی درج تھی

"صلائے عام کے پہلے پرچے کو دیکھ کر ناظرین بری رائے لگانے میں ذرا تامل کریں۔ اچھی رائے سے تو مجھ پر احسان ہوگا، لیکن اس کی نسبت بری رائے لگانے میں اس قدر تامل کیا جائے کہ دو چار پرچے نکل جائیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس کے نقص کم ہو رہے ہیں یا زیادہ۔ جو نقص کہ اس پرچے میں رہ گئے۔ اگر آئندہ اُن کا علاج نہ ہو سکے تو اس کی برائی کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔ میں جانتا ہوں کہ پہلے پہل کے انتظام میں بہت سے عیوب رہ جاتے ہیں۔ لیکن ارادہ ہو رہا ہے کہ اس کے

اہتمام میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا جائے۔

اہل علم کے لئے یہ پرچہ اظہار کمال کا اچھا ذریعہ ہے جس کے لئے التجا ہے کہ جس کو جس طرز پر لکھنے میں ید طولیٰ ہو دریغ نہ کرے اس پرچے میں نظم و نثر کے اعلیٰ درجے کے مضامین جو ماسٹر پیسیز ہوں شائع ہوا کریں گے۔ جن کی اشاعت سے یہ غرض ہے کہ اُردو لٹریچر کا اچھا مسالا جمع ہوتا رہے، اور صلائے عام کے ذریعے اہل کمال کی یادگار قائم رہے ؎

درمخزنِ جگر گہرِ چند جمع بود
دلّال گشتہ دیدہ بداماں فروختیم

فروختیم متاع سخن بدیں فرہاد کہ مژدہ باد شناسندگان کالا را

اس پرچے کی قیمت پانچ روپے سالانہ ہے۔ اس میں محصول ڈاک بھی آگیا اس قدر لٹریچر کا ذخیرہ اور پانچ روپے سالانہ میری دانست میں زیادہ نہیں۔ میں خود اس قدر مضامین کا پرچہ بڑی خوشی سے اس قیمت پر لوں اور احسان مانوں ؎

دل را بہ یک کرشمۂ پنہاں فروختیم
بُر کار بود مشتری ارزاں فروختیم

لکھنے پڑھنے میں خرچ کرنے کی نسبت میری رائے یہ ہے کہ جو شخص علمی مشاغل سے بیزار نہ ہو اگر اس کے اور اخراجات ہزار بارہ سو، سال کے ہیں تو اپنی زبان کے لٹریچر کے لئے سوسوا سو روپے، سال سے کم خرچ کرنا علم کی قدردانی میں داخل نہیں۔"

حضرت ریاضؔ نے صلائے عام کے پہلے پرچے کا ریویو اپنے ریاض الاخبار میں لکھا۔ جو بذاتہٖ یادگار ہے۔ یہ ریویو میر ناصر علی نے صلائے عام کے دوسرے نمبر میں اس نوٹ کے ساتھ نقل کیا!

"مجھ پر احسان ہے کہ اہلِ علم نے میری خاطر صلائے عام کے پہلے پرچے کی نسبت بُری رائیں نہیں لگائیں۔ حضرت ریاضؔ نے صلائے عام کا ریویو جو ریاض الاخبار میں لکھا بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے۔ تاکہ معلوم ہو کہ ریاضؔ کا طرزِ نثر کتنا پاکیزہ ہے۔ حضرت ریاضؔ پر مجھے رشک آتا ہے تو اس بات پر کہ غزل گوئی میں تو آپ کے مرتبے کو کوئی نہیں پہنچا نثر میں بھی آپ کو کمال حاصل ہے۔ یہ خیال مجھے اس وجہ سے ہو رہا ہے کہ میں نے صرف ایک ہی بات پر محنت کی، یعنی نثر لکھنے میں۔ وہ بھی حضرت ریاض مجھ سے چھینتے دکھائی دیتے ہیں۔

جناب ریاضؔ کی زبان کتنی پاکیزہ ہے۔ وہو ہذا

چاندنی پھیلی ہے گھر تک مرے میخانے سے
چاند نکلا ہے یہ ساقی ترے پیمانے سے

صلائے عام کا پہلا نمبر دہلی سے شائع ہوا۔ ریاض الاخبار میں ناظرین اس کا اشتہار ملاحظہ فرما چکے ہوں گے۔ خان بہادر سید ناصر علی صاحب کی انشا پردازی نے ایک زمانے میں "تیرھویں صدی" "آگرہ اخبار" اور "زمانہ" سے خاص شہرت حاصل کی تھی۔ خان بہادر اپنی انشا پردازی کے موجد ہیں۔ امید ہے صلائے عام تمام معاصرین سے سبقت لے جائے گا۔ ہر چند ملک کے بعض ماہوار رسالے اپنے ڈھنگ پر اچھے نکل رہے ہیں۔

"یہ سچ ہے کہ خان بہادر نے تقریباً تیس سال سے اپنے دست و قلم کو اُن مضامین کے لئے تکلیف نہیں دی۔ جو آپ کی انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ سمجھے جاتے تھے۔ مگر صلائے عام کی حالت اس لئے بہت کچھ اُمید افزا ہے کہ آپ نے ملازمت کے جھگڑوں سے سبکدوشی حاصل کر کے اس کام کو مطمئن زندگی میں شروع کیا ہے۔۔۔۔

جو ادائے خاص آپ کے لٹریچر میں ہے وہ آپ کا حصّہ ہے۔ اور پہلی شہرت اور اعلیٰ انشا پردازی کے اعتبار پر یہ امر تمام ملک کے لئے مسلمہ ہے کہ صلائے عام اعلیٰ لٹریچر کا نہایت عمدہ ذخیرہ ہے۔ اس پرچے کی اشاعت سے ملک کو خاص مسرت اسی حالت میں ہو گی کہ خان بہادر زیادہ تر اپنے دست و قلم سے کام لیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اور اہلِ قلم کے مضامین سے بے پروائی کی جائے۔ مگر زیادہ تر مضامین اس لٹریچر کی مناسبت سے جو صلائے عام کے لئے موزوں ہو۔

صلائے عام کے آخر میں بہ عنوان "التماس" خان بہادر نے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ پہلے دیباچے کی نسبت قوبی رائے قائم کرنے میں تامل کیا جائے۔ اچھی رائے کی کچھ روک ٹوک نہیں ہم کو تعمیل ارشاد میں کیا عذر ہے۔

صلائے عام کے پہلے نمبر میں شمس العلما ذکاء اللہ خان صاحب کے سادہ تاریخی لٹریچر نے زیادہ حصہ لے لیا۔ دلّی کا یہ تاریخی حال اپنے لئے ایک مستقل کتاب چاہتا ہے ہم نے اس کا دیکھنا دوسرے وقت پر اٹھا رکھا ہے ؎

دیکھ ڈالیں گے جو فرصت ہو گی

جناب ضیا کی طرف سے صلائے عام کا خیر مقدم بہت اچھا رہا۔ اُن مضامین کا

کیا کہنا جو خود خان بہادر کے قلم کی کاوش ہیں ـــــ جناب اکبر علی خاں صاحب کا مسدس خیالات کے اعتبار سے بُرا نہیں ۔ مگر ایسے مصرعے تصحیح کے محتاج ہیں ۔ وہ کتابت کی غلطی ہو یا محض اتفاق، جو ہر شاعر کو پیش آسکتا ہے ـــ ع

سونچو کہ ہم ہشیار ہیں یا بیخود و مخمور

جناب اختر کی غزل امتیازی درجہ رکھتی ہے ۔ کشکولِ نادرہم دیکھ نہ سکے ۔

صلائے عام ٹائیٹل کے سوا چالیس صفحوں پر ۲۲ × ۱۸ کی بڑی تقطیع پر شائع ہوا ۔ قیمت صرف پانچ روپے سالانہ ، ہم تو یہی کہیں گے ع

نرخ بالا کن، کہ ارزانی ہنوز

حضرت محشر لکھنوی نے الناظر میں صلائے عام کا ریویو اس طرح لکھا ؛

نِرا کھرا علم و ادب کی ترقی کا خیر خواہ ہندوستان میں اگر کوئی رسالہ ہے تو صلائے عام ۔ مضامین ایسے کہ اڈیٹر کی شائستگی اور وسیع معلومات کا پتا دے رہے ہیں ۔ لکھائی چھپائی ایسی کہ سلیقہ شعاری کا سارٹیفکیٹ ۔ اس کے اوراق میں سب کچھ ہے مگر سنجیدگی کے ساتھ ۔ اس کے صفحات حسن و عشق کے دفتر ہیں ۔ مگر تصوف اور تہذیب کے اعلیٰ پیمانے پر ۔ اشاعت میں پابندیٔ وقت سب پر بالا ، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اڈیٹر صاحب نے اپنا کل وقت مع راحتوں کے خدمتِ ملک و زبان کے لئے وقف کر دیا ہے ملک کے محسنوں کی فہرست میں آپ کا نامِ نامی امتیاز کے ساتھ اگر درج نہ کیا جائے تو انصاف کا خون ہے ۔ آپ کی جانفشانی کی جہاں تک داد دی جائے کم ہے ......؛

اسی طرح اور سینکڑوں مشاہیر کی رائیں اور ملک کے مقتدر جریدوں کے بیشمار

تبصرے ہیں۔ اگر نقل کئے جائیں تو دفتر کے دفتر جمع ہو جائیں۔ ان میں سے اکثر صلائے عام میں دوبارہ شائع ہوتے رہے۔ اور جلدوں میں جابجا نظر آتے ہیں لیکن خود صلائے عام کی جلدیں نایاب ہیں۔ اساتذہ کی یہ یادگار تحریریں یکجا صورت میں محفوظ کرنے کے لائق ہیں۔ لیکن یہ ایک علیحدہ مستقل کام ہے۔ یہ مضمون تو اس کا متحمل بھی نہیں ہو سکتا کہ "صلائے عام" کی خصوصیات خاصہ بیان کی جاسکیں۔ اُس صحبت کے چند بزرگوں کے مکاتیب جو "صلائے عام کی ڈاک" کے تحت میر ناصر علی اپنے لطیف حاشیوں کے ساتھ صلائے عام میں شائع کرتے تھے۔ اس انتخاب کے آخری مضمون "دادِ صلائے عام" میں شامل ہیں انھی سے "صلائے عام" کے مرتبے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

صلائے عام کے چند مستقل عنوانات، جن کے تحت میر ناصر علی سالہا سال تک گہر افشانی فرماتے رہے۔ مثلاً "دیباچہ مضامین" جس کا عنوان بعد کو "پیرایۂ آغاز" کر دیا گیا تھا۔ "مضمون پریشاں" اور "صلائے عام" کے بارے میں میر صاحب ہی کے چند دلپذیر مقامات سُن لیجئے بغیر کسی ترتیب کے جابجا سے نقل کئے جاتے ہیں۔ یہ اقتباسات ایسے مختصر شذرات یا نوٹ وغیرہ سے لئے گئے ہیں جن پر مستقل مضامین کا اطلاق نہیں ہو سکتا اسی لئے منتخب مضامین بھی شامل نہ کئے جاسکے، اپنی معنویت اور رنگینی کے اعتبار سے ایسے نوٹوں کا بھی خاص مقام ہے، اس لئے یہاں ان میں سے چند کا درج کرنا غیر ضروری معلوم نہ ہوگا۔

دیباچۂ مضامین

صلائے عام کی خوبیوں میں دیباچے کا ذکر اکثر اہلِ علم کی زبان پر رہا۔ اسکی

تحقیق وتنقید میں اچھے اچھے مضامین نکلے، نواب احمد سعید خاں صاحب کی تحقیق اس بحث میں نہایت پاکیزہ شائع ہوئی، نواب صاحب کی نگاہ میں دیباچے سے غرض حمد ونعت ہے۔ اور اس کا رواج فارسی لٹریچر میں زیادہ نظر آتا ہے۔ لیکن ازروئے لغت فارسی میں دیباچہ لفظ " دیبا کا مصغر ہے۔ جس طرح باغ کا باغیچہ، دیبا ریشمی کپڑے کا نام ہے، جو سلاطین کے درباری لباس میں کام آتا تھا۔ اور اس میں جواہر ٹکتے تھے اور لوازم شاہی میں داخل تھا۔ زینت و آرائش کی مناسبت سے لفظ دیباچہ خطبۂ کتاب کے لئے موزوں سمجھا گیا۔

بعضوں کی رائے ہے کہ یہ لفظ "دیباج" سے نکلا ہے، جو اصل میں دیبا کا ہی معرب ہے، اور زینت اور رونق سے مناسبت رکھتا ہے۔ عربی میں جیم فارسی کو یعنی "چ" کو جیم سے بدل کر مُعرّب کر لیا۔ کنز میں (جو خود گنج کا مُعرّب ہے) اس کے معنی چہرہ و رخسار کے لکھے ہیں۔ کتاب کا دیباچہ گویا کتاب کا چہرہ ہے۔ اسی سے دیباچہ قرار پایا۔ غرض دیباچے سے مقصود محض زینت و آرائش ہے۔

دیباچے کے مرادف الفاظ جو اکثر استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً تمہید شذرات، مقدمہ، تعارف وغیرہ ـــــ ان میں زینت و آرائش کی مناسبت نہیں۔ دیباچے میں جو زور ہے وہ کسی میں نہیں جس طرح چہرے سے انسان کی زینت و رونق ہے۔ دیباچے سے کتاب کی زینت اور رونق سمجھی جاتی ہے۔ اسی لئے فارسی والے دیباچے پر بہت زور دیتے تھے۔ بہر حال میری نگاہ میں پیرایۂ آغاز کے لئے دیباچے سے بہتر کوئی لفظ نہیں۔ جس طرح حسینوں کے لئے نقاب کی ضرورت ہے حسینانِ معانی کو بھی یکبارگی بے حجاب نہ ہونا چاہیے

یہ دیباچہ گویا نقاب شاہدِ مضموں ہے ؎

مناسب ہے اُلٹوں نقابِ سخن
نظر آئے رُخسارِ فکرِ رسا

"ساقیا ابر ابھی آیا نہیں میخانے پر
کیوں قدح نوش گرے پڑتے ہیں پیمانے پر

ابر کے انتظار میں مستی اور ساغر کے لئے قدح نوشوں کا اضطراب و فورِ شوق کا دیباچہ سمجھئے۔ اسی طرح یہ دیباچہ جو صلائے عام کے مضامین کا آغاز ہے پڑھنے والوں کو مضامین سے پہلے اپنا مشتاق رکھتا ہے کہ مضامین تو پیچھے دیکھنے میں آئیں گے۔ دیباچے ہی سے ان کی خوبیوں کا حال معلوم ہو جاتا ہے ع

قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا"

بنی اسرائیل کے قدیم لٹریچر میں کتاب کے بابوں اور فصلوں کو استخواں سے تشبیہہ دیتے تھے کہ جس طرح انسان کے جسم میں مضبوطی کے لئے ہڈیاں ضروری ہیں، اسی طرح کتاب کے لئے باب ہیں اور دیباچہ گویا چہرہ ہے۔ جس سے انسان کی شناخت ہوتی ہے ۔ ؎

حفیظ اوّل جگہ اپنی ہے اربابِ محبت میں
کتابِ عشق کا دیباچہ ہے یہ داستاں میری

دیباچے کی تمثیل چہرے سے ہمارے ہاں کی لٹریچر میں بھی رائج ہے کہ مرثیے کے حصوں میں جہاں رزم کی تیاری، معرکہ اور بین ضروری ہیں وہاں آغاز کے بند بھی ضروری ہیں جو بڑے زور کے ہوتے ہیں، ان کو چہرہ کہتے ہیں۔ سیاق والے جانتے ہیں کہ حلیے میں چہرے کی تفصیل زیادہ لکھی جاتی ہے۔ اسی طرح کتاب میں دیباچے پر زور دینے کا دستور ہے۔

جس طرح جبینِ یار کے لئے قشقہ اور برہمن کے لئے چندن ہے اسی طرح دیباچہ جو مضامین کی زینت کا سبب سمجھئے گویا مضامین کی پیشانی ہے ؎

سیندور کے قشقے میں یہ دیکھی ہے تجلّی
مِشعل کی اسے راہ میں حاجت نہیں ہوتی

مہاراج کالیداس جی کا قول ہے کہ حسینوں کی محبّت باتوں سے پہلے نگاہ سے معلوم ہو جاتی ہے۔ ان کی محبت کا پتا اقرار ناموں اور حلفیہ بیانوں سے نہیں بلکہ اشاروں سے چل جاتا ہے۔ لیکن میرے مطلب کا مضمون جس خوبی سے جنابِ داغؔ نے باندھا ہے مجھ سے عمر بھر ادا نہ ہوتا۔ فرماتے ہیں ؎

بتائیں لفظِ تمنّا کے تم کو معنی کیا
تمہارے کان میں اک حرف ہم نے ڈال دیا

یہی معنیٰ اس دیباچے کے ہیں۔

مجھے اس بات کی تحقیق نہیں کہ دیباچے کی ایجاد ایشیا کی ہے یا یورپ کی۔ یہ لٹریری رسم مسلمانوں نے قائم کی یا ہم نے دوسری قوموں کی لٹریچر سے لے کے اختیار کیا۔ کتبِ سماوی یعنی اہلِ کتاب کی الہامی کتابیں دیباچے سے خالی ہیں۔ فارسی والوں میں البتہ اس رسم کا رواج زیادہ ہے اور اسلام کے وقت کی کتابوں میں سب سے زیادہ۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اسلام میں ہر کام خدا کے نام سے شروع کرنے کا حکم ہے۔ اور ایشیائی آداب میں داخل ہے کہ اپنے سے بڑے سے جب خطاب کیجئے تو اس کی تعریف میں کچھ کہنا چاہیے۔ اس لئے خدا کے نام کے ساتھ حمد و ثنا واجب ہوئی۔ اور حمد کے بعد نعت کا درجہ ہے۔ اس کے بعد بادشاہِ وقت کی مدح بھی ضرور ہوئی۔ پھر سببِ تالیف بھی لکھنے کا

دستورِ قدیم سے رائج ہے کہ اما بعد میگوید فلاں ابن فلاں ..... تصنیف و تالیف کے لئے جہاں اتنی شرطیں ہوں تو خواہ مخواہ دیباچہ کی ضرورت ہوئی۔ یہاں تک کہ کتاب سے زیادہ دیباچے پر زور دیا جانے لگا گلستانِ سعدیؒ میں گلستاں سے زیادہ دیباچہ مشکل سمجھا جاتا ہے۔ اور واقعی دیباچے کے لئے جبقدر خوبیاں ہونی چاہئیں اس میں موجود ہیں۔

لیکن کتاب ہو تو ایک دفعہ کتاب کا دیباچہ لکھ کر چھٹی ہو جائے۔ رسالے کے لئے ہر مہینے نیا دیباچہ لکھنے کا ارادہ کرنا گویا حضرت خضرؑ کی درازیٔ عمر کے لئے دعا مانگنی ہے کہ حضرت کی عمر یوں بھی ختم ہونے والی نہیں۔ میری دُعا قبول ہو جائے تو جانے کیا قیامت آجائے۔ میں نے غلطی کی کہ صلائے عام کے ہر پرچے کا نیا دیباچہ لکھنا شروع کیا۔ مرضِ عشق کی طرح بیٹھے بٹھائے یہ روگ اپنی جان کو لگا لیا۔ اب ہمیشہ ہر مہینے دیباچے کے لئے نئی بات کہاں سے آئے ؎

وہ بات کونسی ہے جواب اُن سے میں کہوں
مضموں وہ کونسا ہے جو پہلے لکھا نہیں

لیکن دیباچہ گویا درباری لباس ہے کہ دربار کے لئے جو لباس مقرر ہے اسی کو پہن کر آنا چاہیے۔ بغیر درباری لباس کے دربار میں آنا جائز نہیں۔ سلطانِ سخن کے دربار میں قبائے مضامین، جسے دیباچہ کہہ لیجئے پہن کر آنا مناسب ہے۔ اس تمثیل کو جانے دیجئے غالبؔ کی پہلی غزل کا مطلع لیجئے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا		کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

جس طرح کاغذی پیرہن فریاد کا دیباچہ ہے، صلائے عام کا دیباچہ بھی آپ کی خدمت میں آپ کی زبان کا فریادی بن کر حاضر ہو رہا ہے آپ اس کی فریاد نہ سُنیں تو یہ کاغذی پیرہن بھی چاک سمجھئے۔

صلائے عام کی یہ بارھویں جلد ہے، اور ہر سال کے بارہ پرچے اس حساب سے مجھے اب تک سوا سو ڈیڑھ سو دیباچے لکھنے پڑے، اس قدر محنت کے بعد اگر میں ذرا اُستالوں تو آپ خفا نہ ہوں۔ دیباچہ نگاری سے ابھی مستغنی نہیں ہوتا نقص خدمت کا عُذر کرتا ہوں ؎

رسم است کہ مالکانِ تحریر آزاد کنند بندۂ پیر

انسان ایک ہی مضمون پر کہاں تک لکھے جائے۔ اگر کوئی لکھے گا تو اس سے زیادہ کیا لکھے گا جواب تک لکھا گیا ؎

اگر ہوئی بھی قیامت تو کون دیکھے گا اسی طرح جو نظر میں ترا خرام رہا

پیرایۂ آغاز

اُن سے تقریبِ سخن پہلے نکالیں تو کہیں
نفسِ مطلب کا ذرا رنگ جمالیں تو کہیں

میں دیکھتا ہوں کہ اب اکثر رسالوں اور تازہ تصنیفوں میں کچھ نہ کچھ دیباچے کے طور پر لکھنے کا دستور ہو گیا ہے ـــــ اس کا عنوان کہیں "شذرات"، کہیں "ملاحظات"، کہیں "شکرپارے"، کہیں "حرفِ گفتنی" رکھا جاتا ہے۔ مدت تک میں صلائے عام کے ہر پرچے کے لئے دیباچہ لکھا کرتا تھا دیباچے کا لفظ کچھ رسمی سا معلوم ہونے لگا اس لئے ترک کر دیا۔ لیکن آغاز میں کچھ نہ کچھ لکھنے کی ضرورت بدستور باقی رہی۔ اس لئے مضامین سے پہلے پیرایۂ آغاز کے نام سے لکھنا بے موقع معلوم نہیں ہوتا۔ طرزِ کلام میں ہر طرح کے پیرائے میں اپنا مطلب ادا کرنا فصاحت میں داخل ہے، جناب ناظم کا شعر ہے ؎

میں نے جو کی حسد کی مذمت تو آپ نے
پیرائے میں ہنسی کے کہا مرحبا مجھے

میں نے یہ عنوان اس لئے پسند کیا کہ یہ طرز نیا ہے۔ گندہ بروزہ یا خشکہ، اگرچہ گندہ لیکن ایجادِ بندہ، آپ یہ طرز اگر پسند نہ کریں تو بھی نہ ہونے سے بہتر جانیں سمجھ لیں کہ جو غرض دیباچے سے تھی وہی "پیرایۂ آغاز" کی ہے یعنی مضامین کا حال پہلے سے آپ کو معلوم ہو جائے ؎

سامنے یار کے خود رفتہ نہ ہو جائیں کہیں
دلِ بے تاب کو پہلے سے سکھا رکھا ہے

مضمونِ پریشاں

"مضمون پریشاں کو میں زلفِ حسیناں سے تشبیہ دیتے دیتے تھک گیا۔ ٹکڑے ٹکڑے مضمون، جو فقیر کی گدڑی کی طرح الگ الگ ہوں۔ کیا آشفتہ مزاجوں کے دامن و گریباں کے پرزوں سے مشابہ نہیں ہو سکتے۔ جو فصلِ گل میں وارفتہ اڑائے جاتے ہیں۔؟ یا اُس نامۂ شوق سے نہیں ملتے جسے یار ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دے۔

اس مضمون کو اُس ہار سے کیوں نہ تشبیہ دی جائے جو رات کو یار کے گلے سے ٹوٹ گیا۔ جس کے موتی صبح کو سیج پر بکھرے ہوئے ملے۔؟ یا یوں کیوں نہ کہیے ؏

کسی کے مُنہ سے جھڑیں پھول بات کرنے میں!

اور اگر آپ کو زلفِ حسیناں ہی کی تشبیہ زیادہ پسند ہے تو مضمون پریشاں کو گیسوئے جاناں میں دلِ صد چاک کا شانہ سمجھئے ؎

یوں لائے واں سے ہم دلِ صد پارہ ڈھونڈ کر
دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اٹھا لیا

بکھرے موتی ڈورے میں پروئے نہیں تو پوٹلی میں باندھ کر یکجا کر دیے ہیں کہ کھوئے نہ جائیں۔ یہ تشبیہ بھی پسند نہ ہو تو مضمونِ پریشاں کو غالبؔ کے اس شعر کی شرح سمجھ لیجئے۔ ؎

نالہ پابندِ نے نہیں ہے   فریاد کی کوئی لے نہیں ہے

جس طرح زمانے کا ہنر نیرنگی ہے، اور مزاج یار کا تلوّن اداۓ حسن میں داخل ہے، یا جس طرح دنیا میں نشیب و فراز اور انسان کے لئے رنج و راحت ضرور ہے کہ ؎

رہیست پیشیم بسے نشیب است و فراز   کہ انجامش خبر ندارد آغاز
چوں نالہ عاشقاں پست و بلند   چوں وعدۂ گل رخاں دور و دراز

اسی طرح اس مضمون میں ایک ہی طرز کی پابندی شرط نہیں عقل کی نسبت شیخ سعدیؒ کا قول ہے کہ دنیا میں اس کی کمی نہیں مگر ساری ایک جگہ یا ایک ہی کے حصّے میں نہیں آئی۔ عالم میں بکھری پڑی ہے، اس کو جابجا سے جمع کرنا چاہیے۔ یہی تمہید مضمونِ پریشاں کی سمجھ لیجئے کہ اس میں ایک سے نہیں بلکہ مختلف طرز کے خیال جابجا سے جمع کئے گئے ہیں ؎

سُن کے کیا جانئے کیا کیا نہ کریں گے تا دیل
حالِ دل میرا وہاں خواب پریشاں ہوگا

مجھے معلوم نہیں کہ میرے مضامین میں لوگوں کو، مضمون پریشاں کیوں زیادہ پسند ہے حالانکہ بقول محمد صادق علی خاں اختر ؏

پریشاں سے کبھی دیکھا بھلا ہوتے پریشاں کا

اتفاق سے کبھی یہ مضمون ناغہ ہوجاتا ہے تو زلفِ پریشاں کی طرح لوگ مجھ سے برہم ہوجاتے ہیں۔

دنیا میں ہر چیز کا قحط ممکن ہے۔ قحط نہیں تو پریشانی کا نہیں۔ امیر، غریب، رند و پارسا، عورت و مرد، جوان بوڑھے کسی نہ کسی پریشانی میں مبتلا دیکھ لیجئے۔ زلفِ جاناں کی طرح یہ عیب گویا ہنر میں داخل ہے ؏

سر زلف تو نباشد سر زلفِ دگرے

از برائے دلِ ما قحطِ پریشانی نیست

لیکن اس مضمون میں مجھے یہ آرام ہے کہ ایک ہی لَے میں سارا راگ گانے کی ضرورت نہیں۔ ایک بات پسند نہ آئے تو دوسری سُنئے۔ چوک سے جی گھبرایا تو چاوڑی ہے، شہر میں جی نہ لگا تو باغ میں چلے گئے ؎

گہ شہر میں گہہ باغ میں گہہ کوہ میں پھرنا
اوقات ہیں مدت سے پریشاں ہمارے

اس میں لطف یہ ہے کہ کوئی چیز اجیرن نہیں معلوم دیتی ؎

دیر و حرم میں اسیکدے میں کوئے یار میں
سمجھے ہیں رند فرض عبادت کہاں کہاں

بے سروسامانی اور کم بضاعتی میں یہ طرز بہت مناسب ہے کہ تھوڑی پونجی، کچھ یہاں دکھائی کچھ وہاں، یا تھکے ہارے مسافر کی طرح یہاں ٹیکی لے لی پھر وہاں، لگاتار چلنے کی طاقت نہیں ؎

سودا بھی بھلا بے سروسامانی بھی اچھی
ہاتھ آئیں وہ زلفیں تو پریشانی بھی اچھی

جو خیال آپ سے آپ انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اگر سب لکھے جا سکیں تو عجیب دفتر پریشاں جمع ہو جائے۔ لیکن ان کا حال عجیب ہے۔ ذہن میں آتے ہی بوئے گل کی طرح پریشان ہو جاتے ہیں ؎

از حیا گاہے کہ نادانستہ خنداں میشود
رنگ بر رویش چو بوئے گل پریشاں میشود

خیالات کی نسبت بالزیک کا قول ہے کہ غلام گریز پا کی طرح اکثر دور نکل جاتے ہیں۔ ان کے پیچھے دوڑنا پڑتا ہے۔ کبھی ہاتھ آتے ہیں کبھی ہاتھ نہیں آتے — طفل اشک کی طرح کوئی آستین میں چھپ جاتا ہے کوئی دامن میں اصغر علی خاں نسیم کا شعر ہے ؎

افشائے محبت کا جو تھا خوف تو ہر اشک
آنکھوں میں چھپا تھا کوئی دامن میں نہاں تھا

ایسے خیال اکثر خود بخود پیدا ہوتے ہیں۔ کبھی اجل کی طرح بے طلب ہی آجاتے ہیں اور کبھی خیال یار کی طرح ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے ان کو قابو میں رکھنے کی تدبیر یہی ہے کہ جس وقت اور جیسے ذہن میں آئیں ان کو قلم برداشتہ لکھتا جائے — مضمون پریشاں کی یہی حقیقت ہے انگریزی میں اسے یوں کہہ لیجئے

STRAY THOUGHTS AND MUSINGS WITHOUT METHOD

آپ اپنے جی میں کہتے ہوں گے کہ اور مضمون تو آج نہیں کل۔ کل نہیں پرسوں، ہفتے میں نہیں تو عشرے میں۔ مہینے میں نہیں تو سال دو سال میں ختم ہوتے دیکھے، مضمون پریشاں ختم ہی نہیں ہوتا۔ مضمون پریشاں تو تب ختم ہو کہ چاہنے والوں کی شبِ فراق ختم ہو، آپ نے خیال نہیں کیا کہ گیسوئے جاناں پریشاں ہو کر دیر میں سلجھتے ہیں ؎

دانتوں شانے کو دمِ زیب پسینہ آیا
کبھی سلجھے نہ وہ اُلجھے ہوئے ابتر گیسو

سلسلۂ زلف کو شاعر تمام سلسلوں سے بڑا بتاتے ہیں۔ مضمون پریشاں کو بھی آپ خضر و الیاس کی عمر کا جواب سمجھیں۔ ؎

نہ جائے گا تصوّر کوئی دم گیسوئے جاناں کا
رہے گا آنکھ میں ڈورا رگِ خوابِ پریشاں کا

یہ طرزِ بیاں بُرا یا بھلا جیسا ہے عرصے سے صلائے عام کا حصّہ ہو گیا ہے اس طرز کی نسبت عجیب عجیب رائیں ہیں۔ زیادہ تر تو یہ طرز مختلف و اکثر غیر معمولی خیالات کا مجموعہ ہے، جو مضمونِ پریشاں کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔ کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر جہاں صلائے عام کا نام آئے گا، مضمونِ پریشاں کا ذکر بھی ضرور آئے گا۔ اس مضمون میں گو کوئی بات ایسی نہیں ہوتی جو کسی کے ذہن میں پہلے نہ آئی ہو، پھر بھی لوگ اسے نیا ہی سمجھتے ہیں۔ بعض تو حضرت غالب کے اشعار کی طرح مشکل بلکہ مہمل بتاتے ہیں مجھے یہ مشکل ہو رہی ہے کہ اسے ترک کروں یا رہنے دوں ؎

پڑا عجیب کشاکش میں آج سر میرا
وہ تیغ کے لئے سمجھا ہیں آستاں کیلئے

صلائے عام

"اس پیشانی کے سہارے مجھے بار بار لکھنے کی عادت ہو گئی ہے نئی نئی پیشانیاں لوحِ تقدیر کی طرح میرے بس کی نہیں۔ یہ قدرت کاتبِ تقدیر کو ہے کہ ہر شخص کی لوحِ پیشانی علیحدہ علیحدہ مختلف المضامین لکھی کہ ایک کی تقدیر دوسرے سے نہ ملے۔

مضمون کی سرخی (قلمی کتابوں میں اگلے خوشنویس مضمون کی پیشانیاں شنجرف سے لکھتے تھے اس لئے سُرخی کہنا ٹھیک تھا) اب انگریزی خواں مضمون کی پیشانی کو ہیڈنگ کہتے ہیں۔ ان الفاظ سے "مضمون کی پیشانی" مجھے زیادہ پسند ہے کہ انسان کی نظر پہلے چہرے پر جاتی ہے اور چہرے میں غزل کے مطلع کی طرح پیشانی پر سب سے پہلے نگاہ پڑتی ہے خواجہ وزیرؔ کا شعر ہے ؎

ادا سے پنجۂ پر نور ملتھے پر نہیں رکھا
یہ اُس نے لوح پر قرآن کے اللہ لکھا ہے

اس پیشانی کے تحت خدا جانے کتنی دفعہ میں نے ناظرین صلائے عام سے باتیں کی ہوں گی۔ پھیری کے فقیروں کی طرح جو اپنے لگے بندھے ٹھکانوں پر حسبِ عادت صدا لگاتے ہیں گو وہاں سے جو اب ملے نہ ملے صلائے عام کو بھی ہر پرچے میں کچھ نہ کچھ کہنا ضرور ؎

عیاں ہے اضطرابِ دل سے کیا خط میں لکھا ہوگا
بھروسا ہے تو کچھ قاصد کی تقریرِ زبانی کا

اور زبانوں میں یہ بات مشہور ہے کہ جو لوگ اچھی نظم لکھ سکتے ہیں ان کی نثر بھی اچھی ہوتی ہے، برخلاف اس کے ہماری زبان میں شعر کہنے والے لاجواب ہیں مگر نثر میں لکھنا مشکل، اور اب دنیا میں زبان کی ترقی کا مدار نثر پر آرہا ہے

ع ان میں سے کھنچے سے رہی حضرتِ واعظ
میں لے کے تبرک کے یہ انگور کر دوں کیا

نظم کو شاہدانِ بے پروا کی محبت سے تشبیہہ دیتے ہیں جنہیں اپنے اظہار شوق کی سینکڑوں گھاتیں آتی ہیں۔ اور نثر کسی حسین پردہ نشیں کی محبت سے مشابہ ہے جیسے بہت باتیں بنانی نہیں آتیں۔ نظم کی تمثیل ایسی گانے والی کی ہے جس کی شکل اور آواز دونوں اچھی ہیں۔ برخلاف اس کے نثر حسین پردہ نشیں ہے مگر آواز نکالتے ڈرتی ہے کہ کوئی غیر نہ سن لے۔ کچھ تو اس کی جھجک کچھ اس کے گھر والوں کی عادت کہ غیر ہی سے رسم وراہ زیادہ رکھتے ہیں ـــ اس کی رہی سہی زبان بھی لڑکھڑانے لگی۔

شاعری میں جو کچھ کہنا تھا کہہ لیا گیا۔ اب اس کی طرف سے اطمینان کر لینے میں زیادہ ہرج نہیں ہو سکتا۔ نثر کی طرف توجہ درکار ہے اور اسے بڑھانے اور ترقی دینے کے لئے زیادہ محنت زیادہ لیاقت دکھانے کی ضرورت ہے۔ شعرا کو تلامیذ الرحمٰن ہونے کی وجہ سے القا اور وجدان کا سہارا ہے۔ نثر میں کسب اور محنت کے بغیر کام نہیں چل سکتا لیکن نظم ہو یا نثر صلائے عام اپنی زبان کے سوا غیر کا قائل نہیں۔

پہلا اور آخری مضمون صلائے عام نے اپنی وضع پر اپنے نام کے عنوان سے لکھا ہے۔ یہ اس کی روش خاص ہوگئی ہے۔ ؎

خدا جانے وہ دل کیا ہے وگرنہ میرے نالوں نے
کیا ہے گرم پتھر کو کیا ہے نرم آہن کو

اس پرچے کا حجم گو ذرا کم ہے لیکن جس طرح مشک و عطر کے تولنے کے کانٹے اور ہوتے ہیں اور آٹا دال تولنے کے ترازو اور۔ لکڑیاں تولنے کے کانٹے اور ہوتے ہیں جواہرات تولنے کا کانٹا اور۔ کسی چیز کا حساب منوں سے لگایا جاتا ہے۔ اور کسی کا رتیوں ہیں، اسی طرح لٹریچر کی خوبی مضامین کی کثرت پر منحصر نہیں۔ میں نے آج تک نہیں سنا کہ لعل و یاقوت منوں سے تولے جاتے ہوں یا مشک و عنبر پنسیریوں سے۔ لٹریچر کی خوبیوں کا مدار نازک خیالیوں پر ہے کہ زلفِ حسیناں کی طرح مشکل مضامین میں موشگافیاں کی جائیں۔ نازک خیالیوں کے تولنے کے لئے دل و دماغ کا کانٹا درکار ہے خیال کی باریکیاں اسی کانٹے میں تُل سکتی ہیں، یہ کانٹا کبھی جھوٹا نہیں پڑتا اب کی دفعہ صلائے عام میں گو مضامین کی کثرت نہیں، کثرت مجھے زیادہ پسند نہیں۔ خیال ہے تو مضامین کی خوبیوں کا وہ آپ دیکھ ہی لیجئے۔۔۔۔

میں خود زیادہ نہ لکھ سکا قویٰ میں ضعف تو عرصے سے تھا، ان دنوں طبیعت زیادہ مضمحل ہوگئی، اور لکھنے پڑھنے میں زیادہ زور دینے سے طبیعت قابو سے نکل گئی۔ طبیعت کو اصلاح پر لانے کی تدبیریں جتنی ممکن ہیں ہو رہی ہیں۔ لیکن میں زیادہ معتقد دُعا کے اثر کا ہوں۔ اور دُعا بھی ایسی جو تقاضے اور التجا کی محتاج نہ ہو۔

اس بیماری میں مجھے خیال آیا کہ اللہ میاں کے پاس بیمار ہو کر جانا

مناسب نہیں کہ جس طرح قربانی کے لئے شرط ہے کہ ہر طرح صحیح و سالم ہو، اور کسی طرح کا کوئی نقص نہ ہو، اسی طرح اگر ہو سکے تو انسان بیمار ہو کر نہ مرے۔ میں فکر میں ہوں کہ پہلے مجھے صحت ہو جائے پھر مرنے نہ مرنے کا فیصلہ کیا جائے۔

ایک ہی بات کو دوبارہ کہنا عیوب فصاحت میں داخل ہے خاص کر ایسے شخص کے لئے جو ہر بات کو اس طرز سے ادا کیا چاہے کہ اس سے بہتر ذہن میں نہ آسکے۔ اس علالت میں مجھے اس بات کی شکایت رہی کہ ایک ہی ذکر بار بار زبان پر آیا اور اجیرن ہو گیا۔ عیادت کو آنے والوں سے وہی ذکر۔ خطوں میں وہی مضمون، خطوں کے جواب میں وہی، قصہ۔ دل اکتا گیا! ؎

الٰہی جیب کہ دامن کہ آستیں دھوؤں

مژہ نے سیکھ لیا شغل خوں فشانی کا

ضعیفی میں بیماری کوئی نئی بات نہیں جس کا ذکر اس قدر کیا جائے، نئی بات یہ ہے کہ میں جانبر ہوتا نظر آتا ہوں ؎

تصوّر تو اتنا غم فرقت سے نہ گھبرا

یہ رنج بھی دنیا میں ہیں ناداں کوئی دن کے

لب نہ بندم زِ فغاں تا نفسے ہست مرا

کہ خیانت بود از نالہ نفس دُزدیدن

مجھے اس سرخی کے نیچے کچھ نہ کچھ لکھنا ضرور۔ گو وہ بات جو لکھنی ہے پہلے کئی بار عرض کی جا چکی ہو۔ یہ بات تو آپ میرے کہے بغیر بھی دیکھ سکتے ہیں کہ اس

ہنسنے کا صلائے عام پچھلے سے اچھا ہے ؎

چراغ تربت مجنوں پہ آج روشن ہے
جنوں! بتا کہ کسی کی مراد آئی کیا

انسان جو تمنائیں خود کرتا ہے وہ پوری ہوں یا نہ ہوں مگر بے مانگے اتنی نعمتیں اسے حاصل ہیں جن کے شکر و سپاس کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ زندگی میں یاس سے زیادہ امید کا اثر ہے۔ اور حسرت سے زیادہ ارمانوں کا۔ بہار کا آپ کو اعتبار نہیں، یہ غلطی ہے، بہار کو ناپائیدار تو تب کہیے جب بہار پھر نہ آئے، جب ہر سال بے کہے آجاتی ہے تو اس سے زیادہ کیا بات اعتبار کے لائق ہو سکتی ہے؟ کیا مکتب کے لڑکے جمعے کا اعتبار نہیں کرتے جو آٹھویں روز خود بخود آجاتا ہے کیا رمضان کا آپ کو اعتبار ہے اور عید کا نہیں؟

بات یہ ہے کہ جس طرح تھیٹر میں ایکٹر لباس بدلنے کے لئے پردے کے اندر ہو جاتے ہیں، بہار بھی آپ کے لئے نیا جوڑا بدلنے کے لئے آڑ میں ہو جاتی ہے۔ ورنہ بہار کے دیکھنے والوں سے بہار زیادہ پائدار ہے۔ جب ہم بھی نہ رہیں گے تب بھی بہار اسی طرح آتی رہے گی۔

لیکن دنیا میں کوئی چیز پائدار ہو یا نہ ہو انسان کو اپنے بقائے نام کی سب سے زیادہ فکر رہتی ہے۔ انسان سے زیادہ قوموں کو بقائے نام کا خیال چاہیے۔ جس طرح انسان کا بقائے نام گو اولاد و جائداد و مال و اسباب سے سمجھا جاتا ہے مگر انسان کے طبعزاد (تصانیف) ان سے زیادہ پائیدار اور اعتبار کے لائق ہیں کہ انسان کے دل و دماغ کی یادگار یہی ہیں۔ اسی طرح قوموں میں گو ملک و مال راحت و آرام کا ہونا

اچھا ہے مگر دل و دماغ کی یادگار کی زیادہ ضرورت ہے۔ قدیم مصریوں
یونانیوں اور رومیوں کا زمانہ کب کا گذر گیا مگر اُن کی علمی یادگاریں اب
تک دنیا میں باقی ہیں۔ ان کے بعد کی اکثر قومیں مٹ کر فنا ہو گئیں کہ
انہوں نے دل و دماغ کی کوئی یادگار نہیں چھوڑی۔ زندگی سے غرض
محض پیٹ بھر لینا نہیں ہے۔ مکان میں باورچی خانے کی ضرورت سہی
مگر گول کمرے، نشست کے دالان اور بالاخانے مکان کی رونق کا
سبب ہوتے ہیں۔ انسان اپنی تمام عمر باورچی خانے میں بسر نہیں کر سکتا
نہ شائستہ و پاکیزہ مزاج بن سکتا ہے۔ آپ مال و دولت خوب
کمائیں مگر بقائے نام کے لئے دل و دماغ کی یادگار ضرور چھوڑیں۔

سب سے اچھی یادگار جو اس وقت بنی بنائی آپ کے پاس ہے
آپ کی زبان ہے۔ دنیا میں رنج ہو یا راحت، خوشی ہو یا غم، مصیبت زدہ
کو اُسی کی زبان میں تسلّی دینا چاہیے اور خوشی کی خبر بھی اُسی کی زبان میں
اچھی لگتی ہے۔ غرض دنیا کے بیشتر معاملات میں اپنی ہی زبان انسان کے
کام آتی ہے۔ اور زبان میں زیادہ تر نثر کہ جو بات اچھی طرح نثر میں ادا
ہو سکے اُس کے لئے نظم کی ضرورت نہیں۔

نظم کے رنگین ہونے میں کلام نہیں مگر باغبان جانتے ہیں کہ
جو پھول زیادہ خوش رنگ اور خوشبودار ہوتے ہیں وہ جلدی مرجھا
جاتے ہیں برخلاف اس کے جن پھولوں میں رنگ و بو بہت نہ ہو وہ
زیادہ ٹھہرتے ہیں اسی خیال سے رومیوں اور یونانیوں میں دستور تھا
کہ کسی کو یادگار میں جو ہار بناتے تھے وہ بے خوشبو کے پھولوں کے ہوتے تھے
ان کو امارٹیلز (غیر فانی) کہتے تھے، کیوں کہ وہ عرصے تک مرجھاتے

نہیں لکھتے۔ یہی حال نثر کا ہے کہ نظم اگر لاجواب نہیں تو نہ ہونے سے بدتر ہے، مگر نثر کیسی ہی کیوں نہ ہو دیرپا اور بکار آمد ہے۔ صلائے عام نے اب تک جتنا لکھا تھوڑا نہیں ہے مگر ابھی اسے بہت کچھ لکھنا ہے ؎

اے کردگار کاتب اعمال اور بھیج

افسانہ بڑھ گیا ہے بہت میرے حال کا

صلائے عام کسی کی تعریف کا محتاج نہیں اور شکایتیں کرنے والے خود تھک کر بیٹھ گئے۔ اسے اپنے کام سے کام رہا۔ نہ شکایت سے رنج ہوا نہ تعریف سے خوشی ؎

دیکھ آئینے میں عکس کو تو اپنے شوق سے

پر دھیان رکھ دہن کے مقابل دہن نہ ہو

صلائے عام کے دماغ میں یہ خلل سمایا ہوا ہے کہ جو بات ہمیں اپنی زبان میں حاصل ہے غیر کے لئے مشکل ہے۔ اسے اپنی چیز پر ناز ہے، اوروں کو غیروں پر ؎

جلوے کی آزمائشیں کیوں کوہِ طور پر　　　اے حسنِ شوخ یہ بھی ہمارا جگر ہوا

اوّل تو پیام اپنا اور خاص اپنے قلب و روح کا، کسی غیر کا نہیں، دوسرے قاصد کو بات کرنے کا سلیقہ اچھا۔ یہ بات مشکل سے میسر ہوتی ہے۔ اس باغ کی بہار تو بہار، خزاں بھی اگلی بہاروں کا رنگ اڑا لائی ہے۔ جہاں شوقِ فسردہ ہمدمِ برق و شرر ہے۔ دامنِ تر سے زیادہ دیدۂ تر کا اثر ہے حضرت راسخ فرماتے ہیں ؎

اپنے جنوں کا آپ ہی کرتے ہیں ہم علاج

تعویذ دھو کے پیتے ہیں مجنوں کی گور کا

کیا ہوگیا جو زخمِ جگر ہو گئے ہرے ..... شاید جوان پھر کے سپہرِ کہن ہوا

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ابنائے زماں کی بے قدری نے ہماری زبان کی خوبیوں اور ہمارے خیال کی بھلائیوں کو کیسا بھلا رکھا ہے۔ آج کل جوانوں کی ساری ہمت اس بات میں صرف ہو رہی ہے کہ اگلوں کا نام مٹے ان کی نہ کوئی یادگار باقی رہے نہ کوئی قدردان، انھیں کون سمجھائے کہ ان کی سب سے بڑی یادگار ہماری زبان ہے جس کی خوبیوں کو دنیا کی کوئی زبان نہیں پہنچتی جو بات اپنی زبان میں ہے دوسری میں کہاں۔ یہ بادۂ کہن کسے میسّر ہے۔ یہ جلوۂ سخن کسے نصیب ہے۔ اپنی زبان میں ہر خیال پری خانہ بن جاتا ہے۔ اپنی زبان کی لغزش میں بھی لغزشِ مستانہ کا لطف آتا ہے ؎

قبرِ شہید چھوڑ کے سہرے ہیں جو گندھا

وہ پھول چشمِ عشق میں ننگِ چمن ہوا

غیر زبانوں کے شور اور اجنبی خیالوں کے ہجوم میں ہم اپنے سے بیگانہ ہو گئے لیکن جس طرح سفر میں جب کوئی اپنی زبان کا سمجھنے والا مل جاتا ہے تو اُس سے کس شوق سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اسی طرح صلائے عام آپ کو بچھڑے ہوؤں سے ملا رہا ہے۔ آج کل کی صحبت میں یادِ رفتگاں کی کیفیت دکھلا رہا ہے ؎

چھالے پڑے ہیں گو تفِ دل سے زبان پر

اس پر بھی کوتہی نہیں کرتے فغاں میں ہم

صلائے عام نیت کر چکا ہے کہ ابنائے زماں کی طرف سے قدر ہو یا نہ ہو مشغلہ ہاتھ سے نہ جانے دیگا۔ ہزار مدافع ہوں مگر صلائے عام جاری رہے گا۔ لاکھ جورِ آسماں ہوں مگر یہ نہ رکے گا۔ ہم نے سمجھ لیا ہے کہ جب ہماری زبان مٹنے والی ہے تو فغاں کرنے کو کون منع کرتا ہے ؎

کرلیں قفس میں کھول کے دل، خوب چہچہے
آخر تو ایک دن دمِ خنجر ہے اور ہم

اور اگر قسمت سے ہماری زبان بچ گئی اور اس کی قدر بھی ہونے لگی تو پھر دن رات یہی شغل جاری رہے گا ؎

گراب کے میکدے میں ہمیں بخت لے گئے
پھر دیکھنا کہ شیشہ ہے ساغر ہے اور ہم

تب تک، جس طرح بچھڑے ہوئے ملتے ہیں تو وعدے ہوتے ہیں کہ اب بے وفائی نہ ہوگی، قسمیں کھائی جاتی ہیں کہ آیندہ کج ادائی نہ ہوگی، سامان ہو رہا ہے کہ صلائے عام کا ہر پرچہ پچھلے پرچے سے بڑھ کر نکلے اور مضامین بھی ایسے ہوں جو اُردو کیا ہر زبان کی لٹریچر کی جان ہوں ؎

اے مصحفی مرغانِ چمن ہو گئے خاموش
گلشن میں اگر زمزمہ پرداز ہوئے تم

راقم:
تُو تو کافر نہیں خدا کی قسم
تیری کافر زبان ہے کافر

" اس قدر لکھنے کے بعد جی چاہتا ہے کہ ایشیائی طرز کے موافق کچھ تعلّی بھی چاہیے۔ ؎

کس کام پھر تو اے دلِ ناشاد آئے گا
پھر تجھ کہاں یہ موسمِ فریاد آئے گا

خاص کر جبکہ اپنی زبان کی بے قدری دیکھتے دیکھتے دل پک جائے تو بقول حضرتِ سعدیؒ "ہر چہ در دل آید بگوید" ؎

تم دیدۂ گریاں کو کہا کرتے ہو ناسور
میں ضد سے لئے ابرِ گہر بار کہوں گا

آپ اپنی زبان کو بہت ذلیل سمجھتے تھے نا؟ صلائے عام نے ثابت کر دیا کہ ذلت تو کیا اس خوبیٔ نزاکت کی زبان دوسری نہیں ؎

باغِ جہاں میں سرو سخن گو کہیں نہیں
گلشن میں آپ کو دمِ تقریر لائیے

معمولی لیاقت کے لوگ شکایت کرتے ہیں کہ میں فلسفیانہ طرز پر زیادہ لکھتا ہوں۔ ان سے کون کہے کہ یہ تو آپ کی زبان کے ساتھ بڑا سلوک ہے کہ اُردو کی نسبت جو الزام تھا کہ اس میں زلف و سنبل کے مضامین کے سوا اور کوئی گنجائش نہیں، یہ الزام مٹا جاتا ہے اور خوبیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ فلسفیانہ مضامین جو کسی زبان میں شاعرانہ طرز پر نہ ہوں گے پیدا ہو گئے، اور فلاسفی و تحقیق نے جنھیں کوئی زہد خشک کی طرح پوچھتا نہ تھا۔ ایسی دلکش صورت اختیار کر لی ؎

نظر کر دمبدم دلدار کے رخسار و کاکل پر
نظیر اے فلسفی چاہے اگر دور و تسلسل پر "

صلائے عام کے دور تسلسل کی یہ کیفیت رہی کہ ۱۹۰۸ء سے لیکر ۱۹۱۹ء تک مسلسل جاری رہا۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۲ء تک بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر اس کی اشاعت ملتوی رہی۔ ۱۹۲۲ء میں جب میر ناصر علی ریاست پاٹودی کی چیف منسٹری سے سبکدوش ہوکر مستقل طور پر دلی آگئے تو اپنے پریس "مطبع ناصری" کو پھر سے دُرست کیا، اور صلائے عام پھر جاری ہوگیا۔ اس وقت میر ناصر علی کی عمر ۷۵ سال کی تھی۔ اپنے اس دوسرے دور میں 'صلائے عام' ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک یعنی میر صاحب کی آخری علالت تک مسلسل شائع ہوتا رہا۔ یعنی درمیانی تین سال کا وقفہ چھوڑ کر صلائے عام فی الجملہ بائیس برس سے کچھ زیادہ عرصے تک جاری رہا۔ اس دور کے ادبی رسائل کی عمر طبعی کے مقابلے میں یہ مدّت کہیں زیادہ ہے۔

میر ناصر علی نے چھپن[۵۶] برس تک صحیفہ نگاری کی۔ اس میں "تیرھویں صدی" سے پہلے کے مضامین کا شمار نہیں جو میر صاحب وقتاً فوقتاً "دبدبۂ آصفی" "آگرہ اخبار" وغیرہ کے لئے لکھا کرتے تھے۔ ادارت کا سلسلہ "تیرھویں صدی" کے اجرا سے ۱۸۷۹ء میں شروع ہوا اور صلائے عام کے آخری پرچے نومبر ۱۹۳۲ء تک جاری رہا۔ یہ ذکر شاید ہو چکا ہے کہ صحافت یا ادارت کسی سے بھی میر صاحب کو کسی قسم کی منفعت مقصود نہ تھی اور صلائے عام تو سرتا سر اُن کے شوق اور لگن کا نتیجہ تھا۔ آمدنی تو کجا خود اپنا خرچ بھی پورا نہ کرسکتا تھا۔ ہر مہینے رقم کی رقم اس کی نذر ہوجاتی تھی۔ دورِ اوّل میں شاید تین چار ہزار چھپتا ہو، اس کے بعد تو اس کی اشاعت گھٹتے گھٹتے صرف چند سو ہی رہ گئی تھی بڑھیا کاغذ پر نہایت نفیس کتابت وطباعت سے مُرصّع شائع ہوتا اور احباب میں مفت تقسیم ہوجاتا تھا۔ اسی لئے اس کا نہ کوئی باقاعدہ دفتر تھا نہ کوئی منشی یا محرّر۔ سارا کام میر صاحب اپنے شوق سے

خود ہی کرتے تھے، خود ہی ڈاک دیکھتے، خطوں کے جوابات لکھتے، خود ہی کاپیاں پڑھتے، اور خود ہی پروف دیکھتے۔ آخر دور میں تو کاپیاں اور پروف دیکھنے کی مد بھی ختم ہو گئی تھی کہ میر احمد صاحب (مصنف رقم) جنھوں نے ساری عمر صلائے عام کی کتابت کی، خود ہی کاپیاں اور پروف پڑھ کر تصحیح کر لیتے تھے، مطبع ناصری کا باقی کام انھی کے صاحبزادے سید آحمد کے سپرد تھا۔ آخری دور میں پتے لکھنے اور روانگی کا کام میر ناصر علی کے بڑے صاحبزادے سید نصیر علی صاحب نے سنبھال لیا تھا۔

منتخب مضامین کی اشاعت

ممکن ہے بعض حضرات کے ذہن میں یہ سوال کھٹکتا رہے کہ جب فراغت و آسائش بھی تھی، صلائے عام ابھی جاری تھا، اور مطبع ناصری بھی قایم تھا تو قدردانوں کے اتنے اصرار کے باوجود میر ناصر علی اپنی حیات میں اپنے منتخب مضامین کیوں نہ شائع کر سکے۔؟ اس سوال کا جواب خود میر ناصر علی کی تحریروں سے مل سکتا ہے، اس جلد میں شامل بعض مضامین میں بھی اس بارے میں معنی خیز اشارات پائے جاتے ہیں۔ ان مختلف حوالوں کو یکجا کر کے ان سے مجموعی طور پر نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے خاصی محنت اور دقت نظر درکار ہے مبصرین کی سہولت کے لئے میں چند ایسے مضامین سے بھی جو اس جلد میں شائع نہیں اور دیگر مقامات سے جو کہیں اور نقل نہیں کئے گئے۔ اور شاید اب بآسانی دستیاب بھی نہ ہو سکیں۔ چند اقتباسات پیش کئے دیتا ہوں اور اپنی حقیر معلومات کی بنا پر اس ضمن میں چند لائق غور باتیں بھی عرض کرتا ہوں جن سے اس سوال کا جواب پانے میں کچھ مدد مل سکے۔

پہلی بات جو ملحوظِ خاطر رہے یہ ہے کہ میر ناصر علی اوّلاً اور اختصاصاً صحیفہ نگار ہی تھے اور طبعی طور پر رسائل کے لئے مختلف عنوانات پر چھوٹے چھوٹے انشایئے لکھنا ہی پسند کرتے تھے۔ اپنی مدت العمر تک اسی اسلوب انشا پردازی میں مصروف رہے۔ کسی ایک موضوع پر کوئی مستقل کتاب تصنیف کرنے کا اُنہیں فطری طور پر ذوق نہ تھا۔ قصّہ گوئی یا افسانہ نگاری بھی اُنہیں مرغوب نہ تھی جو ناول یا افسانوں کے مجموعے شائع کرتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اپنے مختلف و منتشر مضامین کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا اُن کا خود کبھی خیال نہ تھا۔ چنانچہ تیرھویں صدی (۱۸۷۶ء) سے لے کر صلائے عام کے ابتدائی دور (۱۹۰۹ء) تک منتخب مضامین کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا کہیں اور کبھی ذکر تک نہیں پایا جاتا۔ نہ اُن کی طرف سے نہ اُن کے کسی قدر دان کی طرف سے کبھی اس قسم کی تحریک ہوئی۔ میری حقیر دانست میں اُس دَور میں مختلف مضامین کے مجموعوں کی اشاعت کا اس قدر اہتمام اور رواج بھی نہ تھا۔ ادیبوں کو اپنے مضامین خود مرتب کرکے شائع کرانے کا شوق بھی اتنا عام نہ تھا۔ سرسیّد اور اُس دور کے اکثر صحیفہ نگاروں کے مختلف مضامین کے مجموعے بھی اُن کے بعد ہی اور اصحاب نے مرتب کرکے شائع کیے۔ پھر میر ناصر علی کو اپنی مضمون نگاری سے اپنی پوری ادبی حیات میں کبھی کسی قسم کی تجارت یا مالی منفعت بھی مقصود نہ تھی کہ یہی غرض محرک بن سکتی۔

میر ناصر علی کے منتخب مضامین کی اشاعت کی تجویز پہلی بار مہدی حسن مرحوم کی "کھلی چٹھی بنام خان بہادر میر ناصر علی" (مطبوعہ مشرق ۱۹۰۹ء) سے منظرِ عام پر آئی۔ لیکن اُن کی اس قدر شدید ترغیب بھی میر صاحب مرحوم کو اس کے لئے آمادہ نہ کرسکی۔ اور میر صاحب نے اپنے جوابی مضمون "حُسنِ تحسینِ مضمون"

میں مہدی حسن مرحوم کو بھی یہی کہہ کر ٹالنا چاہا کہ۔ ۔ ۔ ۔

"آپ جوان ہو کر بوڑھے کو ستاتے ہیں۔ جو بات مجھ سے چاہتے ہیں آپ خود مجھ سے بہتر کر سکتے ہیں۔ ۔ ۔"

(محلِ نظر ہے کہ خود افاداتِ مہدی، مہدی حسن مرحوم کی وفات کے کئی سال بعد شائع ہوئی)

"کھلی چٹھی" نے اُس وقت کے ادبی حلقوں میں خاصا ہنگامہ برپا کر دیا اور میر ناصر علی کے متعدد قدر شناس مسلسل یہی تقاضے کرنے لگے۔ یہ سلسلہ کم و بیش اُن کی بقیہ عمر تک چلتا رہا۔ مہدی حسن کی "کھلی چٹھی" کی اشاعت کے پانچ برس بعد کا ایک حوالہ پیش کرتا ہوں۔ ایک قدر دان کے اسی تقاضے کے خط کے جواب میں میر ناصر علی نے لکھا:۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کا اصرار بجا، لیکن مضامین کے انتخاب کی دردسری کون مول لے۔ میرے لئے اتنا ہی مشکل ہے جتنا اس وقت صلائے عام کے لئے لکھ لیتا ہوں۔ پھر "مضمون پریشاں" بھی مضمونوں میں کوئی مضمون ہے، جس کے مجموعے کی اشاعت کے لئے آپ اس قدر درپے ہیں۔ بیکاری میں محض دل و دماغ کو خوش کر لینے کا مشغلہ ہے۔ اس میں کی کچھ نازک خیالیاں کبھی کبھی اچھی طبیعتوں کو پسند آجاتی ہیں۔ ورنہ نری آہ و فغاں ہی ہے اسے اسی حالت میں جب تک چل سکے چلنے دیجئے۔ یہ کتاب میں آ نہیں سکتا ؎

برسوں رہا ہے صدمہ کشِ اشک وآہ دل

یہ نسخہ ہے کچھ آب زدہ کچھ جلا ہوا۔

(صلائے عام نومبر ۱۹۱۴ء)

جب قدر دانوں کا اصرار بڑھتا گیا تو میر صاحب انتخاب کی اشاعت پر کچھ آمادہ سے ہو گئے، لیکن ہمیشہ اسی دشواری کا ذکر کرتے رہے کہ پچھلے پرچے دستیاب نہیں ہوتے۔ واقعتاً "تیرھویں صدی" "زمانہ" "افسانۂ ایام" اور "ناصری" کا تو سرے سے کوئی ریکارڈ ہی نہ تھا۔ پہلے دونوں رسالے آگرہ اخبار آگرہ سے نکلتے تھے، ان کی جلدیں اگر ہوتیں تو وہیں ہوتیں، دلّی میں ان کی ایک کاپی بھی نہ تھی۔ میر صاحب مرحوم نے بارہا خواجہ محمد یوسف صاحب مالک آگرہ اخبار کو پرانے پرچوں کے بارے میں لکھا بھی لیکن وہاں سے ایک پرچا بھی دستیاب نہ ہو سکا۔

"افسانۂ ایام" اور "ناصری" کے پرانے فائل بھی نصرت المطابع کے مستنصر پریس میں مدغم ہو جانے کی وجہ سے اور انگریزی ٹائپ کی چھپائی کے اہتمام میں پارینہ دفتر کے ساتھ گاؤ خورد ہو چکے تھے۔ لے دے کے میر صاحب کا آخری رسالہ صلائے عام رہ گیا تھا۔ جس سے انتخاب ممکن ہو سکتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اس کے بھی پچھلے پرچے نہ ملتے تھے۔ دفتر میں کبھی کوئی ریکارڈ نہ تھا۔ شائع ہوتے ہی ساری کاپیاں تقسیم ہو جاتی تھیں۔ بلکہ یہاں تک بھی ہوا کہ کسی مہینے کا پرچہ اگر چند احباب کو نہ مل سکا تو دوبارہ چھپوایا گیا اور اسی طرح پھر سب کی سب کاپیاں مفت نذر ہو گئیں۔ میر صاحب نے پرانے پرچوں کے بارے میں صلائے عام میں کئی بار لکھا، علیحدہ اشتہار بھی شائع کئے، احباب کو بھی خطوط لکھے لیکن سب بے سود۔ اسی طرز کے ایک نوٹ کا اقتباس ملاحظہ ہو، یہ مہدی حسن کی "کھلی چٹھی" کے شائع ہونے کے دس برس بعد کا ہے:۔

"........ صلائے عام کے پچھلے پرچے کمریار کی طرح نظر نہیں آتے اور جس طرح شعرائے ماضی و حال اس کی تلاش میں رہے، مجھے صلائے عام کے پچھلے پرچوں کی تلاش ہے۔ ان کی اس قدر درخواستیں آ رہی ہیں کہ

ان کا جمع کر کے پھر سے چھاپنا ضرور ہوا۔ بلکہ تازہ پرچے بھی بارہا دوبارہ چھاپنے پڑے۔ پچھلے ماہ کا پرچہ بعض احباب کو نہ مل سکا۔ حالانکہ یہاں سے احتیاط کے ساتھ روانہ کیا گیا تھا۔ انہوں نے ازراہِ قدرشناسی گلہ کیا۔ میرے پاس بھی کوئی کاپی نہ تھی۔ اپنی خفت مٹانے کے لئے دوبارہ چھاپ کر ان کی خدمت میں پھر روانہ کیا، اور اتنی ہی احتیاط کے ساتھ۔ اب بھی نہ ملا تو مطبع ناصری کو پھر چھاپنا پڑے گا — آپ نے دیکھا، اس وقت اُردو کا کوئی اور رسالہ ہے جو اس طرح دو دو بار چھپ کر شائع ہو۔ لیکن یہ بات قدردانوں سے آہستہ سے کہنے کی ہے ؎

آسودگانِ خاک نہ چونک اٹھیں پھر کہیں
آہستہ ذکر چاہیے اس بُت کی چال کا

ملتجی ہوں کہ جن اصحاب کے پاس صلائے عام کے پُرانے پرچے ہوں ازراہِ کرم عاریتاً یا قیمتاً عنایت فرمائیں۔ احباب کا تقاضا ہے کہ پچھلے پرچوں میں جو مضامین انشا وادب کی خوبیوں کے ہیں ان کا انتخاب کتاب کی صورت میں شائع کر دیا جائے۔ اس لئے پچھلے پرچوں کی اور بھی تلاش ہے .....“

(صلائے عام۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء)

ایسی متعدد التجاؤں کے باوجود صلائے عام کے پچھلے پرچے کسی طرح فراہم نہ ہونے تھے نہ ہوئے — قدردانوں کے ذوق کا یہ عالم تھا کہ ہاتھوں ہاتھ صلائے عام مختلف حلقوں میں گردش کرتا رہتا تھا اور جس کے ہاتھ لگ جاتا تھا وہ اسے کسی قیمت پر بھی دینے کو آمادہ نہ ہوتا تھا غرض اسی طرح سال در سال گزرتے چلے گئے۔ اب پچھلے پرچوں کی گم شدگی کے ساتھ ساتھ میر صاحب کی ضعیفی بھی ایک عذر بن گئی

اور حقیقتاً میر صاحب کی عمر اب پچھتّر سال سے متجاوز تھی۔ "کھلی چٹھی" کو شائع ہوئے بیس برس ہو چکے تھے، جب ایک دیرینہ قدر شناس نے پھر انتخاب کا ذکر کر کے میر صاحب کو اُکسانا چاہا!

".... آج کل "صلائے عام" کے پُرانے پرچے دُہرا رہا ہوں۔ اور عجب کیف کا عالم ہے۔ آپ تو اس مٹتی ہوئی زبان کی جان ہی ہیں — خدا سلامت رکھے ...... عرصہ ہوا آپ نے ارادہ ظاہر کیا تھا کہ اپنے چیدہ مضامین کتابی صورت میں شائع کریں گے۔ خدارا اس اہم کام کو جلد ہی پورا کر دیجئے۔ اب تو اشتیاق مایوسی بنتا جا رہا ہے..."

تو میر صاحب نے "صلائے عام کی ڈاک" میں یہ خط نقل کرتے ہوئے اس کے جواب میں لکھا!

...... اس کا ارادہ قطعی ہو رہا ہے۔ لیکن اپنی ضعیفی کی وجہ سے مضامین کے انتخاب کرنے کی ہمت نہیں۔ آپ کے پاس پُرانے پرچے موجود ہیں۔ آپ یا آپ کی طرح میرے دیرینہ کرمفرماؤں میں سے کوئی صاحب یہ کام اپنے ذمے لے لیں۔ مجھے اپنے مضمونوں میں سے اچھا کونسا ہے اور چھوڑ دینے کے لائق کونسا ہے، امتیاز کرنا ذرا مشکل ہے ...... یا اتنا کیجئے کہ پرانے پرچوں میں سے آپ اپنی پسند کے مضامین چھانٹ دیں، پھر میں دیکھ لوں گا کہ دوبارہ کتابی شکل میں شائع ہونے کے لائق کون کون سے ہیں۔ اور اس وقت جلدی میں جو غلطیاں رہ گئی تھیں، انہیں درست کر دوں گا..... اس انتخاب کا آدھا ثواب آپ کو ہوگا — باقی ثواب پڑھنے والوں کو پہنچ جائے گا۔ اکثر احباب جو اس کا تقاضا کرتے رہے ہیں آپ کے احسان مند ہوں گے۔ خاص کر میں سب سے زیادہ کہ

آپ نے اس دردِ سر سے مجھے بچا لیا ؎

جو جو عذاب دستِ جنوں ہم نے جھیلے ہیں

ان سب کا روحِ قیس کو یارب ثواب ہو

(صلائے عام دسمبر ۱۹۲۹ء)

جنوری ۱۹۳۰ء سے کہ صلائے عام ابھی جاری تھا رسالہ ساقی دہلی کا اجرا ہوا جس کی ادارت میں، میں بھی معاون کی حیثیت سے شامل تھا۔ میر صاحب نے "صلائے عام" میں اس کا خیر مقدم کیا۔ اور اپنے بے مثل رنگ میں ریویو بھی شائع کیا۔ طوالت کے خوف سے اس کا اقتباس پیش نہیں کیا جا سکتا۔ نومبر ۱۹۳۰ء کو ساقی کا پہلا دلی نمبر شائع ہوا جو میر ناصر علی کے نام ہی معنون تھا اس کا ریویو بھی صلائے عام میں شائع ہوا۔ صرف ایک دلچسپ جملہ سن لیجئے:۔

"....... رسالہ ساقی دہلی کا احسان ہے کہ اس کے "دلی نمبر" نے مجھے زندہ کر دیا۔ زلیخا کی دوبارہ جوانی کی طرح مجھ میں پھر جان آ گئی ؎

نمیرد آنکہ دادِ بندگی داد   خدا اورا دوبارہ زندگی داد"

ساقی کے ابتدائی پرچوں میں بالالتزام ماہ بہ ماہ میر ناصر علی صاحب کا کوئی پرانا مضمون درج کیا جاتا تھا۔ بھائی شاہد احمد صاحب کے والد ماجد مولوی بشیر الدین احمد صاحب (جو صلائے عام کے بھی مضمون نگار تھے) کے کتب خانے میں کچھ پرانے پرچے صلائے عام کے تھے۔ کچھ پرانے پرچے برادرم سید ولایت حسین کے پاس بھی تھے۔ انہی سے یہ پرانے مضامین نقل کر لئے جاتے تھے۔ اس کے بارے میں میر صاحب نے ایک بار صلائے عام میں یہ نوٹ لکھا جس سے انتخاب مضامین شائع کرنے کی تجویز کی گویا تجدید ہوئی۔

"..... میں جناب شاہد احمد صاحب مدیر رسالہ ساقی کا احسان مند

ہوں کہ آپ نے صلائے عام کے چند پرانے مضامین ساقی میں درج فرمائے مجھے اقتباس کا یہ طرز اس لئے پسند آیا کہ عرصے سے تقاضا ہے کہ "صلائے عام" کے منتخب مضامین کتابی صورت میں شائع کئے جائیں اپنی زیادہ ضعیفی کی وجہ سے مجھے صلائے عام کے گزشتہ مضامین منتخب کرنے کی ہمت نہیں۔ اگر کوئی صاحب انتخاب کرنے کی تکلیف گوارا فرمائیں تو میں تقاضے سے بچ جاؤں، اور صلائے عام کے قدر شناس بھی خوش ہوں . . . . . ."

(صلائے عام۔ مارچ ۱۹۲۰ء)

اسی طرح ماہ ستمبر ۱۹۲۱ء کے ساقی میں اپنے "چند مضامین پریشان" کے اقتباسات دیکھ کر میر صاحب نے صلائے عام میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا!

". . . . . . یہ مضمون دراصل صلائے عام کے "چند مضامین پریشاں" کا انتخاب ہے، جو صاحب رسالہ ساقی کو پسند آئے۔ وہ خود بہت اچھے مضامین لکھتے ہیں اور صلائے عام کے اچھے مضامین کا طرز پسند کرتے ہیں ؎

تھا طرحدار آپ بھی لیکن رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن

عرصے سے ایسے مضامین کو یکجا کتابی صورت میں شائع کرنے کے تقاضے ہو رہے ہیں۔ لیکن اس عمر میں یہ دردِ سر میرے بس کا نہیں ؎

پیری میں کس امید پر اس دردِ سر کی لو

ہستی پہ اپنی ہنستی ہے شمعِ سحر کی لو۔"

(صلائے عام۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء)

اس قسم کا آخری نوٹ جو صلائے عام میں شائع ہوا اُس کا یہ اقتباس دیکھئے۔

اس میں صلائے عام کے پُرانے پرچے پھر فراہم نہ ہونے کے بارے میں کیسا درد اور سوز پایا جاتا ہے۔

"...... میں چاہتا ہوں کہ ساقی جیسے نئے خیال اور نئی وضع کے رسالوں میں صلائے عام کے مضامین زیادہ نقل ہوتے رہیں کہ زیادہ عمر ہو جانے کی وجہ سے ہیں خود تو لکھنے پڑھنے کے کام کا نہیں مگر اس طرح کے پُرانے مضامین کبھی کبھی دیکھنے میں آجائیں تو بُرا نہیں ؎

ساقیِٔ بزم مجھے دیکھ کے آنکھیں نہ چُرا

انھی پیمانوں سے دیدے انھی پیمانوں میں

صلائے عام کے پُرانے پرچے خود میرے لئے عنقا ہو گئے ع

پَر نکالے مرے مضمون نے عنقا ہو کر

لیکن ایسے یارِ بے وفا کی طرح جس کے انتظار میں عمر بھر خونِ دل پانی کیا ہو اور جو ایک بار شکل دکھا کر ہمیشہ کے لئے خفا ہو جائے۔ یہ پُرانے طبعزاد بھی کبھی کبھی بُری طرح یاد آتے ہیں جواب مجھ سے بچھڑ گئے ؎

روؤں دل و جگر کے لئے کیوں نہ عشق میں

اس سے اِنہی کی گود کے پالے بچھڑ گئے

اور اب تو یہ کہانی باقی ہی کتنی رہ گئی ہے۔ بقول جناب عزیز ؎

ختم ہی سمجھو زندگی کے دن کچھ ورق اور رہیں فسانے کے"

(صلائے عام ۱۹۳۲ء)

ساقی کے اجرا کے بعد سے میر صاحب کے منتخب مضامین کی اشاعت کے مسئلے کی ایک طرح سے تجدید ہوئی اور ہم حقیر خوردوں کو بھی اس ضمن میں

میر صاحب مرحوم سے اصرار کرنے کی جرأت ہوئی۔

مقاماتِ ناصری

یاد ش بخیر ایک بار بھائی شاہد احمد صاحب اور میں خدمت میں حاضر تھے، اُن دنوں حضرت علیل تھے۔ بصارت میں بھی ضعف آچلا تھا۔ بھائی شاہد احمد صاحب تازہ ساقی خدمت میں پیش کرنے کے لئے لائے تھے۔ اس میں بھی اُن کا ایک پُرانا مضمون شائع ہوا تھا۔ مجھے وہ مضمون پڑھ کر سنانے کا حکم ملا۔ (اس خدمت کی اکثر سعادت حاصل ہوتی رہتی تھی۔ اور اکثر بعض الفاظ کے غلط تلفظ یا اضافت کے حذف ہو جانے پر ٹوکا جاتا تھا) حضرت بے حد محظوظ ہوئے، اور بعض جملوں کو بار بار سن کر لطف لیتے رہے۔ بھائی شاہد احمد صاحب نے باتوں باتوں میں پھر انتخاب شائع کرنے کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ حضرت کچھ چیں بہ جبیں ہوئے پھر بڑے دکھ کے ساتھ پُرانے پرچوں کی گمشدگی پر افسوس کرتے رہے۔ میں نے انہیں اس قدر پُر ملال کبھی نہیں دیکھا۔ جب بھائی شاہد احمد صاحب نے عرض کیا کہ جس قدر مضامین دستیاب ہو چکے ہیں وہی شایع کر دیے جائیں کیوں کہ ان کی تعداد بھی کافی ہے۔ (ساقی ہی میں اُن کے جتنے مضامین دوبارہ چھپ چکے تھے ان کی مجموعی ضخامت کئی سو صفحات تھی) تو حضرت اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ مُصر تھے کہ جب تک 'تیرھویں صدی' سے لے کر 'صلائے عام' کے اولین دور کے مضامین بھی مجموعے میں شامل نہ ہوں، انتخاب شائع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، حضرت کے نزدیک وہی دور آپ کی انشا پردازی کا بہترین دور تھا۔ ارادہ ظاہر فرمایا کہ صحت یاب ہوتے ہی اپنے احباب کو بالخصوص چند انگریز دوستوں کو پُرانے پرچوں کی فراہمی کے لئے پھر خطوط لکھوائیں گے۔ جن میں سے چند اصحاب کا نام لے لے کر

فرمایا کہ اُن کے پاس اُس دور کا پورا ریکارڈ محفوظ ہے مجھے ان اصحاب کے نام یاد رکھنے اور حضرت کو ان کے نام خطوط لکھوانے کی یاددہانی کی تاکید فرمائی۔

اسی یادگار صحبت میں حضرت نے اپنے منتخب مضامین کے لئے "مقاماتِ ناصری" کا نام تجویز فرمایا۔

رحلت

افسوس کہ حضرت کو اس علالت سے صحت یاب ہونا نصیب نہ ہوا۔ حالت روز بروز بگڑتی ہی گئی۔ عمر شریف ۸۶ سال ہو چکی تھی۔ قویٰ مضمحل ہو چکے تھے۔ ہاتھ میں رعشہ اور بصارت میں ضعف آچکا تھا۔ نقاہت کا غلبہ ہوتا گیا۔ بے حد ناتواں اور نحیف ہو گئے تھے — لیکن حافظہ، اور ذوقِ شعری نے اس عالم میں بھی ساتھ نہ چھوڑا تھا۔ ۱۲ جون ۱۹۳۳ء کو حضرت کی ساری اولاد در اولاد اور دیگر اعزا جمع تھے، آپ پر صبح سے غنودگی کی سی کیفیت طاری تھی۔ میرے والد ماجد نے بڑی لجاجت سے عرض کیا کہ یہ سب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ ان کی خاطر ایک بار آنکھیں کھول دیجئے۔ حضرت نے بمشکل آنکھیں کھولیں سب کو بغور دیکھا اور فرمایا تو بس اتنا ؎

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم
ہو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کرے

اور پھر ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ اور اپنے خالق و معبود سے جا ملے انا للہ و انا الیہ راجعون۔ آپ کے ساتھ لگ بھگ ایک صدی کی عظیم روایات ختم ہو گئیں۔ اجڑے دیار "دلی" کی قدیم وضعداریوں کا ایک جلیل و جمیل پیکر

اُسی خاک میں مل گیا۔ اُردو کا ازلی شیدائی، نازک خیالیوں کا فدائی پاکیزہ بیانیوں پر مٹنے والا نصف صدی سے زیادہ بے لوث اور والہانہ خدمت کرتے کرتے خود فنا ہو گیا مگر اس نونہال کو اپنے خونِ جگر سے سرسبز و شاداب بنا گیا۔

آپ کے جسدِ خاکی کو قدم شریف کی خانقاہ کے متصل خاندانی احاطہ میں آپ کے والد ماجد سیّد ناصر الدّین محمد ابو المنصور کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیا گیا، میرے والد ماجد قبلہ نے حضرت کی وصیت کے مطابق لوحِ مزار پر یہ شعر کندہ کرا دیا ؎

جایم بروزِ واقعہ پہلوئے او کنید

او قبلۂ من است رُخم سوئے او کنید

اسی کے ساتھ آپ کے دو عزیز دوستوں کی کہی ہوئی تاریخیں بھی کندہ کرا دی گئیں۔

سفر کرد ہر گاہ از دارِ فنٔ   بہ فردوس شد میر ناصر علی خاں

۱۳۵۲ھ

ناصرِ میر لشکرِ اُردو   کر گیا گوشۂ سخن خالی

۱۳۵۲ھ   ۱۹۳۳ء

پہلی تاریخ پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی نے کہی تھی جو میر صاحب کے بڑے مداح اور عقیدت مند تھے، آپ نے دہلی میں 'بزمِ سخن' نامی شعر و سخن کی ایک انجمن قائم کی تھی جس کے سالانہ مشاعرے کی صدارت کے لئے ہمیشہ میر ناصر علی کو باصرار لے جایا کرتے تھے۔ ان کے قطعۂ تاریخ کے چند شعر سننے کے لائق ہیں!

سرائیست گیتی پے رہ نوردان — سفر لاجرم چوں رسد شب بہ پایاں
فصاحت کنیزش، بلاغت غلامے — زتوصیف، بالا "خیالِ پریشاں"[1]
چو ساقی زمیخانہ عامش صلائے[2] — چو صوفی زمنبر پیامے بہ خاصاں[3]
بہ بزمِ سخن[4] مسند آرائے عزت — بہ حسن بیاں بُردہ گوئے زسحباں
چو بادِ صبا از چمن زارِ عالم — گزر کرد چوں بوئے گل از گلستاں
پے سالِ رحلت سروشے بہ ساحر — پیامے رسانید از سوئے رضواں
سفر کرد ہر گاہ از دارِ فانی — بہ فردوس شد میر ناصر علی خاں

۱۳۵۲ھ

دوسری تاریخ حضرت احسن مارہروی نے عطا کی تھی۔ اُن کے قطعے کے چند شعر بھی سُن لیجئے!۔

کیوں نہ دہلی ہو غم کدہ کہ ہوا — ایک پر مایہ سے وطن خالی
اُس کے ماتم میں چاک ہونے سے — نہ بچا کوئی پیرہن خالی
نظر آتی ہے بزمِ اُردو میں — مسندِ صدرِ انجمن خالی
بالیقیں تھا وہ فاتح الدریا — نہ سمجھئے یہ حسنِ ظن خالی
اُس کو دُھن خدمتِ ادب کی تھی فقط — اور اُردو کی تھی لگن خالی
اُسکی رحلت کا سن کے حال احسنؔ — دل ہوا میرا نوحہ زن خالی

---

[1] میر ناصر علی کا مشہور رسالہ "مضمونِ پریشاں"

[2] رسالہ ساقی دہلی،

[3] صلائے عام

[4] انجمن "بزمِ سخن"

میں نے لیکن کہیں وہ تاریخیں — جن سے حاصل نہیں ہیں سن خالی
بلکہ ہجری و عیسوی دونوں — ہیں غلو سے حقیقتاً خالی
ناصرِ میر لشکرِ اُردو — کر گیا گوشۂ سخن خالی
۱۳۵۲ھ — ۱۹۳۳ء

حضرت سیماب اکبر آبادی کے قطعے کے چند اشعار بھی سُننے کے لائق ہیں :-

اے چراغِ بزمِ دوشیں کی ضیائے آخری
گلشنِ دہلی کی اے رنگیں صدائے آخری
داغ تو اُردو کے صد پارہ جگر کو دے گیا
آہ! اپنا رنگ بھی تو ساتھ اپنے لے گیا۔
فلسفہ اب سادہ تر لفظوں میں سمجھائیگا کون
اب بساطِ انجمن پر پھول برسائے گا کون
اہلِ عالم کو نوا تیری صلائے عام تھی
جنبشِ لب ترجمانِ عقدۂ الہام تھی
بزمِ داغ و محفلِ غالب، خیابانِ نذیر
سب کی رونق تجھ سے تھی اے یادگارِ سوز و میر
سخت عنوانوں پہ دل میں چھپنے والے حاشیے
سینکڑوں نظموں سے بہتر، چار ٹکڑے نثر کے
آہ! وہ اُردو میں وارفتہ نگاری اب کہاں
حسن کی لے میں حدیثِ بیقراری اب کہاں

اے مسافر! ہو ترا اللہ ناصر الوداع

اے جہان آباد کی آوازِ آخر الوداع

جناب نہالؔ سیوہاروی کے قطعے سے یہ دو شعر سُن لیجئے۔

میر ناصر علی افسوس ہوئے عازمِ خُلد نثر میں فرد تھے جو حالیؔ و آزاد کے بعد
لٹ گئی چرخ ستم پیشہ کے ہاتھوں دلّی اب کدھر جایئے غرناطہ و بغداد کے بعد

شاہد صدیقی اکبر آبادی کی نظم کا آخری شعر تھا۔

یک بندۂ خدا و خدائے زباں بود ناصر علی نظیریؔ ہندوستاں بود

جناب حیدرؔ دہلوی نے نیا مادّہ تاریخ نکالا جوان کے قطعے کا مقطع بھی ہے:۔۔۔

کہو حیدرؔ یہ مصرعِ تاریخ ہو گیا گل چراغِ بزم ادب
۱۳۵۲ھ

اسی طرح صباؔ دہلوی، اکبر حیدر آبادی اور دیگر شعرائے کرام نے میر ناصر علی کو اپنی گرانمایہ نظموں کے ذریعے خراجِ عقیدت پیش کیا تھا ــ یہ قطعات اور دیگر مشاہیر ادیبوں کے متعدد مضامین، رسالہ ساقی دہلی کے "ناصر نمبر" میں شامل تھے جو میر ناصر علی کی یاد میں ستمبر ۱۹۳۳ء کو شائع ہوا تھا بعض نظموں کے چند اشعار آپ نے ملاحظہ فرمائے۔ میر ناصر علی چونکہ خود نثّار تھے اس رعایت سے اُن کی یاد میں لکھے ہوئے چند مشاہیر کے مضامین کے مختلف اقتباس بھی دیکھ لیجئے۔ حضرت نیاز صاحب قبلہ نے مجھے بارہا تاکید فرمائی تھی کہ یہ یادگار مضامین ضرور محفوظ کر لینے چاہئیں۔ اپنے گرانقدر دیباچے میں آں موصوف نے اس کی طرف اشارہ بھی فرمایا ہے۔ یہ تو جب ممکن ہو سکے گا، ضرور کیا جائیگا، اس مضمون میں تو ان یادگار تحریروں کے ایک ایک دو دو جملوں کی بھی

گنجائش نکل سکے تو غنیمت ہے۔ اِن میں خود نیاز صاحب قبلہ کے مضمون سے کوئی اقتباس شامل نہیں کہ ان کے فاضلانہ بسیط دیباچے کے بعد اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں، اور نہ میر صاحب کے سب سے دیرینہ رفیق حضرت ریاض خیرآبادی کے مضمون کا اقتباس ہے کہ یہ نیاز صاحب کے مضمون میں پہلے شامل ہوچکا ہے۔ ان مشاہیر کے لائق تعظیم نام ہی ان آرا کی اہمیت و وقار کی کافی ضمانت ہیں۔ میرے لئے ان پر مزید حاشیہ آرائی کرنا نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ نازیبا بھی ہے۔

سیّد سلیمان ندوی

"...... ایک زمانہ تھا کہ میر ناصر علی کی انشا پردازی اور نکتہ نوازی پر ملک کے اچھے اچھے اہلِ قلم رشک کرتے تھے، مگر افسوس کہ نوجوانوں نے انھیں بھلادیا۔ وہ ہماری پرانی مجلس کے شمع انجمن افروز تھے....

ان کے قلم میں جو لطافت تھی وہ ہماری زبان کا عظیم سرمایہ ہے..."

علامہ راشد الخیری

"...... آج ہم کو جہان آباد کے اُس گوہر درخشندہ کو وداع کرنا ہے جو میر ناصر علی کی ہیئت میں ہمارے سامنے سدا بہار جھکتے پھول برسائے

...... خان بہادر میر ناصر علی نے جس طرح اُردو زبان و ادب کی خدمت کی ہے وہ رہتی دنیا تک یاد رہے گی۔ جو روش قریب قریب ستر برس پہلے شروع کی تھی، آخر تک اُس پر قائم رہے...... اُن کی زندگی ہم کو اساتذہ کی جیتی جاگتی تصویر دکھا دیتی تھی۔ اُن میں ذوق کی سنجیدگی، غالب کی تنک مزاجی اور داغ کی شوخیوں کی ایسی ادائیں جھلکتی تھیں کہ میں نے کئی مرتبہ

ان کا لطف اُٹھایا ہے...... اُن کی کتاب زندگی کا ہر ورق اور ہر سطر پڑھنے والوں کو سچائی کے معنی بنا دیتی ہے...... یہ وہ لوگ تھے جن کی گردنیں زندگی، اور زندگی کی کسی ضرورت کے سامنے کبھی خم نہ ہوئیں... مگن رہے اور مطمئن ہو گئے۔"

خواجہ حسن نظامی

"...... خان بہادر میر ناصر علی، دہلی کے موجودہ دورِ انشا پردازی میں بزرگوں کی یکتا اور بے نظیر و بے مثال یادگار تھے۔ اُن کی صورت میں قدامت تھی، لباس میں قدامت تھی، بولنے میں قدامت تھی، یہاں تک کہ جب وہ کسی کی بات سنتے یا کسی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے تو اس میں بھی ایک عجیب مؤثر ادا قدامت کی ہوتی تھی..... اُن کی معلومات کا یہ حال تھا کہ جس فن کی کتاب ہاتھ میں لیتے، اُس فن کی بیشمار کتابوں اور مصنفوں کے حالات بیان کر ڈالتے....... ان کی انشا پردازی ادب و حکمت، شعر و مزاح کا نادر مجموعہ تھی، اور سلاست و لطافت کے ساتھ عالمانہ شان ہر فقرے اور ہر بندش سے ٹپکتی تھی۔ تیزی سے لکھنے والے، تیزی سے بولنے والے۔ استدلال میں کسی سے نہ دبنے والے، اپنے آگے کسی کو نہ گردانتے والے، نہایت وضعدار اور خود دار فاضل اور علم کے رسیا، عالی دماغ، ہنس مکھ، رحم دل نیک اور فقیر منش انسان تھے...... دہلی میں مجھ جیسے چند لکھنے والے خواہ کسی قسم کے تعلّی آمیز دعوے اپنے مخصوص طرز تحریر کی نسبت کریں، لیکن جو بات میر ناصر علی کی تحریر میں تھی، وہ کسی کو بھی میسر نہیں.... حضرت اکبر الہ آبادی اُن کے بڑے مدّاح تھے اور صورت میں بھی وہ

حضرت اکبر سے تھوڑی بہت مشابہت رکھتے تھے ....."

شاہ دلگیر اکبر آبادی

"ارضِ تاج آگرے سے میر ناصر علی کو ازلی نسبت تھی جس زمانے میں بوڑھے سر سیّد نے علی گڑھ سے تہذیب الاخلاق نکالا اسی وقت یعنی ۱۲۹۲ھ میں جوان ناصر علی نے آگرے سے "رسالہ تیرھویں صدی" نکال کر دھوم مچادی ؎

نکلے جدھر سے وہ یہی چرچا ہوا کیا

اس طرح کا جمال ہو ایسا شباب ہو

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اردو نثر میں حکیمانہ و شاعرانہ مضامین لکھنے کے موجد میر ناصر علی ہی ہیں۔

۱۹۰۹ء سے صلائے عام کی بدولت میر ناصر علی سے میرے تعلقات اور بھی خاص ہو گئے، کئی مرتبہ اُن کے بلانے پر دہلی گیا اور ناصر منزل میں مہمان ٹھہرا..... جس رنگِ سخن کا میں دلدادہ اور جس طرزِ بیاں کا شیفتہ ہوں میر ناصر علی کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔"

مولوی سبحان اللہ گورکھپوری

"...... میر ناصر علی کی اُردو کا جواب نہیں مل سکتا۔ ایک دیباچہ ہی کے نام سے جیسا اور جتنا انھوں نے لکھا اس کا جواب دور دور ملنا مشکل ہے۔ ان کے "مضمون پریشاں" کو دیکھئے ادب و زبان کے لئے ناز کرنے کی بات ہے۔ نثر میں ساقی نامے جس بہتات اور رنگینی اور پُر معنی انداز میں انھوں نے لکھے کسی کو نثر میں تخیّل بھی نہ ہوا...... کوئی اور ملک ہوتا تو اُن کی یاد میں کتنے رسالے اور اخبار جاری ہوتے جو عمر بھر

ہاتھوں ہاتھ بکتے رہتے — لیکن یہ ہندوستان ہے یہاں قابلِ نمود ہستیاں فراموش کر دی جاتی ہیں۔ اور ظالموں کے مجسمے قائم ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔"

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

"۔۔۔۔۔۔ خان بہادر سیّد ناصر علی مرحوم و مغفور کے لئے ہمارا رونا اور بے قراری اس لئے نہیں ہے کہ انہوں نے کم عمر پائی بلکہ اس لئے کہ جو عظیم فائدہ ان کی ذات سے اُردو زبان کو پہنچ رہا تھا اُس کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے۔۔۔۔"

سیّد وقار عظیم

"۔۔۔۔۔۔ مہدی مرحوم نے شبلی کی پُر سحر نثر سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو ان کی اُردوئے خاصہ کی داد ملتی۔ میں خان بہادر میر ناصر علی کی شگفتہ نثر کے بارے میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔ اُن کے خیالات میں بھی حُسن ہے اور الفاظ کے انتخاب میں بھی۔ اُن کی عبارتیں جہاں آزاد کی طرح رنگین اور مسرت افزا ہیں وہاں شبلی کی طرح شگفتہ اور مدلل بھی۔۔۔۔۔۔ ان محاسن کے باوجود نہ عبارت اتنی طویل ہوتی ہے کہ پڑھنے والا اُکتا جائے اور نہ اتنی مختصر کہ مطلب ہی سمجھ میں نہ آئے۔۔۔۔۔۔ اُن کے ہر لفظ سے ادبیت اور علمیت ٹپکتی ہے، کوئی بات اگر شاعرانہ ہے تو اُس کا بیان پاکیزہ دلکش اور تیکھا، عالمانہ ہے تو اس کی تشریح نازک مدلل، منطقیانہ اور روشن لیکن زیادہ حیرت اُس وقت ہوتی ہے جب یہ فلسفی اور شاعر نثار اپنی شگفتہ و پاکیزہ تحریر میں مزاح کی چاشنی ملا دیتا ہے۔ تبسّم زیرِ لب کی برقی لہر جو

لطافت پیدا کر دیتی ہے اس کا لطف ذوق و وجدان ہی کو نصیب ہو سکتا ہے ...... ان خصوصیات کے علاوہ وہ اکثر اپنے بیان کو کسی شعر پر ختم کرتے ہیں۔ یہ طرز گو پرانا ہے مگر میر صاحب نے اسے بادۂ کہن بنا دیا اس میں کیف و سرمستی دو چند بڑھا دی اور اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان کا اشعار کا انتخاب اس قدر پاکیزہ ہوتا ہے کہ نثر کا اچھے سے اچھا فقرہ بھی اُسے پوری طرح ادا نہیں کر سکتا۔ اسی لئے اُن کے ہاں نثر اور نظم کا فرق نظر نہیں آتا، اُنہوں نے قدیم اور جدید رنگوں کو اس طرح شیر و شکر کیا کہ اُردو میں ایک نیا رنگ پیدا ہو گیا جو صرف انھی کا تھا اور انھی کے ساتھ ختم ہو گیا ......'

شاہد احمد دہلوی

" انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں میں اسٹائل کو لٹریچر کی جان سمجھتے ہیں۔ اُردو میں اگلوں نے اس کا خاصا خیال رکھا اب اس پر کم زور دیا جاتا ہے۔ میر ناصر علی کو جو چیز انشا پردازوں سے ممتاز کرتی ہے وہ اُن کا دل پذیر اسٹائل ہی ہے جو اُردو ادب میں اپنے نوع کی پہلی اور آخری چیز ہے۔ میر صاحب اپنے اسٹائل کے موجد بھی ہیں اور اختتامی بھی۔ جس سانچے میں یہ اسلوب ڈھلا اس میں کوئی اور نہ ڈھل سکا... میر صاحب نے فارسی، عربی، انگریزی اور فرانسیسی لٹریچر کا بہت وسیع مطالعہ کیا اور اُردو میں ایسے خالص ادبی مضامین لکھے جو اپنی علو خیالی اور نزہت بیاں کی وجہ سے آپ اپنا جواب ہیں۔ اس کو خود میر صاحب " نازک خیالی" اور " پاکیزہ بیانی" کہتے ہیں۔ ادبی اور شاعرانہ قسم کے مضامین میں فلسفے اور

غور و فکر کے عناصر کے ساتھ ہلکی ہلکی طنز و مزاح کی چاشنی میر صاحب ہی نے دی۔ مغربی لٹریچر کے اثر سے اردو ادب کو گہرے فکر سے روشناس کرایا اور ایک نئی شاہراہِ خیال وضع کی۔ مطالب و معانی فلسفیانہ' وہ بھی خاصے جدید قسم کے اور اندازِ بیان خالص مشرقی۔ میرے نزدیک یہی اُن کا سب سے بڑا کمال تھا، اس اعتبار سے وہ پہلے انشا پرداز ہیں جو نہ صرف صاحبِ طرز (اسٹائیلسٹ) ہیں بلکہ ایک وقیع مفکّر (تھنکر) بھی۔ انہوں نے اُردو نثر میں وہ خاص وضع اختیار کی جو والٹیر، بالزک، ایڈیسن، گولڈسمتھ، ہیزلٹ وغیرہ مغربی ادیبوں نے کی تھی۔ ان کے مضامین میں ایسے خیالات اور تمثیلچوں کی کثرت ہے جن سے اُردو زبان قطعاً نا آشنا تھی، اور طرزِ بیاں ایسا دلکش کہ ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ چھوٹے چھوٹے سلیس اور لطیف جملے، اور بات بات پر شعر۔ جو کہتے تھے وہی بولتے تھے، تحریر و تقریر یکساں، فلسفیانہ نکتہ سنجیوں اور شاعرانہ شوخیوں سے ان کی معمولی باتیں بھی خالی نہ ہوتی تھیں، وہی شوخی اور دبی دبی سی بذلہ سنجی، تبحّرِ علمی کے باوجود کہیں اغلاق نہیں بلکہ ایک متین سی مسکراہٹ رچی بسی رہتی تھی ...... دلّی میں کم گھرانے ایسے رہ گئے ہیں جن میں روزمرہ کی بات چیت میں بھی صحتِ زباں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ انہی میں میر صاحب کا گھرانا بھی ہے، جہاں غلط یا ٹکسال باہر لفظ بہت کم سننے میں آتے ہیں ....

میر صاحب کا لٹریچر ایسا نہیں کہ مجھ جیسا ہیچمداں اس کی خوبیاں سمجھ بھی سکے، خوبیوں کی وضاحت تو بڑی بات ہے۔ میں نے

جو کچھ لکھا، اس حسنِ اعتقاد کی بنا پر لکھا ہے جو مجھے مرحوم کی ذات سے تھا، اور ان کے لٹریچر سے ہے اور ہمیشہ رہے گا کہ مرحوم میرے معنوی استاد تھے۔ ادب کا چسکا مجھے انہی کی تحریر و تقریر سے لگا اور سچ تو یہ ہے فی الحقیقت "صلائے عام" ہی کے آوازۂ ادب کی مضمحل صدائے بازگشت ہے"۔

مرزا محمد بشیر

"...... میر ناصر علی کا رنگین و پرکار طرزِ بیاں زمانے کی رنگا رنگی کی بولتی تصویریں، اُن کا شوخ استدلال، اعلیٰ ذوقِ شعری اور حکیمانہ نثر اُردو کا زبردست کارنامہ ہیں۔ جارج مور نے کیا خوب کہا کہ ایک خیال جو آج میرا ہے کل تمہارا اور پرسوں کسی اور کا۔ لیکن اصل میں اسی کی ملکیت ہے جس نے اسے سب سے زیادہ حسین و موثر طرز پر ادا کیا۔ میر صاحب کا ہر جملہ انھی کی "ملکیت" ہے۔ ان سے بہتر اور پاکیزہ تر انداز پر اُن کا معمولی سے معمولی جملہ از سرِ نو لکھنا آج کسی کے بس کا نہیں۔ بندشِ الفاظ ہی تو ہے اس لحاظ سے ان کی نثر شعر سے زیادہ حسین اور دلکش ہے۔ پھر ان کا سا ذوقِ شعری بھی کسی کو نصیب نہیں۔ اُردو کے کسی نثر نگار کے ہاں اشعار کا ایسا بے نظیر شستہ و رفتہ اور اتنا ضخیم خزانہ نہیں پایا جاتا اور کمال یہ کہ جس موقع اور محل پر جو شعر لکھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ انہی کے لئے اور اسی موقع کے لئے کہا گیا تھا، یہ صفت ہم نے اور کسی میں نہ دیکھی ؎

جامہ زیبی ترے اندام کے اوپر ہوئی ختم
تجھ کو پہنا کے جو اندازِ قبا کو دیکھا

توقع ہے کہ مشاہیر کی تحریروں کے ان چند اقتباسات سے موجودہ نسل کے وہ اصحاب جو اب تک میر ناصر علی سے نا آشنا رہے، ان کی ادبی خدمات اور علمی مرتبے سے کسی حد تک شناسا ہو سکیں گے، ان سے غرض بھی یہی تھی۔

میر ناصر علی کے اس مختصر سے تذکرے میں، میں نے اُن کے کمالاتِ ادبی کے بارے میں اپنی جانب سے کوئی رائے لگانے میں حتی المقدور احتیاط برتی ہے کہ میرا یہ منصب نہیں، یہ ذکر خود انھی کی زبانی یا "در حدیثِ دیگراں" ہی مناسب تھا، اس لئے جابجا سے اقتباسات پیش کئے گئے جن کی طوالت کا مجھے احساس ہے لیکن شاید طلبہ کے لئے مفید ثابت ہو سکیں میرے والد ماجد قبلہ نے اپنے مضمون میں جو مقدمات میں شامل ہے، میر صاحب کی سیرت کے بعض پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے۔ یہ انھی کا حق تھا۔ رہا میر ناصر علی کی انشا پردازی کا محاکمہ، ان کی خوبیوں کا تجزیہ اور ان نکات کی افہام و تفہیم جن سے اُن کے شمائلِ باطنی تعبیر ہیں جن کا مظہر ان کا رنگین و دلپذیر سٹائل ہے۔ یہ فاضل ناقدینِ ادب کا حصّہ ہے، یقین ہے کہ میر ناصر علی کے کُل مضامین کے بغور مطالعہ کے بعد جن کی یہ پہلی جلد ہے، ان کی طرف سے داد کا حق ادا ہو سکے گا اس کے لئے ایک دو مضمون نہیں بلکہ سلسلۂ مضامین درکار ہیں۔ تب تک اسی حقیر تحریر پر اکتفا کیجئے جو مختصر ہونے پر بھی خاصی طویل ہو گئی۔

حرفِ آخر

سید انصار ناصری

مقاماتِ ناصری کی اشاعت میں جو موانع میر ناصر علی مرحوم و مغفور کی زندگی میں حائل رہے، اُن کے رحلت فرمانے کے بعد وہ چوگنی شدّت کے ساتھ متواتر سدِّ راہ بنتے رہے۔ بڑی دقّت اُن کے پرانے پرچوں کی گمشدگی تھی۔ جب ان کی حیات میں اور خود اُن کو پیہم التجاؤں کے باوجود پرانے پرچے فراہم نہ ہوسکے تو ان کے اُٹھ جانے کے بعد تو اس کا رہا سہا امکان بھی ختم ہوگیا۔

اور اب کہ میر ناصر علی کو گزرے ربع صدی سے زیادہ عرصہ ہوگیا، گنی چُنی دو ایک ہستیوں کے علاوہ جو خود آفتابِ لبِ بام ہیں، ان کے صورت آشنا سب کے سب ہی فردوس مکانی بن چکے۔ پھر تقسیم ملک کے خلفشار اور فسادات نے اگلی جماجمی کی ایسی دُرگت بنائی کہ علم و ادب کا تو کیا مذکور، جانوں ہی کے لالے پڑ گئے۔ کس کا 'صلائے عام' کہاں کی 'حویلی میر ناصر علی' اور کیسا 'مطبعِ ناصری'! سب کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ ایسے میں کب کی بھولی بسری "تیرھویں صدی" اور اس کے بعد کے محدود اشاعت والے قدیم رسائل اور نصف صدی کے کمیاب و پارینہ صلائے عام کے گم گشتہ پرچوں کی تلاش، جنھیں حوادث کی کتنی آندھیاں اور انقلاب کے کتنے جھکڑ اڑا اڑا کر نہ جانے کہاں سے کہاں تہس نہس کر چکے تھے، تلاشِ عبث سے بھی کچھ زیادہ ہی معنی رکھتی ہے۔ لیکن سالہا سال اسی عنقا کی جستجو میں بسر ہو گئے۔ اس میں بعض بعید

دلچسپ اور کچھ انتہائی دل شکن حادثات بھی پیش آتے رہے. اصل حادثہ تو وہ تھا جو میرے والد ماجد قبلہ کو پیش آیا جب تقسیم ملک کے فسادات میں حویلی میر ناصر علی پر دھاوا ہوا اور ان کی ساری املاک اور جملہ اثاث البیت لوٹا گیا اور صلائے عام کی جلدوں اور مضامین کے مسوّدات وغیرہ اُن کی آنکھوں کے سامنے جلائے گئے۔ پھر کسی طرح اپنی جان کی بازی لگا کر انہوں نے اس متاعِ عزیز کو بچانا چاہا تو اس جرم میں حوالات میں بھی رہے ـــــ یہ داستان طویل اور المناک ہے، والد ماجد قبلہ نے اپنے دیباچہ میں اس کا مختصر ہی ذکر کیا ہے، جو کچھ گزری وہ کہیں زیادہ درد انگیز واردات تھی۔ اسی اجمالی ذکر سے اندازہ ہو سکے گا کہ وہ اس بچے کھچے خزینے کی بازیافت کے لئے اپنی جان جوکھم میں نہ ڈال دیتے تو ہم اور آنے والی نسلیں اُردو نثر کے ایسے انمول جواہر سے سدا کے لئے محروم رہتے۔

"تیرھویں صدی" اور "افسانۂ ایام" کے بعض مضامین کی نقلیں میں نے اپنے قیام لندن کے دوران (جبکہ میں بی بی سی میں ٹریننگ پا رہا تھا) انڈیا آفس لائبریری کے پُرانے رسائل و اخبارات کے ریکارڈ سے تلاش کر کے خود بنائیں۔ اسی طرح کچھ مضامین کی نقول برٹش میوزیم لائبریری کے اورینٹل سکشن سے حاصل کیں. پھر جب ہندستان جانا ہوا تو "صلائے عام" اور "ناصری" کے چند پرچے، جامع مسجد کے کباڑخانوں سے اتفاقیہ ہاتھ آ گئے۔ چند قدیم گھرانوں اور پرانے دوستوں کے گھروں سے اور اِدھر اُدھر سے کچھ متفرق پرچے حاصل کئے۔ کچھ تحفتاً، کچھ قیمتاً اور کچھ دیگر طریقوں سے (جن سے "چوری" بھی خارج نہیں ہے)

اس اظہارِ حقیقت کو تعلّی نہ سمجھئے کہ "مقاماتِ ناصری" کی اس جلد میں اور آنے والی جلدوں میں بھی لاتعداد ایسے نادر مضامین ہیں جو آج پاکستان اور ہندوستان میں شاذ ہی کہیں دستیاب ہو سکیں اور سب کے سب اکٹھے تو کسی مقام پر بھی نہیں

مل سکتے۔ یہ میں نمود کی نہیں لے رہا بلکہ ذاتی معلومات کی بنا پر وثوق سے عرض کر رہا ہوں۔ پاکستان کے بڑے شہروں کی تو سب ہی پبلک اور یونیورسٹی لائبریریاں میری دیکھی بھالی ہیں، اسی طرح دلی اور لکھنؤ کی بھی، بھاولپور کی سنٹرل اسٹیٹ لائبریری بھی، اور رامپور کی رضا لائبریری سے خود جناب عرشی رامپوری نے تصدیق فرمائی کہ وہاں "تیرھویں صدی" اور اس کے بعد کے رسائل کے فائل نہیں ہیں۔ صلائے عام کے کچھ نامکمل فائل اور چند متفرق پرچے البتہ کہیں کہیں ملتے ہیں۔ کراچی کی لیاقت لائبریری میں تین سال کے نامکمل فائل ہیں اور انجمن ترقی اردو کے کتب خانۂ خاص میں ۱۹۱۰ء کے صرف چند پرچے ہیں۔

مضامین کے انتخاب میں عالی قدر مصنف سے اپنی نسبتِ خصوصی کے پیشِ نظر میں نے تنہا اپنی پسند اور ذاتی رائے پر اعتماد کرنا کافی نہیں سمجھا۔ تمام جلدوں کے مطالعے کے بعد کئی کئی تجاویزِ انتخاب مرتب کیں۔ ان پر جناب ارشد تھانوی صاحب کی مدد سے جو خود صلائے عام کے مضمون نگار بھی تھے، مسلسل نظرِ ثانی ہوتی رہی، پھر ایک اور تجویز اپنے قیام کراچی کے دوران بھائی شاہد احمد صاحب سے طویل بحث و تمحیص اور پیہم مشوروں سے مرتب کی گئی۔ بھائی شاہد احمد صاحب میر ناصر علی کے مضامین کا گہرا مطالعہ کر چکے تھے اور ان کے اسلوب خاص کی لطافتوں کو بخوبی سمجھتے تھے، راولپنڈی میں برادرم یوسف ظفر صاحب کے مشوروں سے مستفید ہوتا رہا۔

منتخب مضامین کی پہلی کھیپ (جس قدر کہ اس وقت مہیا تھے) ۱۹۴۶ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم و مغفور کے ملاحظہ سے گزر چکی تھی جبکہ پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی کی فرمائش پر ان مضامین کو انجمن ترقی اردو دہلی کی جانب سے شائع کرنے کی تجویز پہلی بار پیش کی گئی تھی۔ اس وقت کی سیاسی صورت احوال اور اس کے فوراً بعد کی عام شورش کے اثرات سے انجمن ترقی اردو دہلی بھی

محفوظ نہ رہ سکی۔ چنانچہ اس ہنگامہ خیز دور میں مقاماتِ ناصری کی اشاعت کی نوبت نہ آئی ـــ بعد میں پتا چلا کہ منتخب مضامین کا یہ فائل انجمن کے دفتر سے "گم" ہو گیا۔ پھر کسی طرح میرے کرم فرما سیّد رفیق الدین صاحب (جو ان دنوں بابائے اُردو کے معتمد کی حیثیت سے انجمن کے دفتر ۱۲ دریا گنج دہلی میں رہتے تھے اور انجمن کی طرف سے آل انڈیا ریڈیو کی اردو۔ ہندی ڈکشنری کے ایڈیٹر بھی تھے) اپنی "سُراغ رسانی" سے اس گمشدگی کا پتا چلایا اور بالآخر گمشدہ فائل ایک ممتاز ہستی کے ہاں سے برآمد ہوا یہ ایک علیحدہ حکایت ہے اور خاصی طولانی بھی۔ اس کے برسوں بعد ۱۹۵۴ء میں جب میں کراچی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے بابائے اُردو کی ایک اہم تقریر ریکارڈ کرنے خدمتِ عالی میں حاضر ہوا تو آں مغفور نے بڑے اشتیاق سے "مقاماتِ ناصری" کی اشاعت کے بارے میں دریافت فرمایا۔ اور دیر تک میر ناصر علی کی انشا کے بارے میں پُر لطف گفتگو فرماتے رہے۔ اس لطف و کرم سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی اور میں نے مقدمہ تحریر فرمانے کی استدعا پیش کردی۔ حضرت نے وعدہ بھی فرمالیا۔ چند دن بعد میں نے جس قدر مضامین اب تک مہیّا ہو چکے تھے ان کی نقول پیش خدمت کر دیں جو مہینوں تک حضرت کے مطالعے میں رہیں۔ بعد ازاں میرا کراچی سے تبادلہ ہو گیا۔ پھر مضامین کی آخری قسط ۱۹۵۸ء میں حضرت کے ملاحظے کے لیے پیش کی اور دبی زبان سے مقدمے کی یاد دہانی بھی کردی۔ حضرت ان دنوں علیل تھے۔ کچھ دنوں بعد یہ مضامین مجھے واپس مل گئے اور اس کے ساتھ ہی حضرت کی تحریر کردہ یہ پاکیزہ و یادگار تقریظ بھی جو مقدمات میں سرِ فہرست ہے (اردو کے ایسے عظیم سرپرست، معمولی سے معمولی علمی کام کی قدر افزائی کرنے والے، ہم جیسے بے بضاعتوں کی حوصلہ افزائی کرنے والے، طالب علموں کے ایسے شفیق مربّی، اب کہاں نصیب!!)

میر ناصر علی کے ایک اور محتشم قدر شناس حضرت مولانا عبد الماجد صاحب دریا آبادی

مدظلہ، سے اپنے قیام لکھنؤ کے زمانے میں تجدید نیاز مندی کا شرف حاصل ہوا تھا جب بھی لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے تقریریں نشر فرمانے تشریف لاتے اس حقیر نیاز مند کو بزرگانہ لطف و کرم سے سرفراز فرماتے، اس دور کے رُبع صدی بعد میں نے راولپنڈی سے دیرینہ کرم فرمائی کے حوالے سے "پیش لفظ" تحریر فرمانے کی استدعا کی، آپ نے اسے قبول فرمایا۔ کس زبان سے شکر بجالاؤں، پیش لفظ تحریر فرمانے کا نہیں کہ یہ تو آں محترم کا حق ہی تھا، اُس عنایت و شفقت کا جس سے آپ نے اس احقر کو نوازا۔ یہ گرامی نامہ ملاحظہ ہو :-

عزیز مکرم ـــــ وعلیکم السلام

مدّت بعد آپ کا خط پا کر خوشی ہوئی۔

.... اتنی طویل تمہید اور عبارت آرائی کی کیا ضرورت تھی۔ میں نہ آپ کو بھولا ہوں نہ میر ناصر علی کو بھلا سکتا ہوں۔ ہاں آپ کی ہمت قابلِ داد ہے کہ اس زمانے میں میر ناصر علی کی یاد تازہ کرنے کا عزم کیا۔ خدا آپ کے ارادوں میں برکت دے۔ مرحوم اپنے زمانے کے زبردست صاحب قلم تھے۔ اب بھلا اگلوں کو یاد کرنے کی کسے فرصت ہے۔ آپ کو پرانے پرچوں کی فائلیں کہاں ملیں گی۔ میرے پاس تو صلائے عام کا ایک بھی پرچا نہیں۔ بہرحال! آپ اصرار نہ کرتے جب بھی یہ کام ایسا ہے جو میرے لئے باعثِ توجہ ہے۔ آپ اتنا کیجئے کہ اپنا صاف شدہ مسوّدہ یا چند منتخب مضامین، جتنے آپ بھیج سکیں، میرے پاس روانہ فرما دیں۔ انشاء اللہ دو چار سطریں لکھ دینے کی ہفتے عشرے میں فرصت نکال لوں گا ـــ آپ کو انتظار زائد نہ کرنا پڑے گا۔

آپ کا مرسلہ لفافہ بے کار تھا۔ اب میرا واپس کرنا بھی

بیکار ہے۔

دعاگو عبدالماجد

مطلوبہ مضامین کی نقلیں ارسال خدمت کی گئیں۔ حسب وعدہ ہفتے بھر میں آں محترم کے دست و قلم کا تحریر کردہ "پیش لفظ" مجھے مل گیا اور اس کے ساتھ ہی یہ چند کیف آگیں سطور بھی ــــ اساتذۂ کرام کی ایک ایک سطر ان کے مخصوص اندازِ تحریر کی اور اُن کے قلب و ذہن کی وسعتوں کی آئینہ دار ہوتی ہے:

"۔۔۔۔ لیجئے، عزیز مکرم ــــ تعمیل ارشاد میں بس اتنا ہی لکھ سکا، اپنی کم فرصتی کے ہاتھوں زیادہ لکھنے سے مجبور رہا، گو دل بہت کچھ کہنے کو چاہتا تھا۔ اب جتنا کچھ اور جیسا کچھ ہے حاضر ہے۔

آپ نے خط میں مرحوم کے ساتھ میرے "حق رفاقت" کا ذکر کیا ہے۔ رفاقت برابر والوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ میں اُن مرحوم سے کہیں جُونیر بلکہ اُن کے زمانے میں بچہ تھا ــــ رفاقت کی بجائے شاگرد کہنا موزوں تھا ــــ گر حفظِ مراتب نہ کُنی ۔۔۔۔

کوئی لفظ اگر نہ "چلے" تو دوبارہ دریافت کیا جا سکتا ہے خدا آپ کے ارادوں میں استقامت بخشے۔"

دعاگو عبدالماجد

خوش قسمتی سے اسی زمانے میں حضرت نیاز صاحب فتحپوری، مستقل طور پر پاکستان تشریف لے آئے، آں محترم میر ناصر علی کی انشا کے قدیم شیدائی اور خود صلائے عام کے اوّلین دور کے مضمون نگار تھے اور مقاماتِ ناصری کی اشاعت کے زبردست مؤید بھی۔ میر ناصر علی کے انتقال کے بعد سے مسلسل اس کی تاکید فرماتے رہے۔ ساقی کے ناصر نمبر کے لئے آپ نے جو یادگار مضمون لکھا اس میں بھی اس کی فوری اشاعت

پر زور دیا تھا۔ پھر میرے قیام لکھنؤ کے زمانے میں بارہا اس کی تاکید فرماتے رہے۔ آپ کے کراچی تشریف لے آنے سے مجھے بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ آپ نے جس شفقت کے ساتھ باوجود کثرتِ مشاغل، میری صرف رہنمائی ہی نہیں بلکہ دستگیری فرمائی میرے لئے اس کی سپاس گزاری بھی ناممکن ہے۔ میری مرتب کردہ آخری تجویز انتخاب پر نظر ثانی فرمانے کے لئے آپ نے کئی ماہ تک تمام جلدیں از سرِ نو مطالعہ فرمائیں۔ ایک ایک مضمون دیکھا پھر انتخاب کے لئے نشانات لگائے اور جب یہ انتخاب مکمل ہو گیا تو ایسا سیر حاصل اور وقیع تعارف و تبصرہ تحریر فرمایا جو بجائے خود ایک اہم یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے آنے والی نسلوں کو میر ناصر علی کی علمی شخصیت اُن کے افکار کی 'نازک خیالیوں اور اسلوب نگارش کی 'پاکیزہ بیانیوں' اور لطافتوں کو سمجھنے میں بے انتہا مدد ملے گی۔ اسی دیباچے کا کچھ حصہ آں محترم نے اپنے وقیع جریدے نگار بابت دسمبر ۱۹۶۴ء میں میر ناصر علی کے چند انشائیوں کے ساتھ شائع کیا، اور ان عظیم ہستیوں کا رکھ رکھاؤ اور وضعداری دیکھئے کہ اس کے لئے میری 'اجازت' کو ضروری خیال کیا! اس سلسلے میں حضرت کا یہ گرامی نامہ ملاحظہ ہو:-

"گرامی عزیز

افسوس ہے کہ آپ کراچی سے پھر راولپنڈی چلے گئے اور میں آپ سے نہ مل سکا۔ آپ عابد منزل آئے تو میں نہ تھا اور جب ۲۳ اکتوبر میں آپ کے دفتر گیا تو آپ اپنی مصروفیات کی وجہ سے نہ مل سکے — شاید کوئی میٹنگ ہو رہی تھی۔

صلائے عام کے چند مضامین کا فائل میرے پاس محفوظ ہے۔ لیکن سب کا نہیں۔ معلوم نہیں نقول کا کام جاری ہے یا نہیں۔ بہر حال انہیں جلد ہی کتابی صورت میں شائع ہو جانا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں

اس کا علم بھی لوگوں کو ابھی سے ہو جانا بہتر رہے گا۔ اسی خیال کے پیشِ نظر میں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ کبھی کبھی "نگار" کے ذریعے سے مرحوم کے معجزاتِ ادب، پیش کرتا رہوں۔ اگر آپ اس کی اجازت دیں تو فی الحال اپنے ایک طویل نوٹ کے ساتھ جو میں نے اسی دیباچے سے اخذ کیا ہے مرحوم کے ابتدائی دو مقالے دسمبر میں شائع کرنا چاہتا ہوں۔ دیباچہ آپ ہی کے لئے لکھا تھا اور مضامینِ ناصری کی طرح یہ بھی آپ کی ملکیت بن چکا ہے اس لئے پہلے آپ کی رضامندی حاصل کر لینا ضروری خیال کیا۔ اس نوٹ میں اُن مقاصد کا بھی اظہار کر دیا ہے جو آپ کے پیشِ نظر ہیں۔ کاتب کو ابھی نہیں دیا۔ بواپسی ڈاک اپنی رائے سے مطلع فرمایئے۔"

دعا گو ___ نیاز

میری عین خوش بختی ہے کہ "مقاماتِ ناصری" کی تدوین و ترتیب کے سلسلے میں مجھے ایسی جلیل القدر ہستیوں کی معاونت نصیب ہوئی۔ ان کے لائقِ تعظیم نام ہی انتخاب کی صحت و عمدگی کے ضامن ہیں۔ ان محترم بزرگوں نے اپنے گراں بہا مقدمات میں جو اس جلد کی زینت ہیں میری حقیر کوششوں کا تذکرہ جن تحسین آمیز کلمات میں فرمایا ہے وہ تو میرے لئے باعثِ افتخار ہے ہی، میری دشواریوں اور مجبوریوں کے پیشِ نظر اس غیر معمولی تاخیر کو بھی درگزر کے لائق قرار دیا ہے۔ اس کے بعد میرے لئے اس ضمن میں مزید کچھ عرض کرنے کی نہ گنجائش ہے نہ ضرورت۔

اس جلد کی ترتیب کے بارے میں ایک دو لفظ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں ___ مقدمات کے بعد پہلا مضمون "افتتاحِ کلام حمد باری تعالیٰ" ناصری کے کے پہلے نمبر کا پہلا مضمون ہے۔ نفسِ مضمون کی رعایت سے اسے سب سے پہلے

رکھا گیا۔ باقی مضامین رسائل اور ادوار کے حساب سے تین حصّوں میں منقسم ہیں۔ پہلے حصّے میں تیرھویں صدی کے چیدہ مضامین ہیں۔ دوسرے میں "زمانہ" "افسانہ ایام" اور "ناصری" کے چند مضامین ہیں جو کافی حد تک اس دور کی نمایندگی کرتے ہیں۔ تیسرے حصّے سے صلائے عام کا انتخاب شروع ہوتا ہے، لیکن پہلے دو حصّوں کے منتخب مضامین کی ضخامت اتنی ہو چکی تھی کہ اسمیں صرف ابتدائی دور کے چار سال ۱۹۰۸ء۔ ۱۹۱۱ء کے چند منتخب مضامین ہی شامل کیے جا سکے۔ سوائے مضامین پریشاں کے یہ سلسلہ مضامین ۱۹۱۲ء سے شروع ہوا تھا۔ اس اعتبار سے انھیں اگلی جلد میں درج کرنا چاہیئے تھا، لیکن چونکہ یہ میر ناصر علی کا خاص الخاص عنوان تھا اور اُن کے قدر شناسوں میں اسے بے حد مقبولیت حاصل تھی اس لئے چند "مضامین پریشاں" نمونتہً اس جلد میں شامل کرنے ضروری سمجھے گئے کہ یہ پہلی جلد بھی میر ناصر علی کے جملہ اسالیب کی نمایندگی کر سکے۔ تیسرے حصّے کے شروع کے مضامین، "پیرایۂ آغاز" اور "صلائے عام" بھی صلائے عام کے مستقل عنوانات کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ان عنوانات کے تحت صلائے عام کے ہر پرچے میں میر ناصر علی ایسی ہی سخن گسترانہ باتیں تحریر فرمایا کرتے تھے۔ یہ دونوں مضامین کسی ایک پرچے سے نہیں بلکہ کئی پرچوں کے منتخب حصّوں پر مشتمل ہیں۔ اسی طرح اس حصّے کا آخری مضمون "دادِ صلائے عام" ہے جو صلائے عام کے مستقل عنوان "صلائے عام کی ڈاک" کی نمایندگی کرتا ہے۔ یہ بھی ابتدائی دو تین پرچوں کا مجموعی انتخاب ہے۔ چونکہ مقاماتِ ناصری کی یہ پہلی جلد ہے اور فی الجملہ تعارفی حیثیت بھی رکھتی ہے اس لئے توقع ہے کہ اس مضمون میں اس دور کے مشاہیر کے جو یادگار خطوط درج ہیں اُن کا پاکیزہ اندازِ دادِ سخن مبصرین کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

ہزار ہزار شکر ہے ایزدِ پاک کا کہ "مقاماتِ ناصری" جسے دیکھنے کی مہدی حسن

افادی سے لیکر اختر شیرانی تک کیسے کیسے باکمال سخنور و نکتہ شناس نصف صدی سے آرزو کرتے آئے تھے۔ مجھے آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی توفیق وسعادت حاصل ہوئی۔ اس کی اگلی جلد میں اور بھی پاکیزہ مضامین ہوں گے جو بشرطِ قدردانی انشاء اللہ جلد ہی پیش خدمت ہوگی۔ میر ناصر علی اکثر صلائے عام کے آنے والے پرچوں کی "لذید" میں جس انداز سے دادِ خوش بیانی دیتے تھے اس کا ایک اقتباس یہاں برمحل معلوم ہوتا ہے: ع

این نسخہ از بیاضِ مسیحا نوشتہ ایم

یہ کوئی دفتر نہیں سُن لیجئے — حالِ دل کہتا ہے دم بھر بیٹھئے

یہ تو آپ نے دیکھ لیا کہ خوبیٔ مضامین میں صلائے عام اب تک کسی سے کم نہیں رہا۔ جس طرز پر جو مضمون لکھا گیا اس سے بہتر کہیں نظر نہ آیا۔ اس سے اور کچھ نہیں تو اتنا ثابت ہو چلا ہے کہ ہماری زبان ایسی گئی گزری نہیں جیسی ہم سمجھے ہوئے تھے ؎

ہاتھ کانوں سے فرشتوں کے نہیں ہوتے جدا
اور ہم سمجھے ہوئے ہیں نارسا فریاد ہے

آپ دیکھئے گا کہ اگلے صلائے عام میں اور بھی پاکیزہ مضامین ہوں گے۔ نزاکتِ خیال اور حسنِ مقابل یعنی نازک خیالی اور پاکیزہ بیانی میں ہمارا ارادہ ابنائے زماں سے بازی لینے کا ہے۔ یہ دکھاتا ہے کہ ہماری زبان ہمارے لئے وہ مایۂ ناز ہے جس کے آگے اور باتیں گلستانِ سعدی کے سامنے سادہ اوراق ہیں، جس طرح ستارے مہِ تاباں کے سامنے اور صبح خنداں چاک گریباں کے سامنے ؎

ہیں مضامینِ پری زادذگی پیش نگاہ
دل تڑپتا ہے قلم ہاتھ سے گر رکھتے ہیں

یہ تعلّی سہی، مگر غایتِ مبالغہ خود ہُنر ہے جس طرح بہار میں دیوانگی، جنوں میں عُریانی،

محبت میں ترکِ آرزو اور شب تار میں زلفِ مشکبو۔

مدعائے التماس یہ ہے کہ سخن شناس اگلے صلائے عام کے ابھی سے مشتاق رہیں آگے یا قسمت یا نصیب ؂

کر دیکھیں گے ہم نالہ وہ آئیں کہ نہ آئیں
تیرا بھی کہا اے دلِ ناشاد کریں گے"

ناشکر گزاری ہوگی اگرچند اور کرم فرماؤں اور شفیق دوستوں کی عنایتوں کا ذکر نہ کروں۔ جن کی اعانت مجھے مقاماتِ ناصری کی تدوین و ترتیب کے مختلف مدارج پر حاصل رہی۔ ان میں اُن علم پرور مربیوں کی نوازش کا ذکر پہلے لازم ہے جنھوں نے تلاشِ مضامین میں میری امداد فرمائی۔ مولانا عبدالقادر صاحب نے پشاور یونیورسٹی لائبریری کے علاوہ چند قدیمی کتب خانوں میں، اور ڈاکٹر شوکت سبزواری صاحب نے ڈھاکا کے مختلف کالجوں کی لائبریریوں میں، مولانا عرشی رام پوری نے رام پور کی رضا لائبریری میں، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اور برادرم عشرت رحمانی صاحب نے لاہور کی مختلف لائبریریوں اور پرانی کتابوں کے انبار میں، مسلم ضیائی صاحب، مسعود چشتی صاحب اور اظہر حسین صاحب نے کراچی یونیورسٹی لائبریری اور دیگر کتب خانوں میں، پرانے پرچوں کی تلاش میں میری رہنمائی فرمائی۔

اشاعت کے سلسلے میں سیّد امتیاز علی صاحب تاؔج نے مقاماتِ ناصری کو مجلس ترقیٔ ادب لاہور سے اور برادرم شان الحق صاحب حقیؔ نے ترقیٔ اردو بورڈ کی جانب سے شائع کرانے کی تجاویز کی پُر زور حمایت کی ان دونوں کرم فرماؤں کا میں بے حد ممنون ہوں۔ مقاماتِ ناصری کا انجمن ترقی اردو ہی کی جانب سے شایع

ہونا مقدر ہو چکا تھا۔ برادرم جمیل الدین عالی صاحب کی سرگرم اعانت سے یہ صورت بآسانی بنتی چلی گئی۔ کس زبان سے شکر بجا لاؤں ان کے احسانات کا۔ برادرم یوسف ظفر صاحب اور اسلم جدون صاحب اور ہارون جعفری صاحب نے کاپیاں اور پروف پڑھنے میں میری امداد فرمائی۔ ان حضرات کا بھی ممنون ہوں۔

انصار ناصری

انجمن کے جریدے

سہ ماہی "اردو"	قیمت سالانہ: ۱۴ روپے
ماہنامہ "قومی زبان"	قیمت سالانہ: ۱۲ روپے

۱۹۶۶ء کے بعد کے ان دونوں جریدوں کے شمارے محدود تعداد میں فروخت کے لیے موجود ہیں، نیز مندرجہ ذیل خصوصی شمارے بھی مل سکتے ہیں جو بابائے اردو کی یاد میں شایع کیے گئے ہیں۔

۱۔ سہ ماہی "اردو" بابائے اردو نمبر ۱۹۶۲ء	قیمت: ۵ روپے
۲۔ ماہنامہ "قومی زبان" بابائے اردو نمبر ۱۹۶۱ء	قیمت: ا روپیہ ۷۵ پیسے
۳۔ " " " " ۱۹۶۲ء	قیمت: ۱ روپیہ
۴۔ " " " " ۱۹۶۳ء	قیمت: ۲ روپے
۵۔ " " " " ۱۹۶۴ء	قیمت: ۴ روپے
۶۔ " " " " ۱۹۶۶ء	قیمت: ۸ روپے
۷۔ " " " " ۱۹۶۷ء	قیمت: ۲ روپے
۸۔ " " " " ۱۹۶۸ء	قیمت: ۱ روپیہ

انجمن ترقیٔ اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی ۱

انجمن کی تحقیقی و تنقیدی کتابیں